

ندوة ائین دینی کا علمی و دینی مآبنا

برپاں

مرتب
سعید احمد کسرا بادی

ندوة المصنفین دہلی کی مذہبی و تاریخی مطبوعات

ذیل میں ندوة المصنفین دہلی کی چند اہم دینی، اصلاحی اور تاریخی کتابوں کی فہرست درج کی جاتی ہے۔

مفصل فہرست جس میں آپ کو ادارے کے حلقوں کی تفصیل بھی معلوم ہوگی دفتر سے طلب فرمائیے۔

اسلام میں غلامی کی حقیقت جدید ایڈیشن جس میں نظر ثانی کے ساتھ ضروری اضافے بھی کئے گئے ہیں قیمت سٹے، مجلد للکھ

سلسلہ تاریخ ملت مختصر وقت میں تاریخ اسلام کا مطالعہ کرنے والوں کیلئے یہ سلسلہ نہایت مفید ہے اسلام کی تاریخ کے یہ حصے مستند و معتبر بھی ہیں اور جامع بھی۔ انداز بیان نکھر اہوا و شگفتہ

نبی عربی صلعم تاریخ ملت کا حصہ اول جس میں سرور کائنات کے تمام اہم واقعات کو ایک خاص ترتیب سے نہایت آسان اور دل نشین انداز میں یکجا کیا گیا ہے۔ قیمت پیر مجلد پیر

خلافت راشدہ تاریخ ملت کا دوسرا حصہ، عہد خلفائے راشدین کے حالات و واقعات کا دل پذیر بیان قیمت پیر مجلد پیر

خلافت بنی امیہ تاریخ ملت کا تیسرا حصہ، قیمت تین روپے آٹھ آنے، مجلد تین روپے بارہ آنے

خلافت ہسپانیہ تاریخ ملت کا چوتھا حصہ، قیمت دو روپے۔ مجلد دو روپے چار آنے

خلافت عباسیہ (جلد اول) تاریخ ملت کا پانچواں حصہ، قیمت پیر مجلد للکھ

خلافت عباسیہ (جلد دوم) تاریخ ملت کا چھٹا حصہ۔ قیمت للکھ، مجلد ص ۱

تاریخ مصر و مغرب اقصیٰ تاریخ ملت کا ساتواں حصہ مصر اور سلاطین مصر کی مکمل تاریخ صفحات ۳۰۰ قیمت تین روپے چار آنے۔ مجلد تین روپے آٹھ آنے

خلافت عثمانیہ تاریخ ملت کا آٹھواں حصہ مجلد پیر **فہم قرآن** جدید ایڈیشن جس میں بہت سے آسم

اصناف کئے گئے ہیں اور مباحث کتاب کو از سر نو مرتب کیا گیا ہے۔ قیمت پیر مجلد پیر

غلامان اسلام انٹرنی سے زیادہ غلامان اسلام کے کمالات و فضائل اور شاندار کارناموں کا تفصیلی بیان۔ جدید ایڈیشن قیمت پیر مجلد پیر

اخلاق و فلسفہ اخلاق علم الاخلاق پر ایک مبسوط اور محققانہ کتاب۔ جدید ایڈیشن جس میں غیر معمولی اضافے کئے گئے ہیں۔ اور مضامین کی ترتیب کو زیادہ دل نشین اور سہل کیا گیا ہے۔

قیمت پیر، مجلد معمر **قصص القرآن** جلد اول تیسرا ایڈیشن۔ حضرت آدم سے حضرت موسیٰ و ہارون کے حالات و واقعات تک۔ قیمت پیر، مجلد معمر

قصص القرآن جلد دوم حضرت یوشع علیہ السلام کی حالت تک تیسرا ایڈیشن قیمت پیر، مجلد للکھ

قصص القرآن جلد سوم انبیاء علیہم السلام کے حالات کے علاوہ ماقبہ قصص قرآنی کا بیان قیمت پیر، مجلد پیر

بُرْہَانُ

جلد سبست دوم شمارہ نمبر

جنوری ۱۹۵۳ء مطابق ربیع الثانی ۱۳۷۲ھ

آہ مفتی اعظم ہند

واحسرتا! اس ۲۵ دسمبر ۱۹۵۲ء کو شب کے ساڑھے دس بجے یعنی ٹھیک اس وقت جبکہ ایک سال شمسی اپنی حیاتِ دوازده ماہ کی مقررہ مدت پوری کر کے ہمیشہ کے لئے گوشہٴ عدم میں آسودہ سکون ہو جانے کی تیاری کر رہا تھا علمِ عمل کے آسمان کا ایک آفتاب عالمِ تاب غروب ہو گیا۔ یعنی حضرتنا الاستاذ مولانا الحاج المفتی محمد کفایت اللہ دہلوی نے انہی سال کی لگ بھگ عمر میں داعی اجل کو لبیک کہہ کر جانِ جانِ آفریں کے سپرد کی! انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مفتی صاحب کا وجود گرامی اپنی چند در چند علمی و عملی خوبیوں اور گونا گوں دماغی و اخلاقی کمالات کے باعث صرف ہندوستان اور پاکستان کا نہیں بلکہ پورے عالم اسلام کا ایک ایسا متاعِ گرانمایہ اور سراپا بلند پایہ تھا کہ آج اس کے اٹھ جانے پر جتنا بھی ماتم اور افس پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے۔ حضرت مرحوم خود جلیل القدر بزرگ اور بزرگوں کی یادگار تھے۔ انہیں دیکھ کر اور ان کی صحبت میں دوچار

میں گذر کر سلف صالحین کی یاد تازہ ہوتی تھی۔ قدرت نے اُن میں دل اور دماغ دونوں کی خوبیاں اور ان کے فضائل و کمالات کچھ اس طرح یک وقت جمع کر دئے تھے کہ اُن کی ہستی ”اے تو مجموعہ خوبی بھر نامت خاتم کاملہ اقبال بن گئی تھی۔ وہ ایک طرف بہت بڑے عالم۔ مفسر۔ محدث اور فقیہ تھے تو دوسری جانب علوم عربیہ کے جامع تھے اور ان میں بہت ٹھوس استعداد رکھتے تھے۔ پھر معاملات میں سمجھ بوجھ اور سیاسی و دنیوی امور و مسائل میں ان کی فرا نگ و دانشمندی کا یہ عالم تھا کہ جس طرح علما کی بزم کے وہ صدیق نشین تھے اسی طرح ارباب سیاست و تدبیر کی محفل میں بھی اپنا مقام خاص رکھتے تھے جو بات کہتے تھے اور جو لفظ اُن کے قلم سے نکلتا تھا وہ اس قدر چالا اور نپا نپا ہوتا تھا کہ کسی بڑے سے بڑے نکتہ چین کے لئے بھی اُس پر حرف گیری آسان نہ ہوتی تھی۔ یوں تو اللہ تعالیٰ نے اُن کو سب ہی علوم اسلامیہ میں غیر معمولی درک و بصیرت اور فہم و فراست عطا فرمائی تھی تاہم آپ کا اصل طفرائے امتیاز فقہ فی الدین تھا۔ بڑے سے بڑا پیچیدہ مسئلہ ان کے سامنے آتا تھا اور وہ قرآن و حدیث اور احکام فقہ کی روشنی میں اس کا صحیح حل اس طرح علی وجہ البصیرت معلوم کر لیتے تھے کہ پھر کسی کے لئے اس کا خلاف کرنا آسان نہیں ہوتا تھا۔ یہی وہ صفت تھی جس کے باعث مدتِ بیضی میں ان کو مفتی اعظم کا خطاب دیا تھا۔ اور کوئی شبہ نہیں کہ اس خطاب کا جامہ ان کے تفقہ کے قامتِ موزوں پر بالکل چست آتا تھا۔ اس سلسلہ میں حضرت مفتی صاحب کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ کافی غور و خوض اور تفکر و تدبر کے بعد کسی نتیجہ پر پہنچتے تھے اور اُن کے وقت مسئلہ کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہوتا تھا جو ان کی نظرِ توجہ سے اوجھل رہ گیا ہو۔ اور پھر ان کا فیصلہ الیہ اور مستحکم ہوتا تھا کہ اس کو بدلوادینا ممکن نہ تھا۔ اس حیثیت سے وہ بلاشبہ اسرار و غوامضِ شریعت کے بڑے محرم اور احکام و تعلیماتِ اسلام کے ایک دیدہ ورنیاض تھے۔ ان کے فتویٰ مختصر مگر نہایت جامع اور مدلل ہوتے تھے۔ وہ عموماً اربابِ افتا کی طرح اپنی تحریروں میں کتبِ فقہ کی طولِ طویل عبارتوں اور مختلف اقوالِ ائمہ کے نقل کرنے کے عادی نہ تھے۔ مگر جتنا کچھ لکھتے تھے مسئلہ کی اصل روح اور اس کے اصل معنی کا حامل ہوتا تھا۔ اسی بنا پر ۱۲۷۶ھ میں مکہ معظمہ کی موتمرِ عالم اسلام میں جمعیتِ علماء ہند کے صدر وفد کی حیثیت سے انہوں نے شرکت کی اور اس کے بعد قاہرہ کی موتمر میں تشریف لے گئے تو ہر جگہ حجاز مصر اور عالم

اسلام کے دوسرے ملکوں کے علما و فضلاء نے آپ کے غیر معمولی تفقہ فی الدین اور اہمیت رائے کو تسلیم کیا اور آپ کی علمی عظمت و برتری کا علانیہ اعتراف کیا۔ قاہرہ کے دوران قیام میں آپ کی علمی سیادت کا اعتراف اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا تھا کہ شیخ جامعہ ازہر علامہ مراغی جو اپنے عہدہ کی حیثیت سے شاہ مصر کے محل میں جانے کے علاوہ اور کسی کے منان پر جا نہیں سکتے تھے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مزاج پر سی کے لئے دومرتبہ آپ کے قیام گاہ پر تشریف لائے نہ صرف علماء مصر بلکہ پوری مصری قوم کی طرف سے یہ سب سے بڑا خراج عقیدت تھا جو عالم اسلام کی کسی عظیم المرتبت ہستی کو پیش کیا جاسکتا تھا۔

حضرت مفتی صاحب طبعاً نہایت ٹھنڈے دماغ۔ سنجیدہ فکر متین طبیعت۔ اور مرئج و مرجان مزاج کے بزرگ تھے۔ ہنگامہ فرینی یا انقلاب پسندی سے ان کی طبیعت کو کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ لیکن اس کے باوجود ہندوستان کی تالنج جہد و جہد آزادی کے نہایت نازک دور میں جمعیتہ علماء ہند کے پہلے صدر کی حیثیت سے جب انہوں نے ایک نہایت اہم اور بھاری ذمہ داری اپنے سر لی تو اب وقت آیا کہ ان کی قوت عمل اور کیرکڑکی پوشیدہ خوبیاں بروئے کار آئیں۔ چنانچہ کانگریس کی تحریک آزادی اور جمعیتہ علماء ہند کی پوری تاریخ گواہ ہے کہ حضرت مفتی صاحب نے اس تمام مدت میں جس تدبیر، فراست، عزم و ہمت، استقلال و پامردی اور راہ حق میں بے خوفی و بیباکی کا ثبوت دیا ہے اسے دیکھ کر بھی کہا جاسکتا تھا کہ ایں کاراز تو اید و مژاں چنیں کند۔

حضرت مفتی صاحب کو اگر رئیس العلماء یا امیر العلماء کہا جائے تو ایسا کہنا صورت و منہ نامہر و باطناً دونوں طرح بالکل موزوں ہوگا۔ کیونکہ وہ جس طرح علم و فضل کے اعتبار سے مشاہیر علماء تھے۔ معاشی خوشحالی اور مالی رفاہیت کے لحاظ سے بھی علمائیں انہیں ایک خاص مقام۔ اہمیت تھا۔ انہوں نے ایک کتب خانہ قائم کر کے خود اپنی قوت بازو سے دولت پیدا کی۔ پھر ان کے تعلیم الاسلام کے مختلف حصے گھر گھر اس قدر مقبول ہوئے کہ اب تک لاکھوں کی تعداد میں۔ اشاعت ہو چکی ہے اور ان کے ذریعہ ہزاروں روپیہ کا ان کو فائدہ ہوا۔ اس مالی رفاہیت اور معاشی فارغ البالی کے باعث وہ نہایت خود داری اور عہدہ و عہدہ رکھ رکھاؤ کے ساتھ رہتے تھے۔ خرچ کرنے کے موقع پر بے دریغ خرچ کرتے تھے۔ اور اس معاملہ میں بھی ان کا ہاتھ ہمیشہ اونچا

اور بابائے مول کی امداد سے بے نیاز و مستغنی رہتا تھا۔

مجموعی حیثیت سے حضرت مفتی صاحب کا سب سے بڑا جوہر کمال یہ تھا کہ انہوں نے قدرت کی بخشی ہوئی ظاہری اور باطنی صلاحیتوں کو اپنی خاص توجہ اور محنت سے اس طرح ابھارا اور انہیں پروان چڑھا کر اپنی شخصیت کی تعمیر اس انداز سے کی تھی کہ علم و فضل کے علاوہ وہ اندرون خانہ اور بیرون خانہ زندگی کے کسی کام میں عاجز اور ہمتی مایہ نہ تھے۔ انہوں نے ایک معمولی گھرانے میں پیدا ہونے کے باوجود اپنی دنیا آپ پیدا کی تھی جو دینی حیثیت سے جس طرح مکمل تھی دنیوی حیثیت سے بھی کہیں سے تشنہ اور خام نہیں تھی۔ چنانچہ گونا گوں علمی و عملی اور روحانی و معنوی کالات و فضائل کے علاوہ وہ اعلیٰ درجہ کے خطاط بھی تھے اور خیاط بھی۔ ایک بہترین انجینئر بھی تھے اور طباط بھی خوش لباس خوش غذا تھے اور ورزشی جسم رکھتے تھے۔ ملتان جیل میں بڈنٹن کھیلنا شروع کیا تو چند روز کی مشق میں ہی سب ساتھیوں پر بازی لے گئے حساب دانی میں مشکل سے کوئی عالم ان کا حریف ہو سکتا تھا۔ کبھی کبھی عربی فارسی اور اردو میں شعر بھی کہتے تھے بات چونکہ گچی تلی کہنے کے خوگر تھے اس بنا پر ان کی تقریر اگرچہ پر مغز اور دل ہوتی تھی لیکن ہنگامہ آفریں اور دلولہ انگیز نہیں ہوتی تھی، بزم احباب میں ایک بذلہ سنج مگر باوقار و متین یا شاطر اور ارباب معاملہ کی مجلس میں ایک غائر النظر مدبر و مفکر تھے۔ اس حیثیت سے ان کی زندگی بے شبہ علوم دینیہ کے علماء و طلباء کے لئے ایک کامیاب نمونہ عمل اور اس بات کی شہادت تھی کہ علوم عربیہ و اسلامیہ کا ایک بوریہ نشین طالب علم اگر چاہے اور کوشش کرے تو قوم کے عطیات اور چندوں سے سرکاری ملازمت وغیرہ کی غلامی سے بے نیاز ہو کر اپنی دنیوی زندگی بھی ایک معیاری اور خوشحال زندگی بنا سکتا ہے۔

صدقیت! کہ اب یہ بزرگ صورتیں۔ یہ علم و عمل کی جیتی جاگتی شکلیں اسلام کی دیرینہ روایات کی حامل و علمبردار یہ شخصیتیں انہوں اور پڑیوں کا غم کھانہ والی اور بنی نوع انسان کی ہمدرد و غم گسار یہ ہستیاں روز بروز غمناک ہوتی جا رہی ہیں۔ اور ایک وقت آئے گا کہ لوگ ان صورتوں کے دیکھنے کو ترسیں گے بطنِ انبی کا خزانہ ان سے ملال ہو گا لیکن مادرِ گیتی کی کوک ان سے خالی ہوگی۔ آئندہ نسلیں تاریخ کے صفحات میں ان کو تذکرے پر طہین گی۔ لیکن ظہارِ صن پر ان کی سی ایک صورت و سیرت بھی نہ ملے گی۔ اللہم اغفرہ و ارحمہ رحمۃ واسعہ و املطہ علیہم شایب لطفک السنہی و کرمک الہنی تامہ و کاملہ۔

حضرت خواجہ محمد عاقل

از

(پروفیسر غلیق احمد صاحب نظامی ایم۔ اے)

(لکچرر شعبہ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

”پروفیسر غلیق احمد صاحب نے ”مشائخ حیات“ کے نام سے جو عظیم الشان اور غنیمت کتاب مرتب فرمائی ہے اور جو عنقریب ذرۃ المصنفین سے شائع ہونے والی ہے، زیر نظر مصنفوں اسی کتاب کا ایک باب ہے ”ایڈیٹر“

خواجہ محمد عاقل، حضرت خواجہ ذر محمد مہاروی کے ممتاز ترین خلفاء میں تھے۔ پنجاب میں نظامیہ سلسلہ کی اشاعت میں انہوں نے نمایاں حصہ لیا تھا۔ چاچران، کوٹ مٹمن، احمدپور وغیرہ مقامات کی خانقاہیں ان ہی کی کوششوں سے وجود میں آئیں۔ حاجی نجم الدین صاحب نے لکھا ہے۔

”ہزار ہا مخلوق از دروازہ ایشان فیض یاب
ہزار ہا مخلوق نے ان کے دروازے سے فیض پایا اور
شدند و صد ہا صاحب خانقاہ از ایشان
سینکڑوں صاحب خانقاہ ان سے مبعوث ہوئے
مبعوث شدند“

ان کے علمی تجربہ، پابندی شریعت، بزرگانہ شفقت، اخلاق و مردت کا دور دورہ شہرہ تھا۔ لوگ بڑی عقیدت سے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ یہ ان ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ پنجاب کے نہایت ہی دور افتادہ اور غیر معدود علاقوں میں مذہبی اور روحانی تعلیم کا چرچہ ہو گیا۔ اور ان کے خرمین کمال کے خوشہ چیں دور دور پہل گئے۔

فانڈان و منب | خواجہ محمد عاقلؒ ایک معزز فاروقی فانڈان کے فرد تھے۔ ان کے اجداد شاہانِ مغلیہ اور
امراء وقت کی نظروں میں خاص عزت رکھتے تھے۔ ان کے ایک بزرگ حضرت محبوب اللہ احمد
مخدوم نور محمدؒ تھے۔ ارادتِ خاں وزیر شاہ جہاں ان کا مرید تھا۔ شاہ جہاں نے ان کو پانچ ہزار بیگہ
ارضی اخراجات کے واسطے دی تھی اور اس مضمون کا ایک فرمان عطا کیا تھا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
اِنَّ اللّٰهَ یَاْھُیُّ بِالْعَدْلِ وَاَرْحَمٰنِ الْمَلٰئِکَہِ
یَاٰیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اطِيعُوا اللّٰهَ وَاَطِيعُوا الرَّسُوْلَ

مورخہ نسبت و پنجم شہر ربیع الاول سنہ جلوس مطابق ۱۳۵۲ھ

بدین مضمون کہ

”دو بی زماں فرمان سعادت نشان فرخندہ عنوان بزمِ اینکہ موازی پنج ہزار بیگہ زمین قابلِ زراعت از پرگنہ
منگلوت سرکار صوبہ دارالامان ملتان در وجہ مدد معاش بنام خادماں کرامت نشان پیرو مرشد طریقت ہادی
راہ حقیقت راہبر راہ شریعت و معرفت، خواص سچہ عرفاں، زبدہ خدایرستان حضرت قبلہ میاں صاحب مخدوم
نور محمد کوریچہ دام اللہ ظلہ و شرفہ موافقہ مذکور از ابتدائے فصل خریف بازگشت ادوی بہشت ۹۹۹ فصلی مقرر است
امرد فیع القدر شرف صدور یافت کہ زمین مذکورہ بہ میاں صاحب مغزالیہ عنایت فرمودیم کہ مصلحت آہنا
فصل بفصل سال بسال صرف ماہیاج خود نمودہ و معائنہ خیر دولت ابد پیوند اشتغال می فرمودہ باشند
باید کہ حکام و عمال و جاگیرداراں و کردریاں حال و استقبال و اہل پرگنہ اراضی مذکورہ در محل موجودہ حسب الحکم
اشرف لائلی اس امر علیہ التقدیر مستمر دانستہ و زمین مذکورہ از مالہ سرکار یک عدد و چہل چارہ چک بستہ و یک
مسجد مبارک و سرائے رنگین پنچہ درس خواندن طالب علماں ساختہ بہ تصرف میاں صاحب مغزالیہ
دہند و ہر جہات و سایر حیات اخراجات مثل مغلیہ و پیش کش و جرمانہ و خالصانہ و معمولانہ و در و درخانہ و ہزارہ
دودہ نمی و مقدمی و عدد و دی و قانون گوئی و ضبط ہر سال و تکار از زراعت و کل تکالیف دیوانی و مطالبات سلطانی

مراحت رسانند و در ہر سال و ہر فصل سند مجدد و طلبند واجب الارشاد عمل نموده تخلف نوازند " سحر تاریخ
مناقب فریدی میں عالمگیر اور شاہان مابعد کے فرامین بھی درج ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں
نے اس جاگیر کو برقرار رکھا اور شاہ نور محمد کو ریجہ سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا۔
نور محمد کو ریجہ کے تین فرزند تھے۔

(۱) سلطان مخدوم (۲) مخدوم محمد یعقوب (۳) حاجی محمد اسحاق
اول الذکر نے لا ولد وصال فرمایا۔ موخر الذکر کی اولاد بیرون شلع ڈیرہ غازی خاں میں آباد ہو گئی
محمد یعقوب کے دو بیٹے ہوئے۔

(۱) مخدوم غلام حیدر۔ ان کا فرار دریائے ستلج کے کنارے، یار ادالی میں ہے۔
(۲) مخدوم محمد شریف۔ ان کے دو بیٹے تھے۔ ایک کا صنی نور محمد دوسرے کا صنی محمد عاقل
محمد شریف صاحب، یار ادالی میں مقیم ہو گئے تھے اور وہاں ان کے کثیر تعداد میں مرید ہو گئے تھے۔
وہ بڑے متواضع بزرگ تھے۔ زہد و ورع، قناعت و توکل میں یکائے روزگار تھے۔ حاجی نجم الدین صاحب
نے لکھا ہے کہ وہ عالم باعمل "اور" صاحب برکت "تھے۔ خواجہ گل محمد احمد پوری نے لکھا ہے کہ وہ
زہد و ورع، میں لاثانی تھے۔

کوٹ مٹھن | "مناقب فریدی" میں کوٹ مٹھن کے آباد ہونے کے متعلق لکھا ہے کہ جب مخدوم محمد شریف
صاحب یار ادالی میں آکر آباد ہوئے تو مٹھن خاں بلوچ رئیس یار ادالی آپ کا مرید و مقصد ہو گیا۔ ایک دن
آپ کا گذر اس جگہ سے ہوا جہاں اب کوٹ مٹھن آباد ہے۔ دریا کے کنارہ پر یہ پرفصل مقام دیکھ کر آپ
نے خان موصوف سے کہا کہ اس جگہ ایک شہر آباد کیا جائے اور وہ اللہ والوں کا مسکن ہو۔ خان نے
اس جگہ شہر بسا ماقبول کر لیا اور مخدوم سے گزارش کی کہ وہ خود اس مقام کو اپنا مستقر بنائیں۔ اس طرح
کوٹ مٹھن وجود میں آیا۔ اور حضرت مخدوم محمد شریف کی موجودگی کی وجہ سے دور و در سے علماء و مشائخ
وہاں آکر جمع ہو گئے۔

کوڑہ لقب | شاہ محمد عاقل صاحب کا خاندانی لقب کورجیہ تھا۔ تمام شاہی فرامین میں ان کے بزرگوں کے نام کے ساتھ کورجیہ لقب ملتا ہے۔ حاجی نجم الدین صاحب نے اس کی وجہ تسمیہ یہ بتائی ہے کہ خواجہ صاحب کے خاندان کے ایک بزرگ ایک دن مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے گئے اور پوچھا کہ کیا کسی نے آذان کہہ دی ہے؟۔ لوگوں نے نفی میں جواب دیا تو آپ نے مٹی کے ایک برتن کو جو ترسیب ہی رکھا تھا اٹھایا اور کہا کہ اے کوڑہ تو آذان کہہ۔ اس وقت سے ان کو "کورجیہ" کہنے لگے۔ کوڑہ کو سندھی زبان میں کورا کہتے ہیں۔ اور کہنے کے لئے جو استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ فقہ کورا جو ہو گیا۔ جس کے معنی ہوئے "کوڑہ بگو"۔ رفتہ رفتہ کورا جو سے کورجیہ ہو گیا۔

تعلیم | خواجہ محمد عاقل نے بہت صورتیں طرز میں علم پاک حفظ کر لیا تھا۔ ان کے والد ماجد مخدوم محمد شریف صاحب جو بچتے زمانے "اور محدث دوران" تھے خود ان کو تعلیم دیتے تھے۔ فاضل باپ نے اپنے ہونہار بیٹے میں علم و ادب کا وہ ذوق و شوق پیدا کر دیا جو آخر عمر تک ان کا طرہ امتیاز رہا اور جس سے ہزاروں شاہین علم و ادب نے فائدہ اٹھایا۔

خواجہ صاحب نے اپنے والد کے علاوہ حضرت شاہ فخر صاحب اور خواجہ ہماروی سے بھی تحصیل علوم کیا تھا۔ حضرت شاہ فخر صاحب نے ان کو شرح عبدالحی اور سوار السبیل کا درس دیا تھا۔ خواجہ ہماروی سے انھوں نے حدیث کی سند لی تھی۔

خواجہ صاحب کا حافظہ نہایت عمدہ تھا۔ جزوی مسائل تک صحت اور حواہیوں کے ساتھ ان کو یاد رہتے تھے۔ ان کے تخریفات کے متعلق خواجہ گل محمد احمد پوری نے لکھا ہے۔

۱۔ مناقب المہوبین۔ ص ۱۱۹۔ ۱۱۸۔ ۱۱۷۔ مناقب فریدی ص ۲۵۔ ۲۴۔ ۲۳۔ سیر الاولیاء ص ۱۳۹۔ مناقب المہوبین ص ۱۳۸۔

۲۔ سیر الاولیاء ص ۱۸۰۔ ۱۷۹۔ سلسلہ حدیث اس طرح درج ہے

شیخ محمد عاقل۔ شیخ نور محمد۔ شیخ فخر الدین دہلوی۔ شیخ نظام الدین الغوری ثم ازنگ آبادی۔ شیخ حافظ محمد۔ علاء الدین اکیلی ثم ازنگ آبادی۔ شیخ محمد طاہر بن شیخ محمد ابراہیم کوردی شہر مدنی۔ شیخ محمد ابراہیم کوردی

”دعوتِ خود شرفاً غریباً مثل آنحضرت در علم
ظاہری ہم کسے نبود پڑھے
شرق و غرب میں ان کی مثل اس زمانہ میں علم ظاہری
میں کوئی نہ تھا۔

پھر آگے چل کر فرماتے ہیں۔

”خصوص علم از اصول و فروع بآں مشابہ بود کہ بدرجہ اجتہاد سیدہ بود“

ابراہیم دارسن سلسلہ درس میں پڑیس | خواجہ محمد عاقل صاحب کو ابتدا ہی سے درس و تدریس کا بڑا شوق تھا۔
انھوں نے کوٹ مٹھن میں نہایت اعلیٰ پیمانہ پر ایک مدرسہ قائم کیا۔ بڑے بڑے عالم اس مدرسہ میں ملازم
تھے۔ درس و تدریس کا کام بہت باقاعدہ ہوتا تھا۔ خود خواجہ محمد عاقل تنہا سے زیادہ طلباء کو درس دینے
تھے مدرسہ کے ساتھ ہی ایک بڑا لنگر خانہ تھا۔ جب آپ کوٹ مٹھن سے شدائی تشریف لے گئے تو
وہاں بھی مدارس قائم کئے اور طلباء و اساتذہ کے لئے لنگر کی سہولتیں بہم پہنچائیں۔

خواجہ صاحب کے مدارس میں جن کتابوں کا درس ہوتا تھا وہ یہ ہیں۔

الحکم
مشکوٰۃ شریف۔ احیاء العلوم۔ صحیح بخاری۔ لوائح و شرح قصیدہ۔ سوا السبیل۔ تسنیم فیصول
شرح وقایہ مع حواشی۔ ہدایہ۔ شرح مواقف۔ شرح ہدایہ حکمت۔ میر با شتم۔ شرح عقاید خیالی
مطلوب و غیرہ۔

خواجہ ہاروی کی خدمت میں طافری | تحصیل علم کے بعد خواجہ محمد عاقل اور ان کے بڑے بھائی میاں نور محمد کو اصلاح
باطن اور تزکیہ نفس کے لئے مرشد کامل کی تلاش اور جستجو پیدا ہوئی۔ اگرچہ خود ان کے والد ماجد بڑے
صاحب کمال بزرگ تھے لیکن بقول خواجہ گل محمد

”دوامیہ آنجناب شہباز بلند پرواز بود“

اسی اثنائیں حضرت خواجہ نور محمد ہاروی کی شہرت سنی۔ اتفاقاً ان کے بڑے بھائی کی موضع یاران
والی میں خواجہ ہاروی سے ملاقات بھی ہو گئی۔ پہلی ہی نظر میں یہ عالم ہوا کہ
”... سہیت... آں بادشاہ گدا لباس در گرفت“

اور بے اختیار زبان پر یہ اشعار آ گئے۔

لے محمد سیر لا دلایا۔ ص ۱۳۹ لے البنا ص ۱۴۰ لے البنا ص ۱۴۱ لے البنا ص ۱۴۲ لے البنا

بشہا سیر کے بد امیدم کہ روزے گرد دین روز سفیدم
 شبنم را صبح میں روزی بر آید غم در پنج شہا روزی سر آید
 کہ بودم گرہے در ظلمت شب رسیدہ جان ز گمراہیم بر سب
 بر آمدہ از افق رخشندہ ماہے بکوئے دوستم بخود را سے
 اسی رات کو ایک قاصد خواجہ محمد عاقل کو بلانے کے لئے کوٹ مٹھن بھیجا گیا۔ خواجہ صاحب
 ذرا آکر ملے۔ اور ادب میں خواجہ نور محمد کے دست حق پرست پر سجدت کر لی۔

دہلی کا سفر اور شاہ فخر صاحب | خواجہ محمد عاقل کو کئی مرتبہ حضرت شاہ فخر صاحب رحمہ کی خدمت میں حاضری کی سعادت
 کی خدمت میں حاضری نصیب ہوئی تھی۔ پہلی بار جب وہ خواجہ ہاروی کی ہمراہی میں ہمارے دہلی تشریف
 لائے تھے تو سارا سفر پیادہ پا کیا تھا۔ جب مرشد نے اس کا سبب دریافت کیا تو عرض کیا ”میں نے
 خدا سے عہد کیا تھا کہ حضرت شاہ فخر صاحب کی زیارت کو پیادہ جاؤں گا“ دوسری مرتبہ وہ دہلی اس
 طرح آئے کہ اپنے وطن سے ہمارے خواجہ ہاروی کی خدمت میں گئے تھے، وہاں معلوم ہوا کہ خواجہ صاحب
 دہلی تشریف لے گئے ہیں۔ یہ سن کر آپ نے فوراً دہلی کا رخ کیا۔ دہلی پہنچے تو شاہ فخر صاحب کی خدمت
 میں پیش کرنے کے لئے کچھ پاس نہ تھا۔ صرف ایک لوٹا تھا۔ اس کو فروخت کیا اور شاہ فخر صاحب کے
 لئے مٹھائی خریدی۔ خواجہ ہاروی کو اس کا علم ہوا تو دو اشرفیاں دیں کہ یہ حضرت شاہ صاحب کی خدمت
 میں پیش کر دو۔

مناقب فریدی میں لکھا ہے کہ دوسری بار جب وہ شاہ فخر صاحب کی خدمت بابرکت میں حاضر
 ہوئے تھے تو علاوہ فیضانِ باطنی کے کچھ مسائل تصوف بھی سمجھے تھے۔ مناقب المحبوبین کا بیان ہے کہ
 انھوں نے شاہ فخر صاحب سے شرح عبدالحق اور سوا السبیل پڑھی تھی۔ آخری بار جب وہ مولانا فخر صاحب

نے تکرہ سیر لا دلیا میں ۱۲۶ ھ مناقب فریدی میں ان کے تین مرتبہ دہلی تشریف لانے کا ذکر ہے ص ۶۰-۵۹ تکرہ نے لکھا ہے

کہ دوسرے دہلی گئے ۱۲۶ ھ مناقب المحبوبین نے فیصلہ نہیں کیا بلکہ لکھا ہے ”دوسرے مرتبہ رفتہ اند“ ص ۱۲۱ ۵ تکرہ نے لکھا ہے ص ۱۲۱

مناقب المحبوبین میں لکھا ہے کہ خواجہ ہاروی نے ۱۲۴ اشرفیاں پیش کرنے کے لئے دی تھیں (ص ۱۲۲) ۵ مناقب فریدی ص ۵۸ ۵ فیضان

سے رخصت ہوئے تو انھوں نے چار کتابیں عنایت فرمائی تھیں۔

(۱) مکتوبات شیخ عبدالقدوس گنگوہی

اس پر مولانا کے ہاتھ لکھا ہوا تھا مناقب المجاہدین کے مصنف نے اس نسخہ کی زیارت کی تھی۔

(۲) کتاب مطلق

(۳) سوار السبیل

(۴) ایک مجموعہ جس میں نواح جامی، شریعہ رباعیات جامی وغیرہ تھی۔

مجاہدات | قاضی محمد اقل صاحب نے نہایت سخی مجاہدات کئے تھے۔ خواجہ حافظ محمد جان کہا کرتے تھے کہ قاضی صاحب نے جتنے مجاہدے کئے ہیں مشکل سے کوئی دوسرا شخص کر سکتا ہے۔ ان کو ذکر جہر میں بڑی دلچسپی تھی۔ آخر زمانہ میں بھی، جیسا کہ بدن پیرانہ سالی کے باعث کمزور اور نحیف ہو گیا تھا وہ نہایت پابندی سے ذکر جہر کرتے تھے۔ ان کے ذکر کی آواز ملیوں تک باقی رہتی تھی۔ نواب غازی الدین نے اسماء الابرار میں لکھا ہے کہ قاضی صاحب کے ذکر کی آواز ہمارے شہر فریدنگ (جو تین چار میل کے فاصلہ پر ہے) جاتی تھی۔

قاضی صاحب ”حبس دم“ کی بھی مشق فرمایا کرتے تھے۔

خواجہ گل محمد نے لکھا ہے کہ انھوں نے مجاہدہ حبس دم کہ کمال تک پہنچ دیا تھا۔ اُن کا ارشاد تھا ”شغل حبس مثل مار برگنج است۔ ہرگز از گزند شغل حبس دم خزانے پرسانپ کی مانند ہے جو اس کے نقصان سے نہیں ڈرتا وہ خزانہ تک پہنچ جاتا ہے۔“

عبادت میں مشغولیت کا یہ عالم تھا کہ بعض اوقات ان لوگوں سے جو بلاناغہ حاضر خدمت ہوتے تھے، یہ دریافت فرم لیتے تھے کہ اتنے دنوں کہاں رہے۔ جب کوئی جواب میں عرض کرتا کہ بندہ تو روزاً حاضر ہوتا ہے تو فرماتے۔ ”من ندیدہ ام“

۱۱۱۔ مناقب المجاہدین ص ۵۸۔ مناقب فریدی ص ۵۸۔ تلمذ سیر الاولیا ص ۱۴۷۔ تلمذ سیر الاولیا ص ۱۴۸۔ سیر الاولیا

المجاہدین ص ۱۱۹۔ تلمذ سیر الاولیا ص ۱۴۸۔ تلمذ سیر الاولیا ص ۱۴۵

قید و بند کے مصائب | قاضی محمد عاقل صاحب کے بڑے بھائی قاضی نور محمد صاحب ڈیرہ غازی خان میں ٹھیکے لینے تھے۔ ایک مرتبہ ٹھیکہ کی رقم ادا نہ ہوئی تو ناظم ڈیرہ نے شاہ محمد عاقل صاحب کو جو ضمانت تھے قید کر لیا۔ ۹ مہینے تک شاہ صاحب نے قید و بند کے مصائب برداشت کئے۔ اس زمانہ میں انھوں نے اپنا سارا وقت عبادت و ریاضت میں صرف کیا۔ رہائی کے بعد فرمایا کرتے تھے۔

”اگر آں نہ ماہر بدست منی آمد شاید از نتیجہ شغل بے نصیبی رفتم“

قید کے زمانہ میں پیر و مرشد کی جانب سے حضرت نادر والد صاحب نے متعدد بار رہائی کے لیے اعمال ان کے پاس بھیجے لیکن انھوں نے کوئی عمل نہیں پڑھا۔ بعد کو جب لوگوں نے عمل نہ پڑھنے کی وجہ پوچھی تو فرمایا۔

”برائے مناص نفس خود عمل کردن حیاد اس گیری شد“

مقبولیت | خلافت ملنے کے بعد کچھ عرصہ تک خواجہ محمد عاقل نے شیوع سلسلہ کی طرف توجہ نہیں کی شیخ ہارویؒ کو علم ہوا تو نہایت سختی کے ساتھ لکھا ”تم فیض کو عام کیوں نہیں کرتے اور خلق اللہ کو داخل سلسلہ کیوں نہیں کرتے۔ میں اس کی اطلاع شاہ فخر صاحب کو کروں گا“ یہ سن کر خواجہ صاحب لرز گئے اور نہایت ادب سے عرض کیا۔

”کدام کس پیش من آمدہ است کہ آں رد نمودم۔ اگر منی مبارک باشد خود بہ خود بگویم“
اپنے مرید کا یہ انکسار اور عجز دیکھ کر خواجہ ہارویؒ کو جوش آگیا فرمانے لگے۔

”اے میاں صاحب! روزے باشد کہ ملائک آسمان بنام شما نادی دہند و خلایق از شرق و غرب بر آستان شما جہ سائند سبحان اللہ شامی فرمانید کہ پیش من کس منی آید“

تھوڑے ہی دنوں بعد پیر کی پیشین گوئی صحیح ہوئی اور ہزاروں عقیدت مندان کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔

فروج اور نگر | قاضی صاحب کا نگر ابتدائی زمانہ سے ہی جاری تھا۔ طلباء اور فقرا کو اس نگر سے کھانا

لے لے تے تھے سیر الاولیاء۔ ص ۱۴۹ سے لے کر تکریر الاولیاء۔ ص ۱۵۰

ملتا تھا۔ لیکن ایک زمانہ شاہ صاحب پر ایسا بھی گذرا تھا کہ مسلسل نا قدر رہتا تھا اور نگر کے سب متعلقین
فقر اور طلباء کو یہ مصائب برداشت کرنے پڑتے تھے

خواجہ گل محمد احمد پوریؒ اس تنگی اور عسرت کے زمانہ میں قاضی صاحبؒ کی خانقاہ میں رہتے
تھے۔ ان کا بیان ہے کہ جب فتوح نہ آتی تھی تو کچھ نہ بکتا تھا۔ جب کچھ آ جاتا تو پک جاتا۔ لیکن خواجہ صاحبؒ
کا یہ عالم تھا کہ جب تک تمام متعلقین، درویش اور طالب علم کھانا نہ کھا لیتے
”دست بہ طعام نمی بردند“۔^۱

خواجہ گل محمدؒ نے لکھا ہے کہ ان کے متعلقین وغیرہ کی تعداد پانچ سو تھی۔ اور یہ تعداد اس وقت
تھی جب فقر و فاقہ کے مصائب بھی برداشت کرنے پڑتے تھے جب باب فتوح کھل گیا تو نگر سے
کھانے والوں کی تعداد اس قدر بڑھ گئی کہ اندازہ لگانا مشکل ہو گیا۔ لکھا ہے۔

”ورآں وقت نہ واردین را تعداد بود، نہ طعام اس وقت نہ آنے والوں کا شمار تھا نہ کھانے کا انداز
را انداز، یکے دربار شاہنشہی بود،“^۲ ایک شاہی دربار تھا (جو چلتا رہتا تھا)

اتباع سنت | خواجہ محمد عاقلؒ اتباع سنت کا خاص لحاظ رکھتے تھے۔ ہمیشہ یہ کوشش رہی تھی کہ احکام
شرعیہ و سنت نبویؐ پر پورا پورا عمل کیا جائے۔ وصال سے کچھ پہلے حضور سرور کائناتؐ کو خواب
میں دیکھا کہ فرماتے ہیں۔

”تو مارا بسیار خوش کردی کہ ہمگیں سنتہائے مارا زندہ کردی۔“^۳

خواجہ جلال پوریؒ فرمایا کرتے تھے کہ ان کو درجہ فتانی الرسول حاصل تھا۔^۴

توزیع اوقات | خواجہ محمد عاقلؒ اپنے اوقات کے بہت پابند تھے مغرب کی نماز باجماعت ادا کرنے کے
بعد وہ شغل و ذکر میں مصروف ہو جاتے تھے پھر کھانا کھا کر عشاء کی نماز باجماعت پڑھتے تھے۔ اس
کے بعد مریدوں کی تعلیم و تربیت میں مشغول ہو جاتے تھے آدھی رات تک یہ سلسلہ جاری رہتا تھا
ہجرت کی نماز پڑھ کر ذکر جہر کرتے تھے۔ قرآن پاک کی تلاوت فرماتے تھے۔ طلباء کو درس شام کے وقت

۱۔ ۲۔ ۳۔ ۴۔ تملک سیرالاولیا۔ ص ۱۴۹ ۵۔ مناقب المجوبین ص ۱۲۳ ۶۔ ذکر حبیب۔ ص ۸۰-۲۵۹

دیتے تھے۔ ڈیڑھ پہر دن باقی ہوتا تھا کہ اُن کا حلقہ دور سے شروع ہو جاتا تھا۔
لباس و خوراک | خواجہ صاحب عمدہ اور لطیف لباس زیب تن فرماتے تھے۔ شاہ فخر صاحب نے ہدایت
 کی تھی کہ لطیف لباس اور لطیف غذا استعمال کرنا۔ فصاحت سن کر ان کو بہت تعجب ہوا تھا لیکن پھر
 جب کفنوں سے رسالہ خواجہ عبید اللہ احمدؒ میں لکھا نہ دیکھا کہ

”سالک را باید که غذا و لباس لطیف استعمال کند کہ اذیاء لطیف وارد نہ شود“

تو شاہ فخر صاحب کی فصاحت کی حکمت اُن کے ذہن نشین ہو گئی۔

خواجہ صاحب کا قمیض سینے پر سے چمک رہتا تھا۔ کلاؤ قادری سر پہ ہوتی تھی جب باہر تشریف
 لے جاتے تو سر مبارک پر دستار یا سلاری (لنگی) باندھ لیتے تھے تلمذ میں اُن کے لباس کے متعلق لکھا ہے۔
 ”پاجامہ نہ تو سید سیاہ و یا نہ بند سیاہ مستعمل می شد، و بر دوش لنگی یا الاچہ یا دوپٹہ یا سلاری بہر کیف می رسد
 مستعمل می شد۔“

رشمین کپڑا کبھی استعمال نہ کرتے تھے۔

خواجہ صاحب بہت قلیل الطعام تھے۔ رات دن میں ۵۰ درم سے زیادہ خوراک نہ ہوتی تھی
 تلمذ میں لکھا ہے۔

”در اقل و شرب اُن حضرت از شخصیت و بہشت درم ارد و بہشت نال تنگ و نرم تیار کردہ می شد بایں

طریق کہ برتابہ نیم پختہ نمودہ بعد از اں براگر ہاتھ تمام پختہ می شد بایں صورت اُن تمام نرم می شود از اں ناہاد و نیم ناں

گچہ بہ شور بہ چوزہ یا دال مونگ یا شلغم نادل می فرمودند و ہم چنین وقت شب می کردند“

اخلاق | شاہ صاحب کا اخلاق نہایت اعلیٰ تھا۔ امیر و غریب، بوڑھے اور جوان سب ہی ان کی خدمت میں حاضر
 ہوتے تھے اور وہ سب سے یکساں شفقت اور انکساری سے ملتے تھے۔ جو اُن سے ملتا تھا یہ سمجھتا
 تھا کہ جس قدر انتفاع و اکرام مجھ پر ہے کسی پر نہیں۔ اکثر اوقات ایسا دیکھا گیا کہ بعض لوگوں نے بازو پکڑ
 پکڑ کر آپ کو اپنی طرف رجوع کیا لیکن آپ نے نہایت ہی خندہ پیشانی اور محبت سے ان کو جواب دیا۔

۱۔ مناقب فریدی جس ۵۵۴ء تک لکھا گیا ہے۔ ۱۳۴۲ء تک تلمذ سیرالاولیا میں ۱۳۴۲ء۔ مناقب فریدی ص ۵۵۴ تا ۵۵۵ ایضاً

لوگ زور زور سے گفتگو کرتے لیکن آپ نہایت آہستگی اور خندہ روئی سے اُن کو مطمئن کرتے۔ بعض مرتبہ خود سنس کر فرمایا کرتے تھے کہ لوگ میرے بازو دیکھ کر اور زور زور سے چیخ کر مخاطب کرتے ہیں، گویا میں برا ہوں۔

اصطلاح مریدین | شاہ محمد عاقل اپنے مریدوں کی اصلاح و تربیت کی طرف خاص توجہ فرماتے تھے۔ وہ اُن میں صحیح مذہبی جذبات، خدا پر عبور و تسلط اور اسی سے ہر مشکل میں مدد مانگنے کا صحیح جذبہ پیدا کرنا چاہتے تھے ایک مرتبہ چھپک کے عمل کے متعلق ذکر ہو رہا تھا۔ فرمانے لگے۔

”نسبت از خود کردن عین شرک است۔ موثر حقیقی حق تعالیٰ است۔“

شاہ ولی اللہ کی عقیدت | اکبر شاہ ثانی نے شاہزادہ جہاں خسرو اور کاؤس شاہ کو قاضی محمد عاقل صاحب کا مرید کر لیا تھا۔ بہادر شاہ ظفر کو اُن سے بہت عقیدت تھی۔ ایک شعر میں کہتا ہے کہ

بولند کرتے ہیں نامِ فخر دین پر اے ظفر ہم ہیں عاقل و ربط عاقل سے دلی رکھتے ہیں ہم وصال قاضی صاحب تقریباً چار ہینتے تک علیل رہے۔ ایک روز فرمانے لگے۔

”امروز در تمام ہرج سفر کشیدیم خوب شد کہ بہ منزل رسیدیم۔“

حاضرین حیران ہو گئے کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ خواجہ گل محمد احمد پوری یہ الفاظ سن کر رونے لگے اسی دن شاہ صاحب نے وصال فرمایا۔ شدائی سے کوٹ مٹھن لا کر سپرد خاک کیا گیا۔ ۸ رجب ۱۲۲۹ھ کو یہ واقعہ پیش آیا۔ تاریخ وصال ہے کہ

دل ز داغِ دردِ پُر سوز و لہب۔ جاں بلب شد چوں سخن گوید بلب

رفت از دار فنا سوئے بقا۔ رہبر دین ہدیٰ عالی نسب

منظر نور محمد، فخر دین۔ شہ محمد عاقل، محبوب رب

ہادی خلق خدا رفت از جہاں۔ حسرتا در دا درینا ضد عجب

آہ و دایا و صد افسوس و درد۔ کز جہاں نور جہاں شد محتجب

تذکرہ سیر الاولیاء۔ ص ۱۲۲ تا ۱۹۵۔ تذکرہ سیر الاولیاء۔ ص ۱۲۲۔ مناقب فریدی۔ ص ۵۵۔ تذکرہ ص ۱۲۳۔

خم تہی گشت و نماندہ صاف درد درد باقی بہر مست و مضطرب
 چونکہ تاریخ و مہ سال وصال از دل پر درد خود مکروم طلب
 سر ز جیب بے خودی بر کرد و گفت روز ہشتم بود از ماہ رجب
 ۵۱ ۱۲۲۹ھ

لے مکتب سیر لا ولما ص ۱۵۳

تفسیر مظہری

تمام عربی مکتب خانوں و عربی جاننے والے اصحاب کے لئے پیشکش

ارباب علم کو معلوم ہے کہ حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ کی یہ عظیم المرتبہ تفسیر مختلف خصوصیتوں کے اعتبار سے اپنی نظیر نہیں رکھتی لیکن اب تک اس کی حیثیت ایک گہرے نایاب کی تھی اور ملک میں اس کا ایک قلمی نسخہ بھی دستیاب ہونا دشوار تھا۔

الحمد للہ۔ ساہا سال کی عرق ریز کوششوں کے بعد ہم آج اس قابل ہیں کہ اس عظیم الشان تفسیر کے شائع ہو جانے کا اعلان کر سکیں، اب تک اس کی حسب ذیل جلدیں طبع ہو چکی ہیں جو کاغذ اور دیگر سلاطین طباعت و کتابت کی گرانی کی وجہ سے بہت محدود مقدار میں بھی ہیں۔ آخری جلد زیر کتابت ہے۔
 ہدیہ غیر مجلد جلد اول تقطیع ۲۹×۲۲ سات روپے جلد ثانی سات روپے جلد ثالث آٹھ روپے،
 رابع پانچ روپے، قامس سات روپے، سادس آٹھ روپے، سابح آٹھ روپے، تامن آٹھ روپے،
 کل قیمت ۸ جلد ۵۵۔

مکتبہ برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی ۷

مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ

از

(حضرت مولانا سید مناظر حسن صاحب گیلانی
(سلسلہ گزشتہ)

”جمہور متکلمین اشاعہ اور معتزلہ دونوں ہی کی طرف یہ خیال کتابوں میں منسوب کیا گیا ہے“
(عقد الجدید صفحہ ۱۱)

مسئلہ کو سمجھاتے ہوئے ارقام فرمایا ہے کہ

ان اختلافات کی مثال ایسی ہے جیسے ”تینوں میں آیا ہے کہ

”أُنزِلَ الْقُرْآنُ عَلَى سَبْعَةِ أَحْرَفٍ“ قرآن سات (یعنی بہت سے) حروف پر نازل ہوا ہے
آخر ہم قرآنی الفاظ کی قراتوں کی مختلف شکایں کو جیسے صحیح سمجھتے ہیں اجتہادی مسائل کے اختلافات کے
ہر پہلو کو صحیح قرار دینے میں کیا دشواری پیش آئے گی،

بہر حال سلف سے خلف تک کتابوں میں بھی لوگ لکھتے چلے آئے ہیں، اور اول سے آخر تک مسلمانوں
کی فہم عمومی کا عملی مذاق بھی یہی رہا ہے، تقلید تو کوئی شبہ نہیں توگ کسی ایک امام کی ہی کرتے رہے ہیں، لیکن
احترامی تعلقات اجتہاد و تفقہ کے سارے ائمہ کے ساتھ انھوں نے مسلسل باقی رکھے ہیں۔ سب ہی کو مقبولان
حق اور دین کے راست، باز پیغمبر کے وفادار بزرگوں میں شمار کرتے رہے ہیں۔

لیکن بائیں ہمہ اس کا اعتراف بھی واقعہ کا اعتراف ہوگا، کہ خاص حالات کے زیر اثر کبھی کبھی مسلمانوں پر ایسے
خفائی دورے بھی پڑے ہیں، جن میں یہ کیا گیا ہے کہ روح سے بے تعلق ہو کر سبک دماغوں کا کوئی طبقہ گروہ
دین کے صرف بیرونی خط و خال نوک پلک کے سنوارنے پر بے جا اصرار کر رہا ہے۔ غلو میں بڑھتے ہوئے
اس حد تک پہنچ گیا کہ عام مسلمانوں کے لئے اس گروہ کا وجود باعث فتنہ و فساد، افتراق و شقاق بن گیا۔ جاننے
والے عموماً اس کی ذمہ داری فقہی اختلافات کے قصوں کے بہرہ خوب دیتے ہیں۔

حالانکہ سچ پوچھتے تو ہر آبادی میں کچھ لوگ ایک خاص قسم کے نفسیاتی مرض، اور ذہنی روگ کے شکار ہوتے ہیں۔ ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ قدرتِ حق سے کہیں کسی سرکاری ملازمت کے حاصل کرنے میں مثلاً کاپا ہو گئے تو ان کی زندگی سمٹ سمٹا کر اسی ملازمت اور ملازمت کے قصوں میں کھپ جاتی ہے سرکاری ملازم کے جو فرائض ہیں۔ کہ وقت پر کچہری میں آدمی حاضر ہو، خدمت جو اس کے سپرد کی گئی ہے، دیانت، دامت کے ساتھ اس کے حقوق ادا کرے، لیکن ظاہر ہے کہ کچہریوں کا ملازم صرف کچہریوں کا ملازم ہی نہیں ہوتا وہ اپنے بچوں کا باپ بھی ہے۔ بیوی کا شوہر بھی ہے، عزیز دل اور قریبوں کا رشتہ دار بھی ہے، سوسائٹی کا ایک فرد بھی ہے، الغرض کچہری کی زندگی کے سوا اور بھی بیسیوں شعبوں سے اس کا تعلق ہے، لیکن مذکورہ بالا نفسیاتی روگ کے بیماروں کی مصیبت یہ ہوتی ہے کہ ان کی ملازمت دفتر کی کرسی اور میز تک محدود نہیں ہوتی۔ بلکہ اپنی بیوی بچوں میں بھی سرکاری ملازمت کا شعور ان کا گلا پکڑے رہتا ہے، ملنے جلنے والوں کے سامنے بھی وہ سرکاری ملازم کے سوا اور کسی شعور کو اپنے اندر نہیں پاتے، جاگتے بھی ہیں، تو اسی تصور کے ساتھ حکومت کا میں عہدہ دار ہوں، اور سوتے بھی ہیں تو اسی خیال کے ساتھ سوتے ہیں الغرض زندگی کا کوئی لمحہ اس احساس سے ان غریبوں کا خالی نہیں ہوتا، اکثر و بیشتر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ اس قسم کے لوگ درحقیقت اپنی ملازمت کے حقیقی فرائض کی تکمیل سے قاصر ہوتے ہیں، آخر دفتر کے باہر بھی جو سرکاری ملازم ہی بنا رہے گا، تو دفتر کے اندر پہنچ کر نئے فرائض کا شعور اس میں نہ ابھرے اور اندر پہنچ کر بھی وہ باہر رہے، تو اس قسم کی ذہنیت کا انجام عام حالات میں یہی ہونا چاہیے۔

مذکورہ بالا نفسیاتی مرض کے مریضوں کا ذہنی رشتہ کسی وجہ سے مذہب یا دین کے ساتھ جب قائم ہو جاتا ہے تو اس کے تاثرات بھی عجیب ہوتے ہیں۔ اچانک اپنے ہم مذہب افراد کی عمومیت سے دیکھا جاتا ہے، کہ اچک کر باہر بھاگ گیا، جو کچھ سب مانتے ہیں وہ بھی مانتا ہے، جو کچھ سب جانتے ہیں وہی سب کچھ وہ بھی جانتا ہے لیکن اس نفسیاتی سحران کے طمانہ میں چشم و ابرو کے ہر اشارہ سے یہی ظاہر کرتا ہے کہ دین اور دنیا کے سوا اس کے اندر کچھ باقی رہا ہے اولاً باہر حرکت ہو یا سکون، نشست ہو یا برخاست، ہر حال میں ایسا معلوم ہوتا ہے اور شاید دوسروں کو وہ یہی معلوم بھی کرانا چاہتا ہے کہ براہِ راست خدا سے اسی کا تعلق قائم ہے مذہب کے واحد

جاگیردار اور دین کے تنہا ٹھیکہ دار کی شکل میں اپنے آپ کو نمایاں کرتا ہے اپنے متعلق طرح طرح کی خوش فہمیوں میں غلطیاں دیکھاں رہتا ہے۔

شاید اسی قسم کے نفوس، اور ان کے نفسیاتی مزاج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت ابوسعید خدری رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے، تاریخ و متفق میں ابن عساکر نے ان ہی کے حوالے سے یہ قول ان کا نقل کیا ہے،

اقوام یظہر علیہم سیرۃ الانس۔ کچھ لوگ ہوتے ہیں جن کو دیکھا جاتا ہے کہ عالم میں جو حوادث

الی اللہ تعالیٰ عند الحوادث و پیدا ہوتے ہیں، یا احکام الہی جاری ہوتے ہیں ان کو خدا

نزول احکام فقال بعد الناس کی طرف منسوب کرتے ہیں سب سے زیادہ پیش پیش

عن اللہ من یدعی انہ شاسع نظر آتے ہیں (ابوسعید نے ان کا ذکر کر کے کہا، جو خدا کی

طرف اشارہ کا، اور خدا سے نزدیک ہونے کا دعویٰ ہو وہی

سب سے زیادہ خدا سے دوسرے خدا کے غصہ کا سب سے

بڑا نشانہ دہی ہے جو سب سے زیادہ (ہر بات میں) اسی

کی طرف اشارہ کرتا ہو اور کھائی دے۔

شاید اسی معنوت و معنوں طبقہ کے انہم کو دیکھ کر مسیح علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ

”تم پھروں کو چاہتے ہو اور اونٹوں کو نکلتے ہو“

ہندوستان میں بھی پہلے دین زوال حکومت کے بعد مسلمانوں پر آفات و مصائب کے جو پہاڑ ٹوٹے

ان قسموں میں اور تو جو کچھ ہوا، سب ہی اسلام اور مسلمانوں کی رسوائی کی بعض ناگوار صورتیں اس شکل

میں جو پیش آئیں، کہ مسجدوں میں زنگے ہو رہے ہیں، جوتے چل رہے ہیں، گتھم گتھی ہو رہی ہے، ایک دوسرے

کو معمولی معمولی باتوں پر مسجدوں سے نکالنے پر اصرار کر رہا ہے، بسا اوقات بے غیرت مسلمانوں کو اپنے دینی مسائل

کے جھگڑوں میں، انگریزی حکام کے سامنے فیصلہ طلب کرنے کے لئے حاضر ہونا پڑا دین اسلامی کے اختلافی

مسائل کے استعمال کی یہ ایک بدترین شکل تھی جو دین کے متعلق اسی قسم کے نازک حساسات والوں کے غلط

طریقہ عمل کی ہر اذیت تھی۔

اسلام کی روح اور دین کے مغز سے بے گانہ ہو کر صرف اسی پر درہے تھے کہ گواہت آمین کہنا بھی حدیثوں سے ثابت ہے لیکن زیادہ قوی حدیثوں سے ان کا دعویٰ تھا کہ زور سے آمین کی آواز گمانہ سے نکالنا ہی بہتر ہے، یا بجائے نواف یا زینامت کے نماز میں سینے پر ہاتھ باندھنا حیا کرتے تھے کہ زیادہ اچھا ہے، رکوع میں جلتے ہوئے یا اس سے اٹھتے ہوئے کوئی... دونوں باتوں کو نہ اٹھائے تو وہ بھی کہتے تھے کہ اس کی نافرمانی تمام اٹھانا باتوں کا کہتے تھے کہ زیادہ ثواب کا کام ہے، یہ سب کچھ ماننے کے باوجود ان ہی چند مسئلوں میں جو غلط غلطی ہوئے، ہنگامے چلتے گئے، جگ ہنسائیاں ہوئیں وہ بڑی دردناک داستان ہے۔ فقہی اختلافات کے غلط استعمال کی یہ بڑی ہولناک تاریخی مثال ہے۔

اور گواہ یہ جوش و خروش رفتہ رفتہ ٹھنڈا پڑتا چلا جا رہا ہے، لیکن دین کے صحیح احساس کا نتیجہ شاید ہم اس کو بھی قرار نہیں دے سکتے، وہ تو جو کچھ ہو رہا تھا دینی احساس کی شدت کا نتیجہ تھا، اور اب جو کچھ دیکھا جا رہا ہے، دینی احساس سے بے گانگی کی یہ پیداوار ہے، جیسے جیسے مغربی تمدن کا اثر جاگزیں ہوتا جا رہا ہے دین کے فروعی مسائل تو خیر دور کی چیزیں ہیں، خود اصل دین سے ہی لوگ بے تعلق ہوتے چلے جا رہے ہیں خدا ہی جانتا ہے کہ اس کا آخری انجام کیا ہوگا۔ زوالِ حکومت کی چوٹ سے کچھ چونک پیدا بھی ہوئی تو اس چونک اور تنبیہ کا رخ، اختلافی مسائل کی طرف بھر گیا، اور سرے سے رخ کچھ بڑا بھی ہے تو خطرہ پیدا ہو گیا ہے کہ اصل دین ہی کا قصہ (العیاذ باللہ) ختم نہ ہو جائے۔

بہر حال کہنا یہ چاہتا تھا کہ بجائے خود اندرونی اختلافات کے ان قصوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے، البتہ کبھی سبک دماغوں کے اس طبقہ نے ان کو بھیانک اور حد سے زیادہ خوفناک بنا دیا۔ جیسا کہ پچھلے دنوں ہندوستان کے مسلمانوں میں زوالِ حکومت سے پیدا ہونے والی بے چینیوں کے سلسلے میں دیکھا گیا تھا، لوگ حیران تھے کہ اچانک یہ ہوا کیا۔ جو حاکم تھے وہ حکومت بن گئے، جن کا سب کچھ تھا ان کا کچھ باقی نہ رہا، پھر کچھ تو مذہب کے ان ہی فروعی مسائل کے سلجھانے میں مشغول ہوئے شاید ان کا احساس تھا کہ ان مسائل سے غفلت کی سزا مسلمانوں کو فتنہ کی طرف سے دی گئی ہے لیکن سلجھانے کی ہر کوشش مسائل کو ابھارتی ہی چلی گئی بعضوں نے قصہ کے ساتھ حدیثوں کے قصہ کو بھی اسی لئے ختم کر دینے کا تہیہ کیا اور دعوت دیے گئے کہ

مقابلہ الہی کے آزاد کی کوئی شکل اس کے سوا نہیں ہے، کہ سب کچھ جمہورِ کرشمہ کی کتاب پر مسلمانوں کو جمع کر دیا جائے مگر عمل کا جب وقت آیا تو جو ہونا چاہئے تھا وہی ہوا یعنی اللہ کی کتاب کے ساتھ اپنے اور بھی جمع کرنے والے مسلمانوں کو جمع کرنے لگے، قرآن کے ساتھ ہندوؤں کی قرار دیا گیا کہ قرآن سمجھانے والوں کے دماغوں اور بھجوں پر بھی ایمان لایا جائے اسی سلسلہ میں بعض نے تو قرآن کے ساتھ ساتھ خود اپنے اور ہونے والی وحیوں پر بھی ایمان لانے کی دعوت حکومت سے مہروم ہونے والے مسلمانوں کو دینے لگے، کھوئی ہوئی حکومت کے ملنے کی واحد شکل یہی قرار دی گئی کہ محمد رسول اللہ کی وحی کے ساتھ جدید زحی کی روشنی حاصل کی جائے گویا محمدی رسالت ناکافی ٹھہرائی گئی یہی خفقانی دورہ تھا، جو مختلف شکلوں میں دلوں اور دماغوں پر پڑتا رہا، اور یہ سب جو کچھ بھی ہوا، ان ہی لوگوں کے ہاتھوں ہوا، جو عام مسلمانوں کے مقابلہ میں اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کسی اختصامی رشتہ کے مدعی بن بیٹھے تھے۔ دین کی جاگیر داری اور مذہب کی ٹھیکہ داری کا دھوکہ کسی نہ کسی وجہ سے ان کو لگ گیا تھا۔ اسی کے ساتھ تاریخ ہی کی شہادت یہ بھی ہے کہ تصدّد و ارادۃ و فردی اختلافات کے ان قصوں کو چھڑ کر کبھی کبھی نادانانہ غریب مسلمانوں کے اندر اپنا الوسیدھا کرنے کی نگوہیدہ کوششیں بھی کی گئیں، بات تنگدینی، تل بڑھا کر مسہ بنا دیا گیا جو کچھ نہ تھا، قرار دیا گیا کہ وہی سب کچھ ہے۔

یوں ائمہ اجتہاد کے ماننے والوں کو ٹکڑیوں میں بانٹ کر اپنی شکم پروری کا سامان بھی ماننا چاہئے کہ بعض سیاہ سینہ افراد نے کیا۔ یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ افراتفری کی جو شکلیں مسلمانوں کے اندر زوالِ حکومت کے بعد پیدا ہوئیں۔ ان میں بھی فکلی کارہ بارہ والوں کا ہاتھ تھا یا نہیں، بلکہ عرض کر چکا ہوں میرا خیال یہی ہے کہ زیادہ تر یہ نفسیاتی روگ کی پیداوار ہے، جس کا بدستمتی سے اس زمانہ میں دین ہی سے تعلق قائم ہو گیا تھا۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ اس جھیلے میں شکلی عیارانِ شاطر بھی شریک ہو گئے ہوں۔

بہر حال ہندوستان میں دینی جھگڑوں کے یہ تماشے جو دیکھے گئے، دین کے صحیح احساس پر اس کی بنیاد یقیناً قائم نہ تھی۔ اب خواہ تہ میں ان کے وہی نفسیاتی مرض ہو، یا شکلی تقاضے پوشیدہ ہوں۔ تاہم یہ بھی قطعاً بہتان اور فتر ہے کہ بانٹنے والوں نے مسلمانوں کو کلیتہً فقط اپنے پیٹ میں کچھڑانے کے لئے بانٹا تھا بلکہ کہہ سکتا ہوں کہ اکثریت اس جرم سے اپنا حسن ظن تو یہی ہے کہ عموماً بری اور پاک تھی،

لیکن پیٹ کے لئے ناواقف مسلمانوں کو کبھی بائنا نہیں کیا ہے۔ یہ بھی کلیتہً درست نہیں ہے۔ چونکہ صدی بھری کے ایک بڑے فہیم و زکی، عالم بیدار مغز سیاح علامہ مقدسی ہیں، انھوں نے سیاحت کے بعد سفر کی یادداشتوں کو ایک کتاب کی شکل میں مرتب بھی کر دیا تھا۔ کتاب یورپ میں طبع ہو کر شائع بھی ہو چکی ہے، اس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے، کہ سارے اسلامی ممالک جن میں مقدسی گھومتے ہیں، وہاں کے مسلمانوں کے دینی رجحانات کا یہی تذکرہ کرتے چلے گئے ہیں۔

خراسان میں جب پہنچے تو لکھا ہے کہ

”حنفی مسلمانوں کو دیکھا کہ ان کو لوگ یہاں مسکیرے نام سے موسوم کرتے ہیں اور شافعیوں نے اپنے آپ کو صدیقیہ کے نام سے مشہور کیا ہے“

آگے ان ہی کا بیان ہے کہ

بینہما حصبیاحت یھراق فیہما الذمماء (حنفیوں اور شافعیوں میں) لاگ ڈانٹ کے تعلقات
ویدخل بینہما السلطان صلاۃ میں بسا اوقات اسی سلسلہ میں خوں ریزیاں بھی ہوتی

ہیں، حکومت کو دخل اندازی کی ضرورت ہوتی ہے

خراسان کے شہر سرخس میں پہنچے تو پایا کہ حنفیوں کو یہاں ”دسیہ“ کہتے ہیں۔ اور شافعیہ اپنے آپ کو اہلیہ کہتے ہیں۔ آئے دن ان میں مذہبی جھگڑے ہوتے رہتے ہیں۔ ہر رات میں بھی یہی تاشہ اٹھوں نے دیکھا۔ حد یہ ہے کہ مکہ معظمہ میں بھی مقدسی نے لکھا ہے کہ میں نے دیکھا کہ

”وہاں کے خزانہ (قصابوں) اور ضیاطین (دردز یوں) میں خوب جھگڑے ہوتے ہیں۔ قصابوں کی پارٹی شیعہ بن کر لڑتی تھی اور دردزی شیعہ بن کر ان پر چڑھائی کرتے تھے۔“

عرب ہی کے مقام یمامہ میں پہنچے، تو لکھا ہے کہ

”وہاں دیکھا کہ قصابوں کی ٹولی الگ تھی، اور بدوؤں سے ان کی لاگ ڈانٹ چلی جاتی ہے (دینی جھگڑے

بڑھنے ہوئے اس نسبت کو) پہنچ چکے ہیں کہ جان بدلتک کان لوگوں نے بٹوارہ کر لیا ہے، جب کوئی

مسافر باہر سے ان کے پاس آتا ہے تو کہتے ہیں ان دونوں فرقوں میں سے جس کے پاس تمہارا جی چاہے

کھڑے ہو، ورنہ پھر یہاں سے نکل جاؤ۔“ ص ۳۱

بصرہ میں بھی بیان کیا ہے کہ

”شہریوں کو بھی ان ہی مذہبی قصوں کے سلسلے میں لوگوں نے بانٹ رکھا ہے، آپس میں لڑتے رہتے ہیں

اور اطراف نواح کے مصیبتوں، دیہاتوں سے بھی لوگ ہر ایک کی مدد کے لئے آتے ہیں۔“

کتاب تو اس وقت میرے پاس نہیں ہے، لیکن یاد آتا ہے کہ معجم البلدان میں ”رے“ جس کے کھنڈروں

کے پاس آج کل طہران کا شہر آباد ہو گیا ہے۔ اسی ”رے“ کے ذیل میں لکھا ہے کہ

”محققوں اور شافعیوں کو اس شہر میں لڑایا گیا۔ اور اتنا لڑایا گیا کہ برابر دیہاتوں اور قصبوں سے اپنی اپنی پارٹی

کی حمایت کے لئے جڑے آتے رہتے تھے۔ انہی خورزیاں ہوتیں کہ بالآخر ”رے“ کا اکثر حصہ ویران و برباد ہو کر

رہ گیا۔“

لیکن ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے فردعی اختلافات سے ناجائز اور قطعاً ناجائز نفع اٹھانے کی یہ ناپاک کوششیں

نہیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں قصابوں، درزیوں، بدوؤں یا اسی قسم کے بے چارے عامیوں، نادانوں کو بے وقوف

مناکر کام نکالنے والے اس زمانے میں بھی کام نکالتے تھے اور آج بھی اس راہ میں کامیابی کے لئے عوام کے ان

ہی طبقات کو تاکا جاتا ہے ورنہ جہاں کے مسلمان پڑھے لکھے صاحبِ فہم و بصیرت تھے ان ہی مورخین کے

بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ حریفوں کی وہاں نہیں چلتی تھی۔ خود مقدسی نے اس کی مثالیں بکثرت پیش کی ہیں۔

قیروان جو کسی زمانہ میں افریقہ کا سب سے بڑا مرکز شہر لاکھوں لاکھ کی آبادی والا تھا۔ مقدسی نے وہاں کے

حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

”اس شہر میں حنفی بھی ہیں، اور مالکی بھی جن میں کسی قسم کی کوئی کشمکش اور جھگڑے نہیں سب ایک دوسرے

کے ساتھ محبت و الفت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔“ ص ۳۲

جس سے معلوم ہوا کہ ”مذہبی اختلافات“ میں بجائے خود فتنہ و فساد شقاق و عداوت کے جراثیم پوشیدہ نہیں

ہیں، بلکہ بھرنے والوں کا جب جی چاہتا ہے، یا ضرورت محسوس ہوتی ہے تو ان میں بھی باہر سے زہر بھر دیتے ہیں

اسی جہاں گرد، جہاں میں سیاح نے ایک موقع پر بڑی دل چسپی و تجربہ کی عبرت آموز خبر دی ہے، بلخ کے متعلق

یہ لکھ کر کہ

”اس شہر کو مذہبی جھگڑوں سے دیکھا کہ پاک ہے۔“

آگے وہی اطلاع دیتے ہیں کہ

وسيلة عصبیات غیر المذہب
ولذا لا فی جمیع البلدات
عصبیات ۳۳

لیکن بجائے مذہب کے، وہاں غیر مذہبی تعصبات کا
زور ہے اور اسی طرح تمام شہروں میں کسی نہ کسی قسم
کا تعصب پایا ہی جاتا ہے۔

یہ بڑے پتے کی بات ہے، اور یہی واقعہ ہے، عرض کر چکا ہوں کہ بنی نوع انسانی کے افراد میں وحدت کے
ساتھ کثرت اور اختلافات کے پہلوؤں کا پایا جانا، ایک ناگزیر قدرتی واقعہ ہے۔ لیکن اختلاف کے ان پہلوؤں
کے استعمال میں آپ کو اختیار ہے، چاہے فتنہ و فساد کے بھڑکانے میں ان کو استعمال کیجئے، چاہے گلہائے رنگ
رنگ کو زمینیت چمن قرار دے کر ان سے منافع حاصل کیجئے۔

سادہ دلوں کا ایک گروہ باور کئے ہوئے ہے کہ سارے جھگڑے مذہبی اختلافات ہی سے پیدا ہوتے ہیں
جن کے ختم کرنے کی دو ہی صورتیں ہیں یعنی یا تو دنیا کو مذہب اور دین کے عنصر سے کلیتہً خالی کر دیا جائے اور
یہ ممکن نہ ہو سکے، تو دنیا کو حنت بنانے کی ایک شکل احمقوں نے یہ تجویز کی ہے کہ زمین کے ہر حصہ کو کسی خاص
دینی فرقہ کا وطن بنا دیا جائے۔ جب یہ ہو جائے گا تو شاید خود بھی یہی باور کئے ہوئے ہیں اور دوسروں کو بھی باور
کراتے پھرتے ہیں کہ آئے دن کے جھگڑوں، رگڑوں سے ہمیشہ کے لئے فرصت ہو جائے گی۔

”احمقوں کی جنت“ صحیح معنوں میں اگر مانجھ لیا کی کوئی شکل ہو سکتی ہے تو شاید یہی تجویز ہو سکتی ہے آپ
دیکھ چکے کہ ایک ہی مذہب کے ماننے والوں کو بھی جب آسانی مختلف ٹولہوں میں بانٹ دیا جاسکتا ہے،
اور ایک فرقہ کو بے کر دوسرے فرقہ کے سروں پر ٹپکنے والے بہ سہولت تمام ٹپک سکتے ہیں۔ تو آخر ”ایک
مذہب“ کی صحیح تعریف کیا کی جاتی ہے، جب حنفیوں کو شافعیوں سے لڑایا جاسکتا ہے ایک کا خون دوسرے
کے ہاتھوں بہانے میں الہی کامیابی حاصل کرنے والے کامیابی حاصل کر چکے ہیں تو آخر ”دینی وحدت“ کا ایسا قلاب
کون بنا سکتا ہے جس میں قطعاً کسی اختلاف کی سرے سے گنجائش باقی نہ رہے،

پھر جو مذہب کو ختم کر کے انسانوں کے باہمی اختلافات کے قصوں کو ختم کرنا چاہتے ہیں، مقدسی نے تو کئی سو سال پہلے دیکھا تھا کہ ”جہاں مذہبی تعصبات نہ تھے، وہاں غیر مذہبی عصیانوں کی بنیاد پر لوگ آپس میں لڑتے ہوئے تھے“ لیکن ہم تو اپنی آنکھوں سے آج دیکھ رہے ہیں۔ ہماری مدی ہی اسی تماشے میں گزر رہی ہے، کہ ایک ہی دین، ایک بنی، ایک کتاب، کے ماننے والے بلکہ ایک ہی رنگ و فخر یا ایک ہی نسل والے ٹھہر ٹھہر کر ایک دوسرے پر چرند و درخت ہیں، لاکھوں ہی نہیں بلکہ کروڑوں کی تعداد میں مقتولوں کی قبرستیں مسلسل بنتی چلی جا رہی ہیں، تقسیم کے نئے معمولی معمولی حیلہ تراش لیا جاتا ہے، آخر جب کالے رنگ کے چہرے والوں کو اہلی کھان والوں سے رنگ کے اختلافی پہلو کو اعباء کرکڑا دیا جاسکتا ہے تو کسی زمانہ میں پوست قد والوں کی ایک سوٹ بنا کر درازہ والوں سے یا چھوٹے کان والوں کو بڑے کان والوں سے بھڑا دینے کو آپ عظیم بات کیوں سمجھتے ہیں نہ مین کے فرضی و دہمی خُذ کو وطن کا نام دے کر جب عوام کو کھڑا یا جا رہے تو اس قسم کو گھروں اور بلنگوں تک کیوں نہیں بڑھایا جاسکتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ یوں مذہب اور دین سے کسی کا دل بے زار نہ رہتا۔ دوسری چیز ہے، لیکن لڑائی جھگڑوں کا الزام مذہب کے سر منڈ ہوتا کہ ساتھ ساتھ بڑے بڑے مذہب سے پیدا ہونے میں اور مذہبی الزام کو ننگا کر دینے سے مذہب ہی کے ختم کر دینے کا دوسرا سہارا جن دونوں میں پیدا ہو رہا ہے۔ ان کو بھی بے بنی کے ذرا واقعات پر نظر رکھتے ہوئے رائے قائم کرنی چاہیے،

دوسروں سے تو کچھ کہنے کا بھی حق نہیں لیکن مسلمانوں سے کہہ سکتے ہیں کہ کم از کم ان کے مذہب سے تو مذہبی اختلافات کی نوہ خوانیاں قلنا جلی نہیں معلوم ہوتی۔

مقدسی نے اپنی اسی کتاب میں مذہبی اختلافات کے قصوں کا تذکرہ کرتے ہوئے اگوند کے ایک پرانے بزرگ عمرو بن قرقا کا ایک بڑا پر مغز بیان درج کیا ہے۔ خدا سے جس کا یہ ہے کہ ایک شخص عمر بن قرقہ کے پاس حاضر ہو کر کہنے لگا کہ جناب والا میرا مطلب مال ہے، اب تک مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں شریک ہو کر الگ ہوتا رہا ہوں ہر فرقہ اپنی انید میں قرآن ہی سنا ہے میں تو ان مذہبی جھگڑوں سے تنگ آ گیا ہوں۔ بتائیے کہ آخر میں کون کیا؟

عمر بن قرقہ نے کہا کہ اے شخص سن! تو نے مسلمانوں کے مذہبی اختلافات کا ذکر کیا میں پوچھتا ہوں تو جواب دیتا جا۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے پیچھے رسول ہیں اور جو کچھ اللہ کے پاس سے لائے سب سچ ہے کیا مسلمانوں کا اس میں اختلاف ہے؟ جواب دیا گیا نہیں۔

قرآن عہد کی کتاب ہے کیا مسلمانوں کا اس میں اختلاف ہے؟ نہیں۔ پانچ وقتوں کی نمازیں فرض ہیں کیا مسلمانوں کا اس میں اختلاف ہے؟ نہیں۔ کعبہ مسلمانوں کا قبلہ ہے کیا اس میں اختلاف ہے؟ نہیں کیا رمضان کے چوبیسے میں روزے فرض ہیں اس میں اختلاف ہے؟ نہیں

بیت اللہ کا حج مسلمانوں پر فرض ہے کیا اس میں اختلاف ہے؟ نہیں

زکوٰۃ فرض ہے اس میں اختلاف ہے؟ نہیں

جنابت (ناپاکی) سے پاک ہونے کے لئے غسل کرنا فرض ہے کیا اس میں اختلاف ہے؟ نہیں
الغرض ان تین تہ مسائل بوں ہی سوال کرتے جاتے تھے اور جواب میں پوچھنے والا بے چارہ نہیں نہیں کہتا تھا
تب عمرو بن تروہ نے کہا کہ

”وہ بھڑا بھڑائی مسلمانوں کا جز مسائل پر اتفاق ہے، مکمل بات یہی ان ہی کو کہتے ہیں ان کو پکڑ لو اور اختلافی مسائل میں زیادہ غور و خوض کی ضرورت نہیں، ان کی نوعیت متشابہات کی ہے۔“
اور آخر میں وصیت کی۔

”اہل کتاب کے بعد میں مسلمانوں کے سپرد کیا گیا، ہمارے پہلوں نے، یعنی صحابہ نے دین کو جس شکل میں مانا اور پڑھا اس ان ہی کا طریق کار اور ان ہی کا شیوہ اختیار کر کے مطمئن ہو جانا چاہئے۔“
المقدسی نے ابن تیرہ کے اس بیان کو نقل کر کے ایک قاضی صاحب کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ جن جن لوگوں سے میں اب تک ملا ہوں۔ ان میں سب سے زیادہ اثر پذیر ان ہی سے ہوا،
ان کی مجلس میں فرہی اور فقہی اختلافات کا ذکر چھڑاؤ میں نے دیکھا کہ قبلہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہی فرما رہے ہیں:-

من صلیٰ ہذہ القبلة فہم اخواننا
المسلمون من احسن التقاسیم
اس قبلہ کی طرف رخ کر کے جو نماز پڑھتے ہیں وہ ہمارے
مسلمان بھائی ہیں۔

آخر میں ”المقدس“ نے اپنے ان احساسات کو درج کر کے ان اختلافات کی بحث ختم کر دی ہے،

هذا التعصب الذي ترى امنا
نورۃ الجہال والمتسرفون من القضا
وغيرهم واما الامة فغلی ما ذكرت
نقصات اور تنگ نظریاں جنہیں ہم دیکھتے ہو، اور
یہ شورش جالوں کی پھیلانی ہوئی ہے اور قصہ کہانیاں
سنانے والے واعظوں کی حدود سے متجاوزہ بیانات

کے نتائج ہیں لیکن عام اسلامی امت کو ان قصوں سے

کوئی تعلق نہیں۔

فقیر بھی یہی عرض کرتا چلا آ رہا ہے، اسی پر اپنے اس مقالہ کو ختم کرتا ہوں۔ واللہ ولی الابرار والتوفیق علی

اللہ قصد السبیل ومنہاجاثر ولو شاء لهداکم اجمعین۔

غلامان اسلام

انٹی کے قریب ان صحابہ تابعین، تبع تابعین، فقہاء اور محدثین اور ارباب کشف و کرامات، اور
اصحاب علم و ادب کے سوانح حیات اور کمالات و فضائل بڑی تحقیق کاوش سے جمع کئے گئے ہیں جنہوں
نے غلام یا آزاد کردہ غلام ہونے کے باوجود ملت کی عظیم الشان خدمتیں انجام دیں جنہیں اسلامی
سوسائٹی کے ہر دور میں عظمت و اقتدار کا فلک الافلاک سمجھا گیا اور جن کے علمی مذہبی تاریخی اور سماجی
کارنامے اس قدر شاندار اور اس قدر روشن ہیں کہ ان کی غلامی پر آزادی کو رشک کرنے کا حق ہے اور
بجا ہے، یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ ایسی محققانہ، دلچسپ اور معلومات سے بھرپور کتاب اس موضوع
پر اب تک کسی زبان میں شائع نہیں ہوئی اس کے مطالعہ سے غلامان اسلام کے حیرت انگیز اور شاندار کارناموں
کا نقشہ آنکھوں میں سما جاتا ہے۔ دوسرا ایڈیشن صفحات ۴۸۰ بڑی قطع قیمت پانچ روپے آٹھ آنے مجلد ہے،

مکتبہ برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی

رحمتِ عالمِ مصلح کا پیش کردہ نظامِ حیات

۲

(مولانا محمد طفیل الدین صاحب استاذ دارالعلوم مبینہ سائتہ)

آج دنیا ایک ایسے نظامِ حیات کے لئے سرگرداں ہے، جو اسے تمام شعبہ جاتِ زندگی میں طمانیت کی دولت وافر عطا کر دے، اور جس نظامِ اجتماع و تمدن میں عدل و مساوات کی حکمرانی ہو، جہاں افراط و تفریط کو چھوڑ کر اعتدال و توازن قائم ہو۔ انسانیت کا احترام و اکرام ہو، و صہرم اور مذہب کے نام پر فتنہ و فساد کی گرم بازاری نہ ہو، نظامِ معیشت میں سہواری ہو اور طبقاتِ انسانی میں کوئی طبقہ افلاس کے قدموں میں کھلتا ہو نظر نہ آئے، معاشرتی زندگی پاکیزہ اور بدکرداریوں سے پاک ہو، اور تمام انسانوں کی غفّت و عصمت کا مکمل تحفظ ہو۔

بلاشبہ دنیا میں اس وقت تک ہزاروں مصلح اور پیغمبر تشریف لائے، اس میں بڑے بڑے انقلابی اور راہ نماؤں نے جنم لیا، اور انسانیت کی فلاح و نجات کے نام پر اصلاح کی سعی کی مگر اس عظیم الشان جہت میں جو ہمہ گیر نظامِ حیات رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیا وہ اور کہیں نظر نہیں آتا، ہم آپ کے سامنے آنحضرتؐ کی زندگی اور آپ کے پیغام کا خلاصہ سرسری طور پر پیش کرتے ہیں۔

چالیس سال پہلے | محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چالیس سال کی عمر اپنے آبائی ماحول میں گزاری، آپ عرصہ میں آپ نے تجارت کی، ازدواجی زندگی گزاری، بڑوں اور چھوٹوں میں رہے اور عرب اور شہر مکہ کی ہی تہذیب و تمدن میں پرورش پا کر جوان ہوئے، مگر سوال یہ ہے کہ ان کی اس چالیس سالہ زندگی پر کسی کو کوئی جائز اعتراض ہوا؟ کسی نے آپ کے اعمال و اخلاق کا کوئی گلا اور شکوہ کیا؟ آپ کے رہن سہن اور انہوں کے ساتھ احترام و اکرام اور محبت و شفقت پر کسی نے کوئی حرفِ گبری کی؟ انسانی لغزشوں اور کذب و افترا کی کسی نے ایک مثال پیش کی؟ ظلم و ستم اور جور و تعدی پر کسی کو نالاں پایا؟ مختصر یہ ہے کہ

آپ کی زندگی کے کسی شعبہ پر کسی ایک متنفس کو بھی ریشہ طیکہ وہ قابلِ اعتماد اور منصف ہوا شکوہ سنج نہیں پائیں گے، بلکہ اس کے برعکس نظر آئے گا۔ تو یہ کہ پورے مکدوالوں کی زبان پر رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے امین اور صادق کے پاکیزہ لفظ کے علاوہ دوسرا کوئی لفظ نہیں ہے۔

زندگی کے تیس سال | اب پالیس سال بعد | اس ہمہ اعتماد و اعزاز جب توحید کا لفظ زبانِ وحی ترجمان پر آتا ہے مکہ اور مدینہ میں | تو مکدوالوں میں ایک عجیب شورش پیدا ہو جاتی ہے، اور مکہ کی تیرہ سال کی زندگی کا نقشہ یہ ہوتا ہے کہ اپنے غیر ہو گئے، مجلسِ حسابِ بزمِ اعدا میں تبدیل ہو گئی، چچا پیچھے پڑ گئے، اہل خاندان نے حمایت سے انکار کر دیا، سردارانِ قریش نے دباؤ ڈالنے کی سعی کی، قوم تدمر اجماعی اور درشت خوئی سے پیش آئی، قریش نے سخت و سست کہا، قتلِ نبی کی پے در پے جدوجہد کی گئی، صحابہ کرام پر مشن ستم جاری رہی، مسلمان خواتین کو زخم لگایا گیا، صاحبزادی کو ہجرت حبشہ پر مجبور ہونا پڑا، منافقوں نے مذاق اڑایا، شائے مبارک پر غلاطت ڈالی گئی، گردنِ مبارک میں پھندا ڈالا گیا، محمد کی جگہ مذمم سے خطاب کیا گیا، شبِ ابی طالب میں قید کر کے رُکبِ موالات کیا گیا، جسمِ اطہر لہو لہاں کیا گیا۔ معراج کی تکذیب کی گئی، فریٹینے کی کوشش کی گئی، یہود و مطالبات کئے گئے، اور بالآخر ہجرت پر مجبور کیا گیا، ہجرت کر کے نکلے تو قاتل کیا گیا، گرفتاری پر انعام و اکرام کا اعلان کیا گیا اور کاشائے نبوی پر پہرہ لگایا گیا، جو چند گئے چنے مسلمان ہوتے تھے سب نے وطنِ عزیز کو سلامِ رخصت کیا اور مدینہ منورہ جا پہنچے،

مدینہ منورہ پہنچے تو تعمیری کام کی طرف توجہ دی مگر مدینہ کی دس سال کی زندگی میں آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی، کہ یہود و منافقین اور کفار مکہ سے چھوٹی بڑی ۷۷ لڑائیاں لڑنی پڑیں، عزیز چچا اور رفیقہ حیات کی موت کا غم مکہ میں اٹھا چکے تھے، یہاں بھی کتنے عزیزوں کی موت کا صدمہ برداشت کرنا پڑا، پھر صحابہ کرام کی اچا شہادت کا سنج و اہم، حضرت حمزہؓ کی شہادت کا صدمہ عظیم اور ان کی ناش کے ساتھ وحشیانہ سلوک کا درد اور دوسری اذیتیں علاوہ ہیں۔

تعلیماتِ نبوی | ۲۳ سال کی مختصر مدت اور مصائب اور دوسری مصروفیتوں کا یہ هجوم مگر بتانا یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے با اس ہمہ افکار و مصائب دنیا کو کیا تعلیمات دیں، ان کی کیسی اصلاح

کی، ان کے انتشار و تشتت کو کیوں کر دور کیا، سالہا سال کی جنگ کو صلح اور آشتی سے کیسے بدلا، اور کبھی ہوئی انسانیت کو باہم رنجت تک کس طرح پہنچایا،

انسانیت کا مقام انسانیت دم توڑ چکی تھی اور آدمیت زسوا ہو رہی تھی، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم پہلے شخص تھے جنہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے بعد انسانوں کو ہدایت کی مشعل دکھائی اور بتایا کہ ساری کائنات انسان کے لئے پیدا کی گئی ہے، زمین و آسمان، چاند و سورج سب انسان کے اطاعت گزار ہیں دنیا کی تمام چھوٹی بڑی چیزیں انسان کے فائدہ کے لئے ہیں، انسانیت کا مقام سب سے بلند اور عظیم ہے، آپ نے اعلان کیا۔

سَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ
وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومَ مُسَخَّرَاتٍ بِأَمْرِ إِيَّائِي
ذَٰلِكَ لَا يَبْتَغِي قَوْمٌ يَغْفُلُونَ عَنْهُ
اور تمہارے کام میں اس نے رات، دن، سورج اور چاند
کو لگا دیا ہے اور ستارے اس کے حکم سے کام میں لگے ہیں
اس میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو سمجھ رکھتے ہیں
انسانوں کو تو ہم پرستی سے نکالا، اور بتایا کہ انسان اپنی خلقت میں سب سے اشرف ہے اور بصورتی
اور وضع قطع میں دنیا کی کوئی چیز انسان کے مد مقابل نہیں ہے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب
کی طرف سے اعلان فرمایا۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ (والنہین)
مركزیت اجتماعیت انسان میں خود اعتمادی پیدا کی اور بتایا کہ تم سے اوپر کوئی ہے تو وہ صرف خدا کی ذات ہے
اور تم اسی کی پرستش کے لئے پیدا کئے گئے ہو، وحی محمدی نے اعلان کیا۔
وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِي
اور میں نے آدمی اور جن جو پیدا کیا سو اپنی بندگی کے
لئے پیدا کیا۔

اور پھر انسان کا مرکزی نقطہ اسی ایک ذات کو قرار دیا، جس نے کائنات کو وجود بخشا اور اسی مرکز پر لا کر سب میں یکانیت اور اتحاد پیدا کیا، انتشار و تشتت کو دور کیا، اور سب کے لئے اللہ اللہ اللہ، محمد رسول اللہ کی تصدیق و اقرار کو بنیاد قرار دیا جس میں کسی کو شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَقَالُوا زِلًا كَلِمَةً سَوَاءً
بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا لَا تَعْبُدُوا اللَّهَ وَلَا
تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا
بَعْضًا أَسْرَافًا قَدْ دُرِيتُ اللَّهُ (ال عمران - ۷۰) کوئی کسی کو ہم میں سب بنائے۔

کلمہ توحید میں ”محمد رسول اللہ“ کا کلمہ شریک نہ لایا گیا، مگر اس کے بعد جو اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں اپنی
بے کسی کا بیسیوں جگہ اعلان کیا اور اپنی عبدیت کو کبھی بھی الوہیت کے درجہ میں لانے کی سعی نہیں فرمائی
بلکہ بے شمار موقعوں پر تاکید فرمائی کہ میں اس کا محض ایک بندہ اور رسول ہوں، اس سے زیادہ میری کوئی
حیثیت نہیں۔

قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ أَنَّمَا
إِلَهُكُمْ اللَّهُ وَاحِدٌ (کہتے)

تو کہ میں ہی تم جیسا ایک آدمی ہوں، یہی طرفہ دکھائی ہے
کہ ہمارا معبود ایک معبود ہے۔

یہ بھی پسند نہیں فرمایا کہ کوئی آپ کی تعظیم کے لئے کھڑا ہو، کسی نے غیبِ دال بتایا تو اسے روک دیا،
کہ اس طرح دست کہو، یہ کوئی معنی بات نہیں ہے کہ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی زندگی گذاری پھر
اٹھائے، خندق کھودی، لکڑی توڑی، رات رات بھر اللہ تعالیٰ کی عبادت کی، دوسروں سے زیادہ اللہ
تعالیٰ سے خود ڈرتے رہے، الوہیت کا مستند جب اجاگر ہو گیا تو نظامِ اجتماع کی بنیاد ڈالی اور اپنے ہر
عمل سے توحید کا مظاہرہ کیا۔

نظامِ اجتماع | دن رات میں پانچ وقت کی نماز فرض ہوئی، اور ہر بالغ مرد و عورت پر یہ فرض ضروری قرار
دیا گیا، نماز کے اوقات متین کئے اور سب کے لئے ایک ہی وقت مقرر کیا، فرض نماز کی ادائیگی کے لئے
مسجد کے نام سے ایک خاص گھر بنوایا گیا، پھر جماعت کی نماز جس کو عذر شرعی نہ ہو اس پر ضروری قرار دی
اسی کے ساتھ اس میں ایک شخص کو امام اور بقیہ کو مقتدی قرار دیا، اور اس طرح یہ نماز روزانہ اجتماعی
زندگی کے لئے راہِ عمل قرار پائی، اس میں اخوت و مساوات کی پوری پوری رعایت ملحوظ رکھی گئی، ہر روز
ہر محلہ اور گاؤں کی مسجد میں یا اجتماع ہوتا ہے، ہفتہ میں تمام محلوں کو ایک جامع مسجد میں جمع کر دیا، سال میں

شہر اور دیہات کو عید گاہ میں لاکڑ کٹھا کر دیا اور سال کے اخیر مہینے میں مسجد حرام کے ذریعہ سارے مسلمانوں کو یکجا کر دیا گیا، ان اجتماعوں میں سے کسی میں بھی امیر و غریب، شاہ و گدا، اور شریف و وضع کا امتیاز باقی نہیں رکھا گیا، بلکہ سب کو ایک صف میں، ایک گھر کے اندر، ایک امام کے پیچھے جمع کر دیا گیا، یہ عملی عبادت آج بھی کسی نہ کسی درجہ میں قائم ہے اس لئے فرید تو فیح اور دہلی کی ضرورت نہیں ہے،

و بناوی زندگی میں ایک امیر کی اندر سے ضرورتی تعمیراتی گئی، خلیفۃ المسلمین امام منتخب ہوا، اس کی طاقت

اگر اکثریت نے اسے منتخب کر لیا ہے ضروری ہے، اس سے اختلاف جرم اور نصیبت ہے، خلیفہ خود بھی

احکم الحاکمین کے حکم کا تابع ہوگا، اسے کسی الٰہی قانون میں دم مارنے کی گنجائش نہیں، نماز کے متعلق رب العزت کا ارشاد ہے۔

وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ (بقرہ)

اور نماز پڑھنے والوں کے ساتھ نماز پڑھو

مسجد میں ادا کرنے کے متعلق ارشاد اور باقی ہے

وَأَقِمُّوا صُلُوحَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ
وَأَذِّنُوا صُلُوحَ اللَّهِ لِلدِّينِ (اعراف ۱۵)

تم سب اپنا چہرہ ہر مسجد کے پاس سیدھا کرو اور اس کو
خاص اس کی طرف توجہ دے اور ہر جگہ پکارو۔

جامع مسجد کے انتظام اور ہفتہ و تراجم کے باب میں قرآن نے پکارا

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا دُعِيَ إِلَى صَلَاةٍ
مِّنْ يَوْمٍ تَجْمَعُونَ فَاسْعَوْا إِلَى ذِكْرِ اللَّهِ
وَذَسِّرُوا لِنَفْسِكُمْ (تہٰ ۵۸)

اے ایمان والو! نماز جمعہ کی جب اذان پکاری جائے تو
اللہ تعالیٰ کے ذکر کی طرف دوڑ پڑو اور سچا پہنچو دو

سالانہ اجتماع کے لئے ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَأَذِّنْ فِي النَّامِزِ بِالْحُجَّةِ يَأْذُنُكَ جَلَالٍ
وَعِزِّي أُوْحِي خُصَامُهَا بِأَيْدِيكَ مَبْنُوتٌ كَلِّمْ نَجْمًا
عَلِيمِي (حج ۳۴)

اور حج کے واسطے لوگوں کو پکار دو کہ تری طرف پیدل
اور دست و پے اونٹوں پر سوار ہو کر تری طرف آئیں،
نم دور راہوں سے آئیں۔

امارت کے لئے نوا کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

۱ اِذَا كَانُوا ثَلَاثَةً فَلْيُؤْمَرْ أَحَدُهُمْ
وہ جب تین شخص ہوں تو ان میں ایک کو ان کی امامت
واحقرهم بالامامة ۲ قرأهم مسلم بہ اسحق بالامامة
کرنی چاہئے اور ان میں مستحق امامت سب سے زیادہ
پڑھا ہوا ہے

امام کی اقتدا اور پیروی کی تاکید فرمائی۔

۱ اِنَّمَا جُعِلَ الْاِمَامُ لِيُؤْتِيَهُمْ بَيِّنَاتٍ مِّنْ شَرِّهِمْ (بخاری نا جمل الامامة) امام تو بس اسی لئے بنا یا گیا ہے کہ اس کی پیروی کی جائے۔
یہ چیزیں اس لئے پیش کی جا رہی ہیں کہ غور فرمائیے کہ ان میں کہیں بھی ایسا لب و لہجہ اختیار کیا گیا ہے
جس سے پنج اد پنج کی بو آتی ہو، شریف اور مکینہ کی بات معلوم ہوتی ہو، شودر اور برہن کی تفریق ہو، اور پھر یہ
بھی دیکھنے کی بات ہے کہ یہ نظام کیسے تاریخی اور کتنا مرتبط اور رٹھوس ہے۔

خلافت ارضی کے متعلق اعلان ہوا

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِن قَبْلُ لَكَ
اور ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد لکھ دیا ہے کہ بالآخر
اِنَّ الْاَرْضَ حَنَ يَرْثُهَا بَنِيَادِي الصَّالِحِينَ
زمین پر میرے نیک بندے مالک ہوں گے۔

دوسری جگہ ارشاد ہوا

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا
اللہ نے ان لوگوں سے وعدہ کیا ہے جو لوگ ایمان لائے
الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ
اور عمل صالح کئے کہ البتہ ان کو زمین میں خلیفہ بنا دیں گے

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تشریح فرمائی

اسمعوا واطيعوا وان وليّ علیکم عبد
کہ سنو اور فرمانبرداری کرو، گو تم پر کسی حبشی بد صورت ظم
حبشی ذور بیبہ
کو دالی بنا دیا جائے۔

طریق انتخاب کے متعلق ارشاد فرمایا گیا

اَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (شوری: ۴۰) وہ آپس کے مشورہ سے کام کرتے ہیں

یہاں بھی بار بار غور کیا جائے کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے خلافت ارضی کے متعلق جو طریقہ

اختیار فرمایا اس میں کہیں ذات بات اور زور زبردستی کی گنجائش ہے؟ کہیں بھی مساوات کا دامن

ہاتھ سے چھوڑ گیا ہے؟ صرف صلاحیت اور ایمان و جہ استعناق ہے اور انتخاب کا معاملہ باہمی مشورہ پر ہے، جو منتخب ہو گیا، اس کی اطاعت سب پر ضروری قرار دی گئی،
نظام مساوات | اسلام کا نظام اجتماع دیکھ چکے، اب دیکھئے آپ نے مساوات کا کیسا نظام قائم فرمایا، جو کچھ عرض کیا جا رہا ہے اسے گہری تنقیدی نگاہ سے ملاحظہ کیجئے، رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ (ہجرات -۱) سارے مسلمان تو بھائی بھائی ہیں۔

اس کی تشریح فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا

لا فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی
 نہ کسی عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت ہے اور نہ کسی عجمی کو عربی پر
 عربی ولا لا بیض علی اسود ولا
 نہ کسی گورے کو کالے پر فضیلت ہے اور نہ کسی کالے کو
 لا سود علی ابیض الا بالتقویٰ (الناس
 گورے پر، مگر اصل تقویٰ ہے تمام لوگ آدم سے ہیں
 من آدم و آدم من ترائب (زاد الساری ص ۲۱۱) اور آدم مٹی سے ہیں۔

علاوہ ازیں خود قرآن پاک کے ذریعہ وضاحت فرمائی۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّ الَّذِي خَلَقَكُمْ
 اے لوگو! تم اپنے رب سے ڈرو، جس نے تم کو ایک جان
 مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا رِجَالًا
 سے پیدا کیا اور اس سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں
 وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً
 سے بہت سے مردوں و عورتوں کو پھیلایا
 شعوب و قبائل کے متعلق جو مسئلہ پیش تھا اس کو بھی کھول کر بیان فرمایا، اور بتایا کہ شرافت و رزاک
 خاندان اور قبیلہ میں نہیں ہے، یہ اپنے کردار و اعمال و اخلاق میں ہے اور عند اللہ شریف وہ ہے جو خدا
 سے سب سے زیادہ ڈرتا ہے، قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے اعلان کیا،

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ
 اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا، اور
 وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعْرِفُوا
 تمہاری ذاتوں اور قبیلوں کو رکھنا کہ تمہارے آپس کی پہچان
 لِبَعَارِ فُؤَادٍ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاهُ
 ہو اور اللہ کے نزدیک تم میں باعزت وہی ہے جو ڈر امتی ہے

دین کے معاملہ میں نسب و نسل کے بت کو پاش پاش کر ڈالا، اور شرافت اور بزرگی، اتقاء اور خدا ترسی کو قرار دیا، کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ حضرت زیدؓ کی شادی جو نسباً غلام تھے حضرت زینبؓ سے کی، اور اس کا تذکرہ قرآن پاک میں محفوظ کر دیا۔ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان اولیائی المتقون حیث كانوا این مرے ہم کنبہ وہ ہیں جو اللہ سے ڈرتے ہیں وہ جہاں کہیں

بھی ہو۔

كانوا (زاد المعاد)

اس نظام مساوات میں کہیں سے کوئی عامی نظر آتی ہے؟ ایک منصف مزاج کا جواب اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ اسلام کا نظام مساوات کلاؤ جزاً بے دلغ ہے،

نظام عدل و انصاف دنیا میں شور بپا ہے کہ عدل و انصاف کی روشنی ہر جگہ بگھٹی نظر آتی ہے، یورپ جو اس وقت دنیا میں سب سے بڑا تمدن خطہ ہے وہ ساری ترقی و تہذیب کے باوجود اب تک گورے اور کالے کی تفریق کرتا ہے اور قانون میں جو رعایت گورے کو اس نے دی ہے، کالے کو اس سے محروم رکھا ہے، انہوں نے جو لطف و کرم ہے غیروں کے لئے نہیں، مگر رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا نظام عدل و انصاف ملاحظہ فرمائیے، کہیں اس میں رورعایت نظر آتی ہے؟

نظام مساوات کے ضمن میں آپ نے عدل کی جلوہ گری دیکھ لی۔ اب غور فرمائیے کہ انہوں سے نہیں غیروں کے ساتھ عدل و انصاف کا کیا برتاؤ درکار کھا گیا ہے، بڑے بڑے عادل یہاں ہنچ کر جوشِ عصبیت میں مہیوت نظر آتے ہیں، اور قوانین میں ہماری باقی نہیں رکھتے مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی بھر اس میں افراط و تفریط نہیں کی اور دوست و دشمن دونوں کے ساتھ برابر کا سلوک کیا، عدل و انصاف کے قوانین کا اعلان فرمایا، اور آج نہیں جبکہ اس کا عام شور بپا ہے بلکہ آج سے ساڑھے تیرہ سو سال پہلے جب کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ نہیں آ سکتا تھا،

اے ایمان والو! اللہ کے واسطے انصاف کرو

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ

بِهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ (المائدہ - ۲)

کسی قوم پر دشمنی کے باعث انصاف کا دامن ہرگز نہ چھوڑو

لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَنْ لَا تَعْدِلُوْا

إِعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَى (مائدہ ۲۰) عدل کرو کہ پرہیزگاری کے زیادہ قریب ہی بات ہے۔

جو وقت بھی حکم ہے کہ انصاف کا سرشتہ ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے کیونکہ اسلام کی محبت و عداوت دونوں جچی تلی ہوئی ہیں، کسی موقع پر بے قابو ہونے کی اجازت نہیں ہے، اگر کوئی بے قابو فریق کر لیجے ہو جائے تو حکم یہ ہے کہ اس کی اس سلسلہ میں ہرگز امداد نہ کی جائے، بلکہ اس کے لئے سب مل کر نیکی اور تقویٰ کا اس طرح اظہار کریں کہ وہ بے جا غیظ و غضب پر شرمندہ ہو کر راہ راست پر آجائے۔

لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا وَعَاوِزُوْا عَلَى الْبَرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوِزُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (مائدہ)

اس قوم کی دشمنی جو تم کو حرمت دہلی مسجد سے روکتی تھی اس کا باعث نہ ہو کہ زیادتی کرنے لگو، آپس میں نیک کام اور پرہیزگاری پر مدد کرو، گناہ اور ظلم پر مدد نہ کرو، اور اللہ سے ڈرتے رہو، بلاشبہ اللہ کا عذاب سخت ہے

انصاف کے تحت پر جلوہ افروز ہونے کے بعد کبھی معاملہ سنگین آجاتا ہے، احترام و اکرام اور محبت و شفقت ارادوں میں جنبش پیدا کر دیتی ہے اس وقت بھی اجازت نہیں ہے کہ عدل کا دامن تار مار کیا جائے، ارشاد رب العزت ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدِ وَالْاَقْرَبِیْنَ (نساء ۵۹)

اے ایمان والو! انصاف پر قائم رہو، اللہ جیسی گواہی دو گوتہارا یا تمہارے ماں باپ کا اور یا تمہارے قریب والوں کا نقصان ہو،

یا اعلان ہی اعلان نہیں ہے عہد نبویؐ اور خلافت راشدہ کے زمانہ کی تاریخ پڑھ جائے، وہاں عمل ہی عمل ملیں گے، آپ پڑھیں گے کہ مسلمان اور یہود کا مقدمہ پیش ہوا اور فیصلہ یہود کے حق میں ہوا، تفصیل میں چونکہ جانا نہیں ہے اس لئے واقعات کی تفصیل چھوڑتا ہوں۔

نظام جنگ و انتقام | جنگ و انتقام کا نام ہی خوفناک ہے، یہاں اعتدال کا نام شاید کہیں نظر آئے، اگرچہ

کے ساتھ اعتدال دیکھنا ہو تو اسلام کی تاریخ پڑھئے، کہ اسلام نے نظام جنگ کتنا پاکیزہ ترتیب دیا اور انتقام کے لئے کتنا جاذبِ نظر اور دل نشین اصول مرتب کیا ہے، بڑا اور سزاء کے متعلق رب العزت کا ارشاد ہے، کہ درگزر سے کام لیا جائے، اور اگر بدلہ ہی لینا ہو تو برابر، اور ویسا ہی ہو،

حَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٍ مِّثْلُهَا فَتَنْ عَفَا
وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ
الظَّالِمِينَ (شوری - ۴۱)

برائی کا بدلہ برائی اسی کے برابر ہے، پھر جو معاف کرے اور
صلح کرے، تو اس کا اللہ کے پاس سے ثواب ہے، بیشک
اس کو زیادتی کرنے والے پسند نہیں،

دوسری جگہ فرمایا اور کیسے دل نشین انداز میں فرمایا کہ کبھی سخت بات کہے یا برا معاملہ کرے تو اس کے ساتھ رفیق و ملاطفت سے پیش آنا چاہیے۔

لَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ
إِذْ فَعَّ بِالَّذِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي
بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ
حَمِيمٌ وَمَا يُلْقِيهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا
وَمَا يُلْقِيهَا إِلَّا ذُو حُظٍّ عَظِيمٍ (حم سجدہ - ۴۱)

نیکی اور بدی برابر نہیں، یہ ایسی بات کہو جو اس سے
بہتر ہو، پھر ایسا ہو کہ تجھ میں اور جس میں دشمنی تھی گویا لہرا
دوست قرابت والا ہے، اور یہ بات اٹھنی کو ملتی ہے
جو تحمل رکھتے ہیں اور یہ بات اسی کو نصیب ہوتی جس
کی قسمت بڑی ہے۔

عضو اور درگزر کے متعلق ارشاد فرمایا گیا

وَإِنْ تَعَفَّوْا وَلَتُصْفَحُوا وَإِنْ ذَاكَ
مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ

اگر تم معاف کرو اور درگزر کرو تو بے شک یہ غمٹ
کی بات ہے۔

جنگ و قتل کے متعلق فرمایا کہ بچوں، بوڑھوں، عورتوں اور جو خدا کی یاد میں گوشہ نشین ہوں، ان

کو نہ چھیڑو

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يَقَاتِلُوكُمْ
وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ
الْمُعْتَدِينَ (بقرہ - ۲۳۰)

اور اللہ کے راستہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑنے
ہیں اور کسی پر زیادتی نہ کرو، اللہ تعالیٰ بے شک زیادتی
کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا ہے

اسلام نے کہیں بھی زیادتی اور جور و ظلم کو پسند نہیں کیا، صلح و سلامتی اسلام کے قوام میں داخل ہے، انتقام و مکافات کے سلسلہ میں اس نے بہادری اور احتیاط کی تعلیم دی، ارشاد ہوا، کہ جو متحیّر ڈال دیں اور صلح کے لئے آمادہ ہو جائیں ان پر زیادتی نہ کرو۔

يَاۤ اَعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يَقَاتِلُوْكُمْ وَالْقَوٰ
اَلَيْكُمْ السَّلٰمُ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ
عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا (النساء)

سو اگر وہ تم سے علیحدہ رہیں، پھر تم سے نہ لڑیں اور
صلح پیش کریں تو اللہ تعالیٰ نے تم کو ان پر راہ نہیں دی

جہاں جاؤ، وہاں خوب غور و فکر کو کام میں لاؤ، بغیر سوچے سمجھے کوئی کام عجلت میں نہ کر ڈالو، قتل و خوریزی کوئی معمولی بات نہیں ہے، اس نئے سے خوب اچھی طرح تحقیق کر لو، ارشاد باری تعالیٰ ہے
يَاۤ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ
سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا (النساء-۱۳)

اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کی راہ میں جب سفر کرو تو تحقیق
کر لیا کرو۔

پھر بے رحمی کو بھی راہ نہیں دی ہے، اگر کوئی زبان سے ایسا کلمہ کہے جو اس کے با ایمان ہونے کو
بتا رہا ہو یا اطاعت کا اعتراف کرے تو اس کو معاف کر دیا جائے۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِلَّذِيْنَ اٰلَقٰۤى اِلَيْكُمْ السَّلٰمَ
لَسْتُ مُّوْمِنًا (النساء-۱۳)

اور جو شخص تم سے سلام علیک کرے اس کو یہ نہ کہو کہ
تو مسلمان نہیں۔

فیصلہ تو ظاہر عمل پر ہے باطن کی ذمہ داری حاکم کے ہاتھ میں نہیں ہے اسے اللہ تعالیٰ جانتا ہے
اور فیصلہ جو بھی ہو انصاف کے ساتھ ہو، افراط و تفریط سے پاک اعتدال پر حکم ہے ارشاد ربانی ہے
وَ اِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ (النساء-۵۸) اور تم لوگوں میں جب فیصلہ کرو تو انصاف سے فیصلہ کرو۔
اس حکم سے سربموجہ و زلی اجازت نہیں، تاریخ اسلام میں اس کی بے شمار مثالیں ہیں۔ عورتوں پر راجعہ اٹھانے کی
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت نہیں دی غزوہ اُحد میں جس خاتون دہندہ نے حضرت حمزہؓ کی کچی کچلی کھال
کر چبائی تھی، حضرت ابو ذہابؓ نے اس کے سر پر تلوار اس غزوہ میں رکھ کر اٹھالی تھی کہ آنحضرت کی اجازت نہیں ہے۔
کہ عورتوں پر تلوار چلائی جائے۔

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات سے کچھ ہی پہلے ایک لشکر کی تیاری کا حکم دیا تھا، جس کا سردار حضرت اسامہ بن زیدؓ کو مقرر فرمایا تھا، ابھی لشکر روانہ بھی نہیں ہوا تھا کہ آپ وفات فرما گئے، چنانچہ صدیق اکبرؓ جب خلیفہ منتخب ہوئے تو اسے روانگی کا حکم فرمایا، حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت اسامہؓ کو روانہ کرتے ہوئے یہ نصیحتیں فرمائیں۔

”دیکھو خیانت نہ کرنا، دھوکہ نہ دینا، مال نہ پھپھانا کسی کے اعضاء کو نہ کاٹنا، بوزھوں، بچوں اور عورتوں کو قتل نہ کرنا، کھجور کے درختوں کو نہ جلانا، پھل والے درختوں کو نہ کاٹنا، اور کھانے کی ضرورت کے سوا کسی باری کائے یا اونٹ کو نہ کاٹنا، تمہارا گذر ایک قوم پر ہوگا، جو دنیا کو چھوڑ کر اپنی خانقاہوں میں ٹہپی ہوگی تم اس سے تعرض نہ کرنا۔“

پھر دنیا جانتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جنگ کے معاملہ میں یہ دستور تھا کہ پہلے مخالفین پر اسلام کی دولت پیش فرماتے اگر اس پر راضی نہیں ہوتے، تو جزیہ کا مطالبہ ہوتا، جس کا ماحصل یہ تھا اسلام کی حکومت تسلیم کر لی جائے، اور اس کے بعد آخری درجہ میدان کارزار کا ہوتا، ذمیوں کی تاریخ پڑھی جائے کہ وہ اسلامی حکومت میں کتنے آرام و عافیت کی زندگی گزارتے تھے، ان کی عزت و آبرو کتنی محفوظ ہوتی تھی۔

یہ تھا رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا نظامِ جنگ اور اصولِ انتقام، آج تو بہت سے لوگ جب اسلام کی رحمتیں عام ہو چکی ہیں یہ کہتے نظر آتے ہیں گے کہ جنگ میں وحشت و بربریت نہیں ہونی چاہئے، مگر اس وقت تو کسی کے دہم میں بھی ایسی بات نہیں تھی، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ نظامِ جنگ مرتب فرما کر پیش کر رہے تھے۔

نظامِ معیشت دنیا میں تہلکہ مچا ہوا ہے کہ انسانوں میں ایسا نظامِ عمل ہونا چاہئے کہ سارے انسان پیٹ بھر کھائیں، پہننے کے لئے ان کو کپڑا میسر ہو اور رہنے کے لئے گھر ہوں، پیٹ کے نام پر بے شمار ہتھکبیں اٹھتی رہتی ہیں گو نتیجہ کے اعتبار سے کوئی بھی کامیاب نہیں ہوتی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سارے تیرہ سو برس پہلے جو نظامِ معیشت پیش فرمایا، اس میں کوئی بھی بھوکا، تنگا اور بے گھر نہیں رہ سکتا، اس کی عملی مثالِ خلافتِ راشدہ کا دورِ خلافتِ موجود ہے،

اسلام میں زکوٰۃ کو بنیادی حیثیت حاصل ہے، اور ارکانِ خمسہ میں ایک زکوٰۃ بھی ہے، خدا سے ڈرنے والوں کی صفوں میں ایمان بالغیب کے ساتھ یہ بھی فرمایا گیا۔

وَمَا سَرَزْتُمْ لَهُمْ يَفْقَهُوْنَ (بقرہ ۱۰) اور جو کچھ ہم نے ان کو روزی دیا، اس سے خرچ کرتے ہیں

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا

أَقِمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ (بقرہ ۱۱) نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دیا کرو

قرآن میں بیسیوں جگہ اس کی تکرار ہے، اور یہی وہ زکوٰۃ ہے جس کے بند کردینے پر صدیق اکبرؑ نے تلوار اٹھائی تھی، وہ سب کچھ مانتے اور کرنے کو آمادہ تھے مگر صرف یہ کہتے تھے کہ نبی کریم ﷺ کے بعد زکوٰۃ نہیں دیں گے۔ بہت سے صحابہ کرام اس موقع پر پس و پیش میں تھے، کہ وہ کلمہ اسلام پڑھتے ہیں پھر صرف زکوٰۃ کے بند کر دینے پر ان کے خلاف تلوار کس طرح اٹھائیں مگر صدیق اکبرؑ کی غزیت اور ان کے بیان سے سمجھوں گا سینہ کھلا اور سب نے متفقہ طور پر طے کیا کہ جو زکوٰۃ بند کر دے اس سے لڑنا ضروری ہے اور لڑے، صدیق اکبرؑ کی انسی سو چھ پر امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں قام ابو بکر یوم الاحد مقام ان نبیاء (ارتداد کے زمانہ میں حضرت ابو بکرؓ نے نبیوں کا سا کام کیا)

بخاری اور مسلم دونوں نے حضرت صدیق اکبرؑ کا واقعہ بیان کیا ہے، اس میں مذکور ہے کہ حضرتؑ نے فرمایا لا الہ الا اللہ جو کہتے ہیں ان سے قتال کس طرح کیا جائے گا، اس موقع پر حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا

واللہ لا قائل من فرق بین الصلوة

والزکاة فان الزکاة حق امال، واللہ

لو منعونی عقالا... لقاتلہم علی منعه

در باطن الصالحین ص ۵۰۔ اس کے روکنے پر بھی ان سے لڑوں گا۔

اس واقعہ سے اہمیت کا اظہار ہے کہ عمل بھی اس پر کس قدر ضروری ہے، ورنہ قرآن پاک میں جس

قدر تاکید ہے وہی بہت کافی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا

خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُخَفِّفُ عَنْهُمْ

ان کے مالوں سے زکوٰۃ لے، کہ تو ان کو پاک کرے اور

وَتَزَكِيهِمْ هَٰذَا (توبہ - ۱۳) اس کی وجہ سے ان کو بابرکت کرے۔

اور اس زکوٰۃ کا منشا یہ ہے کہ مالداروں سے لے کر حاجتمندوں پر خرچ کی جائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

إِنَّ اللَّهَ افْتَرَضَ عَلَيْهِمْ صَدَقَةً تَأْخُذُ
مِنْ أَغْنِيَائِهِمْ وَتُرَدُّ عَلَىٰ فُقَرَائِهِمْ
مَالِدَارُونَ سے لی جائے اور ان کے حاجتمندوں کو دی
متفق علیہ (ربا من الصالحین باب وجوب الزکوٰۃ) جائے۔

زکوٰۃ پر چالیس روپے میں ایک روپیہ، غلہ میں اگر سینچائی نہیں لگی ہے تو دس من میں ایک من
یعنی دسواں حصہ جسے اصطلاح میں عشر کہتے ہیں اور اگر سینچیا پڑا ہے تو اس میں نصف عشر ہے یعنی بیسواں
حصہ، اسی طرح ہر پائدار چیز میں زکوٰۃ ہے جس کی تصریح فقہاء نے بتائی ہے تفصیل فقہ اور حدیث کی
کتابوں میں دیکھی جائے،

غور فرمائیے صرف زکوٰۃ اور عشر کی رقم کتنی ہوگی، پورے ملک میں جتنا غلہ پیدا ہوتا ہے اس کا دسواں
اور بیسواں حصہ غریبوں کے نام پر نکل جائے گا اور نقد رقم کا چالیسواں حصہ محتاجوں کو مل جائے گا،
علاوہ ازیں قرابت داروں کا حق ہے پڑوس کا حق ہے اور دوسرے حقوق ہیں، جن کی تاکید حدیث
کی کتابوں میں جگہ جگہ ہے۔

پھر سرمایہ داری کو ختم کرنے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میراث کے خدائی قانون کا
اعلان فرمایا، سود کو حرام قرار دیا، فریب اور کذب کی کمائی سے منع فرمایا، رشوت کو ناجائز بتایا، اور دوسرے
ناجائز شعیبوں پر پھر بٹھا دیا،

اسی کے ساتھ اسلام کا یہ قانون ہے کہ اگر تمام ضروری مدات کی وصولی اور تقسیم کے بعد بھی کچھ لوگ بھوک
مر رہے ہوں اور کچھ لوگوں کے پاس ضرورت سے زیادہ غلہ اور رقم ہو، تو خلیفہ وقت مالداروں سے
فاضل چیز لے کر مفلسوں اور بھوک مرنے والوں پر خرچ کرے،

اس سے بڑھ کر بہتر اور مکمل نظام اور کیا ہو سکتا ہے، کمبوزم میں بھی بالکلیہ مساوات نہیں ہے،

در نہ کاشتکاری نہ ہو، کارخانے نہ چلیں، باربرداری کا کام انجام نہ پائے، ایک کاشتکاری کرنے والا صد
جمہوریہ جیسا آرام نہیں پاسکے گا اور اس جیسی عزت حاصل نہ کر سکے گا، پھر کمپوزم میں قوت کار کردگی مرد
کردی جاتی ہے، لوگوں میں کمانے اور محنت کا صحیح جذبہ باقی نہیں چھوڑا جاتا، اسلام کا نظام ان تمام خامیوں
سے پاک ہے،

نظام عفت و عصمت | رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو نظام معیشت پیش فرمایا ہے اس میں کوئی بھوک
سے نہیں مر سکتا، پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا دنیا نے عفت و عصمت کی مٹی پیدا کر ڈالی تھی، عورتوں کی قدر
و منزلت، ذلت و حقارت میں تبدیل ہو گئی تھی، حسب و نسب کا معاملہ پیچیدہ ہوتا جا رہا تھا، عصمت
فروشی عام تھی، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے اس کے فلات آواز بلند کی، ان کی عفت
و عصمت کو بیش قیمت قرار دیا، اس راستے سے جو فتنہ و فساد اٹھتے رہتے تھے ان کو بند کیا، نکاح کا
ایک درست طریقہ پیش فرمایا اور اس پر عمل کی تاکید کی، زن و شو کے تعلقات کے لئے قوانین ترتیب
دئے، اعلان فرمایا

وَأَنْكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنْكُمْ وَالصَّالِحِينَ
مِنْ عِبَادِكُمْ وَأَمَّا الْكُفْرَانُ لَكُمْ فَوُثَّ
فَقَرَأَ يُغْنِيهِمْ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ وَاللَّهُ
وَاسِعٌ عَلِيمٌ (نور)

اپنے بے بیاہوں کا اور تمہارے غلام اور لونڈیوں میں
جو لائق ہوں ان کا نکاح کرو اگر وہ مفلس ہوں گے تو
اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ان کو غنی کر دے گا، اور اللہ
کشائش والا ہے سب کچھ جانتا ہے،

اس آیت کا لب و لہجہ بتاتا ہے کہ نکاح صلاحیت کے بعد ضرور کرنا چاہئے، فقر و فاقہ کا خدشہ
جو نفس پیدا کرتا رہتا ہے اس طرف سے بھی بڑی حد تک تسکین دلائی گئی ہے کہ اگر مشیت ہے تو رب العزت
کوئی نہ کوئی جاز و فکل پیدا کر دے گا،

جس میں نکاح کی صلاحیت ہی نہ ہو، نہ بالفعل ہو اور نہ بالقوہ بلکہ وہ ہر طرح مجبور ہو، اس کو
عفت کی زندگی گزارنے کی ہدایت کی گئی ہے اور اشارہ ہے کہ جہاں پھر صلاحیت ہو نکاح کر لے،
وَلَيْسَتَّعْفِيفُ الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ نِكَاحًا
یہ لوگ جن کو نکاح کی استعداد نہیں ہے ضبط

حَقُّ يُغْنِيهِمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ
کریں تا آنکہ اللہ ان کو اپنے فضل سے غنی کر دے

(نور)

نکاح ایک بڑی نعمت ہے، انسان اپنی زندگی میں ماں باپ کے بعد بیوی سے ہی آرام و عافیت اور سکون اور چین حاصل کرتا ہے اور اس کے ذریعہ اپنی عفت اور عورتوں کی عصمت کا پورے طور پر تحفظ کر سکتا ہے رب العالمین فرماتے ہیں

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ
أَزْوَاجًا لِيَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ
مَوَدَّةً وَرَحْمَةً (روم - ۳)

اس کی نشانیوں میں سے یہ بات ہے کہ اس نے تمہارے لئے تمہاری ہی قسم سے جوڑے بنادئے، تاکہ تم ان کے پاس چین حاصل کرو اور اس نے تمہارے آپس میں پیار اور مہربانی رکھی۔

شہوت کی جگہ کی حفاظت کا حکم فرمایا اور اس پر عمل کرنے والوں کو سزا دیا، برائی سے روکا اور زیادتی کرنے والوں کی مذمت کی جہاں ایمان والوں کی فلاح کا تذکرہ ہے ان میں ان کو بھی شمار کیا گیا ہے۔

وَالَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ إِلَّا
عَلَىٰ أَسْرَاجِهِمْ أَنْ يَمْلِكُوا أَنْ يَمْنَهُمْ
فَأَنَّهُمْ غَيْرُ مُؤْمِنِينَ وَمَنْ أَتَّبَعِيَ
وَبَرَاءَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْعَادُونَ

اور جو اپنی شہوت کی جگہ کی حفاظت کرتے ہیں مگر اپنی بیوی اور لونڈیوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں ان پر کوئی الزام نہیں ہے اور جو کوئی اس کے سوا کی جھٹو کرے وہ حد سے بڑھنے والے ہیں۔

عفت و عصمت پر غلط تہمت لگانے والوں کے لئے اسی دُرے سزا مقرر کی، اور اس کی گواہی

کو مرد و قرار دیا۔

وَالَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ لَمْ
يَأْتُوا بِرَبْعَةٍ شُهَدَاءَ فَإِنَّهُمْ لَكَاظِمُونَ
وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ (نور - ۱)

جو پاک دامن عورتوں کو تہمت لگائیں اور چار گواہ نہ لائیں تو ان کو اسی کوڑے سے مار د اور کبھی ان کی گواہی قبول نہ کرو وہ فاسق لوگ ہیں۔

زنا کار کی سخت سزا مقرر کی، اگر غیر شادی شدہ ہے تو سو دترے اور شادی شدہ ہے اور خطوت کر چکا ہے تو اس کے لئے سنگ سار کرنے کا حکم ہے، یعنی قوم کے رد و اس کو سچا کر ہلاک کر دیا جائے۔

الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةً جَلْدَةٍ وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَشَهَادَةُ عَدَايْهِمَا طَائِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ (نور - ۱)

زنا کرنے والی عورت اور زنا کرنے والے مردان میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو، اور اگر تم اللہ اور آخرت کے دن پر یقین رکھتے ہو تو تم کو ان دونوں پر اللہ کا حکم جاری کرنے میں ترس نہ آئے اور کچھ مسلمان ان کی سزا کو دیکھتے رہیں

سنگسار کرنے کے باب میں حدیث میں حضرت معاذ کا واقعہ مذکور ہے اور یہی بہت ساری حدیں ہیں۔ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے سامنے کتنا عظیم الشان نظامِ عدت و عصمت پیش فرمایا اگر اس کے تمام شعبہ جات پر عمل کیا جائے، تو ممکن نہیں، دنیا میں عفت و عصمت کا تحفظ کمزور رہے، اور بہت ساری بد اخلاقیات مٹ مٹا جائیں،

نظامِ امن و امن وامان جو اب ایک جنسِ نایاب بنتی جا رہی ہے، اس کے متعلق بھی رحمت عالم نے جو اصول و قوانین پیش فرمائے وہ ہر طرح مکمل ہیں ان میں کسی جگہ کوئی رخصتہ نہیں ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے وَلَا تَقْتُلُوا أَنْفُسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ (بنی اسرائیل - ۳۰)

اس جان کو قتل نہ کرو، جس کو اللہ نے حرام کیا ہے مگر حق کے لئے

قاتل کے لئے قصاص کا حکم نافذ فرمایا یعنی مقتول کے بدلہ میں قاتل بھی قتل کر دیا جائے،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلِ الْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْأُنْثَىٰ بِالْأُنْثَىٰ (بقرہ - ۱۷۸)

اے ایمان والو مقتولوں میں تم پر قصاص (برابری کرنا، قص) ہے، آزاد کے بدلہ آزاد، اور غلام کے بدلہ غلام اور عورت کے بدلے عورت،

اور اس کو صحتِ زندگی بتایا کہ اس کی اہمیت اور فائدوں میں انسان غور و فکر سے کام لے۔

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ (آلہ - ۱۷۹)

اور اے عقل والو! قصاص میں بڑی زندگی ہے

فسادی اور ڈاکوؤں کے متعلق سخت سے سخت منرا تجویز کی، تاکہ امن وامان میں کبھی خلل نہ ہونے پائے جس سے ملک کی رقی رک جاتی ہے، پبلک میں خوف و ہراس پھیل جاتا ہے، سفر اور کہیں آنا جانا و شوار ہو جاتا ہے اور بہت ساری معیبتیں ٹوٹ پڑتی ہیں۔

مَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ
وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ
فَسَادًا أَنْ يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا أَوْ
تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَسْرُجُلُهُمْ مِّنْ
خِلَافٍ أَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْأَرْضِ

ان کی سزا جو اللہ اور اس کے رسول سے لڑنے میں اور
ملک میں فساد مچانے میں یہ ہے کہ وہ قتل کئے جائیں یا
پھانسی دئے جائیں یا ان کے ادھر کے ہاتھ اور ادھر
کے پاؤں کاٹ ڈالے جائیں، یا ملک سے الگ
کردئے جائیں۔

چور کی سزا کے متعلق رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جو رات کا سیکون حرام کر دیتا ہے
اس کے ہاتھ کاٹ ڈالے جائیں

السَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا جَزَاءً بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللَّهِ (مائدہ ۶۰)

یہ اور اس طرح کے بیسیوں حکم اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے جاری فرمائے جن سے امن وامان کا
کامل تحفظ ہو جاتا ہے، کسی کو گنجائش نہیں مل سکتی ہے کہ وہ فتنہ برپا کرے

نظام تعلیم | رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیمات میں جگہ جگہ علم و فضل کی ترغیب دی اور ارتقاء و
عروج پر رانگیتھ کیا، دواؤں میں مسلمانوں کے حکمت و ہندسہ کے جو قابل تقلید نمونے پیش کئے وہ
سب رسول الثقلین صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات و ہدایات کا ادنیٰ پر تو تھا، ارشاد ہوا۔

هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ (الزمر: ۱)

کیا علم والے اور بے علم برابر ہوتے ہیں

کہیں ترغیب کا پہلو اختیار کیا اور فرمایا۔

وَمَا أُوتِيتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا

تم کو علم نہیں دیا گیا مگر تھوڑا سا

دعا کے جملہ کے طور پر فرمایا گو خاص واقعہ ہی کے سلسلہ میں فرمایا

قُلْ سَرِّبْ زُحْنِي عِلْمًا (طہ - ۶) تو کہہ اسے رب مجھ کو علم میں زیادہ کر
 رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے علوم و فنون کے تحصیل کی تاکید فرمائی، ارشاد فرمایا
 اطلبوا العلم ولو كان بالصحین علم حاصل کرو اگر اس کے لئے چین جانا پڑے
 علم کی قدر افزائی فرمائی، عالموں کی قدر و منزلت بیان کی، علم کے فضائل پر بحث فرمائی، اور مسلمانوں
 اور دوسرے انسانوں کے دل میں یہ حقیقت راسخ کی کہ علم دنیا کی بڑی نعمت اور بیش قیمت دولت ہے
 ارشاد نبوی ہے،

فقیہ واحد افضل عند الله من ایک فقیہ اللہ کے نزدیک ہزار عبادت گزاروں سے افضل ہے۔
 الف عابد

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ طالب علم کی روشنائی شہید کے خون سے زیادہ مقدس
 ہے، طلبہ کے لئے ساری چیزیں دعا کرتی ہیں، حتیٰ کہ مچھلیاں سمندر کی تہ میں ان کے لئے دعاگو ہیں پھر اس
 کا جو نتیجہ ہوا وہ تاریخ میں پڑھئے، علوم و فنون کا وہ کون سا میدان ہے جہاں مسلمان نظر نہ آتے
 ہوں اور سائنس و فلسفہ کا کون سا شعبہ ہے جو مسلمانوں کا رہن منت نہیں، پہلے پہل تحقیقات کی
 تشویق مسلمانوں نے پیدا کی اور کد و کاوش اور جدوجہد کا صورت رحمت عالم کا پھونکا ہوا ہے، حدیث کی
 کتابوں میں ایک مستقل باب ”کتاب العلم“ کے نام سے موجود ہے،

عقل و فہم سے کام لینے کی ترغیب جتنی رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے شاید کسی نے
 دی ہو، قرآن میں ہر جہد سطروں کے بعد افلا یعقلون، افلا یتدبرون، لا یستعرون، لا یفقیہون اور فہل من تدکر
 اور اس طرح کے بسیسوں الفاظ میں جو دماغ اور فکر و شعور سے کام لینے کی ترغیب دیتے نظر آتے ہیں اس کا
 اعتراف غیروں نے بھی کیا ہے۔

نظام اخلاق اعمال | رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اخلاق و اعمال کی جو بیش بہا تعلیم دی وہ تو مخصوص آپ
 ہی کا حصہ ہے فرمایا

انا بعثت لکم مکارم الاخلاق میں تو اس لئے بھیجا گیا ہوں کہ مکارم اخلاق کی تکمیل کروں

قرآن پاک نے اعلان کیا

إِنَّكَ تَعْلَىٰ خَلْقٍ عَظِيمٍ (القلم-۱)

دوسری جگہ کہا۔

لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ
عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ

يَا مُؤْمِنِينَ سَرُّوفٌ رَّحِيمٌ (نوبہ-۱۶)

اپنی امت کو مخاطب کر کے فرمایا

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ

تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ

الْمُنْكَرِ (آل عمران-۱۱۰)

ہلاک ہونے والی کے متعلق ارشاد فرمایا گیا

كَانُوا إِلَّا يَنْهَوْنَ عَنْ مُنْكَرٍ فَعَلُوهُ

لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ (الانہ-۱۱)

وہ آپس میں برے کام سے نہیں روکتے تھے جسے وہ

کر رہے تھے۔

پھر جُزئی مسئلوں میں اخلاق پرستی کی تاکید فرمائی، ماں باپ کی تعظیم و تکریم کا حکم فرمایا ان کے لئے

دعا خیر کرنے کی تاکید کی اور خلافِ ادب بات کہنے سے منع فرمایا، والدین کے متعلق ارشادِ باری ہے

لَا تَقُلْ لَهُمَا أُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ

لَهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا (سبہ اسرئیل،

بات کہو

یا بھی تعلقات کے متعلق رحمتِ عالم نے ارشاد فرمایا

لَا تَقَاطَعُوا أَسْوَاقَ الْبَازِلِ وَلَا تَبَاغَضُوا

وَلَا تَحْزَنْهُمْ وَلَا كُفُوا عِبَادَ اللَّهِ

أَخْوَانًا وَلَا يَجِدَ لِلْمُسْلِمِ إِذْ يَخْبِرُ

بِغَضَبٍ رَّحْمِيٍّ كَرِهَ اللَّهُ لِمَنِ كَذَبُوا

بِغَضَبٍ رَّحْمِيٍّ كَرِهَ اللَّهُ لِمَنِ كَذَبُوا

بِغَضَبٍ رَّحْمِيٍّ كَرِهَ اللَّهُ لِمَنِ كَذَبُوا

اخلاہ فوق ثلاث (ترمذی ص ۱۲ ج ۲) دن سے زیادہ اپنے بھائی کو جھوٹ دے،
 ضرر رسائی اور تکلیف دہی سے منع کیا اور مکر و فریب سے سختی کے ساتھ رد کا، ایک دفعہ فرمایا
 ملعون من صاغر مومنا و مکرہ اس پر خدا کی لعنت ہے جو کسی مسلمان کو نقصان پہنچائے
 (ترمذی ص ۱۲ ج ۲) یا فریب دے

جھوٹ بولنے والوں کے لئے وعید شدید بیان فرمائی اور سچ بولنے والوں کو سراہا،
 عَلَیْكُمْ بِالصَّدَقِ فَإِنَّ الصَّدَقَ يَهْدِي
 تم پر سچائی ضروری ہے کیونکہ سچ بولنا نیکو کاری کی راہ
 الی البر والبر یھدی الی الجنة... دکھاتی ہے اور نیکو کاری جنت کی، اور جھوٹ بولنے سے
 وایاکم والکذب فان الکذب ھدی الی الفجور والفسوس ھدی
 قطعی پرہیز کرو، کیونکہ جھوٹ بدکاری کی طرف لے جاتی
 ہے اور بدکاری آگ کی طرف،
 الی الناس (ترمذی ص ۱۹ ج ۲)

حسن خلق کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا

خیا سرا کہ احسنکم اخلاقاً (ترمذی ص ۱۹ ج ۲) تم میں بہتر وہ ہے جو اخلاق میں سب سے اچھا ہے
 جو کچھ عرض کیا گیا، وہ سمندر میں سے چند قطرے ہیں، پھر بھی گزارش ہے کہ ان مسئلوں کو گہری
 نظر سے مطالعہ کریں اور یہ چیز بھی غور کرنے کے لائق ہے، کہ یہ تعلیمات آپ نے دنیا کے سامنے اس
 وقت پیش کیں، جب وہ فسق و معصیت، ظلم و جبر، عصبیت و جہالت اور شر و فتن میں بھنسی ہوئی
 تھی، ہدایت اور حقانیت کا چراغ گل ہو چکا تھا، اور روئے زمین آپ رحمت کے ایک ایک
 قطرے کو ترس رہی تھی،

سطور بالا میں اسلام کے اجتماعی، معاشرتی، اقتصادی، عمرانی اور ملکی کارناموں کی طرف اجمالی
 اشارہ کیا گیا ہے، اس دور میں بھی اس تابناک روشنی اور عالم تاب آفتاب ہدایت کی ضرورت پڑی
 ہے انشاء اللہ قوم و ملک دونوں کی گتھی اس میں غور و فکر کرنے سے سلجھ سکتی ہے اور اس پر عمل کرنا حکومت
 و ملت کی ترقی و عروج کا ذریعہ ثابت ہوگا، وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ، صَلَّى اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم

حضرت علیؑ کا ریکل ثانی

آنحضرتؐ کی ناراضگی

(سید احمد)

لاہور سے ایک بہن لکھتی ہیں:-

”میں چند روز ہوئے ایک کتاب پڑھ رہی تھی کہ اس میں دیکھا ایک مرتبہ حضرت علیؑ نے حضرت فاطمہؑ زہراؑ کی زندگی میں ہی ایک اور لڑکی سے شادی کرنے کا ارادہ کیا آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات معلوم ہوئی تو آپ کو بڑا غصہ آیا اور آپ نے مسجد میں جا کر مجمع عام کے سامنے اپنے شدید غیظ و غضب کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ میں ہرگز ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ پیغمبرؐ کی بیٹی کے ہوتے ساتھ اس پر ابو جہل کی بیٹی کو کیوں کر سوکن بنا کر لایا جاسکتا ہے؟“

یہ واقعہ پڑھ کر قدرتی طور پر چند سوالات پیدا ہوتے ہیں، امید ہے کہ آپ ان کا جواب عنایت فرما کر میری تسلی کر دیں گے،

(۱) پہلا سوال تو یہ ہے کہ حضرت علیؑ کے لئے اس سے بڑھ کر فخر کی کوئی بات نہیں ہو سکتی تھی کہ ان کو سرور کائنات کی سب سے زیادہ چہیتی اور لاڈلی بیٹی لے شوہر ہونے کا شرف حاصل تھا اس لئے ان کو حضرت فاطمہؑ پر سوکن لانے کا خیال پیدا ہی کیوں کر ہوا؟ ایک ادنیٰ درجہ کا مسلمان بھی ایسا خیال نہیں کر سکتا چہ جائیکہ حضرت علیؑ!

(۲) اچھا اگر حضرت علیؑ نے ایسا ارادہ کیا ہی تھا تو آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس پر اتنا غصہ کیوں آیا اور آپ نے یہ کیسے فرمایا کہ ”میں ہرگز ایسا نہیں ہونے دوں گا“ جب کہ اسلام میں چار عورتوں تک سے نکاح کرنا جائز ہے اور خود آپؐ نے چار سے بھی زیادہ نکاح کئے تھے؟ خود کئی کئی نکاح کرنا لیکن اپنے داماد کو سختی کے ساتھ تعدد از دواج سے روکنا کتنا فی صاف سے بعید اور کم از کم

ایک پیغمبر کی شان سے گری ہوئی بات معلوم ہوتی ہے۔

(۳) ہر سب سے زیادہ جوابات کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ آپ نے ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ کے رسول کی بیٹی اور اللہ کے دشمن کی بیٹی دونوں ایک جگہ اکٹھی نہیں ہو سکتیں! اب سوال یہ ہے کہ ابو جہل چاہے کیسا ہی ہو لیکن اس کی بیٹی تو بہر حال مسلمان تھی اور اسی وجہ سے حضرت علیؑ کا اس کے ساتھ نکاح ہو سکتا تھا، ورنہ مشرک سے نکاح جائز ہی کہاں ہے؟ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ مسلمان ہونے کے بعد سب گناہ دھل جاتے ہیں اور یوں بھی کسی شخص کو اس کے ماں باپ کے کفر و شرک یا کسی عمل کی بنا پر طعنہ نہیں دیا جاسکتا۔ جب یہ سب کچھ درست اور مسلم ہے تو پھر آں حضرت نے ابو جہل کی بیٹی کو اللہ کے دشمن کی بیٹی کہہ کر اس کی تحقیر کیوں کی!

میں نے جب سے یہ واقعہ پڑھا ہے سچ جانے کسی کل چین نہیں ہے، سخت پریشان ہوں حد کے لئے اور باتوں کا آپ جب چاہیں جواب دیں۔ میرے ان سوالات کا جواب جلد دیجئے، ورنہ اگر میرے ایمان میں خلل آگیا تو اس کی ذمہ داری آپ پر ہی ہوگی!

آپ کی دور افتادہ

آمنہ عفت۔ لاہور

۱۲ ستمبر ۱۹۵۲ء

جواب: حکم فرمائی کی وجہ سے آپ کے سوالات کے جو جوابات سرسری طور پر میرے ذہن میں ہیں وہ لکھتا ہوں اگر ان پر آپ نے ٹھنڈے دماغ سے غور کیا تو امید ہے کہ آپ کو بھی اس معاملہ میں وہی اطمینان خاطر حاصل ہو جائے گا۔ جو مجھ کو ہے اور جس طرح یہ واقعہ اور اس کے تمام متعلقات و تفصیلات کتابوں میں پڑھنے کے باوجود مجھ کو اپنے ایمان میں خلل کے پیدا ہو جانے کا کبھی خطرہ نہیں ہوا وہی طرح آپ کا ایمان بھی شک و شبہ کی خلل اندازی سے محفوظ رہے گا۔

اصل جواب سے پہلے چند مقدمات سمجھ لیجئے:

(۱) اسلام دین فطرت ہے۔ یعنی وہ انسانی فطرت کو مسخ نہیں کرتا۔ فطرت کے جذبات اور اس کی خواہشات کو قتل نہیں کرتا بلکہ ان خواہشات کی تسکین کے ذرائع و وسائل کا جائزہ لینے کے بعد ان کی

ترتیب و تنظیم کرتا ہے، ان میں جہاں کہیں بے اعتدالی یا اخلاقی گراوٹ ہوتی ہے اسے دور کرتا اور میل و کھیل سے پاک و صاف کر کے انھیں نکھار کر پیش کرتا ہے اس سلسلہ میں وہ مقتضی اور مقتضایا اشتہار اور مشق ہونوں کی حد بندی ضرور کرتا ہے لیکن اشتہار یا اقتضا کو دبانے اور اسے کھل دینے کا حکم نہیں دیتا۔ مثلاً بھوک اور پیاس سے سری فطرت کا مطالبہ ہے تو اسلام یہ نہیں کرتا کہ بھوک اور پیاس کو جو گیانہ یا سنی طریقوں پر کم کر دینے یا ان کو دبانے کا حکم دے بلکہ وہ صرف یہ کرتا ہے کہ ایک طرف حلال اور حرام چیزوں کا فرق بیان کر کے ان کی تشخیص و تعیین کر دیتا ہے اور دوسری طرف وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ بھوک لگے تو کتنا اور کس طرح کھانا کھانا جائے مثلاً یہ کہ ناپ شتاب نہیں کھانا چاہئے جس سے بد مصفی ہو، اور ہاتھ دھو کر۔ بسم اللہ پڑھ کر اپنے ہاتھ سے اللہ کے رزق کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے کھانا چاہئے۔ پس جس طرح اسلام فطرت کے اس تقاضے کو قنا نہیں کرتا بلکہ اس کو پورا کرنے کے اسباب و ذرائع کی ترتیب و تنظیم کرتا ہے اسی طرح فطرت کا دوسرا تقاضہ یعنی حبشی خواہش اس کو بھی دبانے یا کھل دینے کا حکم نہیں دیتا۔ بلکہ اس تقاضہ کو کس طرح پورا کرنا چاہئے؟ اس کی نسبت وہ اپنی تعلیمات پیش کرتا ہے۔

(۲) حضرت علیؑ کا کیا ذکر! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیغمبر آخر الزماں اور خدا کے نہایت ہی برگزیدہ محبوب ہونے کے باوجود بشر تھے، قرآن مجید میں اس کا نہایت صراحت کے ساتھ ذکر موجود ہے۔ علاوہ
 یہ کہ اگر آپ بشر نہ ہوتے تو انسانوں کے لئے اسوۂ حسنہ کیونکر ہو سکتے تھے؟ پھر چونکہ بشر بھی سب سے کامل و اکمل تھے اس بناء پر آپ کی بشری طاقتیں اور قوتیں مثلاً آپ کا ذہن اور دماغ، آپ کی بصارت اور سماعت، جسمانی طاقت اور تندرستی، دل کی مضبوطی اور ارادہ کی پختگی سب سے بڑی ہوتی تھیں اور اس کا نتیجہ یہ تھا کہ آپ کو اپنی اولاد کے ساتھ جو محبت تھی وہ بھی مل باپ کی عام محبت سے زیادہ تھی، یہ محبت آپ کو اپنی سب سے زیادہ محبت تھی لیکن حضرت فاطمہ زہراؑ کی چشم و چراغ و دمان نبوی اور گوہر بکتلے درج رسالت پناہی تھیں ان سے آپ کو اور بھی زیادہ محبت تھی۔ چنانچہ آپ نے متعدد موقعاں پر فرمایا کہ فاطمہ میری ہے، محمد سے ہے میری جگر پارہ ہے، جو شخص اس کو تکلیف پہنچاتا ہے وہ مجھ کو تکلیف پہنچاتا ہے، جو اسے غصہ دلاتا ہے وہ مجھے غصہ دلاتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حضرت

فاطمہؓ کے ساتھ یہ والہانہ محبت آپؐ کا نقص نہیں بلکہ کمال ہے اور آپؐ کے بشر کامل ہونے کا ثمرہ ہے (۳) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت کرنا یا رکھنا فقہ کی اصطلاح میں فرض و واجب ہو یا نہ ہو مقتضائے ایمان ضرور ہے اور اس ذات ہمہ آیات بنیات کے ساتھ جس قدر زیادہ کسی کو عشق ہوگا اسی قدر اس میں ایمان زیادہ ہوگا بلکہ صحیح حدیث میں تو یہ ہے کہ ”خدا کی قسم تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن ہی نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے اپنے نفس اور اولاد سے زیادہ محبوب نہ ہوں“ اس حدیث کے ساتھ ایک واقعہ بھی یاد رکھئے کہ حضرت عمرؓ نے ارشاد گرامی سننے کے بعد فرمایا کہ ”یا رسول اللہ! آپ بے شک مجھ کو میری اولاد سے اور ماں باپ سے زیادہ محبوب ہیں۔ لیکن اب تک میرے اپنے نفس سے زیادہ محبوب نہیں“ آنحضرت نے یہ سن کر فرمایا ”تو پھر لے عمر! تم اب تک مومن بھی نہیں“ اس ارشاد کا زبان مبارک سے ادا ہونا تھا کہ حضرت عمرؓ کے دل کی کائنات یک بیک بدل گئی اور فرمایا کہ ”الان یا رسول اللہ! ہاں بے شک اب آپ مجھ کو میرے اپنے نفس سے بھی زیادہ پیارے ہیں“ اور حضرت عمرؓ نے یہ کہا اور ادھر ارشاد گرامی ہوا ”الان یا عمر!“ تو ہاں بے شک تم اب مومن بھی ہو گئے،

پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہ محبت محض عقلی نہیں بلکہ طبعی اور عادی ہونی چاہئے جیسا کہ مندرجہ بالا حدیث اور حضرت عمرؓ کے واقعہ میں ”احب من ولدہ و نفسہ“ سے معلوم ہوتا ہے (۴) اس کے ساتھ ہی یہ بھی سمجھ لیجئے کہ محبت عادی و طبعی کا تقاضا کیا ہوتا ہے، فرض کیجئے مجھ کو کسی کے ساتھ غایت محبت ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ شرعی طور پر کسی شے کی اباحت اور اس کے مطلق جواز سے قطع نظر کر کے مجھ کو وہی کرنا چاہئے جس سے میرے محبوب کو خوشی حاصل ہو اور کسی شے کی مطلق اباحت کی آڑ لے کر مجھے وہ کام نہ کرنا چاہئے جو اس کو ناگوار ہو یا مکرر طبع کا باعث ہو، مثلاً مجھ کو طبعاً کوٹ تیلون زیادہ پسند ہے اور شرعاً اس کا پہننا جائز بھی ہے لیکن اگر میرا محبوب اپنے طبعی ذوق کی بنا پر شیردانی زیادہ پسند کرتا ہے تو میری محبت کا یہ تقاضا ہونا چاہئے کہ کوٹ تیلون کے شرعاً مباح اور جائز ہونے کے اور خود اپنی بھی پسند کے باوجود اس کو استعمال نہ کروں اور اس کے

بجائے شہروانی ہی پہنوں۔

(۵) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے اقوال و اعمال ہیں جن کا تعلق آپ کی پیغمبرانہ حیثیت سے بالکل نہیں ہے، مثلاً بحیثیت شوہر کے آپ نے ازواج مطہرات سے کوئی بات ارشاد فرمائی اولاد سے بحیثیت باپ کے ساتھیوں سے بحیثیت ایک دوست کے آپ نے کچھ فرمایا یا کوئی کام کیا تو اب اس پر غور کرتے وقت ہمیں آپ کی اس حیثیت کو پیش نظر رکھنا ہوگا اور آپ کی اس حیثیت کو آپ کی پیغمبرانہ حیثیت کے ساتھ غلط ملط کر دینا کسی طرح قرین جواب نہ ہوگا۔ جو معاملہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے وہی معاملہ تمام صحابہ کرام اور حضرت علیؓ کا بھی ہے کہ ان کے کسی قول یا عمل پر غور کرتے وقت ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ وہ کس حیثیت میں کہا گیا کیا گیا ہے۔ اور آیا وہ اسلام کے کسی حکم یا اصل سے ٹکراتا ہے یا نہیں! اگر نہیں ٹکراتا تو بس اس کے درست اور سچا ہونے کے لئے اتنی ہی بات کافی ہے اگرچہ ایک عام اور فارجی نقطہ نظر سے اس میں تھوڑی بہت بے اعتدالی پائی جائے، یہ بے اعتدالی صرف خارجی نقطہ نظر سے ہوگی لیکن ایک حج کا فرض ہے کہ وہ کسی قول یا فعل پر محاکمہ کرتے وقت اس کے داخلی اسباب و عوامل اور اس کے باطنی محرکات کو بھی سامنے رکھے۔

اگر یہ مقدمات آپ کے ذہن نشین ہو گئے ہیں تو اب اپنے سوالات کے جوابات نمبر وار لیجئے۔
(۱) بلاشبہ حضرت علیؓ کے لئے اس سے بڑھ کر فخر کی کوئی بات نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد اور آپ کی سب سے زیادہ محبوب بیٹی کے شوہر تھے لیکن جب آپ حضرت فاطمہ کی اس بلند و اعلیٰ حیثیت پر غور کرتی ہیں تو اس وقت شاید یہ بھول جاتی ہیں کہ حضرت علیؓ ان کے شوہر تھے اور شوہر ہونے کی حیثیت سے ان کا حضرت فاطمہ سے مقدمہ نمبر اول کے بموجب ان تو قنات کا قائم رکھنا سب کا تقاضا جو ایک شوہر کو اپنی بیوی سے ہونی میں پھر اس میں بھی ذرا شک نہیں کہ حضرت فاطمہ خود نہایت اعلیٰ اور بلند اخلاق و فضائل کی خاتون تھیں اور اس بناء پر ایک بہترین مثالی بیوی تھیں۔ تاہم دونوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چہیتے اور اولاد کے تھے اور دونوں کے مزاج میں نزاکت بھی تھی اس بنا پر دونوں میں کبھی کبھی رنجش بھی ہو جاتی تھی۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خبر ہونے ہی صلح صفائی کر دیتے تھے جہاں پہ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ آنحضرت حضرت علیؓ کے

گھر میں تشریف لے گئے، باہر آئے تو زیادہ مسرور تھے لوگوں نے وجہ پوچھی تو فرمایا کہ میں نے ان دو شخصوں کو حضرت علیؑ اور حضرت فاطمہؑ میں صلح کرادی ہے جو مجھ کو بہت محبوب ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود حضرت فاطمہؑ کی نازک مزاجی سے واقف تھے اور اس وجہ سے وقتاً فوقتاً حضرت فاطمہؑ کو سمجھاتے بھی دیتے تھے، چنانچہ ایک مرتبہ حضرت فاطمہؑ کو کسی بات پر نالواری ہوئی تو آنحضرت کے پاس حضرت علیؑ کی شکایت لے کر چلیں۔ مجھے مجھے حضرت علیؑ بھی ہوئے۔ حضرت فاطمہؑ نے شکایت کی تو آپ نے فرمایا بیٹی! ہمیں خود جانا چاہیے کہ کون شوہر اپنی بیوی کے پاس چپ چاپ چلا آتا ہے، حضرت علیؑ یہ سنکر بہت متاثر ہوئے اور حضرت فاطمہؑ سے بولے میں اب تمہارے مزاج کے خلاف کوئی بات نہ کروں گا بہر حال یہ نہ بھولنا چاہیے کہ حضرت علیؑ حضرت فاطمہؑ کے شوہر تھے۔ اور اگر انہوں نے نکاح ثانی کا ارادہ کیا تو وہ اسی حیثیت سے تھا حضرت فاطمہؑ اگر جبرگوشہ رسول تھیں تو حضرت علیؑ کو بھی یہ شرف تھا کہ وہ آپ کے چچا زاد بھائی اور پہلے مسلمان لڑکے اور آنحضرت کے محبوب تھے۔ دونوں کو آنحضرت کی محبت پر ناز تھا اور جب جانہیں میں ناز ہوتا ہے تو ایک ہی جگہ رہنے پہننے کے باعث ٹکراؤ بھی ہو ہی جاتا ہے اور جب ٹکراؤ ہوتا ہے تو اگر شوہر کے دل میں کبھی نکاح ثانی کا خیال پیدا ہو جائے تو کون سی مستند بات ہے۔ یہ تصادم اور کشمکش بسا اوقات اس وقت پیدا ہوتی ہے جبکہ شوہر میں یا بیوی میں باہمی تعلق کے اعتبار سے دو مختلف حیثیتیں جمع ہوں چنانچہ عشق و محبت کی شادیاں جو علم طور پر ناکام رہتی ہیں ان کی وجہ یہ ہی ہوتی ہو کہ بیوی شادی سے قبل محبوبہ اور اس حیثیت سے وہ گویا مخدومہ ہوتی ہے لیکن شادی کے بعد شوہر قوام بن جاتا ہے تو اب معاملہ برعکس ہو جاتا ہے اور کشمکش شروع ہو جاتی ہے۔ (۲) جیسا کہ مقدمہ نمبر میں بتایا جا چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بشر تھے اور نہایت کامل بشر اور حضرت فاطمہؑ کے ساتھ آپ کو حد درجہ محبت تھی اس بنا پر حضرت علیؑ کے نکاح ثانی کے ارادہ سے آپ کا انجید ہونا بالکل فطری اور طبعی امر تھا۔ پھر جیسا کہ مقدمہ نمبر میں کہا گیا اگر حضرت علیؑ کا کوئی فعل اس انجیدگی کا سبب بنا تو اس سے خود حضرت علیؑ کا ایمان خطرہ میں پڑ جاتا اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو زیادہ غصہ آیا اور آپ نے مسجد میں جا کر اس کا اعلان فرمایا پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غصہ کی دو جہیں تھیں ایک کا تعلق آپ کے باپ ہونے کی حیثیت سے تھا اور دوسری کا تعلق آپ کی پیغمبرانہ حیثیت سے تھا۔ اس بنا پر آپ کو جتنا بھی ملال اور رنج ہوتا کم تھا چنانچہ صبح بخاری میں اس موقع پر آپ کے خطبہ کے جو الفاظ مروی ہیں ان میں آپ نے یہ صاف صاف فرمایا ہے کہ میں صلی کو حرام یا حرام کو حرام کرنے نہیں کھڑا ہوا ہوں۔ ان میں اشارہ اسی بات کی طرف ہے کہ حضور کے ارشاد کا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا

کہ آپ حضرت علیؑ کے لئے تعدد ازدواج کو ممنوع قرار دے رہے تھے، بلکہ بات صرف یہ تھی کہ حضرت فاطمہ کے دکھ سے آپ کو دکھ ہوتا اور اس دکھ کا باعث جب حضرت علیؑ بننے تو ان کا ایمان خطرہ میں پڑ جاتا۔

اللہ اکبر! ذرا غور کیجئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مذکورہ بالا فقرہ کس طرح آپ کے رسول صادق و مصدقؐ ہونے کی گواہی دے رہا ہے ورنہ حضرت فاطمہؑ جی نور نظر و نعت جگر مٹی کا معاملہ! آپؐ نوراً یہ حکم بھی دے سکتے تھے کہ دختر رسولؐ پر سوکن ملنا حرام ہے! یہ سب کچھ نہیں ہے اور آپ صرف ایک محبت سے بھرے باپ کی طرح اپنے طبی رنج و آزر دگی کا اظہار فرما رہے ہیں اور اس کی داد عام مسلمانوں سے چاہتے ہیں۔

بلغ اہلی بکمالہ کشف الدجی بجمالہ

حسنت جبع خصالہ صلوا علیہ والہ

اس واقعہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضگی سے آپ کا متعجب ہونا ایسا ہی ہے جیسا کہ بعض صحابہ کو اس وقت ہوا تھا جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے ابراہیم پر جان کنی طاری تھی۔ آنحضرتؐ نے ان کو اپنی گود میں لے لیا اور اسی عالم میں باغ رسالت کا وہ غنچہ نودمیدہ قبل از وقت موت کی باد خزاں کے ایک جھونکے سے کھلا کے رہ گیا اور مرغ روح کی ایک پرواز نے اس ننھے سے جسم کا رشتہ اس کی جان سے منقطع کر دیا۔ سرور کائنات کے قلب مبارک میں رنج و غم کی ایک لہر کٹھی اور آنکھوں سے بے ساختہ آنسو ٹپک پڑے، کسی نے کہا یا رسول اللہ! آپ بھی روتے ہیں تو ارشاد حق بنیاد ہوا کہ ”کیا میں محبت کرنے والا باپ نہ ہوں؟ پھر جگر گوشہ کی ننھی سی لاش کو خطاب کر کے ارشاد ہوتا ہے ”اے ابراہیم ہم تمہاری جدائی سے غمگین ضرور (لمحزونون) ہیں لیکن اللہ کی رضا پر رضا مند ہیں“ آپ نے دیکھا یہ ہے وہ مقام عبودیت و بندگی جہاں اسلام فطرت انسانی کو اس کے اصل جذبات و مطالبات کو قائم رکھتے ہوئے لا کھڑا کرنا ہے اور اس کو مسخ کر کے سنیا سی نہیں بنے دیتا۔

(۳) اب رہا آپ کا تیسرا سوال! تو میرے خیال میں اس کی نسبت کچھ کہنے کی ضرورت نہیں رہی ہے

اگر مذکورہ بالا دونوں سوالات کے جوابات آپ کی سمجھ میں آ گئے ہیں تو اس تیسرے سوال کا جواب بھی خود بخود آپ سمجھ گئی ہوں گی اس میں شک نہیں کہ حضرت فاطمہؑ و آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی

اور حضرت فاطمہؓ کے ساتھ آنحضرتؐ کی غایت محبت کے علم کے باوجود حضرت علیؓ کا نکاح ثانی کا ارادہ ایک بڑی جسارت تھی۔

پھر حضرت علیؓ کے مزاج میں جو خود رائی اور یک گونہ ضد تھی جو زندگی بھر ان کے کاموں میں ظاہر ہوئی رہی اور جس کی وجہ سے وہ خلافت کے بارگراں سے حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ رضی اللہ عنہما کی طرح کامیابی کے ساتھ عہدہ برائیں ہو سکے، آپ حضرت اس سے بھی بے خبر نہ تھے۔ اس بنا پر ضرورت تھی کہ حضرت علیؓ کو اس ارادہ سے باز رکھنے کے لئے آنحضرتؐ سخت قدم اٹھاتے۔ مرض قینا شدید ہوتا ہے دوا بھی اسی قدر تیزی جاتی ہے پس ابو جہل کی بیٹی کی نسبت آنحضرتؐ کا ارشاد خود اس کی حقیر کے لئے نہیں ہے۔ بلکہ حضرت علیؓ کو سختی سے نکاح ثانی کے ارادہ سے روکنے کے لئے ہے اور یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ اور حفصہؓ رضی اللہ عنہما نے حضرت صفیہؓ سے انہیں چھڑنے کی عرض سے کہا کہ ہم رسول اللہؐ کی بیوی بھی ہیں اور چچا زاد بہن بھی اس لئے ہم تم سے زیادہ معزز اور آپ حضرت کے مقرب ہیں۔ اس کے بعد آنحضرتؐ گھر میں تشریف لائے تو حضرت صفیہؓ نے شکایت کی اور سارا ماجرا کہہ سنایا، آپ نے فرمایا ”صفیہ! تم نے انہیں یہ جواب کیوں نہیں دیا کہ تم مجھ سے زیادہ معزز کیوں کر ہو سکتی ہو! میرے شوہر محمدؐ ہیں میرے باپ موسیٰؓ اور چچا ہارونؓ تھے۔“ ظاہر ہے کہ اس واقعہ میں حضرت صفیہؓ کو آپ حضرت کی تلقین کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ اسلام میں نسب پر فخر کرنا اور دوسروں کے مقابلہ پر اپنی اس طرح بڑی جتنا جائز ہے۔ بلکہ یہ صرف ایک طرح کی چھڑ چھاڑ اور نوٹنک جھونک تھی اور اس کو آپ اسی حد تک محدود رہنا چاہتے، حضرت عائشہؓ حضرت حفصہؓ اور حضرت صفیہؓ کی گفتگو تھی۔ اور حضرت صفیہؓ سے آنحضرتؐ کا ارشاد بحیثیت شوہر کے تھا۔

”کوئی تو بات سنسی کی نکلے“ زندگی کا ہر وقت سنجیدہ بنا رہنا بھی آخر کیا زندہ رہنا ہے۔ اسلام میں تعدد ازواج مباح اور جائز ہے لیکن اس اباحت سے مسلمانوں نے من حیث القوم اسلام کی تعلیمات کی اصل اسپرٹ کے خلاف کس قدر ناجائز فائدہ اٹھایا ہے اس کو تاریخ کے صفحات میں تلاش کیجئے کتنی بڑی بڑی اور عظیم الشان مسلمین تھیں جو محض تعدد ازواج اور اہل کتاب کی عورتوں کے ساتھ شادی کے باعث مٹ گئیں چنانچہ یہی وجہ تھی کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ کو ایک صحابی کے

صحابی کے متعلق معلوم ہوا کہ انہوں نے ایک کتابیہ عورت سے شادی کر لی ہے تو شرعاً اس کے جواز کے باوجود آپ سخت برہم ہوئے اور آپ نے انہیں حکم دیا کہ فوراً طلاق دو اور ساتھ ہی فرمایا کہ اگر تم لوگ اسی طرح ان عورتوں سے شادی بیاہ رہا نہ لگے تو یہ عرب کی دو شیرہ لڑکیاں کہاں جائیں گی۔ بہر حال تعددِ ازدواج اگرچہ مباح ہے لیکن حضرت علیؓ کے نکاح ثانی کے ارادہ پر آنحضرتؐ کی تقریر اس امر پر بھی متنبہ کر رہی ہے کہ اس اباحت سے اس وقت فائدہ اٹھانا چاہئے جب کہ اس کی واقعی کوئی ضرورت ہو۔ اگر حضرت علیؓ کا ایسا ارادہ تھا تو انہیں بتانا چاہئے تھا کہ حسن و جمال، جوانی اور تندرستی، اخلاق و فضائل، سلیقہ شعاری اور سنگٹریا۔ شوہر کی اطاعت شعاری اور فرمانبرداری۔ اولاد کی حسن تربیت اور ان کی نگرانی اعلیٰ حسب اور نسب ان میں سے آخر کون سے جوہر کمال کی حضرت فاطمہؓ میں کمی تھی جس کے باعث وہ ابو جہل کی بیٹی سے شادی کرنے چلے تھے تعددِ ازدواج مباح اور جائز ہے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ بیوی سے ذرا ناراضگی ہوئی اور شوہر نے جھٹ اس کے چھاتی پر مونگ دلنے کے لئے ایک سو کن لا بٹھائی۔ یہ مذہب کے ہمہ گیر احکام کی وسعتوں کی آڑ میں وہ ہوس رانی ہے جس کے خلاف چارہ جونی عدالتوں میں نہ ہو سکے تو نہ ہو۔ اللہ اور اس کے پیغمبر کے سامنے پروان نہیں چڑھ سکتی۔

علاوہ بریں آنحضرتؐ نے ابو جہل کی بیٹی اور حضرت فاطمہؓ کا موازنہ کرتے ہوئے جو ارشاد فرمایا غور کیجئے تو اس میں ایک نہایت دقیق اور غامض حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ یہ تو آپ جانتی ہی ہیں کہ اسلام میں تعددِ ازدواج کی جوازت ہے وہ مطلقاً نہیں ہے بلکہ دونوں میں عدل قائم رکھنے کی شرط کے ساتھ مشروط ہے۔ اس عدل کا مطلب عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ دونوں بیویوں میں کھانے پینے اور لباس وغیرہ کے معاملات میں برابری قائم رکھنا اور بس! لیکن آنحضرتؐ کا یہ ارشاد اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ عدل بین الذواتین صرف مذکورہ بالا اشیاء میں مساوات قائم رکھنا ہی نہیں ہے۔ بلکہ عدل کے مفہوم میں یہ بھی داخل ہے کہ دونوں بیویاں حسب و نسب اور خاندانی اعزاز و وقار کے لحاظ سے برابر ہوں۔ ورنہ فرض کیجئے ایک شوہر کی پہلی بیوی بہت اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی ہے اور اس بنا پر نہایت مہذب۔ شائستہ اور سلیقہ مند عورت ہے۔ اب اگر شوہر اس پر کسی ایسی عورت کو سو کن بنا کر لائے جو سہ چار طعنہ پیار ہو۔ بد سلیقہ اور بد اطوار ہو۔ اور کسی بیچ

خاندان سے ہو تو یہ عدل کے خلاف ہوگا۔ کیونکہ ایسا کرنے سے شوہر گویا پہلی بیوی کے سینہ میں ایک ایسا خنجر بھونک دے رہا ہے جس کی خلسہ زندگی بھر وہ محسوس کرتی رہے گی اور آخر گھٹ گھٹ کر مرجائے گی۔ جو عورتیں اعلیٰ خاندانوں کی ہوتی ہیں ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ اگر ان کے خاندانی وقار کو صدمہ نہ پہنچے تو موٹا جھوٹا کھپائی کر بھی وہ خوش رہتی ہیں۔ لیکن اگر ان کا خاندانی وقار مجروح ہوتا ہے یا ان کے حسبی و نسبی شرف و مجد کو ٹھیس لگتی ہے تو آپ ان کو لاکھ سونے اور چاندی کے قمقمے کھلائیں پھر بھی وہ خوش نہ ہوں گی۔ اس بنا پر آنحضرتؐ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ نکاح ثانی کرتے وقت دونوں عورتوں کی نفسی اور خاندانی مساوات کا بھی لحاظ رکھنا چاہئے اسی وجہ سے آنحضرتؐ نے اس تقریر میں فرمایا کہ اچھا اگر علیؑ ایسا ہی ابو جہل کی لڑکی سے نکاح کرنا چاہتے ہیں تو فاطمہؑ کو طلاق دے دیں اور پھر جو چاہیں کریں۔

آپ کے سوالات کے جوابات ختم ہوئے۔ اب آخر میں اتنا اور کہنا ہے کہ یہ آپ نے ایمان میں خلل پڑنے کی ایک ہی کہی۔ اگر خدا نہ کرے آپ کا ایمان ایسا ہی خام ہے کہ کسی کتاب میں دو چار سطریں دیکھیں یا کسی سے ادھر ادھر کی دو ایک باتیں سنیں تو اس میں خلل پڑنے لگا تو بس آپ کے ایمان کا خدا ہی والی اور نگہبان! اس وقت بے ساختہ آزاد سہجانی کی ایک غزل جو کبھی بچپن میں کہیں سنی یا پڑھی تھی اس کا ایک شعر یاد آگیا ہے آپ بھی سن لیجئے!

مزاج لاابالی اور جوانی!

خدا حافظ ہے ناموس حیا کا!

آپ کو سورج کے سورج ہونے کا یقین ہے اور اس پر آپ کا ایمان ہے۔ پھر اگر آپ کی سمجھ میں نہیں آتا کہ سورج کی شعاعیں ٹیڑھی ترچھی کیوں پڑتی ہیں۔ سیدھی کیوں نہیں پڑتیں اور نیزیہ کہ ان کا رنگ بنفشی کیوں ہے۔ سفید کیوں نہیں۔ زمین سورج کے گرد کیوں گھومتی ہے۔ سورج زمین کے گرد کیوں نہیں گھومتا تو سورج پر آپ کے ایمان میں کیوں خلل نہیں پڑتا۔

احسان

رحمت للعالمین

جناب ارشد مدنی

وہ نذرِ عقیدت و محبت جو لکھنؤ کے حالیہ جشنِ عیدِ میلاد میں بارہ ربیع الاول شہرِ لہن کو
صبح صادق کے انوار کے ساتھ یہ صد ہزار ادب و احترام بارگاہِ رسالت میں پیش کی گئی۔

مراد کعبہ اہل و فاء سلام علیک

امام قافلہ انبیاء سلام علیک

ملکین مسندِ عرش خدا سلام علیک

بہ ہر شمارِ نفس صد ہزار بار سلام

بہ روحِ پاک تو ہر لمحہ بشیاء سلام

بشر کو تجھ سے تجلیِ حسنِ ذات ملی

ترے ظہور سے کونین کو حیات ملی

حیات کو ترے قدموں میں کائنات ملی

بلند چشمِ دو عالم سے ہے مقامِ ترا

لگے فروغِ دو عالم ہو لطفِ عامِ ترا

گماں کو خواب پریشاں بنا دیا تو نے

یقین کو دل کا نگہباناں بنا دیا تو نے

خدا کے دین کو آساں بنا دیا تو نے

فنا کو حسنِ بقا تیرے آئناں سے ملا

جو وہ جہاں کو ملا تیرے آئینے سے ملا

تری نگاہ تھی بیداری ضمیر حیات
 تری نگاہ ازل آفریں، بشیر حیات
 تری نگاہ ابد تک ہے دستگیر حیات
 تری نگاہ نے ایسے بشر کئے پیدا
 کہ جن کی گردنے گردوں میں دیکھتے پیدا
 فضیلتِ دل صد ضیق جاوداں تجھ سے
 کمالِ عدلِ عمر ہے ابد نشان تجھ سے
 حریم جامعِ قرآن، ہے صوفشاں تجھ سے
 جلالِ مرقنوی میں جمالِ ہر تیرا
 کمالِ خلق صحابہ کمال ہے تیرا
 حیاتِ خاک نشیں کو لباسِ نور دیا
 دلوں کو نور دیا، روح کو سرور دیا
 جسے سرور دیا، ظہر ف بھی ضرور دیا
 یہ اعتراف رہی گا ضمیر امکاں کو
 کہ تو نے محرمِ نیرداں کیا ہر انسان کو
 صہیبِ روم و ابودر کی تشنگی کیا تھی
 بلالِ قرنی و سلمان کی بے خودی کیا تھی
 رصنائے دوست کی صورت تھی زندگی کیا تھی
 انھیں زمین چہ فلک بارگاہ ہونا تھا
 اداسناسِ سالتِ نیاہ ہونا تھا
 ہوائے دامنِ خلقِ عظیم کیا کہتے !

قدم قدم پہ بہشتِ نعیم کیا کہتے !
مقامِ شانِ روفِ الرحیم کیا کہتے !
بشر کے در و کار گراں ٹھانے ہوئے
امینِ رحمتِ یزداں ہر سر جھکا دئے

عجم کے دیر پرستوں کو دیں پناہ کیا
عرب کے دشتِ نوردوں کو خضرِ راہ کیا
دلوں کو محرمِ اسرارِ لا الہ کیا
غلامِ آنکھ بلاتے تھے بادشاہوں ۔

فقرِ کام نہ رکھتے تھے کجکلاہوں
وہ درگزر، کہ جھاکار جھک گئے آخر
وہ رحمتیں، کہ دل آزار جھک گئے آخر
وہ حسنِ خیر، کہ اشعار جھک گئے آخر
عدو کالِ رحم سے شرمسار ہوئے
بھی جو دشمنِ جان تھے وہ جان سار ہوئے

نسیمِ خلد سے بد لگیا سزاجِ سموم
جو راہِ زن تھے، بنے خضرِ کاروانِ علوم
ترے کرم نے غلاموں کو کر دیا مخدوم
یہ فیضِ رحمتِ خیرِ الانام دیکھ لیا
کہ امیوں کو جہاں کا امام دیکھ لیا

وہ شفقتیں، کہ غریبوں کو اوجِ نجات پہ ناز
وہ حسنِ خلق، کرم ہیں بلی عجز کا انداز

ملانہ دہر کو تجھ سا کوئی غریب نواز

جواب میں کسی سائل کو لگا ہوا گیا

درِ کریم سے خالی کوئی گدا نہ گیا

وہ بزمِ شب، وہ تہجد، وہ نورِ بیداری

بیادِ امت، غامی، وہ گریہ و زاری

وہ سوزِ دل، وہ تقاضائے رحمتِ باری

وہ سبیلِ اشک، یہ اخطا شعاروں کا

مقامِ چشمِ کرم میں گنہگاروں کا

تمام لطف، و ترقیم، تمام فضل و عطا

تمام شفقت اور رحمت تمام جو دوحنا

ترے کرم پہ فدا اسے حبیبِ خلقِ خدا

بروں کو چشمِ کرم میں چھپایا تو نے

جہاں کو پیار سے اپنا بنا لیا تو نے

مذبحِ سینہ کو نین ہے پیغامِ ترا

قریبِ منہ تے مبرور ہے مقامِ ترا

نکینِ خاتمِ سب خدا ہے نامِ ترا

بنامِ پاک تو ہر لمحہ بے شمار سلام

یہ بہ شمار نفس صد ہزار بار سلام

شوز علیہ

برقی شیشہ | شیشہ اب تک برق کے لئے غیر موصل سمجھا جاتا ہے۔ یعنی شیشے میں سے برق نہیں گزیر سکتی

لیکن اب ایسا شیشہ ایجاد ہوا ہے جو برق کے لئے موصل ہے۔ چونکہ برق کے گزرنے سے حرارت پیدا ہوتی ہے اس لئے اس شیشے سے ریڈیٹر اور کافی تیار کرنے کے برتن بنائے جاسکتے ہیں۔

ایک دوسرا کام اس شیشے سے یہ لیا جاسکتا ہے کہ موٹروں میں ہوا روک شیشہ اس شیشے سے بنایا جائے گا۔ اس میں سے برق گزرے گی جس سے اتنی حرارت پیدا ہو جائے گی کہ بارش کے قطرے اس شیشے پر ٹھہرنے نہ پائیں گے۔ علاوہ ا بھی چند رکاوٹیں دور کرنا باقی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ نوڈ شیشہ موصل برق نہیں ہے بلکہ اس پر ایک تہہ شفاف مادے کی چڑھا دی جاتی ہے۔ یہی تہہ دراصل برق کو گزرنے دیتی ہے۔ یہ تہہ ہوا روک شیشے کی بیرونی جانب ہوتی ہے اس لئے موٹر چلانے والا برقی روکے اثر سے محفوظ رہتا ہے۔ اس لئے اس شیشے کو اندر کی جانب چھو جاسکتا ہے۔ اس طرح کافی تیار کرنے کا جو برتن ہوتا ہے اس میں یہ مسالہ اندر کی طرف ہوتا ہے لہذا اس کو باہر سے ہاتھ لگایا جاسکتا ہے۔

برقی شیشے سے ایک نیلامپ تیار کیا گیا ہے جس میں نور بردار اشیاء (LUMINOUS) استعمال کی جاتی ہیں۔ یہہ اشیاء کم دلیٹج (برقی دباؤ) والی رو کو درست نور میں تبدیل کر دیتی ہیں۔ ان اشیاء کو ام ۹ میں دریافت کیا گیا تھا۔ چنانچہ شفان کار بورنڈم کی قلمیں سفید روشنی میں دیکھنے لگتی ہیں جب متبادل رو (ALTERNATING CURRENT) ان میں گزاری جاتی ہے۔

دس برس اوپر کار بورنڈم لمپ ایک عجوبہ کے طور پر دکھلائے جاتے تھے۔ باریک تار کے دو جالوں کے درمیان کار بورنڈم کی قلمیں دبا کر بھردی جاتی تھیں۔ اور ان جالوں کو شیشے کی دو تختیوں کے درمیان ہر بند کر دیا جاتا تھا۔ برقی رو ایک جال سے دوسرے جال تک ان قلموں پر سے ہو کر جاتی تھی۔ یہ لمپ عرض و طول میں کئی گز لمبے تھے۔ ۲۰ والٹ کی متبادل رو کی ضرورت تھی۔ روشنی ہلکی دمکی کی شکل میں نمودار ہوتی تھی۔

آج اس لمپ کو دوبارہ زندہ کیا گیا ہے لیکن اب برقی شیشہ اور نور بردار اشیاء استعمال کی جاتی ہیں ان اشیاء کو غیر موصل پلاسٹک کے ساتھ ملا کر شیشے کی سطح پر پھیلا دیا جاتا ہے۔ پھر دھات کا ایک پتلا ورق ان اشیاء پر پھیلا دیا جاتا ہے۔ پھر متبادل رو ورق سے شیشے تک ان اشیاء پر سے گزاری جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ اشیاء خوب روشنی دینے لگتے ہیں۔ یہ لمپ بھی چوکور ہے جس کا عرض طول کئی فٹ کا ہوتا ہے۔ اس کی روشنی بھی شیشے والے رخ سے آتی ہے۔ اس لئے تجویزیں ہو رہی ہیں کہ اس شیشے کو مکانات کی دیواروں اور چھتوں میں استعمال کیا جائے لیکن اس میں ابھی صرخہ بہت ہے۔ اسی طرح چوروں سے حفاظت کے خیال سے اس کو کھڑکیوں میں بھی لگانے کی تجویز ہے۔ کھڑکیوں میں یہ شیشہ باہر کی جانب ہوگا۔ رات کے وقت سب کھڑکیوں میں رو دوڑے گی۔ چونکہ برقی شیشہ گرم بھی ہو جاتا ہے اس لئے جو چور بھی ہاتھ لگائے گا وہ جل ہی جائے گا اور اسے جھٹکا بھی پہنچے گا۔

شیشے کا آدمی | کوہن کے عجائب خانہ صحت میں ۶۰ جرمن سائنس دانوں، ڈاکٹروں، مستریوں اور فن کاروں کی ایک جماعت ایسا سامان تیار کر رہی ہے جو آج تک کہیں نہیں بنایا گیا۔ یعنی وہ جسم انسانی کے مختلف اعضاء اور حصے ہر قسم کے اور مختلف اشیاء سے تیار کر رہے ہیں حتیٰ کہ گوشت اور ہڈی سے بھی۔

وہ لوگ بڑے فخر کے ساتھ ایک ”شیشے کا آدمی“ دکھلاتے ہیں۔ اس کی ہڈیاں ڈھلے ہوئے ایلومینیم کی ہیں اور اس کی جلد ایک خاص قسم کے شیشے کی ہے۔ اور اس کے سب اعضاء نیم شفاف پلاسٹک کے ہیں۔ سب کے سب صحیح پیمانے پر ہیں۔ دماغ سے لے کر مثانے تک کے اعضاء اندر سے منطقی ترتیب میں روشن ہوتے ہیں اور یہ شیشہ زادہ ہر عضو کی غرض و غایت خود ہی بتلاتا ہے۔ اس کے اندر دھمیل کے رنگین تار ہیں جو ہر سنس، شربان، اعصاب وغیرہ کا صحیح مقام روشن کر کے بتلاتے ہیں ساتھ ہی ان کی جگہ اور ان کا فعل بھی واضح کرتے ہیں۔

کوہن کے اس عجائب خانے نے ”شیشے کی عورت“ بھی تیار کی ہے جس کی قیمت تقریباً ۶۰۰۰ روپیہ ہے۔

قصص القرآن جلد چہارم حضرت عیسیٰ

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات اور

متعلقہ واقعات کا بیان۔ دوسرا ایڈیشن جس میں ختم نبوت کے اہم اور ضروری باب کا اضافہ کیا گیا ہے۔

قیمت چھ روپے آٹھ آنے ہے جلد سات روپے آٹھ آنے میں اسلام کا اقتصادی نظام وقت کی اہم ترین

کتاب میں اسلام کے نظام اقتصادی کا مکمل نقشہ پیش کیا گیا ہے جو تھرا ایڈیشن قیمت پندرہ روپے

اسلام نظام مساجد قیمت پندرہ روپے جلد لکھ مسلمانوں کا عروج و زوال :-

جدید ایڈیشن۔ قیمت للعمم جلد ص

مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ لغت قرآن پر پے مثل کتاب۔ جلد اول۔ طبع دوم

قیمت للعمم جلد ص

جلد ثانی قیمت للعمم جلد ص

جلد ثالث قیمت للعمم جلد ص

جلد رابع (زیر طبع)

مسلمانوں کا نظم مملکت مصر کے مشہور مصنف

ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن کی محققانہ کتاب النظم الاسلامیہ

کا ترجمہ۔ قیمت للعمم جلد ص

ہندوستان میں مسلمانوں کا

نظام تعلیم و تربیت

جلد اول :- اپنے موضوع میں بالکل جدید کتاب

قیمت چار روپے للعمم جلد پانچ روپے ص

جلد ثانی :- قیمت چار روپے للعمم جلد پانچ روپے ص

قرآن اور تصوف حقیقی اسلامی تصوف پر

محققانہ کتاب۔ قیمت ع۔ جلد ص

ترجمان السنہ جلد اول۔ ارشادات نبوی کا

بے مثل ذخیرہ۔ قیمت ننانوے روپے

ترجمان السنہ جلد دوم۔ اس جلد میں چھ سو کے

قریب حدیثیں آگئی ہیں قیمت للعمم جلد ص

تحفۃ النظائر یعنی خلاصہ سفرنامہ ابن بطوطہ

مع تنقید و تحقیق از مترجم و نقشبندی سفر قیمت ص

قرون وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات

قرون وسطیٰ کے حکماء اسلام کے شاندار علمی کارنامے

جلد اول۔ قیمت پچاس روپے

جلد دوم قیمت پچاس روپے

عرب اور اسلام :-

قیمت تین روپے آٹھ آنے ہے جلد پانچ روپے آٹھ آنے میں

وہی الہی

مسئلہ وحی اور اس کے تمام گوشوں کے بیان پر پہلی

محققانہ کتاب جس میں اس مسئلہ پر ایسے دل پذیر

انداز میں بحث کی گئی ہے کہ وحی اور اس کی صداقت

کا ایمان افروز نقشہ آنکھوں کو روشن کرتا ہوا دل کی

گہرائیوں میں سما جاتا ہے۔

جدید ایڈیشن۔ قیمت پچاس روپے

جلد چار روپے

چند چند

میں جہنم

اردو بازار جامع مسجد دہلی - 4

مختصر قواعد ندوۃ المصنفین دہلی

۱۔ **محسن خاص** جو مخصوص حضرات کم سے کم پانچ سو روپیہ یکمشت مرحمت فرمائیں وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنین خاص کو اپنی شمولیت سے عزت بخشیں گے ایسے علم نواز اصحاب کی خدمت میں ادائے اور مکتبہ برہان کی تمام مطبوعات نذر کی جاتی رہیں گی اور کارکنان ادارہ ان کے قیمتی مشوروں سے مستفید ہوتے رہیں گے۔

۲۔ **محسنین** جو حضرات پچیس روپے مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنین میں شامل ہوں گے۔ ان کی جانب سے یہ خدمت معاوضہ کے نقطہ نظر سے نہیں ہوگی بلکہ عطیہ خاص ہوگا۔ ادارے کی طرف سے ان حضرات کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات حق کی تعداد تین سے چار تک ہوتی ہے۔ نیز مکتبہ برہان کی بعض مطبوعات اور ادارہ کا رسالہ "برہان" بلا کسی معاوضہ کے پیش کیا جائیگا۔ جو حضرات اٹھارہ روپے پیشگی مرحمت فرمائیں گے ان کا شمار ندوۃ المصنفین کے حلقہ معاونین :- معاہدین میں ہوگا ان کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات ادارہ اور رسالہ برہان (جس کا سالانہ چندہ چھ روپے ہے) بلا قیمت پیش کیا جائے گا۔

۳۔ **اجتہاد** نورپے ادا کرنے والے اصحاب کا شمار ندوۃ المصنفین کے اجتہاد میں ہوگا۔ ان کو رسالہ بلا قیمت دیا جائے گا اور طلب کرنے پر سال کی تمام مطبوعات نصف قیمت پر دی جائیں گی یہ حلقہ خاص طور پر علماء اور طلبہ کے لئے ہے۔

قواعد رسالہ برہان (۱) برہان ہر انگریزی مہینے کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔ (۲) مذہبی، علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین اگر وہ زبان و ادب کے معیار پر پورے اتریں برہان میں شائع کئے جاتے ہیں۔ (۳) باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاک خانوں میں ضائع ہو جاتے ہیں جن صاحب کے پاس لٹا نہ پہنچے وہ زیادہ سے زیادہ ۵۰ تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیں۔ ان کی خدمت میں پرچہ دوبارہ بلا قیمت بھیج دیا جائے گا۔ اس کے بعد شکایت قابل اعتنا نہیں سمجھی جائے گی۔

(۴) جواب طلب امور کے لئے ۲۰ آنے کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا چاہئے۔ خریداری نمبر کا حوالہ ضروری ہو۔ (۵) قیمت سالانہ چھ روپے۔ دوسرے ملکوں سے ساڑھے سات روپے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ۔ (۶) منی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھئے۔

مولوی محمد ادریس پرنٹر پبلشر نے جمید برقی پریس میں طبع کرا کر دفتر برہان جامع مسجد ہلی سے شائع کیا

ندوة ائمة دینی کا علمی و دینی مآہنامہ

سُپان

مرتب
سعید احمد بک سرآبادی

ندوة المصنفین دہلی کی مذہبی و تاریخی مطبوعات

ذیل میں ندوة المصنفین دہلی کی چند اہم دینی، اصلاحی اور تاریخی کتابوں کی فہرست درج کی جاتی ہے۔

مفصل فہرست جس میں آپ کو ادارے کے حلقوں کی تفصیل بھی معلوم ہوگی دفتر سے طلب فرمائیے۔

اسلام میں غلامی کی حقیقت جدید ایڈیشن

جس میں نظر ثانی کے ساتھ ضروری اضافے بھی کئے گئے ہیں قیمت سترے، مجلد للکھ

سلسلہ تاریخ ملت مختصر وقت میں تاریخ اسلام

کا مطالعہ کرنے والوں کیلئے یہ سلسلہ نہایت

مفید ہے اسلامی تاریخ کے یہ حصے مستند و معتبر

بھی ہیں اور جامع بھی۔ انداز بیان نکھر اہل اور شگفتہ

نبی عربی صلعم تاریخ ملت کا حصہ اول جس میں

مسور کائنات کے تمام اہم واقعات کو ایک خاص

ترتیب سے نہایت آسان اور دل نشین انداز میں

یکجا کیا گیا ہے۔ قیمت پندرہ، مجلد پیر

خلافت راشدہ تاریخ ملت کا دوسرا حصہ

عہد خلفائے راشدین کے حالات و واقعات کا

دل پذیر بیان قیمت پندرہ، مجلد پیر

خلافت بنی امیہ تاریخ ملت کا تیسرا حصہ

قیمت تین روپے آٹھ آنے۔ مجلد تین روپے بارہ آنے

خلافت ہسپانیہ تاریخ ملت کا چوتھا حصہ

قیمت دو روپے۔ مجلد دو روپے چار آنے

خلافت عباسیہ (جلد اول) تاریخ ملت کا

پانچواں حصہ، قیمت پندرہ، مجلد للکھ

خلافت عباسیہ (جلد دوم) تاریخ ملت کا

چھٹا حصہ۔ قیمت للکھ، مجلد صفر

تاریخ مصر و مغرب اقصی تاریخ ملت کا ساتواں حصہ

مصر اور سلاطین مصر کی مکمل تاریخ صفحات ۳۰۰

قیمت تین روپے چار آنے۔ مجلد تین روپے آٹھ آنے

خلافت عثمانیہ تاریخ ملت کا آٹھواں حصہ مجلد پیر

فہم قرآن جدید ایڈیشن جس میں بہت سے آہم

اصناف کئے گئے ہیں اور مباحث کتاب کو از سر نو

مرتب کیا گیا ہے۔ قیمت پندرہ، مجلد پیر

غلامان اسلام انہی سے زیادہ غلامان اسلام

کے کمالات و فضائل اور شاندار کارناموں کا تفصیلی

بیان۔ جدید ایڈیشن قیمت پندرہ، مجلد پیر

اخلاق و فلسفہ اخلاق علم الاخلاق پر

ایک بسوط اور محققانہ کتاب۔ جدید ایڈیشن جس میں

غیر معمولی اضافے کئے گئے ہیں۔ اور مضامین کی

ترتیب کو زیادہ دل نشین اور سہل کیا گیا ہے۔

قیمت پندرہ، مجلد پیر

قصص القرآن جلد اول تیسرا ایڈیشن۔

حضرت آدمؑ سے حضرت موسیٰ و ہارونؑ کے حالات و

واقعات تک۔ قیمت سترے، مجلد صفر

قصص القرآن جلد دوم حضرت یوسفؑ سے

حضرت یحییٰؑ کے حالات تک تیسرا ایڈیشن قیمت سترے، مجلد للکھ

قصص القرآن جلد سوم انبیاء علیہم السلام کے واقعات

کے علاوہ انی قصص قرآنی کا بیان قیمت صفر، مجلد صفر

برہکان

شمار نمبر ۲۰۵

جلد سی ام

فروری ۱۹۵۳ء مطابق جمادی الاول ۱۳۷۲ھ

فہرست مضامین

۶۶	سعید احمد	نظرات
۶۹	جناب انعام اللہ خاں صاحب انصاریہ ریزہ نانہہ لکھنؤ	حکیم سنائی
۸۱	جناب مولانا ابو محفوظ الکرم معصومی لکھنؤ تاریخ عالیہ	ہندوستان کے عربی شعراء پر ایک نظر
۹۱	جناب مولانا محمد ظفر الدین صاحب پورہ نو دیہائی شادوالہ	مسلمان حکومتوں کی موجودہ دہوں حالی
۱۰۷	جناب محمد عبداللہ صاحب ایم۔ اے استاد عالیہ کلکتہ	مدرسہ عالیہ کلکتہ کی مختصر تاریخ
		حالات حاضرہ
۱۱۳	جناب اسماعیل احمد صاحب آزاد	کینیا اور اس کے باشندوں کی قومی تحریک
		وفیات الاعیان
۱۱۹	عشق الرحمن عثمانی	حاجی شیخ رشید احمد صاحب مرحوم
۱۲۲	جناب محمود دہلوی	ادبیات غزل
	جناب شائق میرٹھی ایم۔ اے	رباعیات
۱۲۴	م۔ ا۔ ع۔	شعرون علیہ
۱۲۶	(ص)	تبصرے

نَظَرِ

اربابِ علم و ستون در بزرگوں کی طرف سے آئے دن ایسے خطوط ملتے رہتے ہیں جن میں برہان کے مضامین و مقالات کی نسبت حوصلہ افزا کلمات ہوتے ہیں۔ لیکن ان کو شائع کرنا تو کجا ان کا ذکر تک بھی نہیں کیا جاتا۔ لیکن آج ایک خاص مقصد کے پیش نظر ہم ایک خط شائع کرتے ہیں جو برہان کی اشاعتِ گزشتہ کے ایک مقالہ ”حضرت علیؑ کا نکاح ثانی“ کے متعلق وصول ہوا ہے یہ عنایت نامہ سردار صاحب ماسٹر مکتبہ منگھ کا ہے جو اردو کی صحافتی برادری کے ایک نہایت دیرینہ اہل بڑے ہی غلصہ رکن ہیں جناب موصوف ایک نصف صدی سے ”رہنمائے تعلیم“ مجلہ کے ذریعہ اردو زبان اور اخلاق و تعلیم کی مفید خدمات بڑے استقلال و رسمیت و پامردی کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔ اصل وطن مالوٹ لاہور ہے شکر کے انقلاب سے ترک وطن پر مجبور ہو کر وہلی میں آئے اور رہائے تعلیم اب وہلی سے ہی نکل رہا ہے جناب موصوف سے اس حیثیت کے ساتھ مجھ کو تعارف پہنچن سے ہے لیکن افسوس ہے کہ ملاقات کا موقع آج تک ایک مرتبہ بھی نہیں مل سکا۔

بہر حال اس مختصر تعارف کے بعد اب خط کا مضمون سنئے

”مجھے معاف کیجئے میں آپ کے بے حد قیمتی وقت کا ذرا سا حصہ اس کارٹ کے پڑھنے کے لئے لینے کی جسارت کر رہا ہوں۔ میں مجبور ہوں اور اپنے جذبہ کو پیش کئے بغیر نہیں رہ سکتا ہوں کیوں کہ ”ہر کس بنیال خوش خبطے وارد“ واقعہ یہ ہے کہ میں آپ کے تازہ برہان کے مطالعہ سے اس قدر متاثر ہوا ہوں کہ خواہ مخواہ اس کی تعریف کرنے پر مجبور ہوں۔ یوں تو آپ ہر مضمون کو ہی نہایت وضاحت اور صاف دماغی کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور ہمیشہ یہی ہوتا رہتا ہے مگر میں تازہ پرچہ کے مضمون ”حضرت علیؑ کا نکاح ثانی“ از صفحہ ۴۹ تا صفحہ ۸۵ کو پڑھ کر تو کہہ نہیں سکتا کہ کس درجہ متاثر ہوا ہوں۔

ہیں آمنہ عفت کے سوالات کا جواب جو آپ نے دیا ہے وہ نہایت واضح مدلل اور واقعات و

حوالہ جات کی بناء پر دیا ہے۔ مذہبی نقطہ نگاہ کے علاوہ آپ کے مضمون میں اخلاق کو بھی بہت زیادہ وقار حاصل ہے، یہی وجہ ہے کہ مجھے آپ کے طرز بیان اور بیان کے ذہن نشین کرنے کے طریق پر نہایت مسرت ہو رہی ہے۔ آخر میں بہن محترمہ کی تسلی و تشفی کے لئے سورج والی مثال ہی کافی ثبوت ہے کہ وہ اپنے اعتراضات کو فوراً واپس لے لیں بلکہ غلط فہمی کی بناء پر انھوں نے جو مشکوک صورت حال پیدا کر دی ہے اس سے توبہ کر لیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں اس مضمون کو اپنے رسالہ ”رہنمائے تعلیم“ میں درج کر کے بہت سے پڑھنے والوں کو اس اخلاقی سبق سے عبرت حاصل کرنے کا موقع دوں۔“

جگت سنگھ ۲۰ جنوری ۱۹۵۳ء

اس خط سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں ایک یہ کہ کوئی بات خواہ کیسی ہی مذہبی ہو لیکن انصاف دیانت اور سچائی سے کہی جائے تو اس کا اثر ہر مذہب کے پیرو پر ہوتا ہے بشرطیکہ اس کا دل تعصب کے ذنگ سے پاک نہ صاف ہو، دوسری بات جو بہت زیادہ خوش آئند ہے وہ یہ ہے کہ آمنہ عفت کے بعض الفاظ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس میں جو کسی قدر گستاخی کا پہلو لگتا تھا معلوم ہوتا ہے کہ جناب سردار صاحب موصوف کے دل کو ان سے ایسی ہی تکلیف پہنچی ہے جیسی کہ کسی عاشق رسول مسلمان کو پہنچ سکتی ہے۔ بلاشبہ موصوف کا یہ جذبہ آپ کی نیک دلی اور نیک طبیعت کا سب سے بڑا ثبوت اور لائق صد تحسین ہے ہماری موجودہ نسل کو سردار صاحب جیسے بزرگوں کی نیک دلی اور بلند اخلاقی سے سبق لینا چاہئے۔

اب چونکہ ذکر آگیا ہے تو اگرچہ میں طبعا اس کی اشاعت پسند نہیں کرتا تھا تاہم سردار صاحب اودان جیسے دوسرے حضرات کی اطلاع کے لئے لکھتا ہوں کہ میں نے عزیزہ آمنہ عفت کو ان کے خط کا جواب اکتوبر ۱۹۵۲ء میں ہی لکھ دیا تھا اور میرا ارادہ ہرگز نہیں تھا کہ اسے ”برہان“ میں شائع کروں۔ لیکن آں عزیزہ نے خط کے اس حصہ کی ترہان میں اشاعت پر اس قدر اصرار کیا کہ میں مجبور ہو گیا۔ بہر حال ان پر میرے خط کا کیا اثر ہوا اس کا اندازہ ان کے خط کے مندرجہ ذیل اقتباس سے ہو گا جو میرے خط کے

جواب میں اکتوبر میں ہی آیا تھا:-

”مہ جانے آپ نے خط کس گھڑی اور کس دل سے لکھا تھا کہ پڑھتے ہی حالت غیر ہو گئی۔ ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے سینہ میں خنجر بھونک دیا ہے۔ تین چار دن تو یہ کیفیت رہی کہ جہاں حضور پُر نور یا فاتونِ جنت حضرت فاطمہ کا نام نامی زبان پر آیا اور بے ساختہ آنسو رواں ہو گئے اور ہچکچاہٹ بند ہو گئی گو یا میری حالت ہو ہو ہو اس شعر کا مصداق ہو گئی۔“

جب نام ترا لیجئے تب چشم بھراؤں اس طرح سے جینے کو کہاں سے جگر آؤں
اب اگر وہ کیفیت نہیں ہے تاہم یہ گنہگار دل حب نبوی و حب اہل بیت کی غیر معمولی سی روشنی سے
منور ہے اور میں اکثر درود و سلام پڑھتی رہتی ہوں۔“
امید ہے کہ اس اقتباس کے بعد سردار صاحب اور دوسرے حضرات کو اطمینان ہو جائے گا

جہاں تک اس ناچیز کا تعلق ہے بس یہ ہی کہا جاسکتا ہے کہ اگر اس کی تحریر سے کسی ایک دل میں
بھی عشق و محبتِ نبوی کا کوئی چراغ روشن ہو سکا ہے تو ”شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم“
و کفی به فخراً

غلامانِ اسلام

اسی کے قریبان صحابہ تابعین، تبع تابعین، فقہاء اور محدثین اور ارباب کشف و کرامات اور اصحابِ علم و ادب کے
سوانح حیات اور کمالات و فضائل بڑی تحقیق و تدقیق سے جمع کئے گئے ہیں جنہوں نے غلام یا آزاد کردہ غلام ہونے کے باوجود
ملت کی عظیم الشان خدمتیں انجام دیں جنہیں اسلامی سوسائٹی کے ہر دور میں عظمت و اقتدار کا فلک الافلاک سمجھا گیا اور جن کے
علمی، مذہبی، تاریخی اور سماجی کارنامے اس قدر شاندار اور اس قدر روشن ہیں کہ ان کی غلامی پر آزادی کو رشک کرنے کا حق ہے اور سجا
ہے یہ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ ایسی محققانہ و محسبہ امور و معلومات سے بھرپور کتاب اس موضوع پر اب تک کسی زبان
میں شائع نہیں ہوئی اس کے مطالعہ سے غلامانِ اسلام کے حیرت انگیز اور شاندار کارناموں کا نقشہ آنکھوں میں سما جاتا ہے
دوسرا ایڈیشن صفحات ۴۸۸ بڑی تقطیع قیمت پانچ روپے آٹھ آنے کا ہے

حکیم سنائی

مترجم

(جناب انعام اللہ خاں صاحب ناہر)

ایڈیٹر روزنامہ الجمعیت - دہلی

افغانستان کے مشہور ادیب خلیل اللہ خلیلی نے کئی سال ہوئے حکیم سنائی رحمۃ اللہ علیہ کے سوانح حیات بڑی ہی جانفشانی اور کاوش سے فارسی میں مرتب کئے تھے، انعام اللہ خاں صاحب ناہر نے جو ایک کہنہ مشوق اخبار نویس و ریختہ فلم مصنف ہیں اس ”محققانہ تذکرے“ کو اردو کا قالب دیا اور حق یہ ہے کہ ترجمہ کا حق ادا کر دیا آج اس اہم اور مفید علمی مقالے کے حبت حبت حصے ”برہان“ میں شائع کئے جا رہے ہیں،

ایڈیٹر

نام تمام تذکرہ نگار اس بات پر متفق ہیں کہ سنائی کا نام مجدد تھا اور خود سنائی کے اقوال سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے چنانچہ حدیقے میں ایک جگہ فرماتے ہیں۔

شعرا را بلفظ منظوم - زان قبل نام گشت مجددوم

دوسری جگہ فرماتے ہیں

گوئی این اعتقاد مجدد و داست - جملہ ہر گفتش آئینہ مقصود است

ایک قصیدے میں ارشاد ہوتا ہے

کے نام کہن گرد و مجدد سنائی را نو نوچو بیار آید در وصف تو دیواں ہا

حدیقے کے دیباچہ منشور میں لکھا ہے کہ میں مجدد بن آدم سنائی ہوں۔ کہ یہ دیباچہ حکیم سنائی

کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، اور بعض لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ سنائی کا نام حسن تھا یہ بات کچھ بے اصل

سی معلوم ہوتی ہے اول تو اس لئے کہ سنائی نے ہر جگہ اپنا نام مجدد بتایا ہے۔ دوسرے اس وجہ سے کہ ان

کے معاصرین اور بعد کے مورخین میں سے کسی نے سنائی کو حسن کے نام سے یاد نہیں کیا۔ تبصرے اس سبب سے کہ سنائی کی لوح مزار پر لفظ مجدد لکھا ہوا ہے

کنیت | سنائی کی کنیت جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں اور مروی ہے نے چار مقالہ میں حمد اللہ مستوفی نے تاریخ گزیدہ میں اور جامی نے نغرات میں لکھا ہے ابوالمجدیقی۔ چنانچہ حدیقہ میں ایک جگہ فرماتے ہیں۔

ہر کہ اوکشتہ طالبِ مجد است شفی او ز قول ابوالمجد است

تخلص سنائی تھا (سنائی معنی نور و روشنی) حکیم صاحب نے اپنے قصائد اور مثنویات میں یہ تخلص اختیار کیا۔ اور معاصرین اور ان کے اخلاف نے انہیں اسی تخلص سے یاد کیا ایک جگہ خود فرمایا

سنائی اگر تو خدا سے ڈرتا ہے سنائی اگر تو خدا سے ڈرتا ہے

زمیر چہ پاک و نزار شاہ چہ غم خدا شناس ہے تو بچے کسی امیر سے کیا خوف اور بادشاہ

کی کیا پردا۔

حدیقہ میں کہا ہے:

اے سنائی جو یافتی امکان۔ بنائی اندر اس اے سنائی اگر تجھے قدرت ہے تو اس کلام کو مدلل کر

سخن بر معان

فخاری کہتا ہے

سنائی راصلت ہا بخش تا او ہم چناں مدحے سپرد ازو کہ ہمتا نیست اندر شرافتش

سنائی کو سید بخش نامزد بھی مدح کرے۔ فن شرمیں کوئی دوسرا اس کا حرف نہیں ہے

مولانا جلال الدین بلخی نے کہا ہے

عطار روح بود و سنائی دو چشم او ما از پے سنائی و عطار آمدیم

عطار روح تھے اور سنائی ان کی دو آنکھیں۔ ہم ان دونوں کے بعد آئے۔

سلمان نے کہا ہے

سنائی اگر مرادیدے ز رنگ و نام کے گفتے مسلمان ز سلمان جوئی و درد دین ز بود و روا

سنائی اگر مجھے دیکھتے تو شرم سے ہرگز یہ نہ کہتے کہ اسلام کی حقیقت سلمان سے معلوم کرو اور دین کا دہرہ
بود و ا کے دل میں ڈھونڈ۔

لقب سنائی اپنے زمانے میں حکیم کے لقب سے ملقب تھے۔ جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں
خاک غزنی چو من ز ا د حکیم آتش باد خوار و آب ندیم
از ہمہ شاعران بہ اصل و بہ فرع من حکیم بقول صاحب شرع
غزنی کی سرزمین میں میری مانند کوئی حکیم پیدا نہیں ہوا۔ اس آگ کی طرح جو ہوا کھاتی ہو اور پانی کو
دوست رکھتی ہو۔

تمام شعرا میں اصل اور فرع کے اعتبار سے بھی بقول صاحب شرع حکیم ہوں
جامی لطف علی بیگ۔ آرزو شبلی صاحب خزینۃ الاولیاء انھیں حکیم کے لقب سے یاد کرتے ہیں
مولانا جلال الدین بلخی کہیں انھیں حکیم اور کہیں شیخ کبیر کے نام سے یاد کرتے ہیں دولت شاہ سمرقندی نے
انھیں شیخ العارف کا لقب دیا امین احمد رازی نے انھیں استاد الحکماء لکھا ہے
مولانا یعقوب صرخانی نے انھیں اپنی تفسیر میں شیخ کا لقب دیا۔ محمد بن علی اقام اور عبد اللطیف جاکا
نے حکیم سے ملقب کیا ہے۔

مولد ان کا انھیں کے قول کے مطابق نیز اتفاق مورخین غزنی تھا۔ ایک جگہ فرماتے ہیں۔
گرچہ مولد مرا ز غزنین است نقش شرم چو نقش ماچین است
اگرچہ میں غزنی میں پیدا ہوا ہوں۔ لیکن میرا شرم نقش چین کی مانند دل فریب ہے
اور دوسری جگہ ایک معاصر کو مخاطب کر کے کہتے ہیں

شاد باش از من و از خود کہ اندر نظم و نثر نثر خراساں چو توئی زاد است نثر غزنی چو من
مجھ سے اور اپنے سے خوش رہ اس لئے کہ نہ خراسان میں جبری مانند کوئی نثر نگار پیدا ہوا اور نہ غزنی میں
میری مانند کوئی شاعر

سنائی کے والد کا نام تمام مورخین کے قول کے مطابق آدم تھا۔ حکیم کے اشعار سے بھی معلوم ہوتا ہے

کان کے والد اپنے زمانے کے بزرگوں میں سے تھے۔ اور ان کا خاندان شرافت و نجابت میں ممتاز تھا منائی نے کہا ہے

پدرے دارم از نژاد کرام از بزرگے کہ بہت آدم نام
میرے والد ایک شریف خاندان کے فرد ہیں اور ان کا نام آدم ہے۔

حکیم۔ جب کارنامہ بلخ میں ثقہ الملک سے خطاب کرتے ہوئے اپنے والد کے متعلق فرماتے ہیں کہ وہ اہل قرآن ہیں اور تمہارے واسطے اس سے بہتر دسید نہیں ہو سکتا کہ اہل قرآن تمہارا دبیر اور ملازم ہو

منیت زیں بہ دسیلتے بر تو اہل قرآن دبیر و چاکر تو
مذکورہ بالا شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ آدم نہ صرف اپنے زمانے کے شرفاء میں شمار ہوتے تھے بلکہ علماء و دانشمندوں میں بھی انھیں محسوب کیا جاتا تھا اور وہ ثقہ الملک جیسے وزیر کے دبیر تھے۔ سنائی نے دوسری جگہ اپنی کم آزاری اور شرافتِ نسبی پر فخر کرتے ہوئے یہ کہا کہ یہ خصلت شرافت و نجابت کا نتیجہ ہے
کم آزار و بے رنج پاکیزہ عرضم کہ پاک است الحمد للہ نژادم

میں کسی کو آزار نہ پہنچانے والا اور نیک خواہوں۔ الحمد للہ کہ میری نسل شریف ہے
ایک اور قصیدے میں ممدوح کی تعریف کرتے ہوئے اپنے والد کو صفِ شعراء میں شمار کرتے ہیں اور فرماتے ہیں۔

خاصہ از جود تو دارد پدرم طوفی از منت اندر گردن
میرے والد کی گردن میں آپ کے احسان کا طوق ہے

ہمہ ہر تو نگارد برداں ہمہ مدح تو سر آید بہ سخن
ان کے دل میں آپ کی محبت ہے اور زبان پر آپ کی مدح

کارنامہ بلخ سے معلوم ہوتا ہے کہ آدم سلطان مسعود بن ابراہیم کے زمانے تک بقیدِ حیات تھے لیکن ان کا بڑھا پاپریشانی و تنگدستی انہیں گذر رہا تھا ثقہ الملک کو اپنے والد کے متعلق لکھتے ہیں۔

لے کارنامہ بلخ سے ثقہ الملک سلطان مسعود بن ابراہیم کا وزیر تھا۔

رطب کام نیش کردہ ز عمر ریش چوں قلب خوش کردہ ز عمر
 عمر میں بہت تکلیفیں اٹھائی ہیں۔ اور ڈاڑھی کو اپنے دل کی طرح سفید کر لیا ہے
 از برائے چو تو نکو خوئے بد نباشد چو دعا گوئے
 آپ کی مانند ایک نیک خصلت انسان کے واسطے ایک دعا گو ہر نہیں
 گنج کس از سخا و ژم نشود چوں خزینہ فدائے کم نشود
 کسی کا خزانہ سخاوت سے خالی نہیں ہوتا۔ جس طرح خدا کا خزانہ خالی نہیں ہوتا۔
 اخلاقِ اہلیم سنائی حلقہ صوفیا میں شامل ہو کر گویائی زندگی کے دروازے میں داخل ہو گئے۔ نئی زندگی
 کا مقصد عفا بنی نوع کو فائدہ پہنچانا۔ غریبوں کو مدد دینا اور محتاجوں کی دستگیری کرنا۔ کج تنہائی میں بیٹھا مشق
 حقیقی اختیار کرنا اور اس مادی دنیا سے تعلق توڑ کر دوسرے جہان سے ربط قائم کرنا
 رستہ ز ترکیب زمان و مکان حبسہ ز ترتیب شہور و سنن
 زمان اور مکان کی ترکیب سے الگ۔ اور ماہ و سال کی ترتیب سے جدا
 پائی نہ بد چرخ بزیر قدم دست نہ د ملک بزیر انگیں
 پاؤں نہیں لیکن آسمان زیر قدم ہے۔ ہاتھ نہیں اور ملک زیر انگیں ہے۔
 اور یہی وجہ تھی کہ سلوک میں قدم رکھنے کے بعد ان کی تمام عمر ترک و تجرید میں گزری۔ مخلوق کی کفر
 سے زبان روک لی ترجمانی حقیقت کے سیرا کوئی بات نہ کی۔ امرا اور بادشاہوں کے دربار میں جانا چھوڑ
 دیا۔ صغیر کے بادشاہ کے واسطے گریبان سے تاج بنایا اور دامن سے تخت تیار کیا۔
 اے سنائی جہد کن تا بہر سلطان ضمیر از گریبان تاج سازی و ز بن دامن سرور
 اے سنائی کویشن کر کہ سلطان صغیر کے واسطے۔ اپنے گریبان سے تاج اور دامن کے گوشے سے تخت بنا سکے
 علم حقیقی کے طالب ہوئے یہاں تک کہ علم نے ان سے انھیں لے لیا۔ عزت نفس اور بلندی مہمت
 کو اپنی تکبر گاہ بنایا غلامی تن سے چھوٹ کر آقلے جان بن گئے۔
 علم کمز تو برا نہ ستاند جہل زان علم بہ بود بسیار

۵۲۔ ہم جو تجھ سے خود کو نہ لے سکے تو اس سے پہل بہت اچھا
 ان کا مرتبہ ایک ملک بلند ہوا کہ محمود غزنوی کا پوتا بہرام شاہ باں بہرہ مجد و حشمت اپنی بہن کو ان کے
 حلال عقد میں دیا تھا اور وہ معذرت کرتے تھے۔

مے ستائی خواجہ جانی غلام تن مباش خاک راجوں دوست داری پاک دشمن مباش
 اے ستائی تو خواجہ جان ہے تن کا غلام نہ بن۔ اگر خاک کو دوست رکھتا ہے تو پاک کا دشمن نہ بن
 ایک قصیدے میں کہتے ہیں

من نہ مرد زن دزر و حباہم بہ خدا گر کنم و گر خواہم
 میں زن دزر و جاہ کے طلبگاروں میں نہیں ہوں
 گر تو تاج دہی ز احسانم بہ سر تو کہ تاج ستانم
 اگر تو احسان کا تاج بھی عطا کرے تو میرے سر ہی قسم میں اس تاج کو قبول د کروں
 انھیں مخلوق کی تعریف سے نفرت ہو گئی تھی اور اس بات کو سخت مذموم اور معیوب سمجھتے
 تھے کہ عزت و دولت حاصل کرنے کے لئے تلوں و چالو سی کے طور پر خوشامد کی باتیں کی جائیں بہرہ
 مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

اے ز من خوش مرا کن ناخوش کہ مکافات آں نباشد این
 اگر تو مجھ پر ہرمان ہے تو مجھے ناخوش نہ کر۔ کہ اس کا بدلہ یہ نہیں
 زین و مرکب را مرا بگذار تا شوم ز این پیادہ گی فرزیں
 زین اور گھوڑا تجھے مبارک رہے مجھے برے حال پر چھوڑنا کہ میں پیادہ سے فرزیں و وزیر بن جاؤں
 شہیر جبرئیل مرکب ادست چہ کند جبرئیل مرکب و زین؟
 اس کا مرکب شہیر جبرئیل ہے۔ اور جبرئیل کو مرکب و زین سے کیا سروکار؟

عقل نامہ میں ایک جگہ فرماتے ہیں
 مستانہ بندہ را کہ بد باشد مدح مخلوق ذم خود باشد

بندہ کی تعریف نہ کر۔ اس لئے کہ مخلوق کی مدح اپنی مذمت ہے۔

چہ کشاید ز بنیوائے چہند چہ توان خواست از گدائے چند
بے نواؤں سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے اور گداؤں سے کیا چیز طلب کی جاسکتی ہے؟
گوشہ گیری اور قناعت کو ہر چیز پر ترجیح دیتے تھے۔ نااہلوں کی صحبت سے بھاگتے تھے۔ ان
کی ہمتِ عالی کے سامنے یہ مادی دنیا کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتی تھی۔ چنانچہ فرماتے ہیں
خلق را جملہ صورتی انگار ایچ از ایچ خلق طمع مدار
مخلوق کو محض صورت سمجھ۔ کسی سے کسی چیز کی امید نہ رکھ

زحمت خود ز اہل عصر بکاہ ہر چہ خواہی ز خالق خود خواہ
اہل عصر کو کوئی تکلیف نہ دے۔ جو کچھ طلب کرنا ہوا اپنے خالق سے طلب کر

چوں ستانی نوال اور خوشتر بخشش بے زوال اور خوشتر
اگر تجھے لینا ہے تو اس کی بخشش کا لینا اچھا۔ اور اسی کی بخشش بے زوال اچھی۔

بخت من زان چہیں ژند افتا کہ مرا ہمت بلند افتادہ
میرا نصیب اس لئے خراب ہے۔ کہ میری ہمت بلند واقع ہوئی ہے

دست در رشتہ حقایق زن پائے بر صحبت خلاق زن
حقائق کی جستجو کر۔ اور صحبتِ خلق سے کنارہ کر

سنائی ریاکاری اور ان علمائے ریاکار سے سخت بے زار تھے جو علم کو اپنی اغراضِ شخصی کی پیش
برد اور دوسروں کی ایذا رسانی کا ذریعہ بناتے ہیں ایک قصیدے میں فرماتے ہیں۔

عالمت خفتہ است و تو خفتہ خفتہ را خفتہ کے کند بیدار

تیری دنیا بھی سو رہی ہے اور تو بھی سو رہا ہے۔ سوئے ہوئے کو سو با ہوا کب جگا سکتا ہے

غول باشد نہ عالم آنکہ ازو بشنوی گفت و نشنوی کردار

نہ حدیقہ نہ عقل نامہ نہ کار نامہ نہ طریق الحقین

وہ شخص خول بیابانی ہے عالم نہیں۔ جو گفتار رکھتا ہو اور کردار نہ رکھتا ہو۔

نہ ہواں لعنت است بر اہلبے کہ نذاذ ہے بین ز یار

شیطان پر لعنت اس وجہ سے نہیں کہ وہ داکیں باتیں کو نہیں جانتا

بل ہواں لعنت است کا اندوہیں علم داند بعلم نکند کار

بلکہ لعنت اس وجہ سے ہے کہ وہ اپنے علم کے مطابق عمل نہیں کرتا

اور یا اس بیت میں

حسرت آں را کے بود کزد خہ زی دوزخ برند حسرت آں بر اکش بدوخ از سر مہر برند

حسرت اس کو نہیں ہو سکتی جسے قبرستان سے دوزخ کی طرف لے جائیں حسرت اس کو ہوتی ہے جسے نہر سے دوزخ کی طرف لے جائیں

اور پھر اس شعر میں

چو عقلت است خدمت کن چو دانیایں کہ زشت آید گرفتہ چینیاں احسرام دختہ کی در بطحا

اگر تجھے علم ہے تو داناؤں کی طرح خدمت کر۔ یہ بات اچھی نہیں معلوم ہوتی کہ عینی تواجرام باندے ہوں اور مکہ کا باشندہ ہو جاؤں

سنائی کا شمار شعرائے اجتماعی میں ہوتا ہے۔ اس لئے کہ وہ تمام مسلمانوں کو یہ نگاہ مساوات دیکھتے

تھے اور تمام انسانوں کو (بندہ گان یک داغ و میوہ یک باغ) جانتے تھے۔ تفرقہ انگیزی اور دورنگی

سے انھیں سخت نفرت تھی۔

تو کئی گر کسے نکلندہ دوست باہم عیب بندہ بندہ دوست

اگر کسی کو اس نے پسند کر دیا ہے تو مجھے کیا؟ تمام عیبوں کے باوجود بندہ اسی کا بندہ رہتا ہے۔

چند تفسیر بے بیاں کردن چند تکفیر بندگاں کردن

بیان کے بغیر تفسیر کب تک کرے گا۔ اور کب تک بندگان خدا کو کافر ٹھہرائے گا۔

گر دلت را در اپنے بودے از دورنگی فراغنے بودے

اگر میرے دل میں دانش ہوتی تو۔ دورنگی سے پاک ہوتا۔

ہمہ در بندگی یک داغند ہمہ گان میوہ ہائے یک باغند

سب ایک ہی آقا کے غلام ہیں اور سب ایک ہی باغ کے میوے ہیں۔

حدیقہ میں امام اعظم اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما کی منقبت سے فارغ ہو کر دونوں مذاہب کے پیروں کو اتحاد کی دعوت دیتے ہیں اور تلقین کرتے ہیں کہ جزئیات کی بناء پر باہم نفاق اور بے لگائی پیدا نہ کریں۔ سوائے دائرہ حیات سیاسی کے اندر داخل نہ ہونے اور بادشاہوں کے دیباہوں میں مکر آمدورفت رکھنے کے باوجود کمزوروں اور مظلوموں کی طرفداری کرنے تھے اور اپنے زمانے کے قمر کو عدل و انصاف کا درس دیتے تھے۔ حدیقہ میں فرماتے ہیں

خوش بود خاصہ از جہانگیراں رحمت طفل و حرمت پیراں

بچوں پر مہربانی اور بزرگوں کی تعظیم اچھی ہے اور بادشاہوں کے لئے خصوصیت سے زیادہ اچھی

ہست نزد مہدای و خلق اے شاہ شکر نعمت قبول عذر گناہ

اے بادشاہ خدا اور خلق کے نزدیک۔ گناہ کا عذر قبول کرنا ہی شکر نعمت بجالانا ہے

چوں بہ از خلقت آفریدہ خدائی تو بہ از خلق بندگش سنائی

چوں کہ خدا نے تجھے خلقت میں بہتر پیدا کیا ہے اس لئے تو خلق سے بہتر اس کی بندگی کر

طالب شاہ عادل است جہاں تو عدالت کن و جہان بستان

جہان منصف بادشاہ کا طالب ہے۔ تو انصاف کر اور جہان کو تسخیر کرے

عدل کن ز آنکہ در ولایت دل در پیغمبری نزد عادل

انصاف کر کہ دل کی ولایت میں منصف پیغمبری کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے

لے با رایت عدد شکناں ریز ریز از دعائے بیوہ زناں

دشمنوں پر غالب آنے والوں کے جھنڈے۔ بیوہ عورتوں کی بددعاؤں سے پارہ پارہ ہو گئے

آنچہ یک پیرہ زن کند بہ سحر نکند صد ہزار تیر و تبر

صبح کے وقت ایک بوڑھا جو کچھ کر سکتی ہے۔ وہ ایک لاکھ تیر و تبر بھی نہیں کر سکتی

و آنچہ در نیم شب کند زالے نکند چوں تو خردے سالے

ایک بوڑھا جو کچھ رات بھر میں کر سکتی ہے۔ وہ تجھ ایسا بادشاہ سال بھر میں بھی نہیں کر سکتا۔
 سنائی کی نظر میں دنیا کے ٹھاٹھ اور ظاہری تجمل کی کوئی حقیقت نہ تھی ان کا خیال تھا کہ بزرگی اور
 حشمت انسان کو فروتن اور متواضع بناتی ہے اور خود پرستی اور خود سنائی کے خیال کو اس کے پاس بھی
 نہیں چھینکنے دیتی۔

دولت آں را مداں کہ داوندت بیش از ابنائے صن استظہار
 اس کو دولت نہ سمجھ کہ تجھے دوسروں سے زیادہ شان و شوکت دی گئی ہے
 تا ترا مایہ دولت است نہئی در جہان خدائے دولت یار
 جب تک تو زر کو دولت سمجھا رہے گا۔ اس وقت تک جہان میں جیتنا نہ ہوگا
 چوں ترا از تو پاک بستاند دولت آں دولت است و کار آں کار
 دولت اور کام وہی ہے جو تجھ کو تجھ سے لے سکے
 ملک دنیا مجھ و حکمت جو زانکہ این اندک است و آں بسا
 دنیا کا ملک طلب نہ کر حکمت ڈھونڈ۔ اس لئے کہ یہ نفوڑا ہے اور حکمت بہت ہے

سنائی کا خیال ہے کہ شاہ راہ حقیقت کو ظاہری وسائل سے طے نہیں کیا جاسکتا اور بے درد
 لوگ طریقت کی منزل مقصود کو نہیں پہنچ سکتے اس کے لئے درد کو رہنما اور سوز و گداز کو رفیق طریق بنانے
 کی ضرورت ہے۔

کے توان آمد براہ حق ز راہ حلق و خلق درد باید خلق سوز و خلق دوز و حق گداز
 خلق و خلق کے راستے سے منزل حق نہیں ملتی۔ اس کے لئے خلق سوز ملن دوز اور حق گداز درد کی ضرورت ہے
 عقل نامہ میں عارفوں کی تعریف کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔

تا نباشند عاشق جاں باز درمیاں کے نہنڈ با او راز
 جب تک عاشق جان پر نہیں کھیلتے۔ محبوب ان کو راز دار نہیں بناتے۔

سوز دل ہاست شمع این مجلس آہ و درد است مہر و مونس

اس مجلس کی شمع سوزِ دل ہے۔ اور آہ و دردِ محرم اور مونس ہیں۔

عاشقاں از جگر کباب خوردند و زخم دیدہ خوں چو آب خوردند

عاشق جگر کے کباب کھاتے ہیں۔ اور آنکھوں کے خم سے خون پانی کی طرح پیتے ہیں۔

در خراباتِ عشق مردانند کہ زمین چوں فلک بگردانند

میانِ عشق میں ایسے امیہ لوگ ہیں جو زمین کو آسمان کی طرح گردش دے دیں۔

اور یہ درد بھی پوشیدہ اور مخفی ہو ظاہر اور بدیہی نہ ہو

از برائے غیرتِ معشوق در شہرِ ضمیر اے دریغا ہائے خون آلود پہناؤ اشتیاق

محبوب کی غیرت کے خیال سے دل کے شہر میں۔ خون آلود آہ کو پوشیدہ رکھنا پڑتا ہے

مذہبِ سنائی مذہبِ اہل سنت رکھتے تھے جنہوں نے اس کے خلاف سمجھا ہے انہیں کچھ غلط فہمی

ہوئی۔ اس لئے کہ اول تو سنائی نے حلیقہ اور اپنے تمام قصائد اور مثنویات میں خلفائے راشدین رضوان

اللہ علیہم اجمعین کی مدح و منقبت کی ہے۔ دوسرے خلفاء کے درمیان مذہبِ اہل سنت کے

مطابق مدارج کی ترتیب ملحوظ رکھی ہے یعنی اول حضرت صدیق اکبرؓ اس کے بعد حضرت فاروق اعظمؓ

اس کے بعد حضرت عثمانؓ اس کے بعد حضرت علیؓ درصوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی مدح کی ہے

چنانچہ اپنے مکتوبِ منشور میں جو بہرام شاہ کے نام لکھا ہے ظاہر پرستوں کے اعتراض کو دفع کرتے ہوئے

مدح صحابہ کے مسئلے کو اپنے دعوے کے ثبوت میں بطور دلیل پیش کرتے ہیں مکتوبِ مذکور میں لکھا ہے کہ

”کہتے ہیں کہ آلِ ودان کی مذمت کی اور امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کی فضیلت پر گرویدہ

ہے وہ یہ نہیں دیکھتے کہ ان کو صدیق اکبرؓ کے بعد بلکہ فاروق اعظمؓ اور ذی النورین کے بعد رتبہ دیا۔ جیسا کہ

دوسرے ائمہ سلف نے دیا۔ تیسرے عکیم سنائی ابو یعقوب یوسف ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے۔

جو مشہور صوفی اور خواجہ بہاء الحق نقشبندؒ کے پیرو تھے۔ چوتھے سنائی نے ابو حنیفہ اور شافعی

رحمۃ اللہ علیہما کی تعریف کی اور ان کے مذہب کو مذہبِ حق کہا۔ ابو حنیفہ کی تعریف میں کہتے ہیں۔

دین چو بگذشت از این جواں مردان خلق در دین شدند سرگردان

حباب دین ان جواں مردوں سے گزر گیا۔ تو مخلوق دین سے سرگرداں ہو گئی۔

ہم را باز رائے نعمانی آشتی داد با مسلمان
سب کو نعمانی کی رائے نے۔ پھر اسلام کی راہ دکھائی۔

بود در زیر گنبد ارزق حجت صدق در محبت حق
ہو صیغہ اسی گنبد نیلوں کے تلے۔ حق کی محبت میں برہان صداقت تلے۔

بر روانش ز مادر و دوسلام باد ہم حشر کن بدر اسلام
ان کی روح پر میری طرف سے درود اور سلام ہو۔ اور خدا جنت میں میرا حشر ان کے ساتھ کرے
امام شافعیؒ کی تعریف میں فرماتے ہیں

بود در راہ دیں امام بحق کہ امامت ورا سزد مطلق
دین کی راہ میں امام برحق تھے منصب امامت مطلق انہی کو زیبا ہے

دین از او یافت زینت و رونق در تبع متفق شدند فرق
دین نے ان سے زینت اور رونق پائی۔ ان کے اتباع میں مختلف گروہ متفق ہو گئے

پانچویں۔ اپنے قصائد میں چند مقامات پر اس مسئلے کی طرف اشارہ کیا ہے
ز چار سوئی ملامت بشاہراہ نجات چہار یار پیغمبر لبسند راہبرم
لامت کی چار اطراف سے الگ۔ نجات کی شاہراہ میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم، کے چار یار میری رہنمائی کے لئے کافی ہیں
دوسری جگہ فرماتے ہیں

سنی دین دار شو تا زندہ مانی زانکہ هست ہرچہ جزویں مردگی و ہرچہ جز سنت حزن
سنی دیندار بن جاتا کہ زندہ رہ سکے۔ اس لئے کہ دین کے سوا جو کچھ ہے مردگی ہے اور سنت کے سوا جو کچھ ہو غم ہے
ایک اور مقام میں فرماتے ہیں

دیدہ در چشم سنائی چوں سانے باد تیز گز زمانے زندگی خواہد سنائی بے سنن
سنائی کے طفیل چشم میں ڈھیلے سان کی طرح تیز ہوا نہیں اگر وہ سنت کے بغیر ایک لمحہ بھی زندہ رہنے کی خواہش کرے

ہندوستان کے عربی شعراء پر ایک نظر (ایک مضمون کا جائزہ)

از

(جناب مولانا ابو محفوظ الکریم مصومی کچھرنارینچ مدرسہ عالیہ کلکتہ)

مارچ ۱۹۵۸ء کے معارف میں میرا مضمون "ہندوستان کے عربی شعراء پر ایک نظر" چھپا تھا۔ مضمون اس وسیع موضوع پر آغاز بحث کا پہلا قدم تھا اور بس؛ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ اس وقت میں پے در پے دو مقالے اسی موضوع سے متعلق نظر نواز ہوئے۔ مولانا مجتبیٰ حسن صاحب کامون پوری کا مقالہ "جمہوری گدھ" (نمبر ۱۴) میں اور جناب اختر قہری کا مفید مضمون مجلہ معارف (ج ۶/۳) میں۔ خاص طور پر مولانا کامون پوری کے مضمون سے میری دلچسپی کی ایک وجہ یہ ہے کہ موصوف نے راقم السطور کی بعض مسامحتوں کی طرف بھی توجہ دہرائی ہے؛ مسامحت کا وقوع عقلاً یا عاۓۃً کچھ محال نہیں، آئے دن ایک سے ایک دلچسپ یا کینٹو "اعلیٰ قسم کی مسامحتیں ہمارے مشاہدہ میں آتی رہتی ہیں، جن سے طبقہ علیا کے فضلاء بھی براعت کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ اور اگر مسامحت واقعہً صحیح ہو تو اسے قبول کرنا کچھ براعت تنگ و عار نہیں۔ راقم جیسے بے اشتیاق سے اگر مسامحت یا صریح لفظوں میں کہتے کہ کوئی غلطی سرزد ہی ہو گئی تو اس پر مجھے تعجب نہیں اور فراخ دلی کے ساتھ غلطی کا تسلیم کر لینا اپنا فرض سمجھتا ہوں بشرطیکہ وہ غلطی واقعی ہو؛ سطور ذیل میں قارئین کو ان مسائل کا حال معلوم ہو گا سا تھری جمہور کے فاضل مضمون نگار کے مضمون میں سے بعض اہم نقاط بھی زیر بحث آئیں گے۔

مولانا کامون پوری کے مضمون کی طرف توجہ سے پہلے ناظرین کی توجہ میرے مضمون مطبوعہ معارف کی تہمدی عبارات کی طرف مبذول ہونی چاہئے، اپنے مضمون میں بطور تہمدی جو کچھ لکھا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ قدیم عربی اسلوب، مولد اور بھی شعراء کے کلام میں مفقود ہے۔ اسی نقطہ خیال کو میں نے ہر ممکن اختصار کے ساتھ ظاہر کیا ہے، چونکہ یہ تہمدی نہایت مختصر مضمون کی تھی لہذا اس میں اختصار

پسندی بھی ہے جانہ معنی میں نے اپنے خیال کی ترجمانی وضاحت سے نہیں کی۔ یہ تسلیم کرتے ہوئے بھی میرا دعویٰ ہے کہ اس خیال کا سمجھنا اہل نظر کے لئے کچھ دشوار نہ تھا۔

ابن خلدون کی عبارت پر محل نہ سہی بے محل کیسے ٹھہری جب کہ فارغین کی نگاہ محض میں مولدین سے گزرتی ہوئی اہل عجم کے طبقہ تک پہنچتی ہے اور جب کہ تاریخ ادبیات عرب کے جانتے دانتے جانتے ہیں کہ اہل عجم پر مولدین و محدثین ہی کا اثر براہ راست ہوا اور اس اعتبار سے مولد شعراء کی حیثیت اگر استاد و امام کی ہوئی تو کیوں نہ یہاں کے مقلدین اور معنوی شاگردوں یعنی اہل عجم کی خامی ثابت کرتے ہوئے ان کے اساتذہ ہی کی خامی سے استدلال کریں، بعینہ یہی صورت ہوئی ہے کہ مولدین کے بعد جب ہم نے عجمی ادباء و شعراء کا ذکر کیا تو ان کے سبک و اسلوب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ابن خلدون کی مندرجہ ذیل عبارت بھی نقل کر دی۔

”بہذا الاعتبار کان الکثیر ممن
لقدیامن شیوخنا فی هذه الصنعة
الادبیة یرون ان نظم المتنبی
والمعری لیس ہومش الشعر العربی
فی شئ لا یفما المبحر یا علی اسلیب
اسی اعتبار سے فن ادب کے اکثر شیوخ جن سے میری
ملاقات ہوئی یہ رائے رکھتے تھے کہ متنبی و معری کی نظمیں
کسی حیثیت سے بھی شعر نہیں اس لئے کہ یہ دونوں
اسالیب عرب پر نہیں چلے۔“ (عارف مارچ ۱۹۵۷ء)

العربا“

مجھے کیا علم تھا کہ اس اختصار پسندی کا یہ نتیجہ ہوگا کہ بعض فارغین غلط فہمی میں مبتلا ہو کر ان عبارتوں کی ظاہری ترتیب سے متنبی و معری کا عجمی النسل ہونا اخذ کریں گے عبارتیں خواہ اپنی اپنی جگہ پر مستقل قطعہ کلام ہوں لیکن جب سلسلہ کلام ایک ہے تو ان عبارتوں کے معنوی تعلق و ارتباط کو ملحوظ نہ رکھنا کہاں کی دانشمندی ہے مولانا نے محض ترتیب عبارات سے جو کچھ اخذ کیا وہ قطعاً نصف پر مبنی ہے، کاش ہم اسے تسلیم نہیں بلکہ اپنی ایک عظیم غلطی تسلیم کر لینے کی معقول وجہ سمجھ سکتے۔ اس کا اعتراف ضرور ہے کہ مولانا نے ذہن رسا پایا اور آگے دیکھنے کہ آپ کی ذہانت کیا گل کھلاتی ہے۔

فرماتے ہیں:- ”اسی طرح اس مضمون میں یہ بھی دلچسپ انکشاف ہے کہ ابوریحان بیرونی

ہندوستان کا عربی شاعر ہے“ (جمہور ص ۱۰۰ - مامود ص ۱۰۱)

سبحان اللہ کیا دقیق استنباط ہے! یہ مغزِ نغز ہے ہماری تمہید ہی کی ایک عبارت کا جس کے رموز و

نکات کا سمجھنا مولانا کی طبع و قیاد ہی کا حصہ تھا! ہماری وہ عبارت جس میں آپ کو مذکورہ بالا ”انکشاف“

نظر آیا حسب ذیل ہے:-

”ہندوستان کی تاریخ سے اگر سندھ کی عربی حکومت کو الگ کر دیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہاں عربی ان ”سلم فائین“

ہی کے ذریعہ کئی جن کے درباروں میں حسن بن اسحق فردوسی ملک الشعراء، احمد عنصری، ابوالحسن رودکی،

فرخی، علی عنری وغیرہ کا طوطی بول رہا تھا انہی درباروں میں قفال مروزی، ابونصر عراق، ابوریحان البیرونی

ابوالحسن النخار جیسے حکماء بھی ملیں گے جنہوں نے اپنی قیمتی تحقیقات و معلومات سے عربی زبان کو مالا مال کیا

(معارف مارچ ۱۹۵۷ء)

البیرونی کا نام پورے مضمون میں صرف ایک جگہ اسی عبارت میں آتا ہے۔ اب یہ سوچنے کی بات ہے

کہ مولانا نے ہمارے جس ”انکشاف“ کا انکشاف فرمایا اس کا احساس نہیں پہلے کیوں نہیں ہوا یا اب بھی کیوں

نہیں ہوتا۔ ذہن کی الجھن اور دوچند ہو جاتی ہے جب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مولانا کے اجتہادِ مطلق نے

ایک البیرونی پر کیوں قناعت کی جبکہ ایک طویل فہرست اسماء و اعلام کی ہماری عبارت میں موجود تھی اگر

مولانا چاہتے تو اپنے اجتہاد کا دائرہ اور وسیع کر دیتے اس طرح نہ صرف یہ کہ ایک ”انکشاف“ بلکہ بہت

سارے انکشافات کا علم انھیں حاصل ہوتا اور دنیا ان کے ”اختراعات فائقہ“ پر آفریں کہتی! بہر حال

اس ایک اختراع پر بھی مولانا مستحق تحسین و ستائش ہیں؛

عجب ہے لمن له قدّ و حدّ و منیر بنوۃ القضم الکھام

آئیے تھوڑی دیر مولانا کے ”ذوق ادب“ کا بھی مطالعہ کریں، اس سلسلہ میں آپ کا مضمون ”ہندوستان

میں عربی شاعری“ — جس کا تعلق نفسِ موضوع سے واجبی ہی ہے — ایک اہم دستاویز ہے جس

کے بلند آہنگ و عادی کی روشنی میں اگر ان کے ”حسن مذاق“ کا جائزہ لیا جائے تو شاید بے جا نہ ہوگا۔ زیر بحث

ابن خلدون کی عبارت منقولہ بالا ہے، کہ اس عبارت میں ابن خلدون نے اپنے شیوخِ ادب کے حوالہ سے متبنی و معری کے بارہ میں جس خیال کا اظہار کیا ہے وہ کہاں تک صحیح اور کس حد تک اختلاف کے قابل ہے۔ ہمارے مضمون مطبوعہ معارف میں اس بارہ میں کوئی ایسا جملہ نہیں جس سے یہ سمجھا جائے کہ ہمارے نقطہ خیال سے ابن خلدون کا بیان حرفِ بصر صحیح اور ناقابل اختلاف ہے، البتہ میں ابن خلدون کے بیان سے بڑی حد تک اتفاق ضرور ہے ابن خلدون نے جس خیال کا اظہار کیا ہے اسی کا اعادہ ان نظروں میں بھی کرتا ہے کہ :-

ولهذا كان شيوخنا سرهم الله
يعيون شعرا في بكر بن خلف
شاعر اندلس لكثرة معانيه وازدهارها
في البيت الواحد كما كانوا يعيون
شعر المتنبي والمعري بعدام الشجع
على الاساليب العربية كما هم كان
شعرا كلا ما منظوما نازلا عن
طبقة الشعر والحاكم بذلك

ہمارے شیوخ اندلس کے (مشہور) شاعر ابو بکر بن خلف
کی شاعری پر اسی لئے بحث چینی کرتے تھے کہ اس کے ایک
ہی بیت میں معانی کی کثرت ہوتی ہے۔ متبنی اور معری
کے کلام میں بھی ان شیوخ کو یہی عیب نظر آنا تھا کہ ان
کے کلام میں اسالیبِ عرب کی کمی ہے لہذا ان دونوں
کا کلام منظوم، شعر عربی کے معیار سے نچا ہے اور اس
فیصلہ کا تعلق ذوقِ ادب سے ہے۔

الذوق (مقدمہ ۵۵)

ابن خلدون کے مقابلہ میں مولانا کا مون پوری۔ قاضی جرجانی کے مکتب خیال سے وابستہ ہی نہیں بلکہ اس سے بھی دو چار قدم آگے بڑھے ہوئے ہیں، معلوم نہیں آپ کس ادبی و شعری مکتب کے تربیت یافتہ ہیں کہ آپ کے زعم میں ابن خلدون نے جو کچھ لکھا ہے وہ صرف اس کی اچھ بے لغو محض ہے اور اس کے قول کو واقعیت سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ اور اس کی بات صحیح بھی کیسے ہو سکتی ہے جب کہ وہ عربی ادب کا نقاد نہیں۔ خلاصہ کلام یہ کہ اس کا قول بہ قول مولانا موصوف "عربی ماحول میں تسلیم نہیں کیا گیا" (جمہوریت ماحول) اور یہ عربی ماحول جہاں ابن خلدون کو بادیوازی نہیں ہو سکتی ہمارے مولانا ہی کے دماغ کی تخلیق ہے

یہ متنبی کے شراح و مفسرین کا ماحول ہے جس کے متعلق آپ رقمطراز ہیں کہ :-

”صرف ابن خلکان کے ایک شیخ کو متنبی کی چالیس شرحوں کا علم تھا؛ ابن خلکان کہتے ہیں کہ علماء کا یہ شنف کسی اور

شاعر کے کلام سے ظاہر نہیں ہو گا یا علمائے ادب نے اسے غلطی سے اپنی پسندیدگی کا مرکز بنایا۔ ابن خلدون کے

بیان کے مطابق تو متنبی کی نظم کو شعری نہیں کہہ سکتے۔ یہ ابن خلدون کی اوجہ تھی اور ابن خلدون کی اس طرح کی

اوجہ ان کے خاص موضوع تاریخ نگاری میں بھی جگہ جگہ پر نمایاں ہے۔“ (جمہوریت مامود مس)

واقعی یہ ابن خلدون کی سرسبز یاد تھی کہ اس نے مولانا کا مون پوری جیسے فاضل یگانہ کے محبوب تر

شاعر ”متنبی“ کے اعجازِ بیان سے مسحور ہونے کے بجائے اس کی ایسی توہین کی اور یہ جانتے ہوئے کہ متنبی کو علماء

و ادباء اپنی پسندیدگی کا مرکز بنا چکے ہیں اور اس کے دیوان کے شارحین و مفسرین کی تعداد ”لا تعد ولا تحصى“ ہے

ابن خلدون کی یہ جرات کہ متنبی اسالیبِ عرب پر نہ چلا بلکہ اس کا کلام منظوم شعر کے حکم میں نہیں

ہرگز قابلِ معافی نہیں،

یہ تو حیران خلدون کی اوجہ تھی اور وہ بھی اس کی اپنی نہیں بلکہ شیوخِ ادب سے مستعار جسے نقل کرنے

کا وہ گنہگار ہے لیکن ستم بالائے ستم یہ ہے کہ متنبی کے شراح جن کے اعتناء و شنف کا حال مولانا نے ابن خلکان

کی زبانی سنا یا انہی میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو شرح کرتے ہیں متنبی کے کلام کی اور تفسیر بیان کرتے ہیں اس

کے انکار بد بعد مطالبِ سنہ کی لیکن جب متنبی کے کلام کی طرف رجحانِ عام کے اسباب پر روشنی ڈالتے

ہیں تو ان میں سے ایک سبب ادبی ذوق کی بستی ہی کو قرار دیتے ہیں، الواحدی جس کی شرح سے بہتر یہ مشکل

کوئی دوسری شرح ہوگی اور جس کی تعریف و توصیف میں ابن خلکان رطب اللسان ہے وہ اپنی شرح کے

خاتمہ میں رقمطراز ہے کہ :-

”وافادعانی الی تصنیف هذا الكتاب“ باوجودیکہ فنِ ادب کا زوال ہے اس کتاب کی تصنیف

مع خمول الاحباب وانقلض زمنہ کا سبب لوگوں کا یہ اتفاق اس دیوان کو پسند کرنا، اس

اجتماعِ اہل هذا العصر قاطبہ علی کے خطوط روایت میں ان کلامِ ہماک، اور جمیع اشعار

هذا الديوان وشغفهم بحفظه ورواۃ عرب یعنی جاہلی و اسلامی شعراء کے کلام سے ان کی رو

وانقطاعهم عن جميع اشعار العرب گردانی ہے؛ دان کا شنف دیوان متنی سے اس تک
 جہلیتہا واسلامہا الی هذا الشعر ہے، کہ کلام عرب کا ذخیرہ گویا مفقود ہو چکا ہے؛ اس
 حق کان الا شعار کلمها فقدت وليس عام رجحان کا سبب ہمیں کی سستی، زمانہ کا ادب اور ادباً
 ذلك المتراجع الهمم وخلو النوان سے غلو، جوہر کلام کی پرکھ اور جید دردی کی شناخت کی
 عن الادب وقلة العلم بجوهر الکلام کی ہے،

ومعرفة جیدۃ من سر دئیہ

(کشف الظنون ج ۳/۳۰۹، فلوکل)

خدا را کوئی یہ بتائے کہ الواحدی کی یہ شکایت کیوں تھی؟ اور اس کا سبب کیا تھا بجز اس ادبی انحطاط
 کے کہ دنیا صرف افکار و معانی کو منہ ہائے کمال سمجھ کر متنی کے دیوان سے کامل اہتمام ظاہر کر رہی تھی اور جمیع
 اشعار عرب خواہ وہ جاہلی دور کے ہوں یا اسلامی دور (صد اول) کے جو لسانی اعتبار سے قیمتی جواہر تھے ہکا
 برباد ہو رہے تھے؛ واحدی اگر اس پر بھی بس کرتا تو مولانا کے لئے تاویل کی گنجائش باقی تھی لیکن وہ تو صاف
 طور پر کہہ رہا ہے کہ یہ ذہنی فطور، یہ ادبی انحطاط اور اسی قسم کے سارے انقلابات کیوں تھے؟ صرف اس
 لئے کہ ہمیں سہت ہو چکی تھیں، زمانہ میں ادب کا قحط نمایاں تھا اور جوہر کلام کی شناخت مفقود ہو رہی
 تھی اچھے برے کا امتیاز مٹ رہا تھا غرض ایسے انقلاب کے عالم میں متنی کے کلام کا عالمگیر ہو جانا اور
 عام ذہنیوں پر اس کی شہرت کا تسلط یہ تو ثابت نہیں کرتا کہ متنی کا دیوان کلام عرب کے اصل جوہر کے
 اعتبار سے بھی شاہکار ہے اور اس پر شکہ چینی غلط متنی کے شارحین کی کثرت اور اس کے کلام کی طرف
 رجحان عام کا ثبوت مہیا کر کے مولانا نے بزم خود گویا یہ بھی ثابت کر دیا کہ متنی کا کلام بحیثیت ”عربی“ یا ”عربی“
 سبک و اسلوب ”ابن خلدون کی تنقید سے بالاتر ہے؛ مولانا کا یہ جملہ گویا علمائے ادب نے اسے غلطی سے
 اپنی پسندیدگی کا مرکز بنایا۔ ان کے اس حسن ظن پر مبنی ہے کہ علماء غلطی نہیں کر سکتے یا غلطی کرنا شانِ علم
 کے معافی ہے لیکن ان کا حسن ظن امام واحدی کے بیان کی روشنی میں انتہائی بے خبری کا پتہ دیتا ہے۔
 مولانا صاحب نظر ہیں؛ عربی ادبیات سے ذوق رکھتے ہیں، کلام عرب کے ناقدین کی آراء و اہواء

سے بھی ان کو ضرور واقفیت ہوگی اگر وہ ابن خلدون کے بیان پر غور فرماتے تو یقیناً اسی نتیجہ تک پہنچنے لگتے۔
 کے یہ الفاظ صرف اس کے اپنے خیال کی ترجمانی نہیں کر رہے ہیں بلکہ اس کا یہ خیال ادباء متقدمین کی ایک سبکدوش
 جماعت کے اقوال سے ماخوذ و مستفاد ہے؛ لیکن انھوں نے بلا تامل ابن خلدون کے قول کو بے حاصل قرار دیا
 اور اسی پر بس نہیں کیا بلکہ اس کے موضوع تاریخ نگاری پر بھی آپ حملہ آور ہو گئے؛ اور آپ نے اس کے
 قول کے متعلق بحیثیت قاضی عادی فیصلہ بھی صادر فرمادیا کہ اس کا قول عربی ماحول میں تسلیم نہیں کیا گیا۔
 کیا ابن عباد، محمد بن الحسن الحامی، ابن دکیع، ابن جنی وغیرہ کے تمام تراجم و اخذات بے معنی تھے، مکارہ
 و نقسف پر مبنی تھے؟ یا کچھ اصلیت بھی ان میں پائی جاتی تھی؛ اور ابو ہلال عسکری جس کی ادبیت و علمیت مسلمہ
 ہے اس کے یہ الفاظ شاید واقعیت سے بہت دور ہیں؟ کہ

"ولا اعرف احداً کان يتبع العیویری دانست میں متنی کے سوا کوئی اور ایسا نہیں جو
 فیا تہا غیر مکتوب لہا ان المتنبی لسانی عیوب کا تتبع کرتا ہو اور بے پردائی کے ساتھ ان
 فاندھمن شعراً جمیع عیوب الکلام عیوب کو اختیار کرتا ہو، یہ معروف متنبی ہے جس نے اپنے
 ما اعدم منها شیئاً، کلام میں جملہ عیوب کو جمع کیا اور شاید ہی کوئی عیب اس

(الصناعین: ص ۱۵۲، طبع ثانیہ) کے دائرہ سے خارج رہا ہو۔

سوال یہ ہے کہ مولانا جس "عربی ماحول" کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں وہ ان ائمہ ادب کے ماحول سے
 بھی بالاتر کوئی چیز ہے؟ اگر کوئی ایسی چیز ہے تو اس کا وجود شاید مولانا ہی کے ذہن و دماغ کے "خلیہ" میں
 مصروف ہو ہو گا ورنہ ہمارے پیش کردہ ماحول سے ارفع و اعلیٰ کوئی اور ماحول تو ادبیات عرب کی تاریخ میں
 بظاہر موجود نہیں، ہم یہ سمجھتے ہیں اور بجا سمجھتے ہیں کہ ابن خلدون کا بیان نہ اس کی اپنی اُچھ ہے اور نہ اس
 کے شیوخ ادب ہی کا اختراع بلکہ یہ الکنی المذہب کی رائے کا پرتو اور اسی کے اقوال کی بازگشت ہے؛ اور اگر
 عسکری حامی، ابن عباد و ابو القاسم المرتضیٰ وغیرہ کے ماحول کو ادبی ماحول نہ مانیں تو اس مکارہ کا کیا جواب
 غرض پینکشف حقیقت ہے کہ ابن خلدون نے اپنے الفاظ میں جس رائے کا اظہار کیا ہے وہ طرز اول کے
 "ادبی ماحول" میں تسلیم شدہ ہے؛ یہ باتیں تو ہمیں ایک طرف، خود متنبی کا یہ حال ہے کہ کم از کم اپنے

آخری حصہ کے کلام میں نفس و فتور کا اعتراف صریح لفظوں میں کرتا ہے:-

قد تجاوزت فی شعری واعصیت
یعنی آل حمدان کی مفارقت کے بعد شرو شعری میں نہا
طبی واقتضت الراحة ، ذفا رقت
باقی نہیں رہا طبیعت پرندہ دلنا بھی ترک کر دیا اور اب
آل حمدان: "الشراشی منہ" راحت ہی غنیمت معلوم ہوئی:-

اس بحث کو مزید طول دینے کے بجائے ہم منتہی اور معری کے متعلق اپنے تاثرات کو مختصر لفظوں میں پیش کر دینے پر اکتفاء کرتے ہیں کہ منتہی بے شک معجز نگار شاعر تھا اس کی عظمت ادبی حلقوں میں جانی پہچانی ہے اور اس کے محاسن کا اعتراف نہ کرنا صریح نقادی ہے لیکن ہم اس کے عیوب و مساوی کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اسی طرح معری کی جلالت شان بھی محتاج تشریح و بیان نہیں۔ ابن خلدون کا بیان اس سلسلہ میں ممکن ہے کہ تشدد آمیز ہو، بے اصل اور اچھ ہرگز نہیں اور اس کے متعلق مولانا کا یہ فرمانا کہ اس کا قول عربی ماحول میں تسلیم نہیں کیا گیا، کمال تجاہل ہے:

مولانا کو ابن خلدون سے خاص طور پر کد ہے فرماتے ہیں کہ "وہ خالص عرب نہیں" گویا ہم نے اپنے مضمون میں ابن خلدون کو خالص عرب قرار دیا تھا کہ مولانا کو اس کے حسب و نسب سے تعزین کرنے کی ضرورت پڑی یا آپ کا یہ مقصد ہے کہ چونکہ وہ خالص عرب نہیں لہذا اس کا قول ادبی حلقوں میں مستند و معتبر نہیں۔ اگر مولانا کا یہی مقصد ہے تو سماعی و جموی کے اقوال سے استناد کہاں تک صحیح ہے؟ بہر حال ابن خلدون کے جاننے والے اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ اصلاً و نسلاً حضرمی عرب تھا یہی مولانا کی مویشگانی تو یہ قابل التفات نہیں؛

آپ کا ایک اور جملہ ابن خلدون کے متعلق یہ ہے کہ "وہ عربی ادب کے نقاد نہیں ہیں" حالانکہ ابن خلدون سے واقفیت رکھنے والے عموماً یہ بھی جانتے ہیں کہ کتاب الافغانی کے اشعار، الا علم کی کتابت اشعار عرب کے دفاتر سے، خود منتہی کے کلام کا ایک حصہ وہ بھی اشعار و قصائد اس کی نوک زبان پر تھے اس نے ادب اور علم اللسان کی تحصیل اپنے عہد کے مشاہیر سے کی تھی، ان تمام باتوں کا ذکر وہ اپنے خود نوشت ترجمہ میں کرتا ہے کلام عرب سے اس کو حبشی نزولت و مہارت حاصل رہی ہے وہ اس کے اپنے

بیان کے علاوہ وزیر لسان الدین ابن الخطیب کے الفاظ سے ظاہر ہے؛ اور ابن الخطیب جیسا بلند پایہ و سب
اس کے کلام منظوم و منثور کا معرفت ہی نہیں بلکہ اس کے نقاد ہونے کی شہادت دیتا ہے (فتح الطیب
ج ۴، کتاب العبرج ۷)

مولانا نے ابن خلدون کی تاریخ نگاری پر جو حملہ کیا ہے اس کا سبب ہماری سمجھ میں نہیں آتا، اگر وہ
اپنے اس دعویٰ کے ثبوت میں بھی کچھ مواد اپنے مضمون میں فراہم کر دیتے تو حقیقت حال واضح ہو جاتی؛
لہٰذا غالب یہ ہے کہ مولانا کا یہ دعویٰ ابن خلدون کے مقدمہ تاریخ کے بعض مخصوص ابواب ہی سے متعلق ہوگا
بہر حال صرف ظن کی بنا پر ہم کچھ مزید کہنا نہیں چاہتے؛

خاتمہ کلام میں مولانا کے مضمون کی آخری عبارت کی طرف توجہ ضروری ہے وہ عبارت حسب ذیل ہے؛
”جس طرح ابوازی، تنوخی، ایشہری نے ہندی علوم و فنون پر توجہ کے سلسلے میں ہندی کے بہت سے
اصطلاحات و الفاظ عرب کو مستعمل میں دیتے جس طرح مسلمان تاجر ابو زید سیرانی، مسعودی، بلاذری، ابن خرداد
ابو لطف مینوی، بزرگ بن شہریار، اصطخری، ابن حوقل، بشاری مقدسی نے ہندی سیاحت سے فائدہ
یہاں کے خیالات کے لئے ہندی زبان سے الفاظ کا بڑا ذخیرہ عربی زبان کو دیا اسی طرح مولانا فضل حق نے
بھی اپنی نظم و نثر میں اردو و ہندی کے الفاظ عربی تصرفات کے ساتھ استعمال کئے ہیں درانہ مع کتب خط الامان
رو اذن (روزن)، نکاکرہ (ٹھاکر)، اور ایسی ہی دوسری مثالیں آپ کے کلام منظوم و منثور میں پائی
جاتی ہیں“ (جمہوریت عالمودعۃ ۲)

یہ عبارت اپنی جگہ پر مفید اور ایک دلچسپ لغوی بحث کا آغاز ہے مولانا نے جو کچھ بیان کیا وہ روشن حقیقت
ہے یقیناً علامہ فضل حق خیر آبادی کی نظم و نثر میں اردو و ہندی الفاظ عربی تصرفات کے ساتھ مستعمل ملیں گے
چنانچہ چند الفاظ علامہ خیر آبادی ہی کے استعمال کردہ بطور مثال پیش کئے گئے لیکن ان الفاظ کے سلسلہ میں اگر
مولانا کاموں پوری تحقیق سے کام لیتے تو قارئین کو زیادہ فائدہ پہنچتا اور ان کے مضمون کی قیمت بھی دو بالا ہوتی
یا کم از کم یہ ثابت ہوتا کہ الفاظ مذکورہ علامہ خیر آبادی ہی کے تصرف و استعمال سے عربی زبان میں داخل ہوئے
ہیں تو بھی اک بات ہوتی؛ ان الفاظ میں سے صرف خط الامان کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ یہ اس مرکب

صورت میں علامہ خیر آبادی ہی کے تصرف کا نمونہ ہے بقیہ الفاظ اگر علامہ کے کلام میں ملتے ہیں تو یہ کوئی نئی بات نہیں؛ ضرورت تو اس بات کی تھی کہ ایسے الفاظ چھانٹ کر پیش کئے جاتے جن کو مولانا خیر آبادی سے پیشتر کسی نے استعمال نہ کیا ہو، فاضل مضمون نگار کا بھی یہی مقصد تھا لیکن ایک لفظ کے سوا باقی الفاظ کی تاریخ استعمال کا انھوں نے خیال نہ کیا؛ واقعہ یہ ہے کہ ”خطوط الامان“ کے ماسوا الفظوں کا استعمال عربی زبان میں زمانہ قدیم سے رہا ہے۔ ”التکاکرہ“ کا استعمال مشہور مورخ البلاذری کی کتاب فتوح البلدان میں موجود ہے بلاذری کے یہ الفاظ ہیں؛ ولقبہ محمد والمسلمون وهو على فيل وحوله الفيلة ومعه التكاكره (ص ۲۳۸، س ۱۱، طبع دی فویہ، ۱۸۶۶ء) اسی طرح لفظ ”روزن“ جمع و مفرد ہر صورت عربی معام میں اس کا وجود قدیم ہے ابن سیدہ اور الازہری جیسے لغت اس سے اچھی طرح واقف ہیں چنانچہ لسان کی عبارت ہے:- الرزنة: الكوة، وفي المحكم: المحرق في أعلى السقف؛ التهذيب، يقال للكوّة النافذة، الرزنة. قال راحسبه معرباً وهو الرزازن تكلمت بها العرب (۳۹/۱۷۰) دربان یا درانیہ سے عرب جاہلیت بھی واقف تھے المنقب العبدی جسے ابن قتیبہ ”جاہلی قدیم“ کہتا ہے اسی کا ایک شعر ہے کہ:-

فابقي باطلی وانجد منها كد كان الدسارانية المطين

سلسلہ تاج مملت نبی عربی صلعم

جس میں متوسط درجہ کی استعداد کے بچوں کے لئے سیرت سرور کائنات صلعم کے تمام اہم واقعات کو تحقیق، جامعیت اور اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ جدید ایڈیشن جس میں اخلاق سرور کائنات صلعم کے اہم باب کا اضافہ کیا گیا ہے اور آخر میں ملک کے مشہور شاعر جناب ماہر القادری کا سلام بہ درگاہ خیر الانام بھی شامل کر دیا گیا ہے گورنمنٹ میں داخل ہونے کے لائق کتاب ہے زبان بہت ہی ہلکی اور صاف ہے قیمت ۳۰ جلد ۳۰

مکتبہ برہان اردو بازار جامع مسجد علی

مسلمان حکومتوں کی موجودہ حالت ایک امریکن سیاح کے قلم سے

از

(مولانا محمد ظفر الدین صاحب پوز فورڈ بیہوی دارالعلوم مدینہ)

ابھی چند دن ہوئے کہ نگار سائنہ سلسلہ مولوی محمد یحییٰ صاحب ندوی کے قدر جو ملا، یہ سائنہ ایک امریکن سیاح کی ڈائری ہے، سیاح موصوف نے مشرق وسطیٰ کی سلسلہ میں سیاحت کی ہے اور مسلمان حکومتوں کی اقتصادی زبوں حالی کا نقشہ پیش کیا ہے، اور بتایا ہے کہ ان ممالک میں مزارعین کی حالت کس قدر ناگفتہ بہ ہے، اور صنعت و حرفت کے اعتبار سے یہ اسلامی ممالک کتنے پیچھے ہیں، اور پھر اس نے ان حکومتوں کو مشورہ دیا ہے کہ اگر اچھی سے اس بے کسانوں اور مزدوروں کے حالات پر توجہ نہ دی اور ان کے مطالبات کو پورا نہ کیا متوا یک غنی انسان کا ہونا ضروری ہے۔

میں نے مناسب سمجھا کہ اس کے بعض ضروری اقتباسات تاخرین برہان کی خدمت میں پیش کر دے جاؤں تاکہ یہ بھی جان لیں کہ ہم کتنے پیچھے ہیں اور ہم کو کیا کرنا چاہئے اور زمانہ کے مقتضیات سے چشم پوشی موت کے مراد ہے، (ظفر صدیقی)

امریکن سیاح مارس ہنڈس اپنی کتاب ”ایک مستقبل کی تلاش میں“ جو اس کا سفر نامہ ہے اس کے ”پیش لفظ“ میں ایشیا کے افلاس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ”آنجہانی دہلی نے ایک دفعہ دورِ ان ملاقات میں مجھ سے ایشیائی ملکوں کی نیستی کے متعلق کہا

”ان کروڑوں کسانوں کے پاس اگر صرف اتنی زمین ہوتی کہ وہ سال میں ایک بوڑا گیزوں کا ایک بوڑا چولہہ بنیں“

اصل کتاب انگریزی میں ہے، اس کا ترجمہ اور تفسیر ہے ”ایک مستقبل کی تلاش میں“ یہ ترجمہ جناب لطیف اللہ بن احمد لکھا ہوا ہے

دوقیمیں اور دودھوزے ہی خرید سکتے تو خیال کرو کہ ہم ان کے ساتھ کتنی بڑی تجارت کر سکتے تھے:

عرب کا افلاس | عرب کے افلاس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے

”میں ایک سرائیلی گاؤں دیکھنے گیا تھا اور جب میں اس کے سرسبز کھیتوں میں گھوم رہا تھا، میں نے دیکھا کہ سیاہ چادریں اور بے عرب عورتوں اور بچے پرانے کپڑے پہنے عرب بچوں کے ہجوم نے ایک یہودی کی گاڑی پر ہتھ بول دیا ہے میں نے اسے فرقہ واری ملوہ سمجھ کر گاؤں کے سکریٹری سے سوال کیا تو اس نے جواب میں کہا، کہ بلوہ نہیں ہے، بلکہ جب کوڑے کی گاڑی آتی ہے تو یہ لوگ اس میں سے کچھ کارآمد چیزیں ڈھونڈنے کے لئے دوڑ پڑتے ہیں اور گودڑ وغیرہ چن لے جاتے ہیں۔“

طہران اور اس کا افلاس | استیاح موصوف نے اپنا سفر ایران سے شروع کیا ہے، وہ لکھتا ہے کہ طہران، ایران کا ایک بڑا اور خوش وضع شہر ہے اس کی آبادی ساڑھے سات لاکھ ہے۔ مگر یہاں ہوائی جہازوں کی آمدورفت بہت کم ہے کیونکہ مسافروں کا آنا جانا اتنا کم ہے کہ ہوائی کمپنیاں اپنے اڈوں کے مصارف نہیں نکال سکتیں۔ طہران کی زبوں حالی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتا ہے

”اس شہر کے حال و مزاج کا اندازہ یہاں کے فقیروں اور کتوں سے ہوتا ہے، افریقہ و ایشیا کے سارے فقروں میں طہران کا فقیر بڑا مسکین و خوش مزاج فقیر ہے، یہاں ہر موڑ پر، ہر گلی کوچے میں میلہ کچیلے، انگریزے، لوہے نظر آتے ہیں، کوئی مہیا کھیں پر چل رہا ہے تو کوئی سکڑا میا پڑا ہے، کوئی بے مانگوں کے گھسٹ رہا ہے، تو کوئی درخت یاد یوار کا سہارا لئے کھڑا ہے، ان کا ٹھکانا راستے اور فٹ پاتھ ہیں، جہاں بیٹھے ہیں وہیں سو جاتے ہیں، اور سوتے وقت اپنی ٹوپی الٹی کر کے رکھ دیتے ہیں تاکہ گذرنے والے خیرات کی یاد نہ بھولیں۔“

پھر طہران شہر کی سڑکوں اور بازاروں کا ذکر ہے، اور نئی ترقی جو شروع ہوئی ہے اس کا بیان ہے چنانچہ اس کو ختم کرتے ہوئے لکھتا ہے

”کہ طہران کا چہرہ جوان اور صہم بوڑھا ہے اور یہ کارنامہ ہے رضا شاہ پہلوی کا۔“

رضا شاہ کے کارنامے | اس کے بعد استیاح موصوف نے رضا شاہ پہلوی کے کارناموں کو بتایا ہے، جن کے متعلق وہ لکھتا ہے

”ایرانیوں نے صدیوں سے زندگی میں اتنا بیز انقلاب نہیں دیکھا تھا کہ سردوں کی پٹریاں، دم بھر میں ہیٹ کی صورت اختیار کر لیں اور لمبی مباتیں کورٹ، بٹون بن جائیں، ایرانیوں کے خواب میں بھی نہیں آ سکتا تھا، کہ نقاب پوش قانونیں دیکھنے دیکھتے نقاب ترک کر کے سیم بن جائیں گی۔“

۱۲۷۰ء میں ایرانی عورتیں ریٹورٹ اور سنبا گھروں میں داخل ہوئیں اور پھر ۱۲۷۳ء میں طہران گول ہائی اسکول کی لڑکیوں نے ورزش کی نمائش کی، جس میں رضا شاہ خود اپنی ملکہ اور شہزادیوں کے ساتھ مغربی لباس میں تشریف لائے، آگے چل کر سیاح مذکور لکھتا ہے

طہرانی انسان | اوسطاً ایرانی چہرے بدن کا مستقل مزاج انسان ہوتا ہے، موٹا آدمی یہاں بہت کم دیکھنے میں آتا ہے اور جب نظر آ جاتا ہے تو انگلیاں بھی اٹھ جاتی ہیں ایک یونیورسٹی کے پروفیسر نے باتوں باتوں میں کہا کہ ”ہمارے سب موٹے آدمی پارلیمنٹ میں ہیں“ اس کا مطلب یہ تھا کہ الیکشن میں زیادہ تر تاجر اور زمیندار ہی چنے جاتے ہیں جن کو عمر بھر کوئی کام نہیں کرنا پڑتا، اور عیش و آرام آدمی کو موٹا بنائی دیتا ہے۔“

سیاح موصوف کہتا ہے کہ میں نے ایک طہرانی ادیب سے سوال کیا، کیا آپ کے ملک میں لوگ خودکشی بھی کرتے ہیں؟ اس نے جواب دیا۔

”ہاں، مگر بہت کم، کیونکہ ہماری قوم بڑے بڑے دشوار حالات سے گزر چکی ہے، اور نوہ دھوڑنے ہماری زندگی

کو صعب و دشوار بنا دیا ہے اس لئے کوئی مصیبت ہمیں مایوس نہیں کرتی، ہم ہر حالت میں جئے جلتے ہیں۔“

جفاکشی | اس کے بعد وہ لکھتا ہے کہ طہران میں لوگ رات دن کام میں مشغول رہتے ہیں قاہرہ میں دکھا

لوگ کھانے پکانے میں منہمک ہیں مگر یہاں اس کے بالکل الٹا معاملہ ہے، چنانچہ وہ کہتا ہے

”لیکن جب میں طہران کے گلی کوچوں میں گھوما تو وہ سوال الٹا ہو گیا یعنی ایرانی راحت و آرام کس وقت کرتا ہے؟

گرمی کے موسم میں طہران کی تمام دکانیں زیادہ دیر تک بند رہتی ہیں اس وقت کے علاوہ میں نے ایرانیوں کو ہر وقت

مصروف اور کام کرتے دیکھا، شاید کام کرتے رہنا ایرانی خون میں داخل ہے، ہر ایرانی جو طبقہ اشراف میں شمار

نہیں ہوتا، ہر وقت مصروف نظر آئے گا۔“

ایرانی اشراف کی غلط ذہنیت | ایرانی اشراف تاہم زمیندار اور تعلیم یافتہ طبقہ کی غلط ذہنیت کی نشان دہی کرتے

ہوئے لکھتا ہے

”اشراف ایرانی بے شک اپنے ہاتھ سے کام کرنے کو ذلیل سمجھتے ہیں، تاہم زمیندار کی طرح اہل فن و منتلاً انجیر و غیرہ بھی اس بیماری میں مبتلا نظر آتے ہیں، اور اپنے ہاتھ سے کوئی کام نہیں کرتے، ہر کام کے لئے نو کی ضرورت پڑتی ہے ایرانی سرمایہ داروں میں آپ کو کوئی ”ایسا آدمی نہ ملے گا، جو امریکی سرمایہ دار کی طرح ضرورت کے وقت آستینیں بڑھا کر کام میں لگ جائے، جنگ کے زمانہ میں جب ایران میں امریکی فوجوں کے افسر راستے میں خود اپنی موٹر درست کرنے لگتے تو اس منظر سے ایرانی شرفا لو حیرت ہو جاتی تھی۔“

سیاح نے ان حالات پر اپنے تاسف کا اظہار کیا ہے اور لکھا ہے کہ تعلیمات کے پیش نظر ان کا یہ غلط رویہ حیرت انگیز ہے، کوئی شبہ نہیں کہ ان کی یہ روش اس دور میں بے حد حیرت انگیز ہے جب کہ دنیا کا نعرہ ہے کہ ”جو کمائے گا سو کھائے گا“ اور اسلامی نقطہ نظر سے جتنا غلط ہے اس کی تو کوئی مثال نہیں،

ایرانیوں کا عیب | ایرانی پارلیمنٹ کے ایک ممبر علی دشتی کا یہ قول جو سیاح نے نقل کیا ہے سننے کے لائق ہے ”ہمیں خود ستانی کا مرکب نہ ہونا چاہیے، اگر کسریٰ نے کسی عہد میں ساری دنیا فتح کر لی تھی، تو کیا، آج تو حالت یہ ہے کہ جتنے خدائد فائن ایران میں ملیں گے، کسی دوسری قوم میں نہیں ملیں گے، اور جس طرح ایران میں ایسے لوگ قانون کی زد سے محفوظ ہیں، ویسے کسی دوسرے ملک میں نہیں ہوں گے۔“

ایرانیوں کے جھوٹ بولنے کے متعلق بھی سیاح نے وہاں کے تعلیم یافتہ کے اقوال نقل کئے ہیں چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ طہران پہنچنے کے چند ہی دن بعد مری ایک انگریزی تعلیم پائے ہوئے سے ملاقات ہوئی، اس نے مجھ سے کہا

”ایرانیوں کے متعلق پہلے نہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ وہ بہت جھوٹے ہیں۔“

ایک جگہ اور اس نے لکھا ہے کہ

”ایران کی سیاست میں ریٹرو دوانیوں اور دودغ بافیوں نے ایران کے سنجیدہ لوگوں کو اس قدم بے زار کر دیا

ہے کہ مجلس کے ایک ممبر نے دوران گفتگو میں مجھ سے کہا کہ ”مراکتا البتہ مجھ سے جھوٹ نہیں بولتا۔“

ایران میں سماجی خرابیاں | ایران کی سماجی زندگی میں سیکڑوں خرابیاں ہیں، چنانچہ سیاح موصوف کہتا ہے کہ وہاں زمینداروں کا تسلط ہے اور وہ کبر و نخوت کے پتلے ہیں، کوئی سیاح ان کے یہاں جاتا ہے تو وہ یہ کہہ کر خوش ہوتے ہیں کہ آپ ”مرے گاؤں میں تشریف لائے“ ان کے پاس کافی گاؤں ہوتے ہیں، اور وہ اس پر فخر کرتے ہیں، اس نے ایک زمیندار کا واقعہ لکھا ہے کہ اس سے جب میں نے پوچھا آپ کے پاس کتنے گاؤں ہیں تو اس نے بتایا کہ وہ بائیس گاؤں کا مالک ہے، سیاح کہتا ہے کہ ”ایران میں اسی فیصدی زمین زمینداروں کی ملکیت ہے، اس لئے ان کے اندر ملکیت کا شعور جڑ پکڑ گیا ہے، یوں تو کسانوں پر کوئی پابندی نہیں، اس کو اختیار ہے جہاں چاہے جا سکتا ہے اور اپنے سے اونچے مرتبہ تک پہنچ بھی سکتا ہے، مگر ایران کا دیہاتی اپنی تمام نارسائیوں کے باوجود اپنی جگہ نہیں چھوڑتا اور الیکشن میں زمیندار کی مرضی کے مطابق پارلیمنٹ کا ممبر منتخب کرنا ہے۔“

ایران میں اول اور تیسرے درجہ کے لوگ ہیں درمیانی درجہ کا پتہ نہیں، یعنی کچھ لوگ تو ضرورت سے زیادہ مالدار ہیں اور بڑی تعداد نامان شبینہ کو محتاج۔ چنانچہ سیاح لکھتا ہے۔

”ایران میں اگرچہ ہندوستان کی طرح نیچے اونچے نہیں ہیں، لیکن اول درجے اور تیسرے درجہ کے لوگ ایرانی سماج میں بھی ہیں، دوسرے درجہ والے اول تو وہاں ہیں نہیں، اور اگر چند نفوس ہیں، تو وہ آسانی سے اول یا تیسرے درجہ میں رکھے جاسکتے ہیں اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ ایرانی سماج میں درمیانی کڑی فائب ہے۔“

والاسلٹنٹ ہنگامیا | طہران کے متعلق لکھتا ہے گوڑا شہر ہے، مگر کارخانے اور قابل ذکر فیکٹریاں نہیں ہیں، ہاتھوں اور سادہ اوزاروں سے البتہ چیزیں بنائی جاتی ہیں اور عمدہ اور نفیس بنائی جاتی ہیں، اور خود ہی بنائے ہیں اور خود ہی اسے بازار میں فروخت کرنے کے لئے لاتے ہیں

تعلیم کے متعلق اس کا بیان ہے کہ

”ایران میں جبریہ و لازمی تعلیم کا قانون جلدی ہے، لیکن یہ نام تعلیم آج کی حقیقت نہیں کل کی آرزو ہے، وزیر تعلیم

ڈاکٹر صادق کے قول کے مطابق ۳۳ میں ساڑھے تین لاکھ سے کم بچے اسکولوں میں جاتے تھے اور اب بارہ لاکھ

سے کم نہیں جاتے۔“

اخبار اور پریس کے متعلق اس کا بیان ہے

”ایران کی راہدہ معانی میں سب سے زیادہ چھپنے والا اخبار ”اطلاعات“ ہے لیکن اس کی اشاعت بھی تیس ہزار

سے زیادہ نہیں چار ہزار کی اشاعت والا اخبار بھی کامیاب سمجھا جاتا ہے۔“

وہاں کے ادبی ذوق کے متعلق لکھتا ہے کہ ایران غیر ملکی مطبوعات کا بیوکا ہے لیکن اسے افسانوی ادب سے کوئی لگاؤ نہیں، پچھتر سال ہوئے کہ ناصر الدین شاہ قاچار نے یورپ کا سفر کیا تھا اس وقت سے یورپ خاص کر فرانس کے مستند ادیبوں کی دو ہزار کتابوں کا فارسی میں ترجمہ ہو چکا ہے، نیا ایرانی نئے زمانہ کو سمجھنا چاہتا ہے کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ اس کو اس زمانہ اور اس کے لوازمات سے مفر نہیں، گو وہ اس سے بچا اور اسے بدلنا بھی چاہتا ہے۔

شیراز کی خصوصیت | شیراز کو اس سیاح نے عقل و دانش کا مسکن کہا ہے اور وہ لکھتا ہے کہ شیراز کا نام اہل ملک بڑی عزت سے لیتے ہیں، عیب جوئی دوسرے شہروں کی تو کر سکتے ہیں، مگر اس شہر شیراز کی نہیں، حافظ و سعدی جو ملک کے محبوب و مقبول شاعر تھے، یہ بزرگ شیراز ہی میں مدفون ہیں اور ان کے مزار صدیاں گزر جانے کے بعد بھی زیارت گاہ کی حیثیت رکھتے ہیں، خاص کر جمہ کے دن یہاں مزار پر کافی ہجوم رہتا ہے، اور جانے بنتی ہے اور لوگ غزلیں گاتے اور سنتے ہیں، شیراز میں تقریباً سب شاعری کا ذوق رکھتے ہیں۔

شیراز کی آبادی ایک لاکھ ہے، افلاس ایران میں یوں تو عام ہے مگر شیراز میں افلاس اور بھی زیادہ ہے بائیں ہمہ یہ ایک زندہ دل شہر ہے اور ادبی اور کلچری مستقر ہے، سیاح نے اس کی خوبصورتی اور دل آویزی کی کافی تعریف کی ہے،

شیراز کی عورتیں | شیراز کی عورتوں کے متعلق لکھا ہے کہ بہت خوبصورت اور حسین ہوتی ہیں تعلیم سے محروم ہیں مگر نقاب ڈالنے کو عیب سمجھتی ہیں ہر قسم کی روشن خیالی سے محرومی کے باوجود برقعہ اوڑھنے پر راضی نہیں، یہاں کی عورتیں بلا تکلف اور کسی جھجک کے بغیر دوکانداری کے فرائض انجام دیتی ہیں یہاں کی عورتیں بکثرت سگریٹ بھی پیتی ہیں، پینہ در عورتیں بھی ہیں اور بڑی بے جھجک ہیں لوگوں کو بڑی دلیری

سے مخاطب کرتی ہیں، بالکل ویسی ہی جیسے یورپ کے بڑے شہروں میں،
صوفیہ کی حالت | پورے صوبہ فارس کی آبادی میں لاکھ ہے، اور ملک کا یہ علاقہ بڑا زرخیز اور ہر اچھے
 زمین ہمہ قسم کی صلاحیت رکھتی ہے مگر آبپاشی کا انتظام نہیں، رگنا باد کو خشک ہوتے دیکھ کر کنواں کھودنے
 کی طرف توجہ دی جا رہی ہے، ایک یورپی انجنیر نے ایک کنواں کھودا تو فی گھنٹہ میں ہزار گیلن پانی مینے
 لگا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کی زمین کے نیچے پانی کا بڑا ذخیرہ ہے،
بھکاریوں کا چھتہ | سیاح لکھتا ہے

”شیراز کو بھکاریوں کا چھتہ کہنا مبالغہ نہیں، ایران کے دوسرے شہروں میں اپنا بیچ اور ناکارہ لوگ بھیک مانگتے
 نظر آتے ہیں، مگر شیراز میں کینے کے کینے ہی پیشہ کرتے ہیں، بوڑھے، جوان، مراد اور بچے ٹولیاں بنا کر مانگتے ہیں۔“
مزدوروں کی تعداد اور بیکاری | شیراز میں مزدوروں کی تعداد پچاس ہزار سے کم نہیں، جس میں سے فیکٹریوں میں جو کام
 کسے ہیں ان کی تعداد صرف دو ہزار ہے، سرکاری محکموں میں تین ہزار آدمی مصروف ہیں، مگر ان میں نصف
 تعداد فالتو ہے، سینیتیشن ہزارا جیسے ہیں جو گھر میں رہ کر کچھ نہ کچھ کرتے ہیں اور اتنا حاصل کر پاتے ہیں جو ان
 کی چلتی سانس کو باقی رکھ سکے، یعنی بھر پیٹ کھانا، ضرورت کے مطابق کپڑا اور دوسری ضروریات
 کے لئے یہ ترستے ہیں باقی دس ہزار کے متعلق سرکاری رپورٹ ہے کہ بالکل بے کار اور بے روزگار ہیں
 جہالت | گو شیراز ذوق شاعری میں سب سے آگے ہے مگر بااں ہمہ یہاں کی نوے فیصدی آبادی
 بے پڑھی لکھی ہے صرف دس فیصدی تعلیم یافتہ ہیں، اس شہر میں اخبار آٹھ نکلتے ہیں لیکن ان کی
 مجموعی اشاعت تیس ہزار سے زیادہ نہیں، ان میں سے ایک اخبار بھی روزانہ نہیں ہے اس پوری
 آبادی میں صرف دو ہائی اسکول ہیں، کالج اور یونیورسٹی ایک بھی نہیں ہے،

مذہبی حالات کا اس ایک واقعہ سے اندازہ لگائیے، جو وہاں کے ایک نوجوان محشریٹ کا بیان ہے
 ”آپ جانتے ہیں کہ میں ایک اچھا مسلمان ہوں، مگر مسجد میں کبھی نہیں جاتا اس لئے کہ مجھے ملا سے سخت نفرت
 ہے، میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں، کہ میں ترک وطن کا ارادہ کر رہا ہوں، کیونکہ وطن کے اندھ حالات سخت

حوصلہ فرسا اور مایوس کن ہیں۔“

جو لوگ باہر جا چکے ہیں وہ بھی اور دوسرے بھی جانتے ہیں کوئی حوامی تحریک اٹھے جس میں غمگینوں

کا ہاتھ نہ ہو

قبیلہ کاشغری | صوبہ فارس میں ایک پہاڑی علاقہ قبیلہ کاشغری کا مسکن ہے، اس کے متعلق امریکن سیاح
رہنما لکھتا ہے۔

”یہ علاقہ سورج کی گرمی سے ٹھسٹا ہوا بیابان ہے، اور جہاں وہاں خیموں اور چھوٹے گھروں کی بستیاں آباد،
بھڑوں کے گلے میں اور یہی ان لوگوں کا ذریعہ معاش ہے، اونچے پہاڑوں کے پچ میں وسیع دادی کا یہ علاقہ،
قبیلے کے بانی نے غالباً جنگی مصلحتوں کی بنا پر منتخب کیا ہوگا، اس علاقہ پر چائیک حملہ ہو جانا ناممکن ہے۔“

پھر آگے لکھتا ہے

کاشغری لوگوں کی تعداد دو لاکھ کے قریب ہے، جفاکش، دلیر، شہسوار اور بلا کے نشانہ باز ہیں
ان کا رہنا سہنا خیموں کے اندر ہے قالینوں کا استعمال انتہائی آرام و راحت کی دلیل ہے، قدامت سے
محبت ہے اور جدید روشنی اور ان کی برکات سے نفرت۔“

کاشغری لوگ شکار و سیر کے دلدادہ ہیں، ان کے اکثر افراد گھوڑے پر سوار اور کندھے پر بندوق
و سرے دکھائی دیں گے، ہر گھر میں ایک بندوق اور ایک گھوڑے کا ہونا ضروری سمجھا جاتا ہے،
زمینیت اور دیہی | کاشغری قبیلے کی عورتیں بھی بہادر اور دلیر ہیں، یہ بھی شہسواری کرتی ہیں، ان میں پردہ نہیں ہے
بالکل آزاد ہیں، مردوں اور عورتوں میں بڑی حد تک مساوات ہے مگر یہ باہر کہیں نہیں جاتیں، گھر کے کاموں
میں مصروف رہتی ہیں۔

اس قبیلے کے مرد و عورت سب کٹر مسلمان ہیں، ایمان و عقیدہ میں بہت پختہ ہیں، ایمان اور اسلام
کے نام پر جان قربان کر سکتے ہیں، ایک خاص بات یہ ہے کہ ان کی گردنوں میں قرآن حائل نظر آتا ہے
اور ان کا عقیدہ ہے کہ اس سے بلائیں پاس نہیں آتی ہیں، یہ شراب بالکل نہیں پیتے،
عموماً یہ لوگ ایک ہی بیوی رکھتے ہیں، ایک سے زیادہ بیوی رکھنے کے واقعات شاذ ہیں
کی نوبت تقریباً کبھی نہیں آتی، یہ ان کے یہاں بڑا عیب ہے، اسی وجہ سے یہ اپنی لڑکیاں غیر کاشغری سے

نہیں بیلتے، کہ شاید وہ طلاق دے دے، سولہ سال سے پہلے ہی لڑکی کی شادی کر دی جاتی ہے لبتہ
مرد ملدی شادی نہیں کرتے، ان کے یہاں جب شادی ہوتی ہے تو بندوقیں داعی جاتی ہیں،
صحت اور مستقیم اس قبیلہ کی صحت قابل رشک ہے، یہ پیریا، چچک، ٹائیفاؤڈ اور دوسری وبائی بیماریوں
سے محفوظ ہیں، یہاں کبھی خودکشی کے واردات نہیں ہوتے، ہاں اس علاقہ میں اسپتال، اسکول، ریڈیو
اور سینما وغیرہ نہیں ہیں، جو لوگ خوش حال ہیں وہ مسلم رکھ کر اپنے بچوں کو تعلیم دلاتے ہیں، شاعری کاشتچی
یہ لوگ بھی رکھتے ہیں، گو علم میں بہت پیچھے ہیں،

ایران کی ایک کروڑ ساٹھ لاکھ آبادی میں اندازہ ہے کہ قبائل کی تعداد تین چالیس لاکھ کے درمیان ہے
مرد قبیلہ کی ریاست سیاح مذکور کا بیان ہے کہ میں نے علاقہ سے واپس آکر اس قبیلے کے سردار سے پوچھا کہ آپ
مستقبل کے متعلق کیا خیال ہے؟ تو اس نے جواب دیا،

”آپ ہمارے علاقے میں گھوم کر آئے ہیں آپ نے دیکھا ہوگا کہ باقی تمام ایرانیوں کے مقابلہ میں ہم لوگ بہتر زندگی گزار
رہے ہیں، ہم آزاد ہیں ہم نے اپنی عورتوں کو دبا کر نہیں رکھا ہے، ہماری صحت سارے ایرانیوں سے بہتر ہے، ہمیں
نہ زمیندار کا ڈر ہے نہ جندمد (پولیس) کا خوف،

جب ہمارا ملک ایران ترقی کی اس منزل پر پہنچے گا کہ تمام کاشتکاروں کے پاس فولادی ہل ہوں،
دیہات میں بجلی پہنچ جائے، ڈاکٹر دستیاب ہونے لگیں، اسپتال کافی بن جائیں، لوگوں کے رہنے کو کافی
مکان ملیں، پینے کو صاف اور عمدہ پانی ملے، اور پولیس کے جبر و تشدد کا خاتمہ ہو، اس وقت کاشتچی
خانہ بدوشی ترک کرنے پر سوچ سکے گا۔

سیاح کہتا ہے میں نے توجہ دلائی کہ

”آپ مانیں گے کہ کاشتچی لوگ اس سے بہت زیادہ کر سکتے ہیں، جتنا وہ کر رہے ہیں، اور ان کی بڑی قوت ضائع

ہو رہی ہے، انہوں نے موشیوں کے چوسنے کے لئے اکھوں ایگز آرمانی کو چراگا ہیں بنا رکھا ہے جہاں غلہ
بھل اور ترکابیاں پیدا ہو سکتی ہیں، اسی طرح اس پر بھی غور کیجئے کہ صحیح علاج دستیاب نہ ہونے سے کتنے
موشی ضائع ہو جاتے ہیں۔“

اس نے جواب میں کہا مجبوری کی وجہ سے بے شک ایسی بات ہے مگر ہمارے علاقہ میں کوئی بھکاری تو نہیں ہے،

علاقہ بحر قزوین | بحر قزوین کے علاقہ میں سیاح پہنچا تو سب سے پہلے یہ ایرانی اخلاق سے متاثر ہوا، چنانچہ وہ سب سے پہلے ایک یورپی مصنف کا قول نقل کرتا ہے جو کافی مدت ایران میں قیام کر چکا ہے مصنف لکھتا ہے

”ایرانیوں کو خلق و تواضع کی تعلیم درکار نہیں، یہ وہاں کے پیٹ سے سانس لاتے ہیں“

اس قول کو نقل کر کے سیاح کہتا ہے کہ اس قول کی تصدیق جہاں بھی میں ایران میں گیا ہوں، بحر قزوین کا یہ علاقہ گیلان کہلاتا ہے، یہاں کے مکانات بہت خوبصورت ہیں، رہن سہن پاکیزہ ہے یہ علاقہ زرخیز اور شاداب ہے مگر طیر یا کاکر ہے، یہاں گھروں میں چٹائیوں اور قالینوں سے کام لیا جاتا ہے ان کے علاوہ یہاں گھروں میں اور کوئی فرخچر نہیں،

حالات | سیاح کہتا ہے کہ یہاں کی عورتوں کے اخلاق اور سلیقہ مندی سے میں بے حد متاثر ہوا، یہاں کی عورتیں بہت پاکیزہ رہتی ہیں، پروہ یہاں بھی نہیں ہے مگر یہیں یہ مسلم عورتیں، کاشتکاری کا سارا بوجھ غریب عورتوں نے اپنے کندھوں پر لے رکھا ہے، کاشتکاری پرانے طرز پر ہوتی ہے، لکڑی کاٹل ہے، بوجھ سر پر اٹھا کر لاتے ہیں، ٹھیکہ گاری کا پتہ نہیں، یہاں عموماً ایک ہی بیوی کا رواج ہے، ایک گیلانی نے ایک سوال کے جواب میں کہا ”وہ کوشش تو یہی کرتی ہے کہ دوسرا نکاح نہ ہو، میکے بھی چلی جاتی ہے لیکن پھر آجاتی ہے یہاں طلاق کی نوبت بہت کم آتی ہے،

یہاں سڑکیں کم ہیں، چنانچہ بعض موسموں میں یہ علاقہ شہر سے کٹ کر علیحدہ ہو جاتا ہے، گاؤں والے طبی امداد سے قطعاً محروم ہیں، — گیلان میں بٹائی کا طریقہ رائج ہے، آدمی کاٹھن کسان کو مل جاتا ہے اور کچھ اور رعایتیں بھی حاصل ہو جاتی ہیں، گھر کے ساتھ ایک باغچہ ہوتا ہے، جس میں مندرجات کی چیزیں پیدا ہوتی ہیں، جیسے پھل، ترکاریاں، ٹماٹر، کھیرے، خربوزے اور لہسن پیاز وغیرہ یہاں ہنجر سیاح لکھتا ہے

زراعتی مستی | ایران کی زراعتی بستی موت کے پنج کی طرح پورے ملک پر چھائی ہوئی ہے، اس کے خوش حال گاؤں میں ہل تو بے شک جانور کھینچتے ہیں، مانی تمام کام صرف ہاتھ سے انجام پاتے ہیں، گیلان کا پورا علاقہ چاول کی کاشت کرتا ہے۔ اور سٹاپر خاندان ڈھائی ایکڑ سے زیادہ کاشت نہیں کرتا، کیونکہ دھان کی فصل بہت محنت چاہتی ہے، اس میں سے کسان کو آدھا چاول ملتا ہے جو تیس چالیس بوشل کے درمیان ہوتا ہے، قرض ادا کرنے اور ضرورت کی چیزیں خریدنے کے بعد اس کے پاس موسم بہار کے ختم ہونے سے پہلے غلہ ختم ہو جاتا ہے اور وہ نیا قرض لینے پر مجبور ہوتا ہے، قرض کا سود دو گنا ہوتا ہے، اس مخصوص گاؤں کے بھی سب کسان مقروض رہتے ہیں، اس گاؤں کے لوگوں کی خوش پوشاکی امریکہ سے آتے ہوئے پرانے اور استعمالی کپڑوں کی بدولت تھی، سیاح کہتا ہے کہ ایک شخص نے کہا ”سڑکیں نہ ہونا، قرض اور سجادیران کی متن نعش ہیں، خود اس گاؤں کے نوے (۹۰) فی صدی باشندے طیریا کے شکار تھے، اور ان میں صرف چند ایسے تھے جنہیں کوئین نصیب تھی۔“

استاد اور پاکیزگی | یہاں کے میلہ کا تذکرہ کر کے سیاح کہتا ہے، کہ عوام کو میں نے بڑا خوش دیکھا اور آپس میں یہ بہت گھلے ملے پورپ کی طرح یہاں شراب کا نشہ نہیں دیکھنے میں آیا، یہاں شراب کی کوئی دکان بھی نظر نہ آئی، چونکہ یہ مسلمان ہیں شراب حرام سمجھتے ہیں، زیادہ سے زیادہ چائے کا دور چلتا ہے سینما کا کوئی نام بھی نہیں جانتا، پوری زندگی میں ان لوگوں نے ایک مرتبہ سینما دیکھا ہے اور وہ بھی جنگ کے زمانہ میں، جب برٹش قونصل کی طرف سے انتظام ہوا تھا،

زمینداروں کا تسلط | زمیندار بڑی تعیش کی زندگی گزارتے ہیں عوام کو معمولی سواری بھی میسر نہیں ہے مگر زمیندار موٹر پر دوڑے پھرتے ہیں، ان زمینداروں کے کارندے بڑے ظالم ہوتے ہیں، وہ ان سے پنا مانگتے ہیں، عوام میں زمینداروں کے خلاف جذبات بہت کافی ہیں، کیونکہ ان کے کارندے سربراہ ظلم ہیں حد یہ ہے کہ پانی بند کر دیتے ہیں، سیاح کہتا ہے کہ مرے ایک ساتھی نے کہا

”ہمارے علاقے میں چاول، چائے، تنباکو، اور رشیم کی قیمتی پیداوار ہوتی ہے اور اس کو ہم بڑھا بھی سکتے ہیں آراضی کی استعداد بھی بہت بڑھائی جا سکتی ہے لیکن زمینداروں کو پروا نہیں، اور کسان میں اتہج نہیں، چاول

”ہمارا ملک اس آدمی کی طرح ہے جو سونے کے تحت پر بیٹھا ہو، مگر بھوکا ہو۔“

پھر اس کے قول پر سیاح لکھتا ہے

”بلاشبہ آذربائیجان کی حالت اس قول کی شرح و تفسیر ہے، جدید آلات سے کام لیا جائے تو یہ علاقہ فی الواقع سوئیا

اچھے، لیکن زمیندار نرتی کرنے کی خاطر روپیہ لگاتے، اور بجاوت ہو جائے تو اس کی دولت گئی! یہ خطرہ ہر وقت

زمیندار کے سامنے ہے اس لئے وہ طہران میں بیٹھا چین کر رہا ہے۔“

سیاح موصوف نے تو وہ پارٹی کا تفصیل سے تذکرہ کیا ہے اور بتایا ہے اس نے کیا کیا کام کرائے

نمایاں انجام دیئے اور کہا ہے کہ اب بھی اس کے اثرات دماغوں میں موجود ہیں مگر وہ اپنی سیاحت کے

زمانہ کے متعلق کہتا ہے

”شہرِ زخمی و خاوش تھا، زندہ دلی کے آثار مفقود تھے، اقتصادی بد حالی شدید تھی، دن بھر کی مزدوری چھ تومان

(ایک سکہ ہے) فقی حالانکہ گدھے کا کرایہ دن بھر کے لئے سات تومان ہوتا ہے، کاروبار سرد تھا، کیونکہ سرمایہ دار

کو ڈر تھا کہ روس صرف اسی میل پر ہے۔“

عوام کی بے لیلیانی | سیاح کہتا ہے عوام میں اطمینان نہیں، ”سوئیت کے خیالات پھیل رہے ہیں، جن اسباب

نے پہلا انقلاب کرایا، ان کی جڑیں زمین کے اندر ہیں، اور وہ اب بھی جیسے کے جیسے موجود ہیں اور حکومت

طہران صرف امریکہ کا آسرا تک رہی ہے لیکن امریکہ کی امداد گولے برسا کر آبادیاں تو تباہ و مسمار کر سکتی ہے

بھوکوں کا پیٹ نہیں بھر سکتی، ایرانی عوام کے لئے ردی ہیا کرنا تو طہرانی حکومت ہی کا کام ہے اور وہی کر

بھی سکتی ہے۔“

مسار | شمالی صوبہ مازندران کے شہر ”مسار“ کی سیاح بڑی تعریف کرتا ہے، یہ شہر رضائے

نے اپنی جیب خاص سے روپے خرچ کر کے بنوایا تھا، بہت حسین اور جدید مدن سے آراستہ ہے، سیاح

اس کی جاذبیت سے متاثر ہو کر کہتا ہے ”ایران تو کیا غالباً سارے ایشیاء میں (ایسا شہر) مسیر نہ ہوگا۔“

ایک دوسری جگہ کہتا ہے کہ یہ شہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ کا کوئی شہر انشا کر یہاں بسا دیا گیا ہے۔ یہاں کے ٹہل

کی بڑی تعریف کی ہے اور اس کے دلکش حسن کا منظر کھینچا ہے۔ ”مسار کے ایک ایرانی سائنسدان کی بات

نقل کرتا ہے کہ اس نے کہا ۔

رضاشاہ سے حقیقت | ”ہمارے ملک میں دولت کی کمی نہیں، ہم فرانس سے زیادہ متمول ہیں، ہمارے زرعی وسیلے
جرمنی سے زیادہ ہیں، لیکن رضاشاہ کی معزولی کے وقت سے ہم بے حس و حرکت کھڑے ہیں کچھ کر نہیں سکتے ہیں۔“
رضاشاہ اصفہان آیا، اس نے وہاں سرمایہ داروں کو مجبور کیا کہ مل قائم کریں چنانچہ کپڑے کی ملیں
قائم ہو گئیں اور ان سے کافی نفع ہو رہا ہے پھر بھی ان ملوں کے لئے ترقی کی گنجائش ہے،
تفاح لاردم توجہ | سیاح کہتا ہے کہ ایران امریکہ کے آسیرے پر جی رہا ہے، حالانکہ خود ایرانی زمیندار عقل
سے کام لیں تو ملک بڑی آسانی سے ترقی کر سکتا ہے، امریکہ کے قرض کی نوبت بھی نہ آنے۔

ایران کے ارباب حکومت بھی چوری کرتے ہیں چنانچہ ایک پروفیسر کا بیان ہے

”ہمارے ملک میں لوگ صرف زمینداری اور تجارت ہی سے روپیہ نہیں کماتے بلکہ سیاست کو بھی نفع بخش بنالیتو
ہیں۔“ ایک ممتاز وکیل نے اعتراض کیا کہ ”دود کو کھانے رکھ کر انکم ٹیکس کی چوری کرتے ہیں۔“ مگر سیاح
یہ بھی کہتا ہے کہ اگر تنخواہ بڑی دی جائے تو یہ چیز ختم ہو سکتی ہے اور اس سلسلہ میں نیشنل بینک کے ملازمین
کا حوالہ دیتا ہے جو چالیس ہزار ملازمین کو مشاہرہ دیتا ہے اور دوسری رعایتیں بھی دیتا ہے، بینک کا گورنر
ابوالحسن ابتہاج ہے، سیاح نے اس کا یہ قول نقل کیا ہے۔

”اگر اسٹیٹ بینک کے چار ہزار ملازمین کا مل دیانت اور وفاداری کے ساتھ کام کر سکتے ہیں تو چار لاکھ کو
بھی ایسا بنایا جاسکتا ہے بشرطیکہ انھیں خدمت کا معاوضہ اتنا دیا جائے، کہ وہ لالچ کا شکار نہ بن سکیں۔“
ایران میں چائے بہت پی جاتی ہے، چار ہزار ٹن خود بھی چائے پیدا کرتا ہے، کچھ چائے باہر سے آتی ہے
سیاح کہتا ہے ”سبحر قزوین کے علاقہ میں بیس ہزار ایکڑ زمین ایسی بڑی ہے جہاں چائے کی کاشت کی جاسکتی ہے۔“
اخیر میں سیاح کہتا ہے

”بیرہاں دو باتیں اٹل ہیں۔ اس مشینی عہد کے زمانہ میں ایران کا جو دعرصہ تک قائم نہیں رہ سکتا اور ترقی و
خوش حالی کے لئے جو پورے گرام بھی بنایا جائے گا، اس کی ابتدا زمین اور کاشت کی اصلاح سے ہوگی۔“
قاہرہ اور اس کے علاقے | ایران کے بعد سیاح مصر پہنچا ہے وہ قاہرہ میں اترتا ہے تو دیکھتا ہے زمانہ جنگ کی یہاں بھی

ختم ہے، اور پھر پہلی سی کاہلی، چمچ و پکار اور عام پوشی ہے، گداگروں کی کثرت میں بھی کوئی کمی نہیں، خواجہ
فروشوں کی بہتات ہے اور زمانہ جنگ کی خوش حالی عنقا ہوٹل خالی پڑے ہیں، بازار سامان سے بھر پڑا ہے
مگر کوئی خریدنے والا نہیں، درکار ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔ سامان کی فراوانی سے سیاح
متاثر ہے، وہ کہتا ہے

”یورپ کی فاقہ کشی کے بعد قاہرہ میں کھجور اور بنجیروں کے ابار، کیلے، امرود کے ڈھیر آموں کی افراط دیکھ
کر حیرت ہوتی ہے۔“

قاہرہ کے متعلق سیاح کا بیان ہے، کہ قاہرہ میں عیش و عشرت کا بڑا سامان ہے، اتنا سامان کہ
زیورچ اور جنیوا میں بھی جہاں ڈالر کی بے عداد زرانی تھی، نمبر نہیں، ”بشیرہ کلب، رقص گاہیں، غلنے
اور سینما نہایت خندہ پیشانی سے سیاحوں کا خیر مقدم کرنے کو ہمہ وقت تیار تھے، ہر قسم کی مہاشی و ستریں
کے اندر تھی اور اس کے مہیا کرنے والے موٹر پر سیاحوں کا بچھا کرنے کو موجود تھے۔

سیاح کہتا ہے یہ عجیب شہر ہے ایک طرف شدید بے روزگاری، دوسری طرف ہر طرح کے
سامان کی افراط، ایک طرف قدیم اہرام اور عالی شان مسجدیں اور دوسری طرف نئے ڈیزائن اور جدید
وضع کی دلکش کوٹھیاں، اور پھر تیسری طرف جمونپریوں کا بھر مٹا ایک طرف شاندار موٹریں اور
دوسری طرف اونٹوں اور گدھوں کے قافلے،

افلاس دربتابی | یہاں افلاس انتہا کو پہنچا ہوا ہے گو اس افلاس نے ان کے اخلاق و عادات کو سپت
نہیں کیا ہے، عورتیں بے نقاب بھی ہیں اور نقاب پوش بھی یہاں لوگ باسانی کئی زبانیں بول لیتے
ہیں کچھ لوگ سنجیدہ بھی ہیں مگر عموماً یہاں بلند آواز سے بولتے ہیں، سیاح کہتا ہے

”اسکندریہ کے شہر ڈھول سے پانچ منٹ چلتے تو آپ کو دنیا کی حقیر ترین سبستاں اور جمونپریاں دکھائی

دیں گی جہاں کی گندگی اور بودماغ پر نشان کر دے گی، جہاں بچوں کی اکثریت آنکھوں کی بیماری میں مبتلا نظر

آئے گی، گداگر فٹ پاتھ پر لاشوں کی طرح بے حس و حرکت پڑے نظر آئیں گے، مفر کی اوسط اموات ساری

دنیا سے زیادہ ہے، ایک سال کے ہر چار بچوں میں سے ایک مر جاتا ہے۔“

قاہرہ کی بنیاد کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ۱۲۵۰ء قبل مسیح میں بڑی ترقی یافتہ تہذیب میں اس کی آبادی چھ لاکھ سے کچھ زیادہ تھی مگر اب اس کی آبادی تقریباً بیس لاکھ ہے، اس شہر میں بے شمار شاندار مسجدیں ہیں اور ایک ہزار سالہ قدیم یونیورسٹی ہے جس کا نام ”ازہر“ ہے یہاں سترہ ہزار طلباء تعلیم پاتے ہیں، ان میں سے چھ ہزار دوسرے ملکوں کے ہیں، بقول ایک مصری عالم ”قاہرہ اسلامی دنیا کا دھڑکتا ہوا دل ہے۔“

اخوت اسلام | قاہرہ میں ایک جماعت ”اخوت اسلام“ کے نام سے قائم ہے جو ہر نئی تحریک کی مخالفت ہے اگر بیکلچر کلچ کے طلبہ و طالبات اور پروفیسروں نے مل کر ایک ”محفل رقص و سرود قائم کر رکھی ہے، جہاں باوہار غول کے دور بے تکلف چلتے ہیں، اخوت اسلام والے اس کی مخالفت کرتے ہیں، اخوت اسلام والے اسلام کا مذاق اڑانے والوں کے خلاف احتجاج کرتے رہتے ہیں۔۔۔ سیاح اپنا ایک واقعہ لکھتا ہے:

ایک عبرتناک واقعہ | قاہرہ یونیورسٹی کے ایک طالب العلم نے ایک شام بدیع میں مدھوکیا، بدیع ایک نہایت فیشن ایبل اور

مشہور ریڈیو رین ہے، جہاں الاذہر اور اخوت کی طاقت و اثر کے باوجود نوجوان لڑکیاں ناچتی گاتی ہیں، اس مجلس میں

شریک ہونے سے پہلے میں تصور میں نہ لاسکتا تھا کہ مسلم تاشانی ایسے منظر کو گوارا کر سکتے ہیں، خاص کر جس شہر

میں جامعہ ازہر قائم ہو۔۔۔ میں نے اپنے میزبان دوست سے سوال کیا کہ مسلمانوں کے اتنے بڑے مجمع میں اسلامی

تعلیم کی یہ پامانی کیوں کر ممکن ہے۔۔۔ تو اس نے کہا ”یہ قاہرہ ہے“

سیاح مصر کی تضادِ طبیعت کا حوالہ دیتے ہوئے کہتا ہے ”کہ ایک طرف مصر جو ڈالر کا بھوکا ہے یہ بھی

چاہتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ غیر ملکی سیاح یہاں آئیں۔۔۔۔۔ مگر دوسری طرف . . . غیر ملکوں کے

خلاف مظاہرے بھی کرتا رہتا ہے۔“

رشوت و فساد | سیاح مصر میں رشوت ستانی کی شکایت کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ”رشوت کا یہ عالم ہے کہ جو

غیر ملکی مصر میں کاروبار کرتے ہیں وہ اپنا کام کسی دوسرے ملک میں منتقل کرنے کی فکر میں ہیں“ قاہرہ

کے متعلق کہتا ہے کہ جو یہ کرتا ہے وہی پورا مصر ملک عرب دنیا کا اکثر حصہ کرنے لگتا ہے۔ مصر میں کسانوں

کی حالت نہایت خراب ہے، مگر کوئی پروا نہیں،۔۔۔ (باقی آئندہ)

مدرسہ عالیہ کلکتہ کی مختصر تاریخ

از

(جناب محمد عبداللہ صاحب ایم۔ اے۔ استاذ مدرسہ عالیہ کلکتہ)

”پچھلے دنوں مغربی بنگال کی حکومت کے محکمہ نشر و اشاعت کی فرمائش پر جناب سید احمد البر آبادی ایم۔ اے۔ پرنسپل مدرسہ عالیہ نے بنگال کی اس اہم اور قدیم تاریخی اسلامی درسگاہ کی مختصر تاریخ پر ایک مقالہ انگریزی زبان میں لکھا تھا جو حکومت مغربی بنگال کے آرگن ”ویسٹ بنگال ویکی“ کی اشاعت مورخہ ۲۶ دسمبر ۱۹۵۲ء میں بڑے جلی عنوانات اور خاص اہتمام اور مدرسہ کی چند تصاویر کے ساتھ شائع ہوا اور اس کے بعد متعدد انگریزی اخبارات و رسائل نے اس کو اپنے ہاں نقل کیا۔ اب اردو خواں طبقہ کے افادہ کی غرض سے ہم اس کا اردو ترجمہ ”برہان“ کے ذریعہ پیش کرتے ہیں۔ امید ہے کہ قارئین کے لئے دلچسپی اور معلومات میں اضافہ کا باعث ہوگا۔

(محمد عبداللہ)

کلکتہ مدرسہ ایک قدیم درسگاہ ہے جسے ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان میں قائم کیا۔ اس کی ابتدائی تاریخ بورڈ آف ریونیو کی کارگزاری مورخہ ۱۷ اپریل ۱۸۵۸ء میں محفوظ ہے جسے اس وقت کے گورنر جنرل اور اس ادارہ کے بانی لارڈ دارن ہیسٹنگس نے قلمبند کیا ہے۔

گورنر جنرل موصوف کے بیان کے مطابق کلکتہ مدرسہ کے قیام کی سب سے بڑی وجہ ذیل کا واقعہ ہے ”ستمبر ۱۸۵۷ء میں چند مسلمان اکابرین اور اہل قلم حضرات ایک وفد کی شکل میں میرے پاس آئے اور ایک عرضی پیش کی جس میں یہ درخواست کی گئی تھی کہ ایک تعلیمی ادارہ کے قیام کے لئے میں مولانا محمد الدین نامی ایک شخص کو جو کہ حال ہی میں وارد صوبہ ہوئے تھے، اس پر آمادہ کروں کہ وہ یہاں رہ کر نوجوان طالب علموں کو قوانین اسلامی و دیگر علوم جو مسلم اداروں میں سکھائے جاتے تھے سکھائیں اور یہ کہ مولانا موصوف کی شخصیت علیٰ اعتبار سے عدیم المثال ہے۔ اراکین وفد نے اس پر زور دیا کہ مدرسہ یا کالج کے قیام کے لئے

یہ ایک نہایت مناسب موقع ہے اور مولانا محمد الدین جیسے لائق و فائق بزرگ اس کی تشکیل اور صحیح رہنمائی کے لئے نہایت موزوں ثابت ہوں گے۔

وفد نے آگے چل کر یہ بھی واضح کیا کہ مجوزہ مدرسہ سے کہنی کو اس کے انتظامی امور کی انجام دہی میں بڑی سہولتیں حاصل ہوں گی کیونکہ یہاں سے ایسے قابل اور معاملہ فہم لوگ پیدا ہوں گے جو حکومت کے محکمہ عدل میں حاکم فوجداری و حاکم دیوانی جیسے اہم عہدوں کو بخوبی سمجھا سکیں گے ورنہ ہیڈسٹنگس نے ان سے اتفاق رائے کرتے ہوئے مولانا محمد الدین کو طلب کیا اور مجوزہ عہدے کی پیش کش کی چنانچہ مدرسہ کی ابتداء اوائل اکتوبر ۱۹۵۲ء سے ہوئی۔ ورنہ ہیڈسٹنگس نے اس کے سارے مصارف و جن کی کل رقم ۶۲۵ روپے تھی خود ہی پورا کرنے کا وعدہ کیا۔

مدرسہ کے کام کاج میں مولانا نے جو سرگرمی دکھائی اور مدرسہ کو جو خاطر خواہ کامیابی و شہرت حاصل ہوئی ان سے خوش ہو کر ورنہ ہیڈسٹنگس نے ”شہر کے ایک علاقہ پدو پوکھر میں بیٹھک خانہ کے قریب ایک مناسب قطعہ زمین خرید کر جہاں ہندوستان کے مختلف حصوں کی عمارت کے نمونہ پر مدرسہ کے لئے ایک مے بع عمارت کی بنیاد ڈالی۔ یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ مدرسہ کے سارے اخراجات کا بار اس وقت تک ورنہ ہیڈسٹنگس کی جیب خاص ہی رہتا۔

۱۸ اپریل ۱۹۵۲ء کو ہیڈسٹنگس نے اس کا (یعنی مدرسہ کا) معاملہ بورڈ آف ریونیو کے سامنے ان تجاویز کے ساتھ رکھا کہ اس وقت تک جس ادارے کو وہ اپنے ذاتی خرچ سے چلا رہے تھے حکومت اسے براہ راست اپنی نگرانی میں کرے اور اہ ہزار روپے کے خرچ سے اس زمین پر اس کے لئے ایک عمارت بنائے جسے انھوں نے اس مقصد کے لئے انتخاب کر رکھا تھا۔ اگرچہ بورڈ نے ان تجاویز کو منظور کر لیا اور اپنی سفارشات کے ساتھ کورٹ آف ڈائریکٹرز کے سپرد کر دیا لیکن ماہ اپریل ۱۹۵۲ء سے پہلے مدرسہ کے اخراجات کے لئے خزانہ عامہ سے کوئی رقم منظور نہیں کی گئی۔ اس وقت ورنہ ہیڈسٹنگس ہی مدرسہ کے کل مصارف و برداشت کرتے رہے۔ اس معاملے میں غالباً اسی وجہ سے تاخیر ہوئی کہ ان دنوں ہیڈسٹنگس کسی ضرورت سے بنارس گئے ہوئے تھے۔

۱۸۸۲ء میں چونکہ ۸ اپریل والی تجویزوں پر کوئی کارروائی نہیں کی گئی تھی اس لئے سہینگلز نے اس معاملہ کی طرف بورڈ کی توجہ دوبارہ مبذول کرائی۔ انھوں نے مصارف کی ایک تفصیل پیش کر کے ۵۲۵۱ آرڈینڈ مدرسہ کے اخراجات کے لئے اور اہم ۵۶ روپے اس کی زمین کے لئے سرکاری خزانہ سے حاصل کر لیے ساتھ ہی ساتھ بورڈ نے مدرسہ کی بقا و تحفظ کے لئے مدرسہ محال کی آمدنی سے مزید ۱۲۰۰ روپے ماہانہ دینا منظور کیا۔ جون ۱۸۸۳ء میں حکومت نے کلکتہ سنکرت کالج کے طرز پر مدرسہ کی عمارت بنوانے کا منصوبہ کیا اس کی ضرورت اس لئے محسوس کی گئی کہ مدرسہ کی عمارت کافی شکستہ حال ہونے کے علاوہ شہر کے ایک ایسے علاقہ میں تھی جہاں طلباء کی دماغی اخلاقی اور جسمانی صحت کا برقرار رہنا ممکن نہ تھا۔ بنابرین ۵۳۷۱ آرڈینڈ زمین کی خریداری اور نئے کالج (مدرسہ) کی تعمیر کے لئے منظور کئے گئے، اور اسی جگہ کا انتخاب عمل میں آیا (یعنی ویسلی اسکوائر کے متصل مسلمانوں کی کثیر آبادی کے درمیان) جہاں مدرسہ کی عمارت آج بھی موجود ہے اس کا سنگ بنیاد ضروری تکلفات کے ساتھ ۵ جولائی ۱۸۸۳ء کو رکھا گیا اور ۱۸۸۳ء میں جب اس کی تعمیر مکمل ہو گئی تو مدرسہ کو باقاعدہ یہاں منتقل کر دیا گیا۔

کچھ ہی دنوں کے بعد اس ادارہ میں شعبہ عربی (جو کہ ایک کالج کی حیثیت رکھتا ہے) کے علاوہ ایک اور شعبہ کا اضافہ کیا گیا جسے "انگلورپشین ڈیپارٹمنٹ" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

کلکتہ مدرسہ کا قیام دراصل اس مقصد کے ساتھ عمل میں آیا کہ مسلمان نوجوانوں کو عربی و فارسی ادب کے علاوہ علوم اسلامی کی تعلیم دوسرے مدارس اسلامیہ کے طرز پر دی جائے۔ انگریزی زبان کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا بلکہ کچھ عرصہ کے بعد فارسی کی طرح شاید اسے بھی ایک اختیاری مضمون قرار دیا گیا۔

کلکتہ مدرسہ وقتاً فوقتاً سرکاری تحقیقاتی کمیٹیوں کی توجہات کا مرکز رہا ہے جو ضروری اصلاحات اور دیگر تبدیلیوں کے متعلق حکومت کے سامنے اپنی سفارشات پیش کرتی رہی ہیں۔ چنانچہ ۱۸۹۷ء میں جو تعلیمی نصاب مقرر کیا گیا تھا وہ اوائل ۱۹۲۵ء تک جاری رہا۔ اس نصاب کے مطابق انگریزی ادب کو فارسی ادب کی طرح ایک اختیاری مضمون بنا دیا گیا اور اس کا معیار امتحان میٹرک (کی انگریزی) کے مساوی کر دیا گیا اور ٹائٹل کے موجودہ درجہ حدیث و تفسیر کا اجرا کیا گیا۔

فی الحال کلکتہ مدرسہ دو شعبوں پر مشتمل ہے (۱) شعبہ عربی (۲) شعبہ انگریزی و فارسی (یا اینگلو پرشین

ڈیپارٹمنٹ)

شعبہ عربی میں کل ۱۲ جماعتیں ہیں — ۶ جونیر اور ۶ سینیئر کی۔ جونیر جماعتوں میں کوئی امتحان ایسا نہیں ہوتا جس میں خارجی طلباء (یعنی جو طلباء کلکتہ مدرسہ کے باضابطہ طالب علم نہیں ہیں) شامل ہو سکتے ہوں برخلاف اس کے عالم، فاضل اور ممتاز (ڈائٹل) کے امتحانات ایسے ہیں جن میں خارجی طلباء بھی شرکت ہو سکتے ہیں لیکن مذکورہ امتحانات میں شرکت کے لئے دو تعلیمی سالوں کی پابندی ضروری ہے۔ ممتاز ڈائٹل، جماعت میں فقہ اور حدیث و تفسیر کے دو مختلف گروپ ہوتے ہیں جونیر جماعتوں میں ذیل کے مضامین پڑھائے جاتے ہیں:-

۱۔ عربی قواعد اور صرف و نحو (۲) فارسی (۳) اردو (۴) بنگلہ (۵) انگریزی (۶) ریاضی (۷)

منطق (۸) تاریخ (۹) جغرافیہ (۱۰) عربی ادب (۱۱) فقہ (۱۲) تجوید

سینیئر کی مختلف جماعتوں میں ذیل کے مضامین کی تعلیم ہوتی ہے:-

۱) فقہ اور اصول (۲) عربی ادب (۳) تاریخ اسلام (۴) منطق یونانی (۵) انگریزی یا فارسی (اختیاری)

(۶) اردو (۷) حدیث (۸) تفسیر اور (۹) فلسفہ (یونانی)

اپنے مخصوص نصاب تعلیم اور امتحانات کے لحاظ سے ”انگلو پرشین ڈیپارٹمنٹ“ کا الحاق کلکتہ یونیورسٹی کے ساتھ ہمیشہ رہا ہے لیکن جدید انتظام کی رو سے اس ڈیپارٹمنٹ کا الحاق اب صوبہ کے سکریٹری ایجوکیشن بورڈ کے ساتھ ہے۔

تقسیم صوبہ کے ساتھ ساتھ کلکتہ مدرسہ کا شعبہ عربی، ڈھاکہ (مشرقی پاکستان) منتقل ہو چکا ہے۔ اس کی وجہ سے ملک کو بڑا نقصان پہنچا اور جلد ہی اس کے دوبارہ قیام کی ضرورت شدت محسوس کی گئی:-

بہر حال ۲۰ دسمبر ۱۹۴۸ء کو حکومت مغربی بنگال فیوژنل کا آرڈر جاری کیا۔

سیکرٹری کاونسل کے فیصلہ کے مطابق کلکتہ مدرسہ کے شعبہ عربی کو اگست ۱۹۴۹ء میں تقسیم صوبہ کے

ساتھ مشرقی پاکستان میں منتقل کر دیا گیا۔ اس کے ٹھوڑے ہی عرصہ کے اندر، حکومت سے درخواست

گئی کہ وہ اسے دوبارہ جاری کرنے کے لئے ضروری اقدام کرے۔ حکومت کے پاس مسلمان رہنماؤں اور عالموں کی طرف سے اور بھی درخواستیں پہنچیں جن میں یہ کہا گیا تھا کہ ثقافتی اور تعلیمی اسباب کے پیش نظر کلکتہ مدرسہ کو دوبارہ کھول دینا چاہئے کیونکہ اس صوبہ کے مسلمان اس ادارہ کے مشرقی پاکستان میں منتقل ہو جانے کی وجہ سے اعلیٰ مذہبی تعلیم کے حصول سے محروم ہو گئے ہیں اور اس کا انصاف تعلیم وہی رکھا جائے جو تقسیم ملک سے پہلے رائج تھا۔

۴ اپریل ۱۹۴۹ء کو مدرسہ کا دوبارہ قیام عمل میں آیا۔ حوام کا خیال تھا کہ مغربی ننگال میں مدارس کی تعلیم کا انتظام والضرام از سر نو اس طور پر کیا جائے گا کہ یہاں کے محصلین عربی ادب و علوم اسلامی کے ساتھ ساتھ ادب اور سائنس کے دوسرے مضامین سے بھی کما حقہ واقف ہوں گے۔ نیز یہ بھی محسوس کیا گیا کہ مولوی حضرات اپنی زندگی کا بیشتر حصہ مدارس عربیہ میں صرف کر دیتے ہیں اس کے باوجود عام طور پر ان میں عربی و فارسی میں بات چیت کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی اور جدید عربی و فارسی میں گفتگو کرنے سے تو وہ قطعاً نا آشنا ہوتے ہیں کیونکہ ان کا انہیں کوئی علم نہیں ہوتا۔ مدارس عربیہ کے متعلق ان خامیوں اور کمزوریوں کا احساس کوئی اچھی بات نہ تھی چنانچہ یہ مناسب سمجھا گیا کہ کلکتہ مدرسہ کے شعبہ عربی کے دور نو کی بنیاد جدید طرز تعلیم پر رکھی جائے۔

ان مقاصد کو مد نظر رکھتے ہوئے کلکتہ مدرسہ کے دوبارہ قیام کے فوراً ہی بعد اس میں تین انجمنیں قائم کر دی گئیں :-

النادیۃ العربیہ : یہ انجمن ایک ایسے شخص کی زیر نگرانی اپنے فرائض انجام دے رہی ہے جو عربی زبان و ادب کے استاد ہونے کے علاوہ جامعہ اوزیر قاہرہ کے فاضل ہیں۔ عربی میں بلا تکلف بول چال کر سکتے ہیں اور جدید عربی زبان و ادب کے ماہر بھی ہیں۔ اس انجمن کی ماہانہ نشستیں ہوا کرتی ہیں جن میں طلباء صرف عربی میں مضامین پڑھتے ہیں تقریریں کرتے ہیں اور بحث و تمحیص میں حصہ لیتے ہیں۔

۱۔ سری دو انجمنیں یعنی بزم ادب اردو و بنگلہ، النادیۃ العربیہ کے تحت ہیں جو علی الترتیب زبان اردو

بنگلہ کی ترویج و ترقی کے لئے مصروفِ عمل ہیں۔

کلکتہ مدرسہ ان داغلی سرگرمیوں کے علاوہ ایک مدرسہ بورڈ (بنام مغربی بنگال مدرسہ ایجوکیشن بورڈ) کا بھی مرکز ہے جسے حکومت مغربی بنگال نے صوبہ کے جملہ ہائی مدرسہ، سینیئر اور ٹائٹیل امتحانات کی انجام دہی و دیگر امور متعلقہ کے نظم کے لئے ۲۹ دسمبر ۱۹۴۹ء کو قائم کیا اور پرنسپل کلکتہ مدرسہ جس کے (ایکس آفیشیو) رجسٹرار ہیں۔ اس بورڈ نے وجود میں آنے کے بعد ہی عرصہ بعد پرانے نصابِ تعلیم پر نظر ثانی کرنے اور اس میں جدید فلسفہ، سائنس، ادب، انگریزی اور دوسرے مضامین کے اضافہ پر غور و خوض کے لئے ایک ”سب کمیٹی“ بنائی تاکہ ایک طرف قدیم اور جدید طرزِ تعلیم والے مدارس میں یکسانیت پیدا ہو جائے اور دوسری طرف مدارس عربیہ کے محصلین صوبائی و مرکزی حکومتوں میں خدمات عامہ کی ملازمتوں کے اہل بن سکیں۔ اس ”سب کمیٹی“ نے مارچ ۱۹۵۱ء میں اپنے کاموں کی تکمیل کر لی ہے اور ایک نیا نصابِ تعلیم حکومت کی منظوری کے لئے پیش کر چکا ہے۔

ملک کی تقسیم کے بعد صوبہ میں اسلامی تعلیم کی نشر و اشاعت کی طرف سے چند لوگوں کے دلوں میں ایسی پیدا ہو چکی تھی لیکن کلکتہ مدرسہ اور دوسرے ہائی اور سینیئر مدارس (جو کہ صوبہ میں عابجا قائم ہیں) میں طلباء اور مغربی بنگال ایجوکیشن بورڈ کے امتحانات میں شریک ہونے والے امیدواروں کی تعداد کے پیش نظر یہ قیاس کرنا کہ ان حضرات کا وہم و خوف بے جا تھا کوئی غلط بات نہ ہوگی۔

سیرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم

جس میں آسان اور دل نشین انداز میں سیرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اہم واقعات کو بیان کیا گیا ہے دورِ حاضر کی مختلف سیرت نبوی کی کتابوں میں جامعیت کے اعتبار سے امتیازی حیثیت رکھتی ہے

بلا جلد ص ۴۸

قیمت مجلد سے

حالات حاضرہ

کینیا اور اس کے باشندوں کی قومی تحریک

امرار احمد صاحب آزاد

دوسری عالم گیر جنگ کے بعد دنیا کی تمام محکوم اور نیم محکوم اقوام میں اپنی اقتصادی اور معاشی بہ حالی کی بدولت قومی آزادی اور خود مختاری کی ضرورت کا جو احساس پیدا ہوا ہے "تاریک براعظم" کے باشندوں کا ذہن بھی اس احساس سے خالی نہیں رہا اور آج براعظم افریقہ کے ایک چھوٹے سے خطے کینیا کے باشندے بھی نہ صرف اپنے وطن کی آزادی اور خود مختاری کی جدوجہد میں مصروف ہیں بلکہ برطانوی مستعمرین کے وحشیانہ مظالم کے شکار بھی بنے ہوئے ہیں۔ کینیا براعظم افریقہ کے مشرقی ساحل پر واقع ہے۔ افریقہ کے دوسرے بہت سے ملکوں خطوں اور علاقوں کی طرح یہیں کینیا کے متعلق بھی کچھ زیادہ معلومات حاصل نہیں تھیں لیکن ۱۹۵۲ء کے آخری چار ماہ میں دفعتاً کینیا نے دنیا بھر کی توجہ کو اپنی طرف منکشف کر لیا اور ایک بار پھر حقیقت بے نقاب ہو گئی کہ جمہوریت پسندی کے بلند بانگ دعووں کے باوجود برطانوی استعمار پسند کسی محکوم قوم کی خواہش حریت خواہی کی پذیرائی کے لئے تیار نہیں۔

عام حالات

کینیا کا رقبہ دو لاکھ پچیس ہزار مربع میل ہے اور اس طرح یہ ملک فرانس سے بڑا واقع ہوا ہے۔ ۱۹۴۸ء کی مردم شماری کے مطابق کینیا کی مجموعی آبادی ۵۲۷۳۰۷۸ افراد پر مشتمل ہے جن میں ۵۲۱۸۲۳۲ ملشی ۹۰۵۲۸ ہندوستانی اور ۲۹۶۶۰ یورپین شامل ہیں۔ اس ملک کا تقریباً ۳ حصہ نیم ریگستان واقع ہوا ہے اور چھ کینیا کا جنوبی ساحلی علاقہ بہت زیادہ زرخیز ہے اس لئے اس ملک کی تمام ترقی اقتصادی زندگی اسی حصہ کے ساتھ وابستہ ہے۔

انتظامی اعتبار سے کینیا کا مرکزی شہر نیروبی ہے اور اس شہر کی آبادی ۴۸۹۴۱۱ افراد پر مشتمل ہے۔ نیروبی کے علاوہ ممباسا اور نکورو وڈو اور بڑے شہر میں ممباسا کی آبادی ۴۶۴۴۸ افراد پر مشتمل ہے۔ یہ شہر مندرجہ

اور صنعتی مرکز بھی ہے اور نیکورو کو ان یورپی باشندوں کا مرکز سمجھا جاتا ہے جو کینیا میں زراعت اور باغبانی کرتے ہیں۔

انتظام

انتظامی اعتبار سے کینیا دو حصوں — علاقہ زیر حمایت اور نوآبادی — پر منقسم ہے۔ علاقہ زیر حمایت میں دس میل عرض وہ قطعہ ارض جو ٹانگانیکا کی سرحد سے شروع ہو کر کینیا تک بحر ہند کے ساحل کے ساتھ ساتھ چلا گیا ہے نیز مجمع الجزائر لاسو شمال ہے انیسویں صدی کے آخر میں کینیا پر تسلط حاصل کرنے کے لئے برطانیہ اور جرمنی کے مابین تصادم رونما ہوا تھا اور اس تصادم کے نتیجے میں فریقین کے درمیان ۱۸۹۰ء میں جو معاہدہ ہوا تھا اس کی رو سے برطانیہ نے بحر شمالی میں اپنا مقبوضہ جزیرہ ہلنگوڈ جرمنی کے حوالہ کرنے کے علاوہ ٹانگانیکا پر جرمنی کے استحقاق کو بھی تسلیم کر لیا تھا اور جرمنی نے کینیا اور یوگنڈا کو برطانیہ کے لئے چھوڑ دیا تھا اور ۱۹۱۲ء میں برطانیہ نے کینیا کے اس علاقہ کے علاوہ سلطان زنجبار کی سلطنت میں شامل سمجھا جاتا تھا باقی ماندہ تمام علاقہ کو نوآبادی قرار دے دیا تھا۔

بہر حال جہاں تک نظم و نسق کا تعلق ہے علاقہ زیر حمایت اور نوآبادی میں کوئی فرق نہیں دونوں حصے ایک گورنر کے ماتحت ہیں جسے برطانوی حکومت مقرر کرتی ہے۔ گورنر کی مجلس عاملہ کے اراکین ہی مختلف شعبوں کے انتظام کے ذمہ دار ہوتے ہیں کینیا میں ایک مجلس قانون ساز بھی موجود ہے جس کے کچھ اراکین کو گورنر نام زد کرتا ہے اور باقی ماندہ کو کینیا میں رہنے والے یورپی باشندے منتخب کرتے ہیں لیکن اس مجلس کے منظور کردہ تمام قوانین کے نفاذ کا معاملہ گورنر کی منظوری پر منحصر ہے۔

اقتصادیات

کینیا ایک زرعی ملک ہے۔ وہاں ایک خاص قسم کا گھاس جس سے رستے بٹے جاتے ہیں، کافی، چائے، گندم، کپاس، عاقر قرحا، مونگ پھلی اور لے شکر کی کاشت کی جاتی ہے اور چند ایسے کارخانے بھی ہیں جہاں ملک کی زرعی پیداوار غیر مالک میں بیچنے کے قابل بنانے کے علاوہ جوتے وغیرہ بھی تیار کئے جاتے ہیں۔ کینیا میں سونے، تانبے، نمک اور مینگانیز کے ذخائر بھی دریافت ہوئے ہیں لیکن ابھی ان معدنی

ذخائر کو برآمد کرنے کا کوئی معقول انتظام نہیں کیا گیا۔ مختصر یہ کہ کینیا کے باشندوں کی اقتصادی حالت ابھی نہیں۔

وقت کا اہم ترین مسئلہ

جیسا کہ سطور بالا میں بیان کیا جا چکا ہے کینیا ایک زرعی ملک ہے اور آج اراضی کا مسئلہ ہی اس چھوٹے سے ملک کا اہم ترین مسئلہ بنا ہوا ہے اور اس مسئلہ کی اہمیت کا اندازہ صرف اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ کینیا کے نیچاس لاکھ مقامی باشندوں کے قبضہ میں ۲۷۵۰۰۰۰ ایکڑ اراضی ہے اور صرف ستیس^{۳۲} ہزار برطانوی نوآبادکار ۸۱۰۰۰۰ ایکڑ بہترین قابل کاشت اراضی پر قابض ہیں۔ پھر اسی قدر نہیں بلکہ بعض برطانوی زمینداروں کے پاس کینیا میں ایک ایک لاکھ سے لے کر سارے تین تین لاکھ ایکڑ زمین موجود ہے۔ کینیا کے مقامی باشندوں کی کاشت کو بعض ایسے مخصوص علاقوں میں محدود کر دیا گیا ہے جہاں بیشتر اراضی ناقابل کاشت ہے ”کراؤن لینڈ آرڈی منس“ راء ارضی سے متعلق شاہی ہنگامی قانون کی رو سے مقامی لوگوں کو زر خیز علاقوں میں اراضی حاصل کرنے کی اجازت نہیں اور ۱۹۴۸ء سے انھیں ان کی مقبوضہ زر خیز اراضی سے بے دخل کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ کینیا کے مشہور قبیلہ لکیو یو کو کم و بیش آٹھ سال قبل جو اراضی دی گئی تھی وہ واپس لے لی گئی ہے۔ ایسی تمام اراضی برطانوی نوآبادکاروں کے حوالہ کر دی جاتی ہے اور ان برطانوی نوآبادکاروں کو مالی امداد دینے کے لئے ایک سربہ بھی قائم ہے۔

یہ امر محتاج بیان نہیں کہ اراضی سے محروم ہو جانے کے بعد مقامی باشندے برطانوی نوآبادکاروں کے یہاں مزدوری کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا جاتا بلکہ ان مقامی باشندوں پر گرانقدر محاصل بھی عائد کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ گزشتہ سال کینیا سے شائع ہونے والے برطانوی اخبار ”ایسٹ آف فرینڈز“ نے لکھا تھا کہ — ہمارا خیال ہے کہ مقامی باشندوں پر گراں قدر محاصل عاید کرنے کے بعد ہی — انھیں (ذاتی کاشت) چھوڑنے اور مزدوری کرنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے مقامی باشندوں کے مصارف زندگی کو بڑھانے کا یہی ایک طریقہ ہے اور جیسا کہ اس سے پہلے توجہ دلائی جا چکی ہے اسی بات پر مزدوروں

کے زیادہ سے زیادہ ملنے اور انھیں کم از کم اجرت دینے جلنے کے مسئلہ کا انحصار ہے۔ اور ان مزدوروں کو جو اجرت دی جاتی ہے وہ عام حالات میں، شلنگ سے ۸ شلنگ ماہوار تک اور خاص حالات میں دو پاؤنڈ ماہوار سے زیادہ نہیں ہوتی۔

مقامی باشندے اپنی مخصوص بستوں میں رہتے ہیں، زسلوں، پھولس اور مٹی سے بنے ہوئے ان کے جھونپڑے تاریک اور مرطوب ہوتے ہیں۔ ان کی بستیاں متعدد امراض کا گہوارہ بنی رہتی ہیں، تپ دق کا مرض عام ہے اور ان بستیوں کی کم و بیش ۳۱ فی صد آبادی ملیریا میں مبتلا رہتی ہے اور ۸ فی صد بچوں کے لئے ابتدائی تعلیم کا بھی کوئی انتظام نہیں۔

سیاسی حقوق؟

کینیا کے مقامی باشندے سیاسی حقوق سے محروم ہیں اور اگرچہ ملک کی مجلس قانون ساز میں ان کے چار نمائندے ہوتے ہیں، لیکن انھیں ان کی رائے سے منتخب نہیں کیا جاتا بلکہ گورنر مقرر کرتا ہے پھر وہاں رنگ اور نسل کے امتیاز کو بھی کام میں لایا جاتا ہے۔ برطانوی حکام مقامی باشندوں سے ہر وقت بے گارے سکتے ہیں اور انھیں ان کی مرضی کے خلاف محنت کرنے کے لئے ملک سے باہر بھی بھیج سکتے ہیں، چنانچہ جنوری ۱۹۵۷ء میں جب مصری مزدوروں نے ہنر سوزیہ کے علاقہ میں برطانیہ کے لئے کام کرنے سے انکار کر دیا تھا تو کینیا کے باشندوں کو حیرانہ سوزیہ کے علاقہ میں کام کرنے کے لئے بھیج دیا گیا تھا۔

آزادی کی تحریک

کینیا میں برطانوی مستعمرین تحصیل بالجبر کی جس حکمت عملی پر کاربند رہے ہیں کینیا کے باشندوں نے کسی مرحلہ میں بھی اسے پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا اور اگرچہ یہاں اس جدوجہد کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنا ممکن نہیں جس میں کینیا کے باشندے موجودہ صدی کے شروع ہی سے مصروف رہے ہیں۔ لیکن ۱۹۲۳ء سے ۱۹۴۷ء تک کینیا میں برطانوی حکمت عملی کے خلاف بطور احتجاج چار مرتبہ جو زبردست ہڑتالیں ہو چکی ہیں وہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ کینیا کے باشندے کسی زمانہ میں بھی برطانوی حکمت عملی سے مطمئن نہیں ہو سکے۔

بہر حال دوسری عالمگیر جنگ کے زمانے سے کینیا کے باشندوں کی تحریک آزادی میں شدت اور وسعت پیدا ہوتی جا رہی ہے اور اس تحریک کی قیادت کینیا کے باشندوں کی انجمن — کینیا افریکن یونین — کر رہی ہے۔ اور اگرچہ اس انجمن کی زمام قیادت اعتدال پسندوں کے ہاتھوں میں ہے لیکن اس کے ہر عمل میں — اس سرمایہ سے جو انگریز نوآبادکاروں کی امداد کے لئے محفوظ کر لیا گیا ہے نیگرو کاشتکاروں کے لئے زمین حاصل کرنا، مزدوروں کے لئے مناسب اجرتیں متعین کرنا، ریڈ یونیوں کی تنظیم کا حق حاصل کرنا، متشدد اور متواہن کو منسوخ کرنا مجلس قانون ساز میں نیگرو باشندوں کی نمائندگی میں اضافہ کرنا، بچوں کی تعلیم کا انتظام کرنا اور مقامی باشندوں کی صحت کی طرف سے حکومت کے محکمہ صحت کی موجودہ مجرمانہ غفلت کو دور کرنا ایسے امور شامل ہیں۔ اور اس میں شک نہیں کہ مذکورہ بالا مطالبات میں کینیا افریکن یونین کو حوام کی کامل تائید اور حمایت حاصل ہے۔ یہ انجمن ابتدا ہی سے قانون کی حدود میں رہ کر حصول مقاصد کی جدوجہد کرتی رہی ہے لیکن اس کی تمام کوششیں بیکار ثابت ہوئی ہیں۔

”ماؤ ماؤ“

کینیا کے باشندے کم و بیش گزشتہ پچیس سال سے برطانوی حکومت کو اپنی خستہ حالی کی طرف توجہ دلا کر اصلاح حالات کا جو مطالبہ کرتے رہے ہیں اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا لیکن آج جبکہ ہر چھوٹی سے چھوٹی قوم میں ہی قلمی کی ذلتوں اور مشکلات نیز آزادی اور خود مختاری کی برکتوں کا احساس بیدار ہو گیا ہے برطانوی مستعمرین کو سبباً طور پر اس بات کا اندیشہ لاحق ہونا چاہیے تھا کہ کہیں کینیا کے باشندوں کی موجودہ جدوجہد کینیا کی کامل آزادی کی جدوجہد میں تبدیل نہ ہو جائے اور اسی اندیشہ کے ماتحت انھوں نے کینیا کے باشندوں کی قومی تحریک کو نابود کر دینے کے لئے ظلم اور تشدد کے وہ طریقے اختیار کر رکھے ہیں جن کے تصور ہی سے بدن پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔

کینیا میں برطانوی استعمار پسندوں نے مظالم کا سلسلہ سال گزشتہ کے اخیر میں شروع کیا تھا اور جیسا کہ عام دستور ہے جبر و تشدد کے مظاہرہ سے چند ماہ قبل برطانوی اخبارات میں کینیا کے دہشت پسندوں کی سرگرمیوں کی اطلاعات شائع ہونے لگی تھیں لیکن اسی زمانہ میں کینیا کے شعبہ انصاف اور امن کے ذمہ دار کن

نے کینیا کی مجلس قانون ساز کے رد و اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ — گزشتہ پانچ سال کی مدت میں کوئی ایسا واقعہ رونما نہیں ہوا جسے جرائم کی فہرست میں ضافہ قرار دیا جاسکے۔ اس کے باوجود یہ بات فرض کر لی گئی کہ — کینیا کے باشندے کینیا میں مقیم تمام یورپی باشندوں کو ملک سے نکال دینا چاہتے ہیں اور دہشت خیز افراد کی ایک خفیہ جماعت ”ماؤ ماؤ“ اس مقصد کو تشدد اور خوریزی کے ذریعہ سے حاصل کرنا چاہتی ہے اور اسی مقصد کی بناء پر ستمبر ۱۹۵۲ء میں چند ایسے قوانین مرتب اور منظور کئے گئے جن کی بدولت کینیا کی تمام سیاسی جماعتیں خلاف قانون جماعتیں قرار دی گئیں اور کینیا افریکن یونین کے تمام رہنماؤں اور کارکنوں کو قید خانوں میں بند کر دیا گیا۔ اور یہ صورت حالات اس وقت تک قائم ہے۔

”کی کو یو قبیلہ“

برطانوی نوآبادیات خواہوں کے ہاتھوں سے کی کو یو قبیلہ کو جو عظیم نقصان پہنچا ہے اس کا اندازہ کرنا بھی دشوار امر ہے۔ یہ قبیلہ کم و بیش دس لاکھ افراد پر مشتمل تھا اور اراضی سے بے دخلی کی بدولت چونکہ اسی قبیلہ کو سب سے زیادہ خسار بھی برداشت کرنا پڑا تھا اس لئے اراضی کی صحیح تقسیم کے مطالبہ میں اسی قبیلہ کے افراد ہی پیش پیش بھی نظر آتے تھے۔ چنانچہ کینیا کی سیاسی جماعتوں کو منتشر کرنے کے بعد برطانوی حکام نے تقریباً اس تمام قبیلہ کو ”ماؤ ماؤ“ کے ساتھ وابستہ قرار دے کر اس قبیلہ کے ہزار ہا افراد کو گرفتار کر لیا۔ اور جو لوگ خوفزدہ ہو کر جنگلوں میں جا چھپنے پر مجبور ہو گئے ان کی ہر چیز پر حکومت نے قبضہ کر لیا۔ ان کی سبیتوں کو تباہ کر دیا گیا اور قبیلہ کے ممتاز افراد کو بیس بیس سال کے لئے قید خانوں میں بند کر دیا گیا۔

دہشت دہریت کے یہ تمام مظاہرے مشرق وسطیٰ کی حکومت کی طرف سے کئے گئے ہیں لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ برطانیہ کے سوشلسٹ ہنرماں ٹریڈی نے بھی اس حکمت عملی کی تائید کی ہے۔ بہر حال ان تمام مظالم کے باوجود کینیا کے باشندوں کے حوصلے پست نہیں ہوئے ان کی جدوجہد جاری ہے لیکن کینیا کی قومی تحریک کے سلسلہ میں دنیا کی آزاد قوموں پر بھی ایک ذمہ داری عاید ہوتی ہے اور اگر یہ بظاہر وہ ذمہ داری کینیا کے باشندوں کی جدوجہد کی تائید اور حمایت کے بعد ختم ہو جاتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب تک دنیا کی آزاد قومیں اس ہتھیار کو اپنی طرح ذہن نشین نہ کر لیں کہ مغربی جمہوریت کی علمبردار جو آج بھی کمزور چھوٹی قوموں کو محکوم بنائے رکھنے کے لئے ہر قسم کے مظالم پر پار کر سکتی ہیں ان کی رہنمائی میں اقوام عالم کی سبکدوشی اور اقتصادی نجات ممکن نہیں ہو سکتی اس وقت تک کہ کینیا کی قومی تحریک کی حمایت ہی مفید ہو سکتی ہے اور اس قسم

”وقیات الاعیان“

آہ

حاجی شیخ رشید احمد صاحب مرحوم

از

(عتیق الرحمن عثمانی)

۱۵۲ھ جس کو ”عام الحزن“ کہنا چاہئے اس کی ابتدا برادرِ مکرم مولانا یعقوب الرحمن عثمانی کی وفات کے ساتھ
منک سے ہوئی اور انتہا حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ قدس سرہ کے حادثہ ارتحال پوسی سال برادرِ عزیز مولانا سعید احمد
کے ولادہ ماجد قبیلہ ڈاکٹر ابرار حسین صفا، محب باعفا حافظ ضیاء الدین احمد منادی زندائے محرم، قزول باغ کے غمگسار پڑوسی
چودھری محمد بخش صاحب اور بچپن کے بے تکلف ساتھی قاری محمد طاہر صاحب ماظم دارالانصاف دارالعلوم دیوبند رخصت
ہونے یہاں تک کہ ۲ دسمبر کی درمیانی شب میں مخدومی حاجی شیخ رشید احمد صفا کی بھی رحلت کا حادثہ پیش آگیا۔
حاجی صاحب میر پے اور میرے بزرگوں کے تعلقات نہایت ہی قدیم اور نہایت ہی مخلصانہ تھے، کم و بیش ۵۴
سال سے شرفِ نیاز حاصل تھا، مسرت و غم کے ہر موقع پر ایک دوسرے کے شریک رہتے تھے۔

ابھی کل کی سی بات معلوم ہوتی ہے جب طبعِ مسلمانہ میں بزرگانِ میرٹھ کا یہ قافلہ بڑے اہتمام و شوق سے میرے نکاح
میں شریک ہونے کے لئے دیوبند آیا تھا، اسی کا یہ اثر ہوا کہ ۲۵ سال کے بعد جب گذشتہ ۲۸/۲۹ نومبر کو برخورِ دارِ محبوب الہی کی
تقریبِ شادی ہوئی تو اس وقت جو بزرگ خاص طبر پر پڑ آئے اور جن کے شریک نہ ہونے کا قلب پر غاں اڑ ہوا ان میں
ایک حاجی صفا مرحوم مغفور بھی تھے انسان کی بے خبری دے بسی کا بھی کیا عالم ہے اور اس دنیا کی عجب کاریوں کا بھی کیا لکھنا ہے
۲۸ نومبر میں تقریب کے انتظامات میں لگے ہوئے تھے اور حاجی صفا مرحوم طاعنِ اعلیٰ کے لئے رختِ سفر باندھ رہے تھے۔

”فی اللہ لاسف“

مرحوم شروع میں الہی بخش نیک بینی میرٹھ میں ایک ملازم کی حیثیت سے آئے تھے پھر اپنی غیر معمولی قابلیت، محنت
اور دہشتِ شکاری کی بدولت جلد ہی کمپنی کے شریکِ منفعت ہو گئے اور پھر چند سال کے بعد ایک باوقار اور باوقار شریک کی حیثیت

سے الہی بخشائید کوہلی کے کاروبار کے نگران اعلیٰ مقرر ہوئے، آپ کی بہترین نگرانی میں حافظ فصیح الدین جلیلہ مرحوم کی اس تاریخی فرم نے جلد جلد ترقی کی منزلیں طے کیں اور اس کا شمار دہلی کی چوٹی کی فرموں میں ہونے لگا۔

حاجی صاحب کو قدت نے جن گونا گوں صلاحیتوں اور قابلیتوں سے نوازا تھا قدتی طور پر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کاروبار کی مشغولیتوں کے ساتھ قومی اور ملی کاموں میں بھی زبردست حصہ لینے لگے اور چند ہی سال میں دہلی کی شہری زندگی کے مختلف گوشوں پر چھا گئے شہر کے سب سے بڑے سماجی ادارے یونیورسٹی بورڈ میں ان کی خدمات نہایت نمایاں رہی تھیں اور اس کے طریق کار میں ان کی مدد کا بڑا دخل ہوا تھا چونکہ اول درجہ کے راسخ العقیدہ اور پابند اوقات مسلمان تھے دنیوی خدمتوں کے ساتھ علم دین کی خدمت بھی بڑے شوق اور دل سے کرتے تھے، سالہا سال حضرت مفتی محمد کفایت اللہ صاحب کے ساتھ مدرسہ عالیہ فتح پور کے مہتمم رہے اور مدرسہ کے تمام شعبے بڑی قابلیت سے چلانے، دہلی پنجابی مسلم ہائی اسکول اور فتح پور مسلم ہائی اسکول کے برسرِ سربراہی کا رہے، مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور کے سرپرست خصوصی اور دارالعلوم دیوبند کے مجلس شوریٰ کے سرگرم اور بیدار دماغ رکن تھے۔

بڑے صاحبِ خیر تھے اور ہر اچھے کام میں کھلے دل سے حصہ لینے تھے، وضع داری کے پیکر، ذی مروت، بااخلاق، کشادہ دماغ و کشادہ جبین، رونقِ محفل اور بہارِ چمن،

”ندوة المصنفین“ سے خاص ملاقات رکھتے تھے اور اس کی خدمات کی سنجیدگی اور اہمیت کا قویٰ ہی نہیں عملی اعتراف کیا کرتے تھے، شہدائے دہلی کی بہار لٹریچر فورس و گلستان بھی چٹیا گانگ کی رونق بنا اور اسی شان اور آں بان کے ساتھ زندگی بسر کی، یہاں کی طرح وہاں بھی تمام دینی اور دنیوی مشاغل میں منہمک رہے، وہی سرکاری مناصب، وہی مدارس دینی کی دیکھ بھال، وہی عملی صلاح کی جستجو، وہی شوقِ رج زبانت اور وہی کاروباری شغف، آخری ملاقات شہدائے مدینہ منورہ میں ہوئی تھی اور آخری مکتوب ”جامع المیزان“ پر تنقید کے سلسلہ میں آیا تھا جس کی سطر سطر محبت و اخلاص کے پھولوں میں بسی ہوئی تھی

رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً

خاتمہ بھی ایسا ہوا کہ ہر مسلمان کو اس کی دعا کرنی چاہیے اس سلسلہ میں مرحوم کے منجھلے صاحبزادے اور میرے مخلص دوست برادرِ دم حاجی شیخ منیر احمد صاحب کے ایک طویل خط کی آخری سطریں سننے

کے لائق ہیں۔

”یکم دسمبر کی صبح فرمانے لگے کہ ”اب تو آپریشن بھی ہو گیا مواد بھی خارج ہو گیا۔ ڈاکٹر جو کچھ کر سکتے تھے کر لیا سجاد پھر بھی ہونے لگا تم لوگ مجھ کو میری حالت پر چھوڑ دو جو حق تعالیٰ کو منظور ہو گا وہی ہو گا۔ اسی دن ڈاکٹر سمیع الدین صاحب کو جو بہت متقی، پرہیزگار اور معصوم و صلوة کے پابند میں خاص طور پر بلایا اور فرمایا کہ سب ڈاکٹروں نے کوششیں کر لی ہیں اب میں چاہتا ہوں کہ آپ علاج کی ذمہ داری لیں اور جو کچھ بھی ہو آپ کے ہاتھوں ہو اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہو گا تو آپ ہی کے ہاتھوں شفا ہو گی کیونکہ آپ ماشاء اللہ متقی اور محتاط مسلمان ہیں۔“ ۲ دسمبر (۱۲-۱۳ ربیع الاول) کی درمیانی شب میں حسب معمول صبح ۴ بجے اٹھے۔ ضروریات سے فارغ ہو کر تنیم کیا۔ اسی وقت وہی ڈاکٹر صاحب انجکشن لگانے آئے تو فرمایا ڈاکٹر صاحب پانچ منٹ ٹھہریے۔ میں نوافل سے فارغ ہو جاؤں تو انجکشن لگا دیا، پیچہ کے نوافل کے لئے نیت کی اور اسی حالت میں حرکت قلب بند ہو گئی میں ان کے پاس ہی موجود تھا ڈاکٹر صاحب کو آواز دی وہ فیسے نبض کا پتہ نہ ملا۔ قلب کو دیکھا وہاں بھی کچھ نہ پایا۔ ایک بجی آئی اور ساتھ ہی کلمہ طیبہ کی آواز بھی ”انا للہ وانا الیہ راجعون“ آنا فانا سب کچھ ہو گیا ایک منٹ پہلے بھی دہم و گمان نہ تھا کہ اتنی جلدی ہم سے جدا ہو رہے ہیں انھیں ڈاکٹر صاحب کی موجودگی میں جان دی اور ان کی خواہش پوری ہوئی کہ جو کچھ بھی ہو آپ ہی کے ہاتھوں ہو۔ ڈاکٹر صاحب بھی حیران رہ گئے کہ اتنی آسانی سے جان نکلتی ہوئی میں نے کسی کی نہیں دیکھی۔ اللہ پاک حضرت قیامہ کو اپنی خاص رحمتوں سے نوازیں حضرت مرحوم ”برہان“ بڑی پابندی سے پڑھا کرتے تھے اور جب رسالہ کے آنے میں دیر لگ جاتی تھی تو دریافت فرمایا کرتے تھے کہ اب تک رسالہ کیوں نہیں آیا۔ ”برہان“ کی مطبوعات بھی برابر زیر مطالعہ رہتی تھیں۔

”برہان“ کا فون نمبر بدل گیا ہے نیا نمبر یہ ہے ۲۳۸۱۵

الحیات غزل

(جناب محمود دہلوی)

جناب محمود دہلوی آج پہلی بار ”برہان“ کی ادبی محفل میں تشریف لارہے ہیں۔ محمود صاحب اس وقت بادِ خزاں کے تیز و تند جھونکوں سے مرجھائی دہلی کے اول درجے کے پربہار شاعروں میں شمار کئے جاتے ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جہاں تک سخنورانِ دہلی کا تعلق ہے آپ کی رنگیں نوائی اور شعلہ بیانی سے دہلی کی افسردہ و پژمرده بزمِ شعروادب میں ایک خاص طرح کی گرمی اور زندگی محسوس کی جاتی ہے، محمود صاحب کے کلام کا ایک نفیس مجموعہ عن قریب ”بادۂ مخمور“ کے نام سے شائع ہو رہا ہے، یقین ہے اردو کے قدردان اس کی قدر کریں گے۔

”برہان“

حسن خود چشم خریدار تک آپہنچا ہے	قافلہ مصر کے بازار تک آپہنچا ہے
آج اک مردِ خدا دار تک آپہنچا ہے	عشق اب اس قدر ایشا تک آپہنچا ہے
جس کے دل میں تھی تمنائے بہشتِ مطہی	آپ کے سایہ دیوار تک آپہنچا ہے
تنگ ہے اب ترے بٹل پہ خدائی تیری	آدمی جرأتِ انکار تک آپہنچا ہے
وہ فرشتوں کے مقامات سے گذرا ہوگا	جو سرا پرہ اسرار تک آپہنچا ہے
اب حقیقت میں ہر دل کے کھلیں جوہر	آئینہ مصحفِ رخسار تک آپہنچا ہے
جادۂ صبر و رضا سے بھی گذرا ہوگا	اب قدم منزلِ دشوار تک آپہنچا ہے
نا خدا نے نہ بچایا تو بچائے گا خدا	اب سفینہ مرا نجد ہار تک آپہنچا ہے
کون ہے بارِ امانت کا اٹھانے والا	فیصلہ جرأتِ کردار تک آپہنچا ہے
تیری رحمت سے کسی حال میں ہوس نہیں	نیرا پیغام گنہگار تک آپہنچا ہے
آج جانی ہوئی دنیا کو بھی رخصت کر دے	وقتِ آخر ترے بیار تک آپہنچا ہے

ہوش مندوں سے تو بڑھ کر ہیں ترے دیوانے
کوئی در تک کوئی دیوار تک آپہنچا ہے
رحم فرمائیے اب میری زبوں حالی پر
غبطِ غم طعنہ اعیار تک آپہنچا ہے
اس قدر مست، مئے شعرو غن ہوں محمور
کیفِ بادہ مرے اشعار تک آپہنچا ہے

رباعیات

(جناب شارق میرٹھی ایم۔ اے)

”توفیق خودی“

بڑھتی ہوئی رو بھنبھوڑ ڈالی میں نے
ہر بندش موج توڑ ڈالی میں نے
توفیق خودی ہوئی جو شامل حال
طوفان کی کلائی موڑ ڈالی میں نے
”سہارا“

دیتے ہوں پناہ گر کنارے تو نہ لے
دیتے ہوں صنیا اگر ستارے تو نہ لے
ٹوٹے ہوئے دل کے لک سہار کے حضور
ملنے ہوں اگر لاکھ سہارے تو نہ لے
”پیش کش“

غم کی بھی کھٹک کا لطف پانے جاؤ
تلخی کی بھی لذتیں اٹھاتے جاؤ
پھولوں کی شراب نوش کرنے والو
اک زہر کا جام بھی چڑھاتے جاؤ
”رقص“

طوفان کی صدا پہ رقص کرتا ہوں میں
امواج بلا پہ رقص کرتا ہوں میں
ہر لمحہ حیات کا اشارہ پا کر
دامان فنا پہ رقص کرتا ہوں میں

شورِ علیہ

چچا سچ سچ کی دنیا | جاموگلا سگو کے مسلم تشریح پروفیسر آئی برن نے اپنی ایک تقریر میں بیان کیا کہ جو لوگ ۲۰۰۰ء میں زندہ رہیں گے وہ دیکھیں گے کہ

کارخانوں میں بہت سا کام روبٹ (Robots) انجام دیں گے۔ اور گھروں میں لاسکی دور ٹیلیفون لگے ہوں گے اس سے ایک فائدہ یہ ہوگا کہ جب کوئی شوہر اپنی بیوی کو فون پر اطلاع دے گا کہ اسے کام میں دیر ہو گئی ہے تو وہ دیکھ لے گی کہ وہ سچ بول رہا ہے۔

اون اندرونی کی کاشت کرنے والے بے کار ہو جائیں گے کیونکہ سارے کپڑے کمپادی اشیاء سے تیار ہوں گے۔ دنیا کی آبادی بڑھ جائے گی۔ اس لئے انسان مجبور ہو کر سمندر کا رخ کریں گے جس سے وہ ایندھن اور غذا حاصل کریں گے انسان کی اوسط عمر ۱۰۰ برس کے قریب ہو جائے گی۔

جامعہ کے شعبہ ہوا بازی نے اطلاع دی ہے کہ امریکہ میں لوگ سیاروں تک سفر کے لئے اپنی نشستیں محفوظ کر رہے ہیں۔ یہاں تک کہ سفر کے وقت نامے بھی شائع کر دئے گئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ چاند تک پہنچنے کے لئے ۲ گھنٹے۔ دو بار ہوں گے اور مریخ تک پہنچنے کے لئے ۵ دن لگیں گے۔

لیکن پروفیسر موصوف نے فرمایا کہ اس میں ایک بڑا ”مگر“ بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ زمین کے جاذبی حلقے سے باہر نکلنے کے لئے ۲۰۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار درکار ہوگی اور ہم ابھی تک صرف ۱۰۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار حاصل کر سکے ہیں۔

سورج کی توانائی | امریکہ کے سائنسی اور صنعتی تحقیق کے شعبہ نے ایک کمیٹی مقرر کی تھی جس نے اعلان کیا ہے کہ مستقبل قریب میں سورج کی توانائی (ENERGY) کو حرارت یا طاقت کی شکل

میں استعمال کرنا ممکن نہ ہوگا۔ لیکن بعض خاص حالات میں اس سے فائدہ ضرور اٹھایا جاسکے گا۔

کمیٹی کے صدر ڈاکٹر ہلارڈ کے سپرد یہ کام کیا گیا تھا کہ سورج کی توانائی کے استعمال کے امکانات بتلائیں اور یہ بتائیں کہ اس سلسلہ میں تحقیقی کام شعبہ کی طرف سے انجام دیا جائے یا نہیں۔

کمیٹی نے بتلایا کہ گھروں میں پانی گرم کرنے کے لئے سورج کی توانائی کا استعمال بعض حالات میں ممکن ہے۔

اور بعض گرم ممالک میں ممکن ہے کہ شمسی گرما اور حرارتی پمپ استعمال کر کے پانی کی کثیفہ کی جاسکے۔

کمپنی نے رپورٹ میں بتلایا ہے کہ گھروں کو سورج کی شعاعوں سے گرم کرنے کی طرف توجہ دینی چاہئے۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ کھڑکیاں بڑی رکھی جائیں۔ ماضی میں اس کی غفلت کم توجہ کی گئی ہے۔ حالاں کہ اس سے ایندھن میں کفایت ہوتی ہے۔

رپورٹ نے تسلیم کیا ہے کہ کھانے پکانے کے دیگر ذرائع کے ہوتے ہوئے سو بج سے کھانا پکانے کا رجحان نہیں ہے لیکن جہاں کوئلہ، برقی، یا لکڑی نہیں ملتی وہاں ایک آفتابی چولہا کام میں لایا جاسکتا ہے جس سے کھانا نہایت عمدگی سے تیار ہو سکتا ہے۔

رپورٹ میں ہندوستانی قومی تجربہ خانہ طبیعیات (انڈین نیشنل فزیکل لیباریٹری) کے تیار کردہ آفتابی چولہے کا ذکر کیا گیا ہے جس میں ایک آئینہ اور ایک دھاؤ دار کوکر (COOKER PRESSURE) استعمال کیا گیا ہے۔ یہ چولہا اچھا کام دیتا ہے، لیکن ساتھ ہی اس کا بھی ذکر کیا ہے کہ اس چولہے کی قیمت اتنی ہے کہ جن لوگوں کے لئے اسے بنایا گیا ہے وہ اسے خرید نہ سکیں گے۔

تدوۃ المصنفین کی ایک شاندار کتاب ”عرب اور اسلام“

”عرب اور اسلام“ پروفیسر فلسفہ کے حنفی کی مشہورہ آفاق انگریزی کتاب HISTORY OF THE ARABS کے خلاصہ ASHOF کا نہایت کامیاب اور شاندار ترجمہ ہے اس جامع خلاصے میں پروفیسر حنفی نے خاص طور پر ایسے اجزاء شامل کئے ہیں جن کے بغیر مترجم کو اسلام کے پیغام اور اس کی خدمات سے اور انسانیت پر اس کے احسانات سے روشناس کرایا جاسکتا تھا۔ پروفیسر مذکور نے فی الحقیقت تاریخ نویسی اور حقیقت نگاری کا حق ادا کر دیا ہے کتاب کے مترجم پروفیسر سید مبارز الدین صاحب رفعت ایم۔ اے ہیں جو اس وقت نوجوان پروفیسروں میں صفت اول کے مترجم سمجھے جاتے ہیں، صفحات ۲۵۰ قیمت ۲۰ روپے، مجلد للہ

تبصرہ

اقبال کی کہانی کچھ میری اور
کچھ ان کی زبانی

از ڈاکٹر مظہیر الدین احمد الجامعی تقطیع کلاں صفحات ۳۲ کتابت و
طباعت اعلیٰ قیمت مجلد تین روپیہ پتہ :- اشاعت محل دارالسلام
قدیم ملک پیٹ حیدر آباد دکن -

ڈاکٹر اقبال مرحوم کے فلسفہ ان کی شاعری اور سوانح حیات سے متعلق انگریزی اور اردو میں
اب تک چھوٹی بڑی بیسیوں کتابیں اور سنیکڑوں مقالات لکھے جا چکے ہیں لیکن اس کتاب کے لایق
مؤلف کا دعویٰ ہے کہ ڈاکٹر صاحب موصوف کے پیغام و کلام کی اصل روح جو "آدم گرمی" ہے اسے
فاخر خواہ سمجھنے کی کوشش کسی نے نہیں کی ہے اور جو شخص جس خیال کا ہے اس نے کلام اقبال کو اپنے ہی
خیالات کے سانچے میں اتار لیا ہے اس بنا پر انہوں نے یہ کتاب لکھی ہے جس میں ترجمان حقیقت کلام
کا تخلیقی و تنقیدی مطالعہ کر کے متعدد اشعار کی تشریح انہی کے اشعار سے اور خود اپنی طرف سے اس طرح
کی گئی ہے جس سے پورے کلام میں ہم آہنگی پائی جائے اور یہ معلوم ہو کہ دراصل سارا کلام ایک ہی پیغام کے
مختلف اجزاء ہیں اس میں شبہ نہیں کہ یہ کوشش بڑی مستحسن ہے اور پھر مولف کے خطیبانہ اور واعظانہ انداز بیان
نے اس میں دوزور پیدا کر دیا ہے، لیکن یہ ظاہر ہے کہ کسی حقیقت پر علمی اور سنجیدہ گفتگو کرنے کے لئے یہ طریقہ
اور یہ انداز گفتگو ناموزوں اور نامناسب ہے اس طرز بیان سے جذبات تو رانگیتے ہو جاتے ہیں لیکن موضوع بحث کے
بہت سے گوشے پردہ خفا میں رہ جاتے ہیں چنانچہ اس میں بھی ہوا ہے ہر شخص جانتا ہے کہ جہاں تک شعار اسلام
کے ادب و احترام اور اسلامی رسومات و عبادات اور بشریت و طریقت کے اصل خط و خال کا تعلق ہے اقبال مرحوم
اس معاملہ میں کٹر سے کٹر مولوی اور صوفی تھے اور انہوں نے جس ملامت اور "صوفیت و خانقاہیت" پر نفرس
کیا ہے وہ صرف وہ ہے جس کو بعض لوگوں نے صرف ایک پیشہ کی حیثیت سے اختیار کر لیا ہو اور وہ حیدر

بے روح کی طرح بے کار و بے مصرف ہو کر رہ گئی ہوں لیکن اس کے باوجود لائقِ مَولف نے اس خاص عنوان کی نسبت اقبال کے کلام کی تشریح اس طرح کی ہے کہ پڑھنے والے کے دل سے سرے سے اسلامی عبادات و رسوم اور شریعت و تصوف کے حدود و ظاہری و باطنی کی عظمت و اہمیت ہی نکل جاتی ہے یہ اور اسی طرح کی چند فروگزاشتوں اور بے اعتدالیوں کے علاوہ کتاب مجموعی حیثیت سے مفید اثر انگیز اور دلولہ آفریں ہے اور اقبالیات کے طالب علم کے مطالعہ کے لائق ہے

مرتبہ جناب نبیاحسان الحق صاحب تقطیع کلاں غنیمت ۲۴۰
قطعا و باعیا الابرار آبادی دوم
 صفحات کتابت و طباعت اعلیٰ قیمت مجلد تین روپیہ چھ آنے

شائع کردہ بزمِ اکبر کراچی نمبر ۱

بزمِ اکبر کراچی نے جس کا ذکر انھیں صفحات میں پہلے آچکا ہے حضرت اکبر الہ آبادی سے متعلق کتابیں شائع کرنے کا جو پروگرام بنایا ہے۔ یہ کتاب اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے اس میں حضرت لسانِ العصر کے قطعا و رباعیات جن کی تعداد تین سو پچاسی ہے تیرہ ابواب میں مختلف عنوانات کے ماحول مرتب و مہذب کر کے شائع کئے گئے ہیں ان ابواب کے عنوانات یہ ہیں۔ حمد و دعا اور نعت و منقبت۔ اسلامیات و عرفانیات اسلام سے بے گانگی۔ دین و دانش۔ لامذہبی۔ ہند و موہن۔ اخلاق و معاشرت۔ بصائر و حکم۔ قومیت و سیاسیات۔ طنزیات۔ تقلید فرنگ۔ انگریز اور انگریزی حکومت۔ ادبی چٹکے اور شعری لطائف اس مجموعہ کا ہر قطعہ اور ہر باغی ادب و حکمت کا انمول موتی ہے جس پر اردو زبان و شعر کو سجا طور پر فخر و ناز ہو سکتا ہے بعد لائقِ مرتب نے جگہ جگہ ان قطعات و رباعیات پر تشریحی نوٹ لکھ کر اس مجموعہ کی افادیت کو دو چندان کر دیا ہے اس بناء پر یہ اس لائق ہے کہ ہر صاحبِ ذوق اس کا مطالعہ کرے اور اس کا انتخاب اپنے بچوں اور بچیوں کو پڑھائے۔ بزمِ اکبر کی یہ کوشش سنراوار تحسین و لائقِ صد آفریں ہے کہ وہ اردو کے ایک پوشیدہ خزانہ کو اس طرح وقف عام کر رہی ہے۔

مرتبہ جناب اختر انصاری اکبر آبادی تقطیع کلاں غنیمت ۳۳۶ صفحات کتابت و
اکبر اس و میں
 طباعت اعلیٰ قیمت پانچ روپیہ شائع کردہ بزمِ اکبر کراچی

یہ کتاب حضرت اکبر کی شخصیت اور ان کی شاعری کے مختلف پہلوؤں سے متعلق ۲۳ مقالات پر جوار و زبان کے نامور اور روشناس اہل قلم کے لکھے ہوئے ہیں مشتمل ہے اور آخر میں حضرت مرحوم کی نظم کے دو فارسی ترجمے ہیں یہ مقالات اگرچہ مختصر اور ایک حد تک طالب علمانہ ہیں تاہم سائنس العصر کے کلام کے مختلف پہلوؤں اور ان کے اصل نقطہ خیال کے سمجھنے میں ان سے کافی مدد مل سکتی ہے اس بناء پر کلام اکبر کے طالب علم کے لئے اس کا مطالعہ مفید اور بصیرت افروز ہوگا امید ہے کہ ارباب فوق اس کی قدر کریں گے۔

تبیان الشہور از جناب محمد داؤد صاحب قاسمی جوہپوری تقطیع خورد و ضخامت ۲۷۴ صفحات
کتابت و طباعت بہتر قیمت دو روپیہ پتہ:۔ محمد داؤد عبدالمعبود صاحب
جوہراہ نکل ٹولہ جوہپور۔

مسلمانوں کے قمری سال کے بارے میں ہینے ہوتے ہیں اور ہر مہینہ میں کوئی نہ کوئی دن ایسا ہوتا ہے جو مذہبی یا معاشرتی یا عام رسم و رواج کے اعتبار سے اہمیت رکھتا ہے۔ خواہ اس کی اہمیت واقعی اور حقیقی ہو یا محض فرضی! مگر بہت سے مسلمان ہیں جن کو نہ ان کی اہمیت کی وجہ معلوم ہے اور نہ انہیں اس کا علم ہے کہ وہ دن جس طرح منایا جاتا ہے اس میں کتنی بات غلط ہے اور کتنی صحیح اسی ضرورت کے پیش نظر لائق مولف نے یہ کتاب لکھی ہے جس میں شب دروز اور ماہ و سال کے تعین اور شمسی و قمری سالوں کی تاریخ اور ان کے آغاز وغیرہ سے متعلق گفتگو کرنے کے بعد یکم محرم الحرام سے لے کر ماہ ذی الحجہ تک کے اہم دنوں کے اہم واقعات اور اس سلسلہ کے احکام و مسائل بیان کئے گئے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ کتاب تاریخی اور مذہبی دونوں حیثیتوں سے مفید اور لائق مطالعہ ہے۔

قصص القرآن جلد چہارم حضرت عیسیٰ
اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات اور

متعلقہ واقعات کا بیان۔ دوسرا ایڈیشن جس میں
ختم نبوت کے اہم اور ضروری باب کا اضافہ کیا گیا ہے۔

قیمت چھ روپے آٹھ آنے بے جلد سات روپے آٹھ آنے بے
اسلام کا اقتصادی نظام وقت کی اہم ترین

کتاب جس میں اسلام کے نظام اقتصادی کا مکمل نقشہ پیش
کیا گیا ہے جو نیا ایڈیشن قیمت پندرہ روپے

اسلام نظام مساجد قیمت پندرہ روپے جلد للہ
مسلمانوں کا عروج و زوال۔

جدید ایڈیشن۔ قیمت للہ جلد ص
مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ

لغت قرآن پر بے مثل کتاب۔ جلد اول۔ طبع دوم
قیمت للہ جلد ص

جلد ثانی قیمت للہ جلد ص
جلد ثالث قیمت للہ جلد ص

جلد رابع (زیر طبع)
مسلمانوں کا نظم مملکت مصر کے مشہور مصنف

ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن کی محققانہ کتاب النظم الاسلامیہ
کا ترجمہ۔ قیمت للہ جلد ص

ہندوستان میں مسلمانوں کا
نظام تعلیم و تربیت

جلد اول۔ اپنے موضوع میں بالکل جدید کتاب
قیمت چار روپے للہ جلد پانچ روپے ص

جلد ثانی۔ قیمت چار روپے للہ جلد پانچ روپے ص

قرآن اور تصوف حقیقی اسلامی تصوف پر
محققانہ کتاب۔ قیمت نیا۔ جلد ستم۔

ترجمان السنہ جلد اول۔ ارشادات نبوی کا
بے مثل ذخیرہ۔ قیمت نیا جلد ستم

ترجمان السنہ جلد دوم۔ اس جلد میں چچو کے
قریب حدیثیں لگئی ہیں قیمت للہ جلد ستم

تحفۃ النظائر یعنی خلاصہ سفرنامہ ابن بطوطہ
مع تنقید و تحقیق از مترجم و نقشبند سفر قیمت ستم

قرون وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات

قرون وسطیٰ کے حکماء اسلام کے شاندار علمی کورناے
جلد اول۔ قیمت پندرہ روپے جلد ص

جلد دوم قیمت ستم جلد ص
عرب اور اسلام

قیمت تین روپے آٹھ آنے بے جلد چار روپے آٹھ آنے للہ
و حی الہی

مسئلہ وحی اور اس کے تمام گوشوں کے بیان پر پہلی
محققانہ کتاب جس میں اس مسئلہ پر ایسے دل پذیر

انداز میں بحث کی گئی ہے کہ وحی اور اس کی صداقت
کا ایمان افروز نقشہ آنکھوں کو روشن کرتا ہوا دل کی

گہرائیوں میں سما جاتا ہے۔

جدید ایڈیشن قیمت ستم جلد چار روپے

چھپنے

۴

منہج زندگی مصنفین۔ اردو بازار جامع مسجد دہلی۔

مختصر قواعد ندوۃ المصنفین دہلی

۱۔ **محسن خاص** جو مخصوص حضرات کم سے کم پانچ سو روپیہ یکمشت مرحمت فرمائیں وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنین خاص کو اپنی شمولیت سے عزت بخشیں گے ایسے علم نواز اصحاب کی خدمت میں ادائے اور مکتبہ برہان کی تمام مطبوعات نذر کی جاتی رہیں گی اور کارکنان ادارہ ان کے قیمتی مشوروں سے مستفید ہوتے رہیں گے۔

۲۔ **محسنین** جو حضرات پچیس روپے مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنین میں شامل ہوں گے۔ ان کی جانب سے یہ خدمت معادضہ کے نقطہ نظر سے نہیں ہوگی بلکہ عطیہ خاص ہوگا۔ ادارے کی طرف سے ان حضرات کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات حق کی تعداد تین سے چار تک ہوتی ہے۔ نیز مکتبہ برہان کی بعض مطبوعات اور ادارہ کا رسالہ "برہان" بلا کسی معادضہ کے پیش کیا جائیگا۔ جو حضرات اٹھارہ روپے پیشگی مرحمت فرمائیں گے ان کا شمار ندوۃ المصنفین کے حلقہ ۳۔ **معاونین** :- معاونین میں ہوگا ان کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات ادارہ اور رسالہ برہان (جس کا سالانہ چندہ چھ روپے ہے) بلا قیمت پیش کیا جائے گا۔

۴۔ **اجتہاد** :- نو روپے ادا کرنے والے اصحاب کا شمار ندوۃ المصنفین کے اجتہاد میں ہوگا۔ ان کو رسالہ بلا قیمت دیا جائے گا اور طلب کرنے پر سال کی تمام مطبوعات نصف قیمت پر دی جائیں گی یہ حلقہ خاص طور پر علماء اور طلبہ کے لئے ہے۔

قواعد رسالہ برہان (۱) برہان ہر انگریزی ہینے کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔ (۲) مذہبی، علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین اگر وہ زبان و ادب کے معیار پر پورے اتریں برہان میں شائع کئے جاتے ہیں۔ (۳) باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاک خانوں میں ضائع ہو جاتے ہیں جن صاحب کے پاس لیا نہ پہنچے وہ زیادہ سے زیادہ ۲۵ تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیں۔ ان کی خدمت میں پرچہ دوبارہ بلا قیمت بھیج دیا جائے گا۔ اس کے بعد شکایت قابل اعتنا نہیں سمجھی جائے گی۔

(۴) جواب طلب امور کے لئے ۲۴ آنے کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا چاہئے خریداری نمبر کا حوالہ ضروری ہو۔ (۵) قیمت سالانہ چھ روپے۔ دوسرے ملکوں سے ساڑھے سات روپے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ (۶) منی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھئے۔

مولوی محمد ادیس پرنٹر پبلشر نے جمید برقی پریس میں طبع کرا کر دفتر برہان جامع مسجد دہلی سے شائع کیا

ندوة ائمة دینی کا علمی و دینی مآبنا

برپا

مرتب
سعید احمد بابر آبادی

ندوة المصنفین دہلی کی مذہبی و تاریخی مطبوعات

ذیل میں ندوة المصنفین دہلی کی چند اہم دینی، اصلاحی اور تاریخی کتابوں کی فہرست درج کی جاتی ہے۔

مفصل فہرست جس میں آپ کو ادارے کے حلقوں کی تفصیل بھی معلوم ہوگی دفتر سے طلب فرمائیے۔

اسلام میں غلامی کی حقیقت جدید ایڈیشن

جس میں نظر ثانی کے ساتھ ضروری اضافے بھی کئے گئے ہیں قیمت پچیس، مجلد للکھ

سلسلہ تاریخ ملت محترقات میں تاریخ اسلام

کا مطالعہ کرنے والوں کیلئے یہ سلسلہ نہایت

مفید ہے اسلامی تاریخ کے یہ حصے مستند و معتبر

بھی ہیں اور جامع بھی۔ انداز بیان بکرا ہوا اور سلیس

نبی عربی صلعم تاریخ ملت کا حصول جس میں

سرور کائنات کے تمام اہم واقعات کو ایک خاص

ترتیب سے نہایت آسان اور دل نشین انداز میں

لیکھا گیا ہے۔ قیمت پچیس، مجلد پچیس

خلافت راشدہ تاریخ ملت کا دوسرا حصہ

عہد خلفائے راشدین کے حالات و واقعات کا

دل پذیر بیان قیمت پچیس، مجلد پچیس

خلافت بنی امیہ تاریخ ملت کا تیسرا حصہ

قیمت تین روپے آٹھ آنے، مجلد تین روپے بارہ آنے

خلافت ہسپانیہ تاریخ ملت کا چوتھا حصہ

قیمت دو روپے۔ مجلد دو روپے چار آنے

خلافت عباسیہ (جلد اول) تاریخ ملت کا

پانچواں حصہ، قیمت پچیس، مجلد للکھ

خلافت عباسیہ (جلد دوم) تاریخ ملت کا

چھٹا حصہ۔ قیمت للکھ، مجلد صفر

تاریخ مصر و مغرب اقصی تاریخ ملت کا ساتواں حصہ

مصر اور سلاطین مصر کی مکمل تاریخ صفحات ۳۰۰

قیمت تین روپے چار آنے۔ مجلد تین روپے آٹھ آنے

خلافت عثمانیہ تاریخ ملت کا آٹھواں حصہ مجلد پچیس

فہم قرآن جدید ایڈیشن جس میں بہت سے اسامی

اضافے کئے گئے ہیں اور مباحث کتاب کو از سر نو

مرتب کیا گیا ہے۔ قیمت پچیس، مجلد پچیس

غلامان اسلام انہی سے زیادہ غلامان اسلام

کے کمالات و فضائل اور شاندار کارناموں کا تفصیلی

بیان۔ جدید ایڈیشن قیمت پچیس، مجلد پچیس

اخلاق و فلسفہ اخلاق علم الاخلاق پر

ایک بسوط اور محققانہ کتاب۔ جدید ایڈیشن جس میں

غیر معمول اضافے کئے گئے ہیں۔ اور مضامین کی

ترتیب کو زیادہ دل نشین اور سہل کیا گیا ہے۔

قیمت پچیس، مجلد پچیس

قصص القرآن جلد اول تیسرا ایڈیشن۔

حضرت آدم سے حضرت موسیٰ و ہارون کے حالات و

واقعات تک۔ قیمت پچیس، مجلد صفر

قصص القرآن جلد دوم حضرت یوسف سے

حضرت عیسیٰ کے حالات تک تیسرا ایڈیشن قیمت پچیس، مجلد للکھ

قصص القرآن جلد سوم انبیاء علیہم السلام کے واقعات

کے علاوہ باقی قصص قرآنی کا بیان قیمت پچیس، مجلد پچیس

بُزْهَانُ

شمارہ نمبر ۳

جلد سی ام

مارچ ۱۹۵۳ء مطابق جمادی الثانی ۱۳۷۲ھ

فہرست مضامین

۱۳۰	سعید احمد	نظرات
۱۳۳	جناب انعام اللہ خاں صاحب: ناقص رائے سیر روزنامہ مجیدیہ دہلی	ملکیم سنائی
۱۴۹	جناب مولانا محمد طفیل الدین صاحب: پورہ نوڈیہادی	مسلمان حکومتوں کی موجودہ زبوں حالی
۱۶۲	جناب مولوی عبدالسلام صاحب: رام پوری	قدیم اسلامی درس گاہوں کی اصلاح کے متعلق جذبیادی تبایا
		حالاتِ حاضرہ
۱۶۶	جناب امیر احمد صاحب: آزاد	صدر آئرن ہاور کے اعلان کے بعد چین کا مستقبل
۱۸۰	جناب پروفیسر سید احتشام حسین صاحب: کلکتہ یونیورسٹی	برنارڈ شلا مصنفہ: انصاری
		ادبیات
۱۸۲	رئیس التعلیم جناب گلبرادر آبادی	حضرت خائب
•	جناب سہیل شاہجہاں پوری	میاک خاتون
۱۸۵	م - ۱ - ع	فنونِ علمیہ
۱۸۸	(س) (د) (ع)	تبصرے

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

نَظَرْتُ

۲۸ فروری کو ڈہاکہ میں ”کل پاکستان ہسٹری کانفرنس“ کے موقع پر جو ناگوار واقعہ پیش آیا وہ حد
افسوسناک اور لائقِ شرم ہے اندر سمجھدار انسان کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ اگر لیل و نہار یہی رہے
اور جمہوریت کے لفظ کا غلط استعمال اسی طرح ہوتا رہا تو آخر پورے ملک اور قوم کے حق میں اس کا انجام کیا ہوگا۔
واقعہ یہ ہے کہ کل پاکستان ہسٹری کانفرنس کا تیسرا اجلاس ۲۷/۲۸ فروری اور یکم مارچ کو ہونا قرار پایا
تھا۔ اس قرار داد کے مطابق ۲۷ کو کانفرنس کا پہلا جلسہ بڑے تزک و احتشام اور شان و شوکت کے ساتھ
شروع ہوا۔ گورنر نے افتتاح کیا کانفرنس میں مقامی وزراء، عمل حکومت اور یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر
اور ہندو پاکستان اور بعض دوسرے ملکوں کے مندوبین کے علاوہ پاکستان کے مرکزی کابینہ کے چند وزراء
بھی شریک تھے۔ جو محض اس اجلاس میں شرکت کی غرض سے کراچی سے ڈہاکہ ایک ہزار میل کا سفر کر کے آئے
تھے۔ کانفرنس کے پہلے اجلاس کے صدر مولانا سید سلیمان ندوی تھے جناب صدر نے اپنے فاضلانہ خطبہ
میں ہندو پاکستان میں اسلامی ثقافت و تمدن کے آثار و نشانات پر گفتگو کے بعد بنگالی زبان کے ندریجی ارتقاء
پر روشنی ڈالی اور اس سلسلہ میں زبان کے رسم الخط سے متعلق اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے فرمایا
”میرے خیال میں بنگالی مسلمانوں کو سارے ملک کے مسلمانوں کے ساتھ مل کر ایک ملت بننے کے لئے ضروری
ہے کہ سارے پاکستان کا ایک ہی خط ہو اور وہ عربی رسم الخط نسخ ہے جس میں پشتو، سندھی اور پنجابی لکھی جاتی ہے
اس کا اثر یہ ہے کہ ان صوبائی زبانوں کے نہ جاننے والے عربی رسم الخط اور مشترک عربی و فارسی الفاظ کی بنا پر عبارت کا
حاصل مطلب بآسانی سمجھ لینے میں اگر بنگال کے مسلمان بنگالی کا خط بدل دیں تو وہ سارے پاکستان کو ایک نہا
سکتے ہیں اور قرآن کے لئے عربی رسم الخط اور زبان کے لئے بنگالی رسم خط سیکھنے میں بچے دوسری محنت سے
بچ جائیں گے۔“

سولہ صفحے کے خطبہ صدارت میں رسم خط سے متعلق مشورہ کے صرف یہی دو چار جملے تھے اور

وہ بھی سنجیدہ اور متین انداز میں خلوص اور ہمدردی کے ساتھ؛ لیکن نوہالان قوم کو یہ بھی گوارا نہ ہوئے چنانچہ لگے دن یعنی ۲۸ فروری کو جب کہ کانفرنس کا دوسرا اجلاس شروع ہی ہوا تھا اور جس میں معزز و موقر ہمانوں اور نمائندوں کے علاوہ مرکز اور صوبہ کے وزراء اور یونیورسٹیوں کے ذمہ دار عمال و ارباب مناصب شریک تھے طلباء کی ایک کثیر تعداد مولانا سید سلیمان ندوی کے خلاف خصوصاً اور دوسرے قسم کے عموماً نفرت لگاتی ہوئی ہال میں گھس آئی اور یہاں بھی نفرت لگانے شروع کر دیتے، ڈہاکہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے جو صدد مجلس استقبالیہ بھی تھے۔ طلباء کو ہر جہد سمجھایا۔ مگر جب کوئی اثر نہ ہوا اور صورت حال پر قابو نہ پایا جاسکا تو اجلاس ملتوی کر دیا گیا طلباء نے اس پر بھی قناعت نہ کی۔ بلکہ جب سید صاحب موٹر پر بیٹھ کر اپنی قیام گاہ جانے لگے تو مظاہرین نے موٹر روک لی اور آخر جب موصوف نے ان کے منشا کے مطابق انھیں کے نکمے ہوئے ایک بیان پر مجبوراً دستخط کر کے رسم خط سے متعلق اپنا مشورہ واپس لے لیا تو اب گلہ خلاصی ہوئی اور ان کو وہاں سے روانہ ہو جانے کی اجازت ملی۔ اس واقعہ کا یہ اثر ہوا کہ اجلاس قرار داد کے مطابق تین دن ہونے والا تھا۔ مگر وہ ایک ہی دن ہو کر رہ گیا اور باقی دور روز کی نشست نہ ہو سکی۔

اگرچہ ہمارے نزدیک مولانا کا مشورہ صحیح نہیں ہے اور جس بنیاد پر ہم ہندوستان میں اردو کے لئے دیوناگری رسم خط کو اختیار کر لینے کے حامی نہیں ہیں ٹھیک اسی بنیاد پر ہم اس کو درست نہیں سمجھتے کہ وحدت ملت کے نام پر مشرقی بنگال کے مسلمانوں کو اس کی دعوت دی جائے کہ وہ اپنی زبان کے لئے عربی یا کوئی اور رسم خط اختیار کریں وہاں وحدت ملت کے نام پر اور یہاں متحدہ قومیت کی بنیاد پر آخر یہ کیوں ضروری ہے کہ مقامی، معاشرتی و سماجی اور لسانی امتیازات و خصوصیات کو ہی خیر آباد کہہ دیا جائے علاوہ بریں مولانا کو یہ بھی سوچنا چاہیے تھا کہ وہ تاریخ کانفرنس میں خطبہ پڑھ رہے تھے نہ کہ اسلامیات یا لسانیات کی کسی انجمن میں پھر کیا ضروری تھا کہ خواہ مخواہ ایک ایسے مسئلے کا ذکر کیا جاتا جس کی نسبت مشرقی بنگال کے جذبات و احساسات کا انھیں اچھی طرح علم نہ ہو گا کوئی بات خواہ کیسی ہی حق ہو اور کیسے ہی خلوص و صداقت پر مبنی ہو لیکن اگر اس کو بے موقع کہا جائے اور جو کہنے کا طریقہ ہے اس طریقہ پر اس کو نہ کہا جائے تو اس کا اثر بجائے مفید ہونے کے مضری ہوتا ہے وحدت محض ادھر ادھر کی دو چار باتیں کہہ دینے سے پیدا نہیں ہو سکتی اس

کے لئے اصولاً ضروری یہ ہے کہ پہلے اسلامی اجتماعیت کا یقین محکم پیدا کیجئے جب یہ یقین پیدا ہو جائے گا تو مقامی امتیازات و خصوصیات کے اختلاف کے باوجود پوری قوم وحدت ملی کے رشتہ سے خود بخود منسلک ہو جائے گی تاہم نوجوانان قوم کو یہ سمجھنا چاہئے تھا کہ مولانا نے جو کچھ فرمایا تھا وہ ایک شخص کی خواہ وہ ملک کی کسی ہی مقتدر ہستی ہو اپنی ذاتی رائے تھی وہ نہ حکومت کا کوئی آرڈیننس تھا اور نہ اسمبلی یا کونسل کا فیصلہ! پھر مولانا جو ہندو پاک دونوں ملکوں کے نامور عالم اور بزرگ ہیں اس وقت مشرقی بنگال کے جہاں بھی تھے اس بناء پر شرافت اور انسانیت کا تقاضا تھا کہ اگر انہیں مولانا کی کوئی ایک بات ناگوار بھی ہوئی تھی تو اس پر صبر کرنے اور اگر ضرورت ہوتی تو سنجیدگی کے ساتھ مولانا سے اس پر تبادلہ خیالات و مذاکرہ کرتے، جمہوری ملکوں کا قاعدہ یہ ہے کہ عوام اپنی مرضی سے اور اپنی صوابدید کے مطابق اسمبلیوں اور کونسلوں کے لئے اپنے نمائندے منتخب کرتے ہیں حکومت اسمبلی کے سامنے جوابدہ ہوتی ہے عوام قانون کو کبھی اپنے ہاتھ میں نہیں لیتے۔ انہیں اپنے نمائندوں پر پورا اعتماد ہوتا ہے۔ انہیں حکومت سے جو مطالبہ کرنا ہوتا ہے وہ اپنے نمائندوں کے ذریعہ کرتے ہیں یورپ اور امریکہ جو آج کل کی رائج الوقت جمہوریت میں ساری دنیا کے استاد اور معلم اول ہیں ان سے سبق لینا چاہیے کہ وہاں آئے دن کتنے اہم اور نازک معاملات و مسائل پیش آتے رہتے ہیں مگر کبھی آپ نے اخبارات میں پڑھا کہ فلاں یونیورسٹی کے طلباء نے اسٹراٹک کرومی پولیس سے الجھ پڑے ڈانس چانسٹر کے مکان کا محاصرہ کر لیا۔ اور جلسے جلوس کے ذریعہ مظاہر کئے ہند اور پاکستان دونوں ملکوں کے نوجوان طلباء کو جو اپنی اپنی قوم کے مستقبل کے معمار ہیں اس حقیقت کو کبھی فراموش نہ کرنا چاہئے کہ جہاں کسی بزرگ قوم کی کوئی بات ناگوار ہوئی اور اس کے خلاف جبر و تشدد کا مظاہرہ شروع کر دیا اس کا نام سرگز جمہوریت نہیں ہے بلکہ یہ نہایت شدید قسم کی قومی خودکشی ہے جس کا انجام تباہی و بربادی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا جمہوریت میں ہر شخص کو اظہار خیال کی آزادی یقیناً حاصل ہوتی ہے۔ لیکن یہ آزادی کسی خاص ایک گروہ یا فرقہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہوتی اور اگر آپ دوسروں کی اس آزادی کا احترام نہیں کرتے تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ دوسرے بھی آپ کی آزادی کا احترام نہیں کریں گے نتیجہ باہمی تصادم اور تزاوم ہو گا اور اس میں کسی ایک کا بھی سبب نہیں ہو گا!

حکیم سنائی مترجم

(جناب انام اللہ فال صاحب ناظر)

(ایڈیٹر روزنامہ الجھیت دہلی)

لیکن سنائی یزید اور یزید یوں کے متعلق بھی اچھی راتے نہیں رکھتے تھے حقیقہ میں ان کا ذکر نیکی سے نہیں کیا
امام حسینؑ کے قتل کی بناء پر انھیں ملامت کی اور ان کے اس فعل کو برا کہا۔

پیری اور مردی تصوف کا ایک رکن ہے صوفیاء کے نزدیک مرد کو چاہئے کہ پیری اس حد تک پیری
کرے کہ اپنے کو اس کے اجزائیں سے ایک جز جیسا کہ بیٹے باپ کو سمجھتے ہیں سمجھے اور پیر چاہئے کہ
مسلمانی کے تمام اوصاف سے متصف اور اخلاق الہی سے متعلق ہو حقیقی تصوف عبادت ہے خلق اللہ
کو فائدہ پہنچانے سے اور اللہ کے امر کی تعظیم سجالانے سے سعی فرماتے ہیں

بزرگی بجز خدمت خلق نیست _____ بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست
اسلام کے جلیل القدر عارف حضرت جنید بغدادی فرماتے ہیں۔ ہمارے نزدیک تصوف قیل و قال
کا نام نہیں بلکہ عبارت ہے دنیا کو چھوڑنا اور مالوفات کے ترک کر دینے سے ابو محمد حریری نے کہا ہے کہ تصوف
عبادت ہے اچھے اخلاق اختیار کرنے اور بُری عادتیں چھوڑ دینے سے۔

سنائی پیر کے انقباض اور اوصاف کے متعلق فرماتے ہیں

راہ تجرید را ز غول مپرس خبر از پیر بوالفضول مپرس

ترک اور تجرید کے نکات غول سے نہ پوچھ۔ پیر بوالفضول راننی بات کیا جانے

مرہم ریش چوں کند افنی دا روئے درد چوں وہد اعنی

سانپ زخم پر مرہم کس طرح رکھ سکتا ہے۔ اور اندھا درد کی دوا کس طرح دے سکتا ہے

پیر باید کہ راہبر باشد سالک و حجت و باخبر باشد

پیر ایسا ملہ ہے جو راہ دکھائے۔ سالک حجت اور باخبر ہو

از نہ دل بود بحق یک رنگ سانی از زرق و حیلہ و نیرنگ

دل سے حق کے ساتھ یک رنگ ہو۔ اور مکر و حیلہ و نیرنگ سے پاک ہو

حکیم سنائی باتفاق جمہور مورخین شیخ یوسف ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے اور شیخ صاحب علماء

مناہیر و مشایخ کبار اسلام سے ہیں ابن خلکان لکھتے ہیں کہ

شیخ زکین میں سلسلہ کے قریب بغداد میں آئے اور شیخ ابواسحق شیرازی کی خدمت میں پہنچ کر فقہ کی تحصیل شروع کی

ان بعد میں اپنے زمانے کے ممتاز فاضل اجل ہوئے شیخ نے حدیث حسین محمد بن علی بن ہمدانی باللہ والی الفناقم

عبد الصمد بن علی بن مامون ابو جعفر محمد بن احمد سے سنی اور اکثر اس کو لکھ لیا اس کے بعد بغداد اور باصنت و جہاد

نفس اور گوشہ گیری اختیار کی اور ۵۵۵ھ میں بغداد آئے اور وہاں مدرسہ نظامیہ میں حدیث کا درس دینے لگے۔

آپ کے وعظ اور درس نے باشندگان بغداد میں بڑی مقبولیت حاصل کی۔

سمعی کتاب الانساب میں لکھا ہے کہ یوسف ان علمائے پرہیزگار میں سے تھے جن کی دانش اور

عرفان میں برابری کی نسبت تھی۔

مرد میں ان کی خانقاہ کے اندر صوفیا اور دنیا سے قطع تعلق کرنے والے کثیر تعداد میں جمع ہو گئے تھے

اور شیخ صاحب بچپن سے لے کر تادم وفات راستبازی، نیکو کاری اور شرع کی پابندی کے ساتھ زندگی بسر

کرتے رہے اور ابواسحاق شیرازی خورد سالی کے باوجود شیخ صاحب کو اپنے اکثر دوستوں پر ترجیح دیتے تھے

شیخ صاحب پہلے بغداد سے مرد میں آئے اور مدت دراز تک وہاں رہے اس کے بعد ایک عرصہ تک ہرات

میں قیام اختیار کیا اور پھر اپنے مخلصین کے اصرار پر دوبارہ مرد آئے اور وہاں سے پھر ہرات چلے گئے۔

اخیر عمر میں تیسری بار ہرات سے مرو جانا چاہتے تھے کہ یا مین میں جو ہرات اور بخشور کے درمیان

ایک موضع ہے وفات پائی ان کی نفس کو وہاں سے مرو پہنچا دیا گیا ان کا سال ولادت از رستمے تھیں ۵۳۵ھ

یا ۵۳۶ھ ہے اور سال وفات تحقیق ۵۳۵ھ ہے

بعض مورخین نے یہ بیان کیا ہے کہ طریقت میں سنائی کا اولین رہ نما ایک بادہ خوار تھا۔ اس کے متعلق یہ عجیب و غریب روایت بیان کی ہے کہ غزنی میں ایک صاحبِ حال مجذوب رہتا تھا یہ شخص ہمیشہ ایک بھٹی کے اندر بیٹھا اور شراب کی تلچٹ جمع کر کے پی جاتا۔

ایک دن سنائی ایک قصیدہ لکھ کر سلطان غزنی کے دربار کی طرف جا رہے تھے۔ بعض مورخین نے اس بادشاہ کو بہرام شاہ بعض نے مسعود اور بعض نے ابراہیم سمجھا ہے) اور بادشاہ اس وقت ہندوستان جلنے کا ارادہ کر رہا تھا۔

سنائی ایک حمام کے قریب سے گذر رہے تھے مجذوب کی آواز سنی تو کھڑے ہو گئے۔ ”مجذوب سنائی سے کہہ رہا تھا کہ ایک پیالہ دے کہ بہرام شاہ نے ابھی غزنی کا انتظام نہیں کیا کہ دوسرے لکساکر فسخ کرنے کی فکر میں ہے پھر کہا کہ اے سنائی پیالہ بھر دے کہ سنائی نہیں جانتا کہ اسے خدا نے دوسرے کام کے لئے پیدا کیا ہے اگر قیامت کے دن پوچھا گیا کہ ہمارے واسطے کیا لائے ہو تو کیا جواب دے گا۔“

بیان کرتے ہیں کہ یہ آواز سن کر سنائی کے باطن میں ایک شور پیدا ہوا اور اس نے بادشاہوں کے دربار کو چھوڑ کر تصوف کی راہ اختیار کی۔

یہ بات معلوم نہیں ہو سکی کہ سنائی شیخ یوسف کی صحبت میں کہاں اور کس طرح پہنچے۔ البتہ دولت شاہ سمرقندی صرف اتنا لکھتا ہے کہ جب بہرام شاہ نے سنائی سے اپنی بہن کا عقد کرنا چاہا تو سنائی اس سے انکار کر کے بغیر حج روانہ ہو گئے اور خراسان کے ایک گاؤں میں جا کر شیخ کے ہاتھ پر سبیت کر لی۔

بہر حال جیسا کہ ہم نے پہلے کہا طریقت کے کوچے میں قدم رکھنے کے بعد سنائی کی زندگی بالکل ہی بدل گئی اور ان کے اشعار اور آثار میں اس کا اثر بیان تک نمایاں ہے کہ ان کے وہ اشعار جو مرید ہونے سے پہلے کہے تھے ان اشعار سے بالکل مختلف ہیں جو مرید ہونے کے بعد کہے اس لئے کہ عشق نے پیش کاۓ دل اور منزل معرفت میں پہنچنے کے بعد اشکِ حریت سے دھویا اور خونِ دل سے رنگین کیا۔

سنائی جو پہلے ایک نغزگو ستخوڑ اور قادر الکلام شاعر تھے نئی زندگی میں داخل ہونے کے بعد معلمِ اخلاق اور مصلحِ اعظم بن گئے راہِ عشق و معرفت میں اپنے کو گم کر دیا اور جس شخص کو دولتِ عشق سے

بے بہرہ دیکھا سنگ و خشت جانا۔

مرد بے عشق را جہادِ شمر دل بے سوز را رمادِ شمر

مرد بے عشق تپھر ہے۔ اور دل بے سوز خاکستر

زندگانی عبارت از عشق است دل و جان استعارت از عشق است

زندگانی کا مطلب ہے عشق۔ دل اور جان عشق کا استعارہ ہے

فرماتے ہیں کہ اس سے پہلے لالچ کا دیو مجھے جلا تا رہتا تھا لیکن حلقہ تصدیق میں داخل ہونے کے

بعد بادشاہ خورسندی نے نیک بختی کا جمال دکھایا

حسب حال آنکہ دیو آرزو مرا داشت یک چند در گداز مرا

شاہ خورسندیم جمال نمود جمع منع و طمع محال نمود

یہ فرق مندرجہ ذیل مثالوں سے واضح ہوگا۔ پہلے ایک تصیدے میں لکھا تھا

جامہ بخش مرا خاص خود از سہ قدے تا ز فرتر شود کار من امسال چو جنگ

مجھے اپنا لباس خاص عنایت فرما۔ تاکہ میرا کام امسال شان و شکوہ سے جنگ کی طرح بہتر ہو جائے

اور ایک تصیدے میں لکھا تھا

بزاز تو بندہ بسے مدح گفت در غزنی شنید مدحش ہر کس و لے مذید سخاش

بندہ نے میرے سوا بھی غزنی میں بہت لوگوں کی مدح کی ہے لوگوں نے مدح سنی لیکن کسی نے اظہارِ سخاوت نہ کیا

لیکن پھر اسی سنائی کی زبانی ہم یہ سنتے ہیں

باد رنگین است شعر و خاک رنگین است تو از عشق این دآں چوں آب و آتش بے قرار

شعر ایک رنگین ہوا ہے اور زرا ایک خاک رنگین۔ اور تو اس کے اور اس کے عشق میں آب و آتش کی طرح بے قرار ہے

زمین چنیں باوی و خاکی چوں سنائی برز آئی تا چنودر شہر ہا بے تاج باشی شہر یار

تو اس رنگین ہوا اور رنگین خاک سے بلند تر ہو جانا کہ شہروں میں تاج کے بغیر فرماں برداری کرے

مختصر یہ کہ سنائی پر برقِ تھلی و عرفان اس قدر چمکی کہ ان کی ہستی کے خرمین کو جلا دیا اور انھیں عشق کی آگ

میں ڈال کر دنیا و مافیہا سے بے نیاز کر دیا چنانچہ فرماتے ہیں

ر بادہ بدہ ساقیا زود دادم کہ من خرمین خوش برباد دادم
اے ساقی شراب سے جلد میری مدد کر کہ میں نے اپنا خرمین برباد کر دیا

یہ آتش نکلند ہمیں بیم آسجا من این جاز عشق اندر آتش فتادم
یہ خوف تھا کہ مجھے اس جہان میں جلا نہیں گئے۔ میں نے یہیں عشق اختیار کیا اور آگ میں گر پڑا
ہاں آتش آسجا مبادا بسوزم از این آتش این جا رہائی مبادم
خدا نہ کرے کہ میں وہاں کی آگ میں جلوں۔ کاش مجھے اس آگ سے نکلنا نصیب نہ ہو

ز نیک و بد این و آن فارغم من بز این نعمت ایزد زیادت کنادم
میں اس کے اور اس کے نیک و بد سے فارغ ہوں۔ خدا میری اس نعمت کو زیادہ کرے

سنائی گوہیاں تک استغراق ہو کہ حنبت الماویٰ اور فردوس بریں کو اپنی ہمت بلند کے شایاں نہیں
سمجھتے تھے۔ عقل نامہ میں فرماتے ہیں

ملکا عاشق جمال تو ایم منتظر بودہ جلال تو ایم
اے بادشاہ ہم تیرے جمال کے عاشق اور جلال کے منتظر ہیں

ما نہ مروان باغ و بستانیم ما نہ در بند آب حیوانیم
ہمیں باغ اور بستان کا شوق نہیں نہ آب حیات کی آرزو ہے

روشن سبز و آب را چہ کنیم ما کباب و شراب را چہ کنیم
ہم شاداب باغ اور بانی کو کیا کریں۔ کباب اور شراب سے ہمیں کیا کام

ما بہ غیر از تقا نمی خواہیم ما ز تو جز ترا نمی خواہیم
ہم تیرے جلوہ کے سوا کوئی تمنا نہیں رکھتے ہم تجھ سے تیرے سوا اور کچھ نہیں چاہتے

چند ماں مکر شہد و شیر دہی چند ماں علف و زحیر دہی
تو کب تک ہمیں شہد اور شیر کے وعدوں سے بھیس پونے گا اور کب تک غم و غصہ میں مبتلا رکھے گا

دُرد گوہر بہ تنگدستان دہ جوتی بادہ بجی پرستان دہ

یہ موتی تنگدستوں کو بخش۔ شراب کی نہرے کشوں کو دے

سر مارا بتاج حاجت نیست تن مارا دواج حاجت نیست

ہمارے سر کو تاج کی حاجت نہیں۔ ہمارے بدن کو تبا کی ضرورت نہیں

ما بدیں قدر سر فرو نایم ما بتو بیش از این طمع داریم

ہم اتنے کے لئے سر نہ جھکائیں گے۔ ہم تیری ذات کے ساتھ اس سے بیشتر امید رکھتے ہیں

سنائی کی شاعری میں | سنائی کی زندگانی کو جس طرح تصوف نے یکایک تبدیل اور ان کی توجہ کو دوسری طرف

عرفان کی تاثیر | مائل کر دیا اور ان کے دل میں ایک نیا شعور اٹھایا۔ اسی طرح ان کے پایہ شاعری کو بھی

ایک نئی بنیاد پر رکھا بلکہ بعد کو آنے والے شاعروں کے لئے شعری بنیاد ہی کو زیر و زبر کر دیا مولانا جلال الدین

بلخی کے ہاتھ میں چراغ دیا اور شیخ عطار اور خواجہ حافظ اور سعدی کے رستے میں مشعل روشن کی۔ مخزن میں نظامی

کی یاری کی۔ سقہ میں خاقانی کو مدد دی۔ دہدہ خسروی کو ملبد کیا اور سلسلہ جامی کو مضبوط۔ اس تبدیلی سے

پہلے سنائی کے اشعار میں جو بات نظر آتی ہے وہ بعد کے اشعار میں نظر نہیں آتی وہاں ایک بات ہے خاکی

اور یہاں اک رمز ہے افلاکی۔ وہاں سے اہل فرش کی بو آتی ہے اور یہاں اہل عرش کی خوشبو مشام جان کو

معطر بناتی ہے۔ خود فرماتے ہیں ”کتابہائے خلق کہن شدہ بود“ (یہاں کتابوں سے مراد ہیں شعراء کے دیوان)

میں نے کلام تازہ اور لطیف پیش کیا معانی بسیار کو تھوڑے لفظوں میں اور بڑے سے بڑے مطالب کو

چند جملوں میں سمودیا۔ کلام میں ایک نیا اسلوب اور ادائے مطلب میں ایک نیا طریقہ اختراع کیا

خاطر م گفت مر مرا در سر کاے لفضل تو روزگار مقرر

مجھ سے دل نے در پردہ کہا کہ۔ زمانہ تیرے فضل کا معترف ہے

زود پیش آر و خوب تازہ سخن کہ خلق شد کتاب ہائے کہن

جلد کلام تازہ سنا کہ پرانی کتابیں پاک ہو گئیں

تا بدین عہد نامہ اندر ذکر زانکہ در پردہ بود معنی بکر

اس زمانہ تک اس کا کوئی ذکر ہی نہ تھا۔ اس وجہ سے کہ معنی تو پردہ میں مستور تھا

معنی کی صحت الفاظ کی فصاحت زبان کی سلاست۔ جملوں کی روانی اور مضمون آفرینی کی قدرت سے وہ اشعار پیدا کئے کہ جنہیں روح اور عقل کے ساتھ ملا دینا چاہئے فارسی زبان میں پہلی بار علم الہی کے مطابق توحید کے مسائل شعر کے قالب میں ڈھل کر آئے اور علم اخلاق اس تفصیل اور جوش کلام کے ساتھ نظم کا فن بنایا۔ صوفیا کی مصطلحات مانند خانقاہ اور خرابات پیری و مریدی سماع و وجد صہود و سکر عشق اور گوشہ گیری، ظاہری تمہل سے منہ پھیر کر حقائق کو دیکھنا دنیا کو بے حقیقت سمجھنا اور عاشق حقیقت ہونا یہ باتیں شعر و شاعری میں داخل ہو گئیں۔

عقل نامہ میں فرماتے ہیں

بہ خرابات شو کہ یار آنجاست بازہ روشن و نگار آنجاست
میکدہ میں جا کہ دوست وہاں ہے۔ بازہ روشن اور محبوب اس جگہ ہے۔

جج آزادگان خرابات است جائے افتادہ گان خرابات است
آزادوں کا جج خانہ میں بنا ہے۔ افتادوں کی جگہ خانہ ہے

خانقاہ آشیان مرغ صفاست گلشن عیش و بوستان وفاست
خانقاہ مرغ صفا کا آشیان ہے۔ عیش کا گلشن اور وفا کا بوستان ہے

پھر عقل نامہ میں فرماتے ہیں

خفته گان را مرید نام مہنہ بر دُخ مرغِ مردہ دام مہنہ
سوئے ہوؤں کو مرید نہ کہہ۔ مردہ مرغ پر جال نہ رکھ

سنائی کی یا نگاہ علم | سنائی اپنے عصر کے علمائے اجل میں سے تھے اور حکمت اور فلسفہ میں درجہ استاد رکھتے تھے علم کلام خوب جانتے تھے جیسا کہ حدیقہ سے معلوم ہوتا ہے تفسیر و قرآن اور اس علم کی اصطلاحات میں پورا ہمارت رکھتے تھے۔ حدیقہ کے چند مقامات میں آیات قرآن کی منظوم تفسیر کی ہے اخبار و احادیث نبوی بھی کافی معلومات رکھتے تھے۔ حدیقہ میں متعدد احادیث نبوی نقل کی ہیں اور ان کو منظوم کیا ہے۔ علوم مانند صرف نحو اور عروض مطالعات و معلومات بھی وسیع رکھتے تھے اکثر اپنے اشعار میں ان علوم کی اصطلاحات

استعمال کر کے اچھی تعلیمات پیدا کی ہیں۔

شعرا نے عرب کے دیوانوں کا مطالعہ بھی کیا تھا خود بھی عربی میں اشعار کہتے تھے اپنے اشعار میں قصائد
سب کا مکرر ذکر کیا ہے تاریخ قبل از اسلام کا مطالعہ بھی کیا تھا حدیقہ میں ایک مقام پر موت کی تعریف اور بے
وفائی دنیا کی مذمت کرتے ہوئے قبل از اسلام کے نامور بہادروں اور بادشاہوں کا ذکر کرتے ہیں۔

زاں ملوکِ عجم کہ در تاریخ بگردانِ راست موجبِ نوِ یسخ

ان شاہانِ عجم کا حال جو تاریخ میں دانشمندیوں کے لئے موجبِ عبرت ہے

زاں سخن ہائے ملکِ کینسرو رستم و زال و منیرم و جم و زرد

ملک کے خسرو کا تذکرہ اور رستم۔ زال۔ زریمان۔ جم اور زرد کا حال

زاں خبر ہائے آلِ ساسانی راندنِ کامِ دل بہ آسانی

خاندانِ ساسانی کے واقعات اور دل کی مرادوں کو آسانی سے پورا کرنا

حکیم سنائی اپنے زمانے کے بڑے طبیب سمجھے جاتے تھے اور علم میں کامل ہمارت رکھتے تھے۔

میں ایک فصل جداگانہ طب کے متعلق لکھی ہے اور اس میں اول ان نیم حکیموں کی مذمت کی ہے جو علم طب
سے پوری واقفیت نہیں رکھتے اور علاج کر کے مخلوق کو آرام کی بجائے آزار پہنچاتے ہیں۔ طبابت کو زور
اندوزی اور ذاتی اعراض کی پیش برد کا ذریعہ بناتے ہیں اسی فصل میں دعا کرتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ نیم حکیموں
کے شر سے اپنی پناہ میں رکھے بیماروں کو تندرستی عطا فرمائے اور سب کو اپنا فضل نصیب کرے۔

وائے آنکس کہ ہست حاجت مند بہ چنین قوم کور بے درد و بند

اس شخص کے حال پر افسوس ہے جو ایسے مطلق اندھوں کا محتاج ہو

اے خدا وند از این چنین حکما خلق را کن بفضلِ خویش رہا

اے خدا ایسے حکیموں سے خلق کو اپنے فضل سے رہائی دے

چوں جہاں شد ز فعلِ شاں دیراں خلق را زیں بداں بجاں برہاں

دنیا ان کے افعال سے دیران ہو گئی خلق کو ان بدوں کے جنگل سے نجات دے

سنائی طبیب اس شخص کو سمجھتے ہیں کہ جس نے اصول طب کو پورے طور سے سیکھا ہو طبیات و طبیعیات سے واقف ہو اور اس فن کے علمی اور عملی اسرار جاننا ہو۔

باز مردے کہ دے طبیب بود در سخن صادق و ادیب بود

پیرہ آدمی جو طبیب ہو۔ کلام میں صادق اور ادیب ہو

از ریاض برد بدانش راہ وز طبعی بود بوجہ آگاہ

ریاضی میں دسترس رکھنا ہو۔ اور علوم طبعی سے بخوبی آگاہ ہو

ہند احوال علت و امراض و اند اسباب جوہر و اعراض

علت اور امراض کا احوال دیکھنے اور اسباب جوہر و اعراض کو سمجھنے

حدیقہ میں تقریباً ساٹھ اشعار کے اندر امراض کی تشریح کی ہے اس سے طب میں ان کی مہارت معلوم ہوتی ہے۔ سنائی علم نجوم میں بھی کافی معلومات رکھتے تھے اور اگرچہ اس علم کو محل اطمینان نہیں سمجھتے تھے اس کو بے ہودگی جانتے تھے اور آسمان پیمائی کو ایک غرور حرکت کہتے تھے

ہمہ در راہ حکم خود رایند بسر من کہ ژاثر می خایند

یہ لوگ اپنی رائے سے حکم لگاتے ہیں میں قسم سے کہتا ہوں کہ یہ بکواس کرتے ہیں

غافل اند این منجاں از کار نیست در کار شان دل بے دار

پنجم حقیقت سے غافل ہیں پیشگوئیوں میں ان کا دل بیدار نہیں

ہمہ باد است حکم بادا نگار تو ز احکام خیرہ دست بردار

منجم کا حکم ہوا کے سوا کچھ نہیں۔ تو ایسے تاریک احکام سے دست بردار ہو جا

سخن فال گر ندارد سود باد پیود کا سماں پیود

اگر فال کی بات فائدہ مند نہ ہو تو جس نے آسمان کو نابالک فن عبث کیا

ان تمام باتوں کے باوجود حدیقہ میں اس فن کی اصطلاحات سے مفصل بحث کی ہے مثلاً صفت

افلاک صفت بروج سعادت و نحوست شرف و بلا بیہبوط و معوذت اول و ثنویہ اکثر قصائد مدحیہ میں اس علم کی

اصطلاحات لکھی ہیں حکیم سنائی مذکورہ بالا علوم کے علاوہ تعبیر خواب کا فن بھی جانتے تھے حدیقہ میں اس موضوع پر سوا شمار لکھے ہیں اور طویل تشریحات کی ہیں۔

سیر سفر | دولت شاہ سمرقندی لکھتا ہے جب بہرام شاہ نے اپنی بہن کو سنائی سے رشتہ ازدواج میں منسلک کرنا چاہا سنائی نے اسے منظور نہ کیا اور حج کو روانہ ہو گئے۔ اثنائے راہ میں خراسان پہنچے اور وہاں ایک گاؤں میں جا کر شیخ یوسف ہمدانی کے مرید ہو گئے۔

صاحب تذکرہ ید بیضا نے لکھا ہے کہ سنائی سرود پارہنہ حج کے لئے گئے اور وہاں سے واپس آکر غزنی میں عزلت اختیار کی۔ لطف علی بیگ آذر آتش کدہ میں لکھتا ہے کہ سنائی حرمین شریفین کے سفر خیر اثر کے لئے روانہ ہوئے اور واپس آنے کے بعد شیخ یوسف ہمدان کے پاس پہنچ کر ان کے حلقہ ارادت میں شامل ہو گئے بہر حال یہ بات مسلم ہے کہ سنائی نے فریضہ حج ادا کیا اور اس سفر میں مرو و نیشاپور اور ہمدان بھی گئے اور بغداد پہنچ کر حضرت امام اعظمؒ کے مزار کی زیارت کی اور انطاکیہ و حلوان کی سیر کر کے واپس آئے۔ اس لئے کہ انہوں نے خود ایک قصیدے میں تمام واقعات اور راہ میں پیش آمدہ مشکلات تفصیلاً بیان کی ہیں اور بتایا ہے کہ بصورت کبھی نالائقوں کا بار خاطر نہ بنا پڑتا تھا اور کبھی نادانوں کی صحبت میں رہنا پڑتا تھا۔

سفر مرو | دولت شاہ سمرقندی لکھتا ہے کہ غزنی سے چل کر خراسان پہنچے اور وہاں سے مرو پہنچ کر شیخ یوسف کے مریدوں میں شامل ہو گئے پھر غزنی واپس آئے اور حکیم کے اشعار سے بھی سفر مرو کی تائید ہوتی ہے

سر اسب اسلاں دیدی بر رفت رفتہ برگزوں مرو آنالکوں در گل تن اسب اسلاں بینی

تو نے اسب اسلاں کا بلندی میں سمیر آسمان دیکھا تھا۔ اب مرو میں آکر اس کے بدن کو زیر خاک دیکھ

سفر سرخس | حکیم نے سرخس کا بھی سفر کیا تھا یہ سفر شوق کے نتیجے میں نہ تھا بلکہ ایک ظلم کی وجہ سے تھا جو قاضی اسعد مروی نے حکیم پر کیا تھا۔ قاضی صاحب کی انگشت سے چند غنڈوں نے حکیم صاحب سے کپڑے چھین لئے تھے چنانچہ حکیم صاحب فرماتے ہیں۔

بر سر من گماشت رندے چنڈ بچو او ناکس و ذمیم رشیم

میر پر چندا وہا شوق کو مسلط کر دیا جو اسی کی مانند بلائیں اور بد خصلت تھے

جامہ ہا بستہ نڈو گفتندم نیز دستار کن بہ این سرخیم

میرے کپڑے چین لئے ادا کیا کہ اپنی بگڑی بھی ہمارے سر پہ کھدے

من ز بلخ آنجاں شدم سرخس بلا و عناد رنج و هم

میں بلخ سے سرخس کو ایسی تکلیف اور اذیت غم سے گیا

کہ گنہ گار یونس ابن متی بسویٰ نینوا ز ساحل یم

جیسے گنہ گار یونس ابن متی - ساحل سمندر سے نینوا کی طرف

برأت | علی ابن سہیم نے سنائی کی مدح میں جو قصیدہ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سنائی نے

ت میں بھی کچھ روز قیام کیا تھا۔ علی بن سہیم کہتا ہے ۔

ز انوارش امروز شہر ہرات چو برج و قمر پُر شعاع و ضیاست

اس کے انوار سے شہر ہرات برج قمر کی طرح روشن ہے ۔

فسر بلخ | معلوم ہوتا ہے کہ بزمانہ جوانی سنائی مدت دراز تک بلخ میں مقیم رہے کارنامہ سے یہی ثابت

رہا ہے دوران قیام ان کے والد بقید حیات تھے اور سلطان مسعود بن سلطان ابراہیم کا دور ختم نہیں

واکفا۔ حکیم صاحب کارنامہ بلخ میں مسعود کی تعریف کرتے ہیں اور اسے اپنے والد کے متعلق یاد دلاتے ہیں،

رنام بلخ حکیم صاحب نے بلخ میں تصنیف کی اس میں اپنے غزنوی دوستوں کو مخاطب کیا ہے غزنی

سے بلخ کو جاتے ہوئے سنائی نے راہ میں سخت تکالیف اٹھائیں برف پوش پہاڑوں سے گذرنا پڑا سرد ہوا

و در برف باری کی وجہ سے سفر میں بڑی مشکل پیش آئی چنانچہ وہ فرماتے ہیں

کوہ ہائے بریدہ ام بہ ز حیر کہ قدیں بود تیغ شاں با نیر

میں نے ایسے پہاڑوں میں مسافت طے کی ہے جن کی چوٹیاں تبر کی طرح نوکدار تھیں

انچہ آمد مرا در این رہ پیش گبر در گور ازیں نہ بنید پیش

جو کچھ مجھے اس سفر میں پیش آیا وہ کسی کانفر کو بھی قبر میں پیش نہ آئے گا۔

برف تزد بنات نقش چناں کہ ز مینہ کسان چہ زناں

بنات نقش رستاروں کے جھرمٹ کا نام کے قریب برف اس طرح نظر آتا تھا جس طرح روئی دھتے والوں کی کمان کے پاس روئی کے لچے

انک من کردہ بود یا قوتی غم بے قوتی و بے قوتی

طاقت اور غذا کی قلت نے میرے آسنودوں کو سرخ بنا دیا تھا

بلخ میں ہنجر حکیم صاحب کو اور مشکلوں سے دوچار ہونا پڑا۔ اگر قاضی عبدالحمید بلخی مدد نہ کرتے تو کلام ہی تمام ہو جاتا۔ کارنامہ میں فرماتے ہیں۔

تا بہ بلخ آدم بہ عزم و سلخ عیش من بود چوں مسعود بلخ
دیو غزبت مرا بہ بردی آب گر بنودے کھن امیر شہاب
خواہ عبدالحمید بلخی آں کہ خرد را دل است و دل را جاں
بلخ میں آنے کے بعد ہمیشہ میرا عیش تلخ رہا۔ اگر امیر شہاب مدد نہ کرنا تو۔ دیو افلاس مجھے خواہ کر دیتا خواہ
عبدالحمید بلخی خرد کا دل ہے اور دل کے لئے جہان کی حیثیت رکھتا ہے

بہر حال حکیم صاحب کے آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے یہ تمام سفر حلقہ صوفیا میں شامل ہونے سے پہلے کئے گئے تھے۔

حکیم صاحب عمر بھر پریشان اور پریشانی سے نالاں رہے لیکن طریقت میں قدم رکھنے کے بعد کبھی پریشانی کی شکایت نہیں کی۔

ایک جگہ پریشانی کی شکایت کرتے ہوئے کہتے ہیں
سفر نہ کردے از بہر بیشی و بیشی اگر بسندہ بدے در حضر بہ محضر
اگر قیام میں میرے لئے محضر کافی ہوتا۔ تو میں زیادتی کی طلب کے تقاضے سے سفر نہ کرتا
اور طریق تحقیق میں فرماتے ہیں

بخدائے کہ پاک بے عیب است وایب العقل و عالم العیب است
کہ مرا اندری سرائے ہوس جز ہنر نیست بار و مونس کس
با ہنر کاشش دولتم بودے تا غم و عصفہ ام نہ فرسودے

نہ ممکن ہے کہ یہ قاضی عبدالحمید وہی عبدالدین بلخی ہوں جو اس عہد میں ایک ممتاز عالم تھے۔

سنائی کے عہد میں غزنی کی حالت | غزنی اکل سبکتگین کے دورِ سلطنت میں عروسِ مشرق تھا۔ اور ایشیا کے
مخصوصاً آباد ترین شہروں میں سمجھا جاتا تھا، علیٰ حضرت یمن الدولہ اور ان کے فرزند مسعود کے
عہد میں غزنی کے اندر جو تعمیرات پایہ تکمیل کو پہنچی تھیں کی شان و عظمت اور دولت و ثروت حد بیان سے
باہر ہے محمود کے دربار کا شکوہ اور مسعود کے دربار کا تحجب مشرق میں کسی بادشاہ کو نصیب نہیں ہوا،
یعنی دربارِ محمود کی تعریف کرتے ہوئے رقم طراز ہے ”یہاں کو محلِ صیانت میں لے گئے جو ایک بہشت
تھا“ حوضوں اور طلائی اور نقرئی تھالیوں سے آراستہ ہر طرف مرصع ظروف رکھے ہوئے صحن کشادہ اور
ہر ایک چیز نفیس و پاکیزہ..... رومی خطائی اور رشیدین فرش بچھے ہوئے۔ صدر مجلس میں ایک
انگلیٹی رکھی ہوئی اور اس کے گرد مربع۔ مسدس۔ مثنیٰ اور منور خانوں میں انواع و اقسام کے جواہر
بھرے ہوئے۔ ان جواہرات کا عکس دیکھنے والوں کی آنکھوں میں خیرگی پیدا کرتا تھا۔ اور سب اس
بات پر متفق تھے کہ اکاسرۂ عجم۔ قیصرۂ روم بمقابلہ ابن عرب۔ فرمانروایانِ یمن۔ اور رایانِ ہند کو ایسے
جواہر بے بہا نصیب نہیں ہوئے۔

مجلس کے گرد مشک از فر۔ عنبر شہب۔ کافور ریحی اور عود خماری سے بھرے ہوئے زریں
طاس رکھے تھے اور بعض کاسوں میں سونے سے بنے ہوئے انواع و اقسام کے پھل اور لعل بدخشاں
سے بنے ہوئے پھول سجائے گئے تھے۔

مسعود شہید سپریمین الدولہ کے واسطے جو تخت بنایا گیا تھا بہقی نے اسے جہنم خود دیکھا تھا۔

لکھتے ہیں یہ تخت تین سال کی مدت میں مکمل ہوا تھا جو شخص اس تخت کو دیکھتا تھا پھر اور کوئی چیز اس کی نظر پر نہیں چڑھتی تھی یہ تخت سراسر زر خالص سے تیار کیا گیا تھا اس کے اطراف میں صورتیں شاخہائے نبات کی مانند بنی ہوئی تھیں اور جواہر بیش بہا جڑے ہوئے تھے..... تخت پر دیباے رومی بھی ہوئی اور چار باش زرب تاروں سے بنی ہوئی چھت سے۔ تخت کے اوپر ایک طلائی زنجیر لگی ہوئی تھی اور تاج اس میں آویزاں تخت کے گرد چار دیو پیکر دیں مجسمے ستونوں کے سہارے نصب تھے اور ان کے ہاتھ اس طور سے بنائے گئے تھے کہ گویا تاج کی حفاظت کر رہے ہیں۔

سلطان کے سر پر تاج کا بار نہ تھا اس لئے کہ تاج کو زنجیروں اور ستون سے مضبوطی کے ساتھ آویزاں کیا گیا تھا اس کے اندر ٹوپی بھی تھی مجلس میں ۳۸ طلائی کشتیوں کے اندر کافور۔ مشک۔ عود۔ عنبر اور دیگر اقسام کی خوشبودار چیزیں رکھی ہوئی تھیں اور تخت کے سامنے ۱۵ بارے یا قوت رمانی۔ لعل بدخشانی زرد مروارید اور فیروزے کے رکھے ہوئے تھے۔

اس عہد میں غزنی کی مشہور عمارات میں سے باغ فیروزی بھی تھا اور اس کو شہر کی خوش منظر اور دل کش تفریح گاہوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ اعلیٰ حضرت امین الدولہ محمود اس باغ کی فضا اور ہوا کو بہت پسند کرتے تھے اور اسی بنا پر وصیت کی تھی کہ بعد وفات میرے جسدِ عنبری کو باغ فیروزی میں سپرد خاک کیا جائے چنانچہ انھیں وصیت کے مطابق اسی باغ میں دفن کیا گیا دربار محمود کے مشہور شاعر فرخی سیستانی نے اس باغ کی تعریف میں ایک شاندار قصیدہ لکھا ہے جس کا مطلع ہے۔

بفرخندہ فال و بفرخندہ اختر بہ نو باغ نبشست شاہ مظفر

امین احمد رازی مؤلف ہفت اقلیم نو باغ کے متعلق لکھتا ہے سلطان نے پہاڑ کے دامن میں ایک عالی شان قصر موسوم بنو باغ تعمیر کیا تھا اس قصر میں دلکش مکانات اور خوش منظر اور فرح فراباغ موجود تھے اس باغ کی نہروں اور طرب خیز آبشاروں میں پانی بالائے کوہ سے آتا تھا۔

غزنی کا دوسرا تاریخی مقام میدان افغان کہتے ہیں کہ سلطان محمود کے والد سبکتگین کی قبر یہیں تھی بعد میں اس مقام پر کو شکِ محمودی بنایا گیا۔ یہ میدان وہی جگہ ہے جہاں سبکتگین کی زبست اور غزنی کے

مینار واقع ہیں۔ یہی نے اپنی کتاب میں کئی مقامات پر افغان سلی کا ذکر کیا ہے، بارے نے بھی اپنے ترک میں افغان سلی کا ذکر کیا ہے اور اس کا ترجمہ افغان شعار کیا لیکن درحقیقت اس کلمہ افغان سلی (بنائے افغانی) کی اصل کا تلفظ ثنائے مثلثہ عربی کے قریب ہے اور پشتو میں اس کے معنی ہیں منار یا دگاہ۔

چونکہ یہاں سبکتگین رحمۃ اللہ علیہ کا مقبرہ واقع تھا اس لئے اس کو یادگار افغان کہتے تھے غزنی کی دوسری منار میں بھی اسی میدان میں واقع ہیں۔

غزنی کی دوسری عظیم الشان عمارتوں میں سے کوشک مسعودی تھا۔ یہی لکھتا ہے کہ جب مسعود بن سلطان محمود غزنوی سلامت و سعادت دار الملک غزنی میں پہنچا تو کوشک کہنے محمودی واقع افغان سلی میں فروکش ہوا۔ اس اثنا میں کوشک مسعودی تعمیر ہو چکا تھا سلطان صبح کے وقت نئے محل میں گیا اور گھوم کر ہر ایک مقام کو دیکھا۔ دیروں۔ وکیلوں۔ غلاموں اور کارداروں کے لئے جدا جدا مکانات نام زد کئے اس کے بعد کوشک کہنے محمودی میں واپس آیا۔

سلطان کے واپس جانے کے فوراً بعد مامورین اپنے اپنے مکانات کو دست کرنے میں مصروف ہو گئے۔ فراش فرش بچانے اور پردے اڈیراں کرنے لگے۔ ایسا محل دنیا میں کسی جگہ موجود نہیں۔ اور کسی بادشاہ نے ایسی پر شکوہ عمارت نہیں بنائی۔ سلطان نے اس محل کا نقشہ اپنے دست مبارک سے بنایا تھا۔ اور علم ہندسہ میں انھیں یدِ طولیٰ حاصل تھا یہ محل چار سال میں پایہ تکمیل کو پہنچا تھا۔ سلطان بے اندازہ خیرات کرتا تھا۔ اور لوگ گروہ درگروہ اس چشمہ فیض سے سیراب ہونے کے لئے غزنی آنے لگے۔ عبد الملک نقاش اور ہندس سے میں نے سنا کہ ایک روز سرہنگ بوعلی کو تول سے کہتا تھا کہ سات ہزار دہم خیرات ہو چکے ہیں بوعلی نے کہا مجھے معلوم ہے کہ اس سے دو چاند محتاج موجود ہیں۔ ابن اثیر نے بہرام شاہ کی مدد کے لئے غزنی میں سحر کے وارد ہونے کا واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ باغات محمودی کے اندر چشموں کے دہانے چاندی کے بنے ہوئے تھے سحر کے سپاہی انھیں غارت کر رہے تھے۔ سحر نے انھیں روکا۔

غزنی کی دوسری عالیشان عمارت میں سے مسجد جامع تھی۔ سلطان نے غزوۂ قنوج و کشمیر سے واپس آکر اس مسجد کی تعمیر شروع کی تھی۔ یہی لکھتا ہے کہ سلطان نے عازم ہند ہونے سے پہلے حکم دیا تھا

کہ مسجد جامع کے واسطے ایک میدان مہوار کیا جائے اس لئے کہ جامع مسجد قدیم زمانہ سابق کی ضرورتوں کے مطابق تھی۔ اس زمانے کے لوگوں کو کفایت نہیں کرتی تھی۔

جب سلطان غزوہ سے واپس آئے تو میدان مہوار ہو چکا تھا۔ بنیادیں رکھی جا چکی تھیں اور دیواریں بن چکی تھیں سلطان نے حکم دیا کہ اس عمارت کی تکمیل کے لئے قنارہ و پیہ ضروری ہو خرچ کیا جائے۔

استاذان ماہر اور عملہ چابک مربی کیا گیا اور ثقات حضرت فہرمانی سے ایک ماہر عملہ تبدیل تعمیر پر مقرر کیا گیا۔ صبح سے شام تک ان کے کام کی نگرانی کرتا اور شام کے وقت تراڑ و آگے رکھ کر سب کو اجرت دیدیتا مسجد کے لئے سنگ مرمر دور و دست مقامات سے فراہم کیا گیا اور اس کو مربع اور مسدس شکلوں میں تراشا گیا اور مسجد کے طاق ایسے لطیف دزیبا بنائے گئے کہ آنکھ نظارے کے وقت خیرہ ہوتی تھی ان کو مختلف رنگوں اور عجیب شکلوں سے آراستہ کیا گیا اور ان طاووس پر آپڑر سے نقش و نگار کئے گئے، سلطان نے ایک مکان اپنے لئے برائے عبادت تعمیر کرایا اس کی تعمیر میں کمالی وقت نظر اور نزاکت فن سے کام لیا گیا۔ عبادت خانے کا تمام فرش سنگ رخام سے بنایا گیا اور اس کے ہر ایک مربعہ میں آپڑر سے خط کھینچا گیا اور لا جو رد سے عاشرہ بنایا گیا اس عبادت خانے کی رنگینی و زینت اس درجہ میں پہنچی کہ جو دیکھتا تصویر حیرت بن جاتا۔ لوگ کہتے کہ مسجد دمشق کو دیکھئے اور اس کی عدیم المثالی کا دعویٰ کرنے والو غزنی میں آؤ اور اس کی مسجد جامع کو دیکھو تاکہ تمہارے دعوے کی تردید ہو جائے اور اس کے سامنے ایک مقصورہ بنایا کہ اس میں تین ہزار غلام نماز باجماعت پڑھ سکتے تھے۔ اور لوگ ایک دوسرے کی مزاحمت کے بغیر اپنی جگہ عبادت میں مشغول رہتے تھے اس مسجد کے قریب ایک مدرسہ بنایا اس میں نفیس کتابیں اور نادر تصنیفیں جمع کیں یہ کتابیں علماء اور ائمہ فقہاء کی تصحیح کی ہوئی اور نہایت اچھے خط میں لکھی ہوئی تھیں۔ یہاں طلباء تحصیل و ترتیل علم میں مشغول رہتے تھے۔

مسلمان حکومتوں کی موجودہ بول چال

(ایک امریکن سیاہ کے قلم سے)

از

(مولانا محمد ظفر الدین صاحب پورہ نوڈیہاوی دارالعلوم مدینہ)

(۲)

مصری عورتیں | مصری عورتوں کے متعلق لکھا ہے ”مشرق وسطیٰ کے تمام اسلامی ملکوں میں تعلیم یافتہ عورت خیال و عمل کے لحاظ سے اتنی زہنی یافتہ نہیں ہے، جتنی مصری عورت ہے۔ یہاں کی عورتیں جدید تمدن پر جان دیتی ہیں یہ یورپ کی نقل اتارنے پر فخر کرتی ہیں۔ یہاں کی لڑکیاں سینما کی دلدادہ ہیں۔ ہفتہ میں کم از کم دو بار سینما دیکھنے جاتی ہیں، پارٹیوں اور رقص و سرود کی محفلوں میں بیباک ہو کر شریک ہوتی ہیں۔ انھیں فلم اشاروں کے نام یاد ہیں۔ اور حیا و شرم ان سے رخصت ہو چکی ہے، سیاہ اپنا واقعہ بیان کرتا ہے۔

”ایک مسلم گھر پر ایک پارٹی میں ایک لڑکی کو میں نے خود یہ کہتے سنا، کہ وہ کیری گرانٹ کو دوست بنا سکتی ہے، ہربرٹ مارشل کو شوہر، اور کلاک گسیل کو یہ بھی اور وہ بھی، جب میں نے اسے ٹوکا کہ اس کے گھر والے اسے کیوں کر پسند کریں گے تو بولی کہ ”مرے باپ کا تو انتقال ہو چکا ہے اور ماں سمجھتی ہے کہ میں پوری طرح گمراہ ہو چکی ہوں۔ دادی البتہ بہ عقیدہ باندھے بیٹھی ہے کہ ایک دن مجھے ضرور ہدایت ملے گی، اور میں بے دینی کی راہ چھوڑ دوں گی، حالانکہ میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ میں ان کی طرح نہیں، بلکہ نئی قسم کی عورت بننا چاہتی ہوں۔“ (یہ ہے اسلامی روایات کی پابندی)

عورتیں جدید تعلیم سے آراستہ ہو رہی ہیں، پھر سیاہ اسامہ ہمدی نامی عورت کے خیالات نقل کرنا ہے، مصر کے تعلیم یافتہ نوجوان طلبہ۔ زمیندار۔ تجارت پیشہ اور سرکاری افسروں کی اولاد ہیں، ان میں آزادی اور زہنی کا بڑا جذبہ ہے، ان میں شدید قسم کی وطن پرستی ہے۔

”اخوتِ اسلامی“ کے متعلق سیاح کا بیان ہے ”سٹڈ سے قائم ہے، ایک لاکھ ممبر ہیں، جس میں سے دس ہزار مجاہدوں کی فوج ہے، مذہبی قدامت پرستی اس کا نصب العین ہے۔ عرب ملکوں کا اتحاد چاہتی ہے، اور مصر کی سیادت“

مصری کسان | مصر میں کسانوں کی حالت بڑی قابلِ رحم ہے، یہ عموماً بھینس پالتے ہیں ان کا دودھ بھی کھاتے ہیں اور ان کو ہل میں بھی جوتے ہیں عموماً کسان جس گھر میں رہتے ہیں، اسی میں بھینس باندھتے اور رکھتے ہیں مصر میں کسانوں کے تیس لاکھ کنبے ہیں اور بھینسوں کی گنتی صرف پندرہ لاکھ ہے، بعض کسان جو بھینس نہیں رکھ سکتے، بکری پال لیتے ہیں اور جو اور بھی مفلس ہیں وہ بنیر دودھ ہی کے زندگی گزارتے ہیں، گائے کا رواج نہیں ہے، — مصر میں اس طرح مویشی کی کمی ہے ڈنارک میں جہاں دودھ کی سپلائی اٹھائیس ہے، وہاں مصر میں صرف ایک، جن کو دودھ میسر نہیں ہوتا وہ اپنے بچوں کو سیاہ چائے پلاتے ہیں اور اس چائے کے مصری بہت عادی ہیں، اپنا کپڑا اگر ورکھ کر بھی چائے ملے تو پیتے ہیں

افلاس کا عالم | مصر کی آبادی پونے دو کروڑ ہے اور یہاں صرف پچیس لاکھ ایکڑ زمین میں کاشت ہوتی ہے۔ یہ زمین نیل کے صدقہ میں بہت زرخیز اور شاداب ہے، روٹی مصر کا سونپ ہے، گو یہ قابلِ کاشت زمین کے صرف پانچویں حصہ میں ہوتی ہے روٹی کی برآمدائی فیصدی ہے، پھر بھی کسان بھوکا ننگا ہے اور ساتھ ہی بیکار بھی، مصر کے گاؤں نہایت مفلس اور گھٹیا درجے کے ہیں، کچے مکان ہیں، مکان نہایت بدبودار ہوتے ہیں، کممیاں بہت زیادہ ہیں یہاں کے دیہاتی پینے کا پانی تالابوں سے حاصل کرتے ہیں، جن میں بچے اور مویشی نہاتے ہیں، دیہاتی لوگ جوتا پہننے والے کو دولت مند سمجھتے ہیں مرد اور بچوں کو کپڑے بہت کم نصیب ہیں عورتوں کا لباس البتہ عنایت ہے عورتیں پردہ تو نہیں کرتیں لیکن بڑی عصمت اور پاکدامن ہیں، مصر میں جتنے لوگ بیمار ہیں کہیں اور نہیں، آنکھوں کی بیماری عام ہے یہاں اندھوں کا اوسط تمام دنیا سے زیادہ ہے بلیریا اور گھونگے سے پیدا ہونے والی بیماری بہت زیادہ ہے نثرانسی فیصدی کسان اس بیماری اور داد کے مریض ہیں، مصری کسان اتنے افلاس و جہالت میں مبتلا ہیں کہ وہ سستی سے سستی دوائیں بھی نہیں خرید سکتے ان کے بچوں کی آنکھیں عام طور پر خراب ہیں ہمیشہ کممیاں چھڑتی رہتی ہیں۔

مصر میں تعددِ ازدواج برائے نام ہے مگر شک کی بنا پر عموماً طلاق کی نوبت آتی رہتی ہے، مصری لوگ کمزور ہیں، ان کو اچھی غذا میں میسر نہیں کسی طرح زندگی گزار لیتے ہیں۔

زرعی اصلاحات سے | مصر کا علاقہ تین لاکھ چھپاسی ہزار میل مربع ہے، مگر قابل کاشت زمین صرف ساڑھے حکومت کی ہے پڑا ہے | تین فیصدی ہے بانی سب صحرا ہے، مصر کی آبادی بہت زیادہ ہے، حساب سے آدھے مصری کسان نکمے اور فالتو ہیں۔ قانونِ آراضی کی اصلاح ہو تو مصری کسانوں کی آمدنی بڑھ سکتی ہے۔ سیاح کہتا ہے۔

”اعداد و شمار سے ثابت ہے کہ مصر کے ساڑھے سترہ لاکھ کسانوں کے پاس صرف ساڑھے سات لاکھ ایکڑ اور بارہ ہزار دو سو زمینداروں کے قبضے میں اس سے ساڑھے تین گنی آراضی ہے یہ بے یگانگ حقیقت مصر کی سماجی اور اقتصادی زندگی کے مطلع کو مکدر بناتے ہوئے ہے، سر زمین مصر جس طرح زمیندار کے لئے جنت ہے جس میں وہ عیش و مسرت کی زندگی بسر کر رہا ہے، اسی طرح وہاں کے کسان کے لئے دوزخ ہے جہاں افلاس و بیماری کے سوا کچھ نہیں۔“

اصلاحات کی ضرورت | سیاح کہتا ہے کہ مرے ایک دوست نے جو قطبی ڈاکٹر ہے بتایا کہ ملیریا سے ایک لاکھ جانیں تلف ہوتی ہیں۔ اسی نے یہ بھی کہا ”پاشا زمیندار قہم کے لوگوں نے مصر کی ترقی روک رکھی ہے، اس کے پاس دولت ہے اور جس طرح آپ نے دیکھا عیش و عشرت میں پڑے ہیں۔“ اس قطبی ڈاکٹر کے سے خیالات و احساسات دوسرے مسلمانوں کے بھی ہیں۔ سیاح نے یہاں زرعی اصلاحات پر بڑی تفصیل سے بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ ترقی کی راہیں بہت سی ہیں نئی نئی پیداوار کی طرف دھیان دینے کی ضرورت ہے، بیس لاکھ ایکڑ زمین کو قابل کاشت بنایا جاسکتا ہے اور یہ حصہ ان کو دیا جائے جن کے پاس زمین نہیں ہے اسی طرح یہ قانون ہو کہ کسی کے پاس سو ایکڑ زمین سے زیادہ نہ ہو، جس کے پاس ہو اس پر ٹیکس کافی رکھ دیا جائے کہ وہ خود انکار کر دے اور زمین دینے پر مجبور ہو جائے، کسان چونکہ زمین کا مالک نہیں ہے اس لئے وہ جیسی محنت چاہتے نہیں کرتا، ملکیت حاصل ہونے کے بعد ضروری طور پر اس کی محنت میں اضافہ ہوگا اور آمدنی بڑھے گی۔

احمد حسین | احمد حسین جو سماجی اصلاح کمیٹی کا انچارج ہے اس کی تعریف کی ہے اور بتایا ہے وہ بڑا مستعد اور محنتی ہے اس نے بتایا کام کی ابتدا کر دی گئی ہے اسکولوں میں پانچ لاکھ بچوں کو دن کا کھانا مفت دیا جاتا ہے، گھر بنیو دستکاریاں بھی پھیلائی جا رہی ہیں۔ اصلاحات کے قانون کا مسودہ تیار ہو چکا ہے اور وزارت نے منظور بھی کر لیا ہے، کام ہو رہا ہے، ستیاح کا بیان ہے کہ اخیر میں ڈاکٹر حسین نے کہا ”زمیندار با تو سوا یکم زمین کی آمدنی پر قناعت کریں گے، با پھر چند روز اور عیش منالیں اور اس کے بعد اپنا سر قلم کرائیں۔“

بغداد کے حالات | بغداد، عراق کا مرکز ہے، یہ وہ شہر ہے جہاں مسلمانوں کی حکومت کے جاہ و جلال تاریخ میں محفوظ ہیں، عباسی حکومت کا مرکزی شہر تھا، ہارون رشید جو معروف و مقبول خلیفہ گذرا ہے، یہیں حکومت کرتا تھا، اس وقت یہاں کی کاشت دنیا میں ممتاز تھی۔ پرانے زمانہ کا عراق واقعی ”نہروں سے چمکتا اور غلے کے انباروں سے معمور رہتا تھا۔“ جب کہ آج کے مقابلہ میں تین گنی پیداوار زیادہ تھی، ہارون رشید کے زمانہ میں بغداد کی آبادی بیس لاکھ تھی، سرمایہ کس سا نکس بغداد کا حال لکھتا ہے۔

خلافت عباسی کے تحت میں | ”شہنشاہی دربار شائستہ، شاندار اور بے حد متمول تھا، چاروں طرف شہر آباد تھا، اور بیچ میں قلعہ تھا، جہاں سے نظم و نسق کے احکام جاری ہوتے رہتے تھے، ہر چیز کا محکمہ جدا تھا، اور دفاتروں کی باقاعدگی اس وقت کی دنیا میں بے مثال تھی، شہر بغداد سب سے بڑی تجارتی منڈی تھا، تعلیم گاہوں کا شمار مشکل تھا جہاں دنیا بھر کے طلبہ۔ شاعر۔ فلسفی اور علماء آتے اور کسبِ علم کرتے تھے، دار الخلافہ کی طرح صوبائی مستقروں میں بھی مالیات سرکاری عمارتیں تھیں، پوری مملکت میں ڈاک کا انتظام مکمل تھا فوج و فادار، بہادر اور قلعہ کی پابند تھی۔ گورنر اور وزراء و متدین اور برہنہ ہوتے تھے، عباسی مملکت صقلیہ سے عدن تک اور مصر سے وسط ایشیا تک پھیلی ہوئی تھی اس وسیع مملکت میں نظم و نسق یکساں طور پر مضبوط تھا سرکاری عہدوں پر عیسائی یہودی۔ مسلم۔ اور بے دین سبھی ناز ہوتے تھے اس حکومت کے زمانہ میں جھوٹے پیغیر، باغی جرنیل، اور فاسق غلام یکسر مفقود ہو گئے تھے، تجارت کی وسعت اور دولت کی فراوانی نے قحط اور بھارت کو دیس سے نکال دیا تھا و باوجود امراض کی روک تھام کے لئے سرکاری اسپتال اور شاہی معالج تھے۔“

५०



افسوس ہے زندگی قانون میں اصلاحات کا اس نے زریں موقع کھو دیا، اور زمیندار بلا دست ہیں عراق میں کاشت بٹائی پر ہوتی ہے اکثر حالتوں میں کسان کو تیس فیصدی ورنہ چالیس فی صدی فائدہ ملتا ہے اس میں سے اسے ہنری ٹیکس وغیرہ بھی دینا پڑتا ہے۔

عراق کی زبون حالی | عراق کے کسانوں کی زبوں حالی پر لکھتا ہے

”عراقی کسان کا افلاس عجیب حروف میں لکھا ہے، اوسط اموات مصر کی طرح یہاں بھی زیادہ ہے، ۱۹۳۶ء میں ۲۷ فی ہزار تھی، بچوں کی موت کا اوسط بھی ڈراؤنا ہے ۱۹۳۶ء میں ۲۲ فی ہزار تھا، ہر سال سات آٹھ لاکھ انسان طعیر یا کاشکار ہوتے ہیں عراق میں بھی وہی بیماریاں عام ہیں جو مصر میں ہیں، بغداد میں اندھوں کی گنتی ساڑھے ست ہزار ہے، اور اوسط زندگی پچیس سال ہے۔۔۔۔۔ پنیاٹیس لاکھ کی مردم شماری میں پینتیس لاکھ فلاحین (کسان) کی تعداد ہے، زمین سے نہ فلاح کو محبت ہے، نہ زمیندار کو زمیندار چاہے تو فلاح کو ایک جگہ سے ہٹا کر دوسری زمین پر بھیج دیتا ہے، اور فلاح بھی بہتر آراضی پاتا ہے تو پرانی کو چھوڑ دیتا ہے۔

سیاح یہاں پہنچ کر کہتا ہے

”عراق سے بہتر جہاں کا میں دنیا میں کہیں نہیں ہیں مگر موشی کا اوسط عراق میں بہت کم ہے، قوت پیداوار کے لحاظ سے عراق سب سے زیادہ دولت مند ملک ہو سکتا ہے، مگر سب سے زیادہ مفلس ہے۔۔۔۔۔ عراق کا زمیندار سب جگہ کے زمینداروں سے زیادہ ناتجربہ و رندی ہے۔۔۔۔۔ سیاح نیچے کی سطر لکھ کر عراق کی بحث ختم کر دیتا ہے

”عراقی لوگ عرب بھی ہیں اور مسلم بھی، مگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے یہ الفاظ سجلا چکے ہیں کہ ”میں نے تمہیں زمین

میں کر بکت دی ہے، کھاؤ پو اور صنائع مت کرو“

ایران، مصر اور عراق کے متعلق امریکن سیاح کا آپ نے تاثر معلوم کر لیا، نگار سائز کے ۷۵ صفحات میں یہ اردو ترجمہ شائع ہوا، جس کا یہ اختصار اور خلاصہ میں نے آپ کی خدمت میں پیش کیا عراق کی بحث ختم کر کے مصنف نے فلسطین اور اسرائیلی حکومت کے حالات قلم بند کئے ہیں اور ۷۶ صفحوں سے لے کر صفحوں ۱۰۴ تک مسلسل اسرائیلی حکومت کا ذکر ہے۔

یہودی شہر تل عصف | سیاح کا بیان ہے کہ اسلامی ملکوں کا چھ ماہ سفر کرنے کے بعد فلسطین آیا، یہاں کے ہوائی اڈے سے کار پر بیٹھا اور ”تل عصف“ پہنچا۔

اس تل عصف شہر کو زندگی کے ہنگاموں سے معمور پایا، مصر وغیرہ کی طرح فقروں اور گداگروں کی بھڑ نہ تھی، اونٹ اور گدھوں کے قافلے بھی مفقود تھے، بلکہ بازار میں بڑی چل چل اور موٹروں اور ٹرک کی قطاریں ہیں، مشین نے یہاں انسانوں کی محنت کو کم کر دیا ہے شہر میں تل کا پانی رواں ہے، اسلامی ملکوں کی طرح پانی ابال کر پینے کی زحمت نہ اٹھانی پڑی، تل عصف کو آباد کر کے یہودی نے فطرت کے ساتھ محبت کا ثبوت دیا ہے۔

یہودی ملک کی ترقی | پوری دنیا میں یہی ایک شہر ہے جسے یہودیوں نے آباد کیا ہے اور ان کی ہی حکمرانی ہے، یہاں کی سرکاری زبان عبرانی ہے، خوف دہرا اس کا نام و نشان تک نہیں، اس شہر کی بنیاد ۱۹۰۵ء میں ساٹھ یہودیوں نے ڈالی، پھر یہ تین سو کی تعداد میں پہنچے ۱۹۱۵ء میں یہ تعداد اٹھارہ سو ہو گئی، ۱۹۲۹ء میں بارہ ہزار ۳۶ء میں ایک لاکھ سب ہزار اور آج دو لاکھ کی تعداد ہے۔

علم و عمل کا مرکز | سیاح کا بیان ہے یہاں سوائے بوڑھی عورتوں کے کوئی بے پڑھا لکھا نہیں ہے ”۳۲ء میں جب سبٹ ایک کروڑ ڈالر تھا اس میں سے تیس لاکھ ڈالر تعلیم پر خرچ کئے، بچوں کی تعلیم و تربیت پر بڑی توجہ ہے، نشر و اشاعت اعلیٰ پیمانہ پر ہے دو لاکھ کی آبادی میں بارہ روزانہ اخبار نکلتے ہیں، کتب فروشوں کی دکانیں بہ کثرت ہیں، صرف دوسرے ملکوں سے پانچ لاکھ ڈالر کی کتابیں درآمد کی جاتی ہیں، اس طرح تین لاکھ ڈالر سالانہ کے اخبار، رسالے دوسرے ملکوں سے آتے ہیں، شہر میں پانچ بڑی لائبریریاں ہیں۔“ یہاں شہر میں اظہار خیال کی کامل آزادی ہے، ہر نپڑ رہو میں دن ایک ادبی اجتماع ہوتا ہے، یہاں کے لوگ خوش پوشاک ہیں، غریب کا پتہ نہیں چلتا، اتنا متحرک شہر ہے کہ دو لاکھ کی آبادی پانچ لاکھ معلوم ہوتی ہے، کوئی شخص نکما اور بے کار نہیں، پورے مشرق وسطیٰ میں یہی تل عصف ایک شہر ہے جہاں چودہ سال سے کم عمر بچوں سے کام لینا جرم ہے یہ اب ہیرا تراشی کا مرکز بن گیا ہے ۳۶ء میں اس کی ہیرے کی برآمد سو ادو کروڑ ڈالر کے قریب تھی، سیاح ایک جرمن کا قول نقل کرتا ہے اور کہتا ہے ان میں سمجھنے

کے لئے بہت کچھ ہے، جرمن یہودی نے دوران گفتگو میں کہا
 ”ہم نے اگر ریگستان پر فتح پا کر اسے باغوں سے ڈھک دیا ہے تو ایک دن ہم عربوں سے معاملہ کرنے میں بھی کامیاب
 ہو جائیں گے۔“

ایک ہیڑی گاؤں اس کے بعد سیاح غوات برنیر گاؤں کی بڑی تعریف کرتا ہے اور کہتا ہے یہاں امداد باہمی کے
 طور پر کاشت ہوتی ہے، جو معجزہ معلوم ہوتی ہے اور اس طرح اور بھی بہت سے گاؤں میں مگر یہ سب میں
 ممتاز ہے، یہاں کی آبادی بارہ سو سچاس ہے، چھ سو سچاس بچے ہیں اور چھ سو مرد و عورت، اکثر اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں
 اشتراک عمل اور اس نتیجہ غواط ۳۸ء میں آباد کیا گیا، آج کل چھ سو کاشتکار یہاں نو سو ایکڑ زمین کاشت کرتے ہیں ان
 کے مکانات بہت پاکیزہ ہیں ان کے کھیت بھی ایسے نظر آتے، کہ کہیں بھی جنگلی گھاس کا پتہ نہیں، پینتالیس
 ایکڑ زمین پر صرف باغ ہی باغ ہے جن میں سیب، نارنگی، انگور، لیمو اور دوسرے عمدہ پھل لگے ہیں بعض
 چیزوں کی چار چار فصلیں اُتارتے ہیں۔

”پورے رقبہ میں ڈھائی سو ایکڑ زمین نہری ہے باقی بارانی بارانی پرند بویا جاتا ہے، پھر ایکڑ زمین پر چارہ کی غرض سے
 مکی اور سورج مکھی کی کاشت کی جاتی ہے جس کی بیج سے کھانے کا تیل بھی نکل آتا ہے، مزید بیس ایکڑ ترکاریوں کے
 لئے وقف ہے، اور تین فصلیں اترتی ہیں..... ساتھ ہی پھولوں کی بھی کاشت ہوتی ہے..... باغات کے
 ملاوہ ایک بڑا رقبہ پاکستان کا ہے..... ڈیڑھ سو سے اوپر مویشی تھے..... دودھ کا سالانہ اوسط فی گائے
 ننانوے ہزار پونڈ تھا، دودھ بھی مشین سے دیا جاتا ہے..... ایک برتن خانہ بھی کھول رکھا ہے..... ایک
 درکشاپ بھی قائم کر لیا ہے جو صرف مرمت اور پرزے بی بنانے کا کام نہیں کرتی بلکہ پوری مشین بنا لیتی ہے.....
 لوہے کی ڈھلائی کا کارخانہ بھی چل رہا ہے ایک ٹیکسٹری فریج اور دوسرے لکڑی کے کام کے لئے جاری ہے، اور ایک
 حشرات الارض مارنے والی دوائیں طیار کرتی ہے مشین ہی سے کپڑے دھوئے، روئی پتی، کپڑے سسے اور جوتوں
 کی مرمت ہوتی ہے، عمارتیں بنانے والا ادارہ الگ قائم ہے، پہاڑی کی جوتی پر..... ایک تفریح گاہ بھی ہے
 جہاں ایک سو فٹس آدمی ٹھہر سکتے ہیں، پھلوں کو محفوظ کرنے کی ایک اور ٹیکسٹری چل رہی ہے..... مزدور
 کا بیار وقت گھریلو دستکاروں میں صرف ہوتا ہے۔“

ایک چھوٹا گاؤں کی آمدنی | سیاح کہتا ہے کہ میں نے گاؤں کے سکریٹری سے پوچھا گذشتہ سال پورے گاؤں کی کیا
اور اس کا طریقہ آمدنی تھی تو اس نے جواب دیا۔

”سنتہ میں ہماری کل آمدنی چار لاکھ پونڈ تھی، اس میں ایک لاکھ کاشت کا منافع تھا اور تین لاکھ گھریلو انڈسٹری کا۔“

سیاح حساب کر کے بتاتا ہے کہ ہر کام کرنے والے آدمی نے دو ہزار چھ سو امریکن ڈالر کمائے، سیاح
کا بیان ہے کہ میں نے سوال کیا ہر آدمی کو نقد کیا ملتا ہے، اس نے کہا، کچھ نہیں، یا برائے نام۔ سیاح رقم طراز ہے
میں نے پوچھا ”فرض کر دو کوئی کتاب خریدنا چاہتا ہے؟“

اس نے جواب دیا ”کتاب کے لئے لائبریرین کو اطلاع دے دے گا کتاب آجائے گی“

میں نے پوچھا ”اچھا اگر کوئی نوجوان چاہتا ہے کہ اپنی کسی دوست لڑکی کو تفریح کرانے لے جائے؟
جواب ملا کہ ”اس صورت میں وہ خزانچی کے پاس جائے گا اور اسے مناسب رقم مل جائے گی؟
اس کے بعد سیاح نے بتایا ہے کہ ہر مہینہ بیوی کے لئے ایک عمدہ آرام دہ کمرہ ملا ہوا ہے، باقی کھانا
تو اس کے لئے انتظام یہ ہے کہ سارے گاؤں کا کھانا ایک جگہ پکتا ہے اور ایک ہی جگہ کھایا جاتا ہے، بچوں
کے لئے الگ انتظام ہے، جو بچوں کا گاؤں کہا جاتا ہے، تمام بچے اسی گاؤں میں رہتے ہیں البتہ شام کو والدین
سے مل سکتے ہیں، چھٹی کے دنوں میں بھی والدین کے ساتھ رہ سکتے ہیں — طریقہ یہ ہے کہ بچہ پیدا ہونے
کے بعد چھ ہفتہ اس کی ماں زچہ اسپتال میں رہتی ہے، چھ مہینہ اس کی ماں سے آدھے دن کام لیا جاتا ہے
اور چھ ماہ بعد بچہ ”بچوں کے گاؤں“ میں پہنچا دیا جاتا ہے وہاں اس کے لئے سارا انتظام ہے، غواظ میں بچوں کا
اوسط انوات تمام دنیا سے کم ہے یعنی چھبیس فی ہزار۔ یہاں طبی انتظام خود اپنا ہے،

غواظ میں اٹھارہ سال کی عمر تک تعلیم لازمی ہے، چودہ برس کے بعد اس سے تعلیم کے ساتھ ساتھ
کچھ فیکٹری اور کھیت کا بھی کام لیا جاتا ہے

اس انتظام پر نہار لینن غواظ کے اس جدید نظام کے متعلق اس کے سکریٹری کا بیان ہے

”یہ نظام ہماری زندگی کی ساری سہولتیں فراہم کر دیتا ہے، ہمارا مستقبل محفوظ اور یقینی ہے، رہنے کو مکان ہے،

کھانے کو ہر چیز ہے پہنے کو کپڑے ہیں، اور جوتا، بچوں کی تربیت، تعلیم اور علاج کی سہولتیں، اور بے روزگاری

کا اندیشہ نہیں، اور چونکہ ہمارے کاڈھوں سے سارا بوجھ اُٹا لیا ہے، ہمارے پاس کچری مشاغل کے لئے ہی وقت

رہتا ہے۔“

اشتراک عمل کی برکت | اس غوطہ میں ایک لائبریری ہے، جس میں میں ہزار کتابیں ہیں، عمارت جولا لبریری کے لئے ہے وسیع ہے صرف مطالعہ کے لئے چھ کمرے ہیں جن میں اخبارات و رسائل رکھے رہتے ہیں، ایک ہال ہے جس میں چھ سو آدمی بیٹھ سکتے ہیں، اس میں ایک اسٹیج بھی بنا ہوا ہے گویا یہ گاؤں دیہات کا دیہات ہے اور شہر کا شہر، غوطہ کے ایک بڑے کا بیان سنئے،

”میں اگر دو چار ایکڑ زمین نجی طور پر کاشت کرتا تو مجھے ڈراما دیکھنے یا آرکیٹرا سننے تل عقیف جانا پڑتا مگر چونکہ میں

مشترک سماج اور زراعت کا ممبر ہوں، ڈراما کمپنی اور آرکیٹرا میرے یہاں چلے آتے ہیں۔“

سیاح کہتا ہے کہ ”غوطہ سے تل عقیف پلٹنے ہوئے میں سوچتا رہا کہ مصر و ایران اس سکیم پر عمل کر کے کس قدر نفع اٹھا سکتے ہیں؟ ان ملکوں کا کسان اشتر کی محنت پسند نہ کرے گا مگر اسے اس کی کتنی شدید ضرورت ہے، موشی کی نسل سدھارنے کی ضرورت ہے، اچھے بچوں کے انتظام کی ضرورت ہے، کھیتی اور انسانوں کی بیماری سے جنگ کرنے کی ضرورت ہے، تعلیم پھیلانے کی ضرورت ہے گھر ملبودہ سنکاریوں کے نفع کا پورا احساس کرنے کی ضرورت ہے۔“ اس کے بعد سیاح نے ایک باب اور باندھا ہے اور اس میں یہودی مملکت کی تعریف کی ہے، بتایا ہے کہ ان لوگوں نے کس طرح دلدل کو خشک کر کے طبریا کا خانہ کر دیا، اور کاشت کے لائق زمین بھی پیدا کر لی ۳۷۰ء میں بائیس فی صدی طبریا آبادی کو متاثر کرنا تھا۔ مگر ۳۷۰ء میں دو فیصدی اثر رہ گیا، نارنگی کی کاشت میں یہودی نے ترقی کی، پانی کا انتظام کیا، شہد کے چھتے پال کر ساڑھے بارہ لاکھ پونڈ شہد پیدا کیا، مچلی کے شکار کا انتظام کیا، پھر ایک اور باب میں تل عقیف کی ٹریڈ یونین کا شاندار تذکرہ کیا ہے اور اس کے کارنامے کو بتلایا ہے اور اس کی تفصیل پیش کی ہے، کوئی شبہ نہیں ان کا یہ کارنامہ پڑھ کر زبان پر کلماتِ تحسین آجاتے ہیں۔

مشرق وسطیٰ کی تہذیب | سولہواں باب اس سفر نامہ کا آخری باب ہے اس میں سیاح نے لکھا ہے کہ سیر و تفریح

اور سیاحت سے واپس سوئٹزرلینڈ پہنچا۔ اور جنیوا میں اپنی یادداشت نکالی اور سیاحت کے زمانہ کی

خریدی ہوئی اور دوسری کتابیں سامنے رکھیں اور غور کرنے لگا وہ اس باب میں پہلے عیسائی مصنفین کی کتابوں کے اقتباسات نقل کرتا ہے، پھر اپنی یادداشت کی خاص باتیں، سیاح ایک مصنف کی کتاب ”مشرق وسطیٰ کی اراضی اور افلاس“ سے یہ اقتباس پیش کرتا ہے۔

”قانون سے واسطہ، اموات میں زیادتی، زمین کی بربادی، اقتصادی لوٹ کھسوٹ، یہ ہے مشرق وسطیٰ کی دیہاتی زندگی کا خاکہ یورپ بھر میں اس شدید افلاس کی مثال کہ صاف پانی ہی ممبر نہ آتا ہو، کھجی اور کہیں نہیں ملتی ایک انسان اس گندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا، جو ایک ہی مکان میں انسان اور مویشی کے ساتھ رہنے سے پیدا ہو سکتی ہے۔

نبائی دوتہائی کی ضرورت پھر اس نے اسے صحیح تسلیم کیا ہے اور بتایا ہے کہ ذرا سی زندگی پیدا ہو جانے اور حکومت کی نوک سے یہ دن بدلے جاسکتے ہیں۔ پھر المناک منظر دیکھنے میں نہ آئے گا کہ بیس لاکھ بھڑیں ہر سال مرجائیں، حشرات الارض کھیتی کا تقریباً تین کروڑ دارفحصان کریں طیر یا انسانی زندگی پر حملہ آور ہو، اور مصر کی تین چوتھائی آبادی جو دیہات میں رہتی ہے آنکھوں کی بیماری اور خارش و دوا کا شکار بنے،

آخر یہ کیا غضب ہے کہ شام کی تیس لاکھ آبادی میں دو تہائی کاشت کرے اور قابل کاشت زمین کے ساٹھ فی صدی حصہ پران زمینداروں کا قبضہ ہو جو جہانک کر بھی نہ دیکھیں کہ کاشت اور زمین کس حال میں ہے، شام میں ساڑھے بارہ لاکھ ایکڑ پر کاشت ہو سکتی ہے مگر ابھی کاشت میں صرف اس کا تیسرا حصہ ہے عراق میں پتالیس لاکھ انسان بستے ہیں، مگر زمین جو زیر کاشت ہے وہ صرف بیس فی صدی گوبرطانوی سائنسدانوں نے یہاں کاشت کو ترقی دی ہے مگر ثباتی پر جو کاشت ہو وہ کیا ترقی کر سکتی ہے

عرب کی صحت پر فائدہ ۱۹۴۷ء کے فلسطینی معرکے میں عرب سپاہی بہترین اسلحہ کے باوجود نیچے ثابت ہوئے اور یہود کے مقابلے میں پسپا ہو گئے اس کے سوا اور کیا وجہ ہے کہ ان ملکوں میں صحت غائب ہے، اور یہ انسانوں کی بیٹرائی امرت سے بھی محروم ہے، ان ملکوں کے کسان کاشتکار نہیں، کھیت مزدور ہیں جان برائٹ نے سو سال پہلے لکھا تھا۔

”قانون جب اپنا فرض ادا کرنے سے انکار کر دے حکومت جب عوام کے حقوق ادا کرنے میں قاصر رہے، زمیندار جب

ارضی کے چھوٹے ٹکڑوں پر کاشتکاروں میں صدادہ مقابلہ پیدا کر کے نفع اٹھائے، وہاں لوگ قانون سے سرگردانی

کرنے لگتے ہیں، ہندیب و دندن کے اصول ترک ہو جاتے ہیں اور فطری بلکہ انتقامی قانون کام کرنے لگتا ہے۔

رمانے کی رفتار سے ختم پوشی | سیاح کہتا ہے کہ اسباب پر ہر جماعت اپنے نقطہ نظر سے بحث کرتی ہے مگر مجھے اتفاق موت کے مراد ہے انھیں لوگوں سے جو کہتے ہیں ”اگر زمین کی گھٹتی بیوی طاقت کا علاج نہیں کیا گیا، تو انسان کے مقدر پر مہر لگی سمجھو ————— پھر سیاح ایک تہید کے بعد اخیر میں لکھتا ہے ۔

”ہاں ہمہ سیاست داں اور مدبر روسی تھے کے خلاف جدوجہد کر رہے ہیں، کمیونزم کے پھیلاؤ کو روکنے کی تدبیروں میں لگے ہیں۔ ایشیا و افریقہ پر داغ سوزی کر رہے ہیں تیل اور ہوائی اڈوں کے جھگڑوں میں پھنسے ہوئے ہیں، فوجی ماہر جنگ کے نقشوں پر جھکے ہوئے ہیں، طبقات الارض کے ماہر اور انجینیر اور مینکر اپنے ملک کو چھوڑ کر دوسرے ملکوں میں تیل کے ذخیروں کا حاسب نگار بنے ہیں، یہ سب کچھ ہو رہا ہے لیکن ایک غریب فلاح رکسان اسے جسے کوئی نہیں پوچھتا، گویا اس کا کوئی وجود ہی نہیں، حالانکہ یہ اٹھارہویں، انیسویں صدی نہیں، بیسویں صدی ہے ہوا بازی اور ایٹمی توانائی کی صدی ہے، ہوائی جہاز نہیں، پرواز حیاں کی صدی ہے؟ بنارت کے خیالات کے پرواز کی صدی ہے، وہ نہیں دیکھتے کہ دنیا کا کسان کسمانے لگا ہے، حرکت میں آ رہا ہے وہ کارل مارکس کی زبان تو نہیں سمجھتا۔ لیکن اس سے آراضی کی بات کی جائے، تو فوراً سمجھ لیتا ہے، اس کو اگر کوئی صحیح حل نہیں بتا یا گیا تو غلط قبول کر لے گا وہ ہر اس آدمی کی بات مان لے گا، جو زمین دینے کا وعدہ کرے، کیونکہ زمین اس کی جان ہے اگر اس کی مدد کرنے کو طائفیں کھڑی نہیں ہوتیں..... تو کمیونزم کی فتح یقینی ہے، کل جو روس میں ہوا، آج جو چین میں ہوا ہے، وہی کل مشرق وسطیٰ اور دوسرے ملکوں میں ہوگا..... دمشق، بیروت، بغداد، مکہ، طہران، قاہرہ اور ان کے ساتھ لندن و واشنگٹن بھی ایک پیغمبر کے انتظار میں ہے جو سماجی مقصد و اصلاح کا جھنڈا لیے ہوئے عینی طریق اسلام کی طرح کاشتکار کو صرف یہ کہہ کر ہوش میں لاتے کہ

”جاگ! جاگ!! اور طاقت کا مظاہرہ کر!“

قدیم اسلامی درسگاہوں کے نصاب کی اصلاح کے متعلق چند بنیادی باتیں

(جناب مولوی محمد عبدالسلام صاحب مام پوری)

اسلام زندگی اور اس سے تعلق رکھنے والے تمام مسائل کو چہرہ سادے اور بنیادی عقیدوں کی روشنی میں دیکھتا ہے اور ان کے تحت ہی ان کی قدریں متعین کرتا ہے۔ مسلمان طرح طرح کے ظروف و حالات سے درجاء ہوتے رہتے کہیں ہم آہنگ ہونے کی کوشش کی تو کہیں ہم آہنگ بنانے کی تاہم ان کا انداز فکر ہر جگہ ہر زمانے میں اور ہر حال میں یکساں اور منفرد رہا۔ اس طرح ان میں ایسی ملیت کی بنیاد پڑ گئی جو زمان و مکان اور نسل و قوم کے تعصبات سے پاک تھی۔ مسلمانوں نے اپنی اس ملی انفرادیت کو قائم رکھنے کے لئے جو جو شعور یا غیر شعوری کوششیں کی ہیں ان کے ذکر کا یہ موقع نہیں ہے۔ یہی ان کی اس کوشش کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ انھوں نے اپنے ہر قسم کے اداروں کو اپنی انفرادیت کا مظہر بنا کر ہی چھوڑا۔ زندگی کے جائز اور ضروری تقاضوں کو نظر انداز کرنے کے بجائے ان کو اپنے رنگ میں پورا کرنے کی کوشش کی اس طرح ماحول سے بے آہنگ بھی نہ ہوئے اور ملی انفرادیت بھی قائم رہی۔ انھوں نے دوسروں کو جذب کیا لیکن خود کسی میں جذب نہ ہوئے۔ مسلمانوں کا یہ ملی شعور ان کے تمام اداروں پر برابر چھایا رہا۔

امت اسلامیہ کا ادارہ تعلیم ان کے ملی شعور کا سب سے اہم مظہر رہا ہے۔ یہ ادارہ اگر ایک طرف اس کے مذہبی تصورات اور عقاید سے سب سے زیادہ متاثر تھا تو دوسری طرف اس کی قومی تشکیل میں سب سے بڑی اثر انداز حیثیت رکھتا تھا۔ اس ادارے کا مقصد افراد کو ان کے ذوق و استعداد کے مطابق زندگی کی گونا گوں وسعتوں کے لئے تیار کرنا اور ترقی پذیر گرد و پیش کو اپنے رنگ میں رنگین بنانے کی استعداد پیدا کرنا

تھا۔ مسلمانوں کی درسگاہیں ہر قسم کے علوم و فنون کا مرکز رہیں۔ علوم میں اپنے اور بیگانے کا امتیاز نہ تھا۔ یہ درسگاہیں حکومت کے ساتھ اور حکومت کے بغیر دونوں طرح چلتی رہیں اور اس طرح مسلمانوں کا تعلیمی ادارہ مسلمانوں کی ملی زندگی کے جزو لا ینفک کی حیثیت میں قائم اور برقرار رہا۔

چونکہ مسلمانوں کی ملی زندگی اور اس ادارے کا چولی دامن کا ساتھ ہے اس لئے جوں جوں ان کی ملی حیات میں جمود و اصطلاح آتا گیا ان کا ادارہ تعلیم بھی ویسے ویسے جامد اور مضحل ہوتا گیا۔ اگر ملکیت کی پیش قدمیوں، پس پائیوں اور آباد کاریوں اور تباہ کاریوں کی داستان کو ہی مسلمانوں کی مکمل داستان نہ سمجھ لیا جاتے تو درحقیقت چوتھی پانچویں صدی سے ہی تاریخ کی اس بڑی اور اثر انداز ملت میں جمود اور اصطلاح پیدا ہونا شروع ہو گیا تھا اور وہ سر جہتی اور متناسب نہ ہو اور ارتقا جو کسی قوم کو ہر طرح کے گرد و پیش میں ترقی پذیر اور متناسب بناتے رکھتا ہے اس کے دھارے خشک ہونا شروع ہو گئے تھے۔ یہ جمود و اصطلاح کیسے آیا اور کیوں کر آیا اس کی داستان طویل ہے اور ہم میں سے بہتوں کے لئے تلخ بھی لیکن حقیقتوں سے صرف نظر بھی کب تک۔ مسلمانوں کا مذہبی اور علمی تنزل بلکہ سیرے نزدیک تو ان کا سیاسی اور اقتصادی زوال بھی اسی داستان کا المنک باب ہے میں تفصیلات میں پڑنا نہیں چاہتا تاہم کچھ اشارے بے عمل نہ ہوں گے۔

چوتھی پانچویں صدی میں بعض ماضی حوال سے متاثر ہو کر ہمارے فقہانے فقہی اجتہاد کے دروازے بند کر دئے ممکن ہے کہ وقت کی مصلحتوں کا یہی تقاضہ ہو اور ماحول کی اصلاح کا یہی واحد طریقہ ہو لیکن اس کے اثرات کی دوررسی اور ہمہ گیری کو غالباً یہ بزرگ پوری طرح محسوس نہ کر سکے۔ مسلمانوں کی پوری ملی حرکت کا محور دین تھا۔ دین کے خارجی پہلو یا اس کے معاشرتی رخ سے اجتہاد کو خارج کر کے جمود و دعوت دینا ایک طرح سے ان کی ملی حیات کو جامد بنا دینا تھا زندگی کے تمام شعبے جامد ہونے شروع ہو گئے علوم و فنون کی حرکتیں سست ہو گئیں، اگلوں کا ضروری احترام بجا عصبيت میں تبدیل ہو گیا غلطیاں کر سکنے والے علما معصوم بن گئے۔ جدت افکار گویا ناپید ہو گئی اہل علم کی دماغی ایجوں نے فکری جولانیوں کے لئے اس قید و بند میں بھی نئے میدان تلاش کرنے شروع کر دئے جو پھلوں کے لئے شمع راہ ہونے کے بجائے رستے

کے روڑے ثابت ہوئے اس کے مختلف النوع مظاہر کی تفصیل و تفتیش کا یہ موقع نہیں تاہم اس کا تعلیمی اور تصنیفی مظہر سب سے زیادہ خطرناک ثابت ہوا۔ جدت فکر کی بے راہ روی نے نئی پگڑیاں نکالیں۔ متقدمین کے استنباط کئے ہوئے مسائل جیستوں کے حل دریافت ہوئے اور حلوں کو معہ کیا گیا۔ اعتراض اور جواب توثیق و تردید اور توجہ و تفسیل کی تہیں جمتی گئیں۔ اگلوں کی کلیات نے نئے استقراء اور استنباط سے پچھلوں کو بے نیاز کر دیا۔ اس تاریک فضا میں اگر کسی نے چلے دماغ نے کوئی چمک محسوس کی تو معاصرین اور متاخرین کی کج سمجھیوں نے اس پر دھندہ پھیلانے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔ زمانے کو قدامت سے سیر ہے لوگوں نے پچھلوں کی پذیرائی کی اور اگلوں کے کاموں کو کتاب خانوں میں بند کر کے طالبان فن سے اجہادی منو نے بھی چھین لئے اور پچھلوں کی جامد تاہیفیں ان کی رہنمائی کے لئے رہ گئیں ہمارے نصاب کی کتابوں پر نظر ڈال جائیے قریب قریب سب کتابیں مسلمانوں کے عہد جمود کی یادگار ہیں، متن، شرح اور حلیہ کا ایک چکر ہے جس میں نہ علم کی انفرادیت قائم ہے نہ مصنفوں کی جامعیت نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کس کس کا کیا حصہ ہے۔ کس کس کی فروگزاشتیں ہیں اور کس کس کی اصلاحیں۔ طرز تحریر دیکھئے تو محض کتابی نہ زندگی سے مربوط نہ مقصد سے چسپاں خود قناعتی جمود، حقیقیوں سے اغماض، اور کج سمجھی تو ہمارے مدارس کی گویا خصوصیتیں ہیں۔

علوم و فنون کے جمود۔ نے مسلمانوں کے سب سے اہم عمومی ادارے تعلیم کو جامد بنا دیا اور وہ درسگاہیں جو زندگی کی نشوونما میں سب سے زیادہ قابل قدر حصہ یعنی یقین زندگی سے دور ہوتی چلی گئیں۔ لیکن یہ دوری بہت دنوں تک محسوس نہ ہو سکی۔ اتفاق سے مشرق میں خود زندگی بہت دنوں تک ساکن اور جامد رہی اور ہماری درسگاہیں اپنے پرانے ڈھرے پر تھے ہوتے بھی صدیوں تک زندگی کی ہم آہنگی کرتی رہیں۔ مغرب اور مشرق کا تصادم ہوا اور مشرق میں پہلی بار زندگی نئی افکار، نئی اقدار اور نئے تقاضوں کے ساتھ نمودار ہوئی ہماری درسگاہیں نہ وقت کے ان نئے تقاضوں کو پورا کر سکتی تھیں نہ ان نئی فکروں اور نئی قدروں کا مقابلہ کر سکتی تھیں چنانچہ ہماری درسگاہوں کو اپنی ہر جہتی ختم کرنی پڑی اور آہستہ آہستہ اپنے دائرے کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ علوم و فنون میں دینی اور دنیوی کی تقسیم قبول کر کے اپنے

آپ کو دینی علوم کی تعلیم میں محدود کر لیا۔ اس مذہب سے تقریباً ایک صدی سے زیادہ عرصہ زندگی سے بچتے بچتے گزر گیا۔ لیکن جس طرح زندگی سے الگ کر کے عام علوم و فنون کی تعلیم بہت دنوں تک زندہ نہیں رہ سکتی اسی طرح خالص دینی تعلیم کو بھی زندگی سے بچا کر باقی نہیں رکھا جاسکتا چنانچہ رفتہ رفتہ وہ گوشہ عافیت بھی تنگ ہونا شروع ہو گیا جس کو ہماری درس گاہیں قلعہ بند سمجھے ہوئے تھیں۔

یہ ہو سکتا ہے بلکہ ہے بھی یہی کہ ماحول اور فضا کافی مسموم ہو چکی ہے لوگوں کو دین سے وہ لگاؤ نہیں ہے جیسا ہونا چاہئے۔ اسلامی مدارس کی تعلیم و تربیت سے بڑ بڑھتا جا رہا ہے دینی عقاید و تصورات میں وہ قوت باقی نہیں رہی ہے جو امت مسلمہ کو زندگی کے میدان میں منظم و منضبط رکھ سکے لیکن اس کی ذمہ داری صرف دوسروں پر ہی نہیں ہے کچھ تصور ہماری درس گاہوں کا بھی ہے۔ ہماری درس گاہوں نے زندگی کو ایک کل کی صورت میں دیکھنا چھوڑ دیا زمانے کی عقل کو ناقابل اعتنا قرار دیا۔ عصری علوم و فنون سے دیدہ و دانستہ اغماض کیا اور اس طرح زندگی سے کٹ گئیں ہمارے علماء کا فرض تھا کہ وہ حالات کا صحیح جائزہ لیتے اور حقیقی علل و اسباب کو دریافت کرتے اور جب مرض متعین ہو جاتا تو صحیح علاج کی طرف متوجہ ہوتے اور طبیب حاذق کی طرح ہر وقت مرض اور علاج کی مطابقت پر نظر رکھتے لیکن افسوس کہ ایسا نہیں ہوا۔ برخلاف انہوں نے محض دوسروں کی کوتاہیوں سے اپنی اور اپنے اداروں کی کمیوں کی تلافی کرتی چاہئے

مسلمانوں کی ملی انفرادیت کو برقرار رکھنے کے لئے ان کی تعلیم و تربیت کی انفرادیت کو قائم رکھنا ضروری ہے اور یہ بغیر اسلامی درس گاہوں کے ممکن نہیں۔ ہماری آج کی اسلامی درس گاہیں پرانے عربی کے مدرسے ہیں اور یہی ہماری اس ملی حیات کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ جس کی شیرازہ بندی مذہب کرتا ہے ان مدرسوں کے علاوہ مسلمانوں کے اور جتنے ادارے ہیں یا قومی اور وطنی زندگی کو پیش کرتے ہیں یا دوسرے عصری محرکات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان مدرسوں کا حال یہ ہے کہ ان کا نصاب، طرز تعلیم، ان کے اساتذہ کا انداز فکر ان کے طلبہ کا انداز نظر، سب کے سب زندگی سے دور اور تعمیری قوتوں سے نا آشنا معلوم ہوتے ہیں۔ ہمارے علماء نے یا حالات کی قوت کو محسوس نہیں کیا یا راہنی بقضا ہیں۔

زندگی اپنا چولا بدل چکی۔ علوم و فنون بدل گئے۔ مسائل دوسرے ہو گئے، طرز فکر اور اندازہ نظر نیا ہو گیا۔ ہر چیز قانون ارتقاء کے تحت ماضی سے بہت آگے نکل گئی دنیا کے جن جن اداروں نے زندگی کا ساتھ دیا اور اس کی ارتقاء میں اپنا واجبی حصہ ادا کیا وہ باقی رہے اور ترقی کرتے رہے جو ادارے زندگی کا ساتھ نہ دے سکے انھیں ختم ہونا پڑا۔ کائنات کی ترقی پذیر روح حیات کو جذب کئے ہوئے بغیر کوئی چیز زندہ نہیں رہ سکتی۔ ہماری ان پرانی درس گاہوں نے بد قسمتی سے قدرت کے اس اٹل قانون کی خلاف ورزی کی اس لئے یا فنا ہو گئیں یا فنا پر آمادہ ہیں۔ ان کو ان کی موجودہ حیثیت میں باقی رکھنے کی ہر کوشش لا حاصل ہے ان کا کام ختم ہو گیا ان میں پڑھاتے جانے والے علوم فرسودہ ہو گئے۔ طریقہ تحقیق اور طرز تعلیم دونوں بوسیدہ ہیں۔ نہ یہ ہماری خارجہ زندگی سے ہم آہنگ اور نہ داخلی حیات سے مطابق ان میں اسلام کے حقیقی تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت بھی نہیں زندگی کو اسلامی اصول پر متوازن بنانے کے لئے جن قابلیتوں کی ضرورت ہے ان کو پیدا کرنے سے یہ قاصر ہیں۔ ایسی حالت میں ان کا باقی رہنا کرامت ہو سکتا ہے تاریخ کا تقاضا نہیں۔ اس بدلی ہوئی فضا میں ان کو باقی رکھنے کی بڑی سے بڑی کوشش ان کی رفتار زوال کو کچھ سست کر سکتی ہے ان میں زندگی نہیں بھونک سکتی۔

تاہم اگر ان مدارس کو پرانے انداز پر ہی باقی رکھنا ہے تو پھر وہی تدبیر کرنی ہوگی جس کو اب سے ڈیڑھ دو سو سال پہلے آزمایا گیا تھا۔ ان مدارس کو اور زیادہ نیچے لانا پڑے گا اور کمیت کے ساتھ کیفیت کو بھی محدود کرنا ہوگا۔ نصاب کو بہت زیادہ ہلکا کرنا پڑے گا۔ تعلیمی گھنٹوں میں کافی کمی کرنی ہوگی۔ اوقات میں تبدیلی کی جائے گی اور مدت تعلیم کو کم کیا جائے گا۔ تاکہ مذہبی تعلیم کے شائق (اور خدا کا شکر ہے کہ ابھی تک ہمارے ملک میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں) اپنے غیر مصروف گھنٹوں میں دوسرے کاموں کے ساتھ ساتھ دو تین سال میں مذہبی نصاب کو ختم کر سکیں۔ ممکن ہے کہ ان میں سے کچھ ایسے خصوصی ذوق اور اچھی صلاحیت والے افراد نکل آئیں جو اس تعلیم کی اپنے طور پر تکمیل کر کے ہمارے موجود علماء کی جگہ لے سکیں۔

اس تدبیر سے ہم اپنی موجودہ درس گاہوں کو کچھ زمانے کے لئے آباد کر لیں گے اور مذہبی تعلیم

کا چرچا کچھ دنوں کے لئے مزید برقرار رہے گا کیونکہ یہ محض عارضی تدبیر ہے جو موجودہ ماحول کو دیکھتے ہوئے شاید پیش رو تدبیر سے بھی کم دیر پا ثابت ہوگی اور ہمیں چار دنا چار ان مدارس کو مستقلاً بند کرنا پڑے گا یا پھر کوئی دوسری تدبیر کرنی ہوگی۔ کیونکہ آج کل ظروف و حالات جس تیزی کے ساتھ بدل رہے ہیں اور ان کی تبدیلی کے ساتھ ذہنیوں میں جس سرعت کے ساتھ انقلاب آنا جا رہا ہے اس کو دیکھتے ہوئے اس قسم کی عارضی تبدیلیاں بہت زیادہ وقتی ہو کر رہ جاتی ہیں۔

ہاں اگر ہمارا مطلق نظر ”انداز اور طرز“ نہیں ہیں ہم علوم اور فنون کو انہی علوم اور فنون میں منحصر نہیں سمجھتے ہیں جو متاخرین سے ہیں ورنہ میں پہنچے ہیں بلکہ ہمارا مقصود اسلامی ادارہ تعلیم کو برقرار رکھنا ہے اور وہ بھی اس لئے کہ مسلمانوں کی انفرادی اور معاشرتی زندگی کو وہ کیسے ہی حالات اور ظروف میں ہوا اسلامی بنایا جاسکے اور مذہبی اصول کو بنیاد بنا کر مسلم زندگی کی تنظیم کی جائے تو پھر اس کے لئے وہ طریقے اختیار کرنے ہوں گے جن کو مسلمانوں نے اپنے عہد ترقی میں اختیار کیا تھا مدرسوں میں عصری روح جذب کرنی ہوگی قدیم فرسودہ علوم و فنون کے بجائے علوم و فنون کو ان کی ترقی یافتہ شکل میں شامل کرنا ہوگا تعلیم کو زندگی سے مربوط کر کے آگے بڑھنا ہوگا۔ ان درسگاہوں کا دینی پہلو یہ ہوگا۔ کہ طلبہ کو اسلام کی حرکی قوتوں سے آشنا کریں گی۔ اسلام کی بنیادی قدروں سے زندگی میں کس طرح ضبط پیدا کیا جاسکتا ہے یہ درسگاہیں اس کو سمجھنے اور سمجھانے کی صلاحیت پیدا کریں گی۔

غالباً صرف یہی ایک طریقہ ہے جس سے اسلام کے تعلیمی ادارے کو باقی رکھا جاسکتا ہے اور اس کو مسلمانوں اور خود اسلام کے لئے مفید بنایا جاسکتا ہے اور تنہا اسی قسم کی درسگاہوں کے فضلاء سے زندگی میں رہنمائی کی توقع ہو سکتی ہے۔ چونکہ یہ درسگاہیں زندگی سے بے گانگی نہیں برتیں گی اس لئے وہ شاید زیادہ دیر پا اور مستقل ثابت ہوں۔ یہ طریقہ ایک بار کامیاب ہو چکا ہے اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ اب ناکام ہو اور اگر خداخواستہ ناکام ہو تو بھی ممکن ہے کہ اس تجربے کی بنا پر ہم زیادہ بہتر اور زیادہ عملی راہوں کا سراغ پاسکیں لیکن اگر کچھ بھی نہ ہو سکا اور اصلاح کے شوق میں ہماری موجودہ

درسگاہیں جاتی رہیں تو یہ ایسی بات ہے جو ہونی ہے اس لئے خوف زدہ ہو کر ہمیں صحیح سمت میں گونشیں نہ چھوڑ دینی چاہئیں کیونکہ تسکین کے لئے یہ بھی کیا کم ہے کہ ہم نے اپنی جیسی کر لی۔

ہمارے مدارس کی اصلاح کے سلسلے میں سب سے پہلی بات یہ تحقیق کرنی ہے کہ ہمارے نصاب تعلیم کا وہ خاص ڈھانچہ کون سا ہے جو اسلامی اور غیر اسلامی مدارس میں حدفاصل ہے کون سے مضامین لازم کی حیثیت رکھتے ہیں اور کون سے اختیاری ان مدارس کی تعلیم اور تربیت کی امتیازی خصوصیت کیا ہے۔ ان امور کی صحیح تکمیل کر لی جائے تو ممکن ہے کہ اصلاح کے لئے صحیح رخ سننے مل جائیں۔

تذکروں اور تاریخوں نے ہمارے مدارس کے نصاب کے بارے میں جو کچھ محفوظ رکھا ہے اس سے اور مختلف علوم و فنون کی ان تصانیف سے جو ہم تک پہنچی ہیں یا قیاس کرنا ہے جانیں کہ ہمارے تعلیمی اداروں کی نمایاں خصوصیت یہ رہی ہے کہ انھوں نے دین کو اساس بنا کر تعلیم کی عمارت کو استوار کیا اور ہر طرح کی فکری اور عملی کوششوں کو دین کے سانچے میں ڈھال دینے کی کوشش کی۔ اہل خاکے کو مذہبی رکھ کر اس میں علوم و فنون کی رنگ آمیزیاں کیں۔ مذہب کے تفرق کو نمایاں کیا۔ اس طرح اگر ایک طرف مسلمانوں کے علوم و فنون مذہب سے متاثر ہوئے تو اس میں بھی شبہ نہیں کہ دوسری طرف مذہب نے بھی بعض اصناف قبول کئے تاہم مسلمانوں نے اس کی پرداہ نہ کی اور اس ڈھانچہ کو جو زمانے نے ان کی تعلیم کے لئے مقرر کر دیا تھا کسی طرح نہ چھوڑا۔ ہماری درسگاہوں کا یہی مخصوص ڈھانچہ ہے جو ان کو دوسری درسگاہوں سے ممتاز بناتا ہے۔

مسلمانوں کے نصاب تعلیم کے صد ہا سالہ مسلسل تغیروں پر اڑتی سی نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دینیات اور عربی کو چھوڑ کر ہمارے نصاب کے تمام دوسرے مضامین میں یہم رد و بدل اور متوازن حذف و اثبات ہوتا رہا ہے اور یہ استثنا بھی ابتدائی اور متوسط نصاب میں ہے نصاب تعلیم کے اعلیٰ مراتب میں یہ استثنا بھی نظر نہیں آتا۔ تقفنی الدین اور عربی کی سانی بہارت طلبہ کے ذوق، مناسبت طبع اور فرصت اور حالات کی مساعدت پر منحصر رہی ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دین سے اوسط درجے کی عام واقفیت پیدا کرانی جس سے اسلام کے

عقاید و اعمال واضح ہو جائیں، اسلامی طرز زندگی کا علم ہو جائے اور معاشرہ کی روزمرہ کی ضرورتیں پوری ہو سکیں ہمارے مدارس کا مقصد نظر تھا اس سے زیادہ کی تعلیم کو ادارے نہ ضروری سمجھتے تھے اور نہ مناسب۔ ان اداروں کو عربی سے جتنی دلچسپی تھی اس کی حدیں بھی مقرر تھیں یہ درسگاہیں اپنے طلبہ کو اس قدر عربی سے لازماً آشنا بنادیتی تھیں جس سے وہ قرآن و حدیث سے بطور خود اور بلا واسطہ فائدہ اٹھا سکیں اور اسی ضمن میں فقہ و اصول اور عقاید و کلام کی کتابوں کا براہ راست مطالعہ کر سکیں۔ جدید جاہلی کی ادبی عربی اپنی تمام لسانیاتی نزاکتوں اور فصاحت و بلاغت کے نکٹوں کے ساتھ قرآن کے اسلوب بیان، مجاز و اور تدبیر معانی کے لئے ضروری تھی، دو عربی اہل زبان کے اختلاط و تعلق کے لئے ناگزیر تھی لیکن ہماری درسگاہوں نے اپنے عام متوسط نصاب کا ان کو جز لازم نہیں بنایا بلکہ خصوصی ذوق اور شخصی ضرورتوں پر محمول رکھا۔

اسلامی درسگاہوں کی تربیت کی امتیازی خصوصیت یہ رہی ہے کہ وہ طلبہ میں اسلامی کردار کو نشوونما دینے کے انکار، اخلاق اور اعمال کو اسلامی منزلے کے مطابق ڈھالیں۔ چنانچہ صالح ماحول، اسلامی کردار کے اساتذہ اس تربیت کے لئے ضروری عناصر سمجھے گئے۔ فرض یہ کہ ہماری درسگاہوں کی تربیت کا مقصد صرف اچھے اور مفید شہری بنانا نہیں رہا ہے بلکہ اچھے اور مفید مسلمان بنانا رہا ہے اور تنہا یہی وہ مقصد ہے جس کے لئے مسلمانوں کو اپنی مستقل درسگاہوں کی ضرورت ہے۔

اسلامی درسگاہوں کے امتیازی اوصاف کی اگر یہ تحلیل درست ہے تو ان کو سامنے رکھ کر ہی ہم اپنے مدارس کی اصلاح کرنی چاہتے جہاں تک تربیت اور مقصد کا تعلق ہے جب تک ہماری درسگاہوں کو ایسے اساتذہ مہیر نہ آجائیں جو خود اس رنگ میں رنگے ہوں اس وقت تک یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ ہم اپنی درسگاہوں میں مقصد اور تربیت کے اعتبار سے سو فی صدی کامیاب ہوں گے تاہم اس سلسلے میں جو کوششیں ہو سکتی ہوں ان سے دریغ نہ کرنا چاہئے اور جو وسائل مفید ہوں ان کو اختیار کرنا چاہئے۔

ابتدائی اور متوسط نصاب میں دینیات اور عربی کو لازم قرار دیا جائے اور اعلیٰ اور تکنیکی نصاب میں ان کو اختیاری مضامین کی حیثیت میں پڑھایا جائے اور حتیٰ الامکان ان درسگاہوں کو ہر جہتی بنانے کی کوشش کی جائے۔ پرانے علوم آج اتنے ترقی کر چکے ہیں کہ جدید و قدیم میں نام کے علاوہ شاید کوئی اشتراک نہیں۔ فہرست علوم میں سیکڑوں نئے علوم کا اضافہ ہو گیا، ہماری درسگاہوں کو حسبِ قدرت ان سب کو شاملِ نصاب کرنا چاہیے اور ایسے تمام علوم و فنون کو جو آج محض قدیم نظریوں کی حیثیت رکھتے ہیں اور صرف تاریخی اہمیت کے حامل ہیں ان کو عام نصاب سے خارج کیا جائے ان کی صحیح جگہ ہمارے مدارس میں اگر کہیں ہے تو تخصص کے مرحلے میں اور وہ بھی اختیاری حیثیت میں۔

یہ سچ ہے کہ ہماری عام درسگاہیں موجودہ فنون کی تعلیم کا بار اٹھانے کے قابل نہیں لیکن ابتدائی اور ثانوی مرحلوں تک بہت سے مدرسے اگر چاہیں تو جدید تعلیم کا بار اٹھا سکتے ہیں، ہندوستان کے بعض بڑے مدرسے کوشش کریں تو کم از کم نظری فنون کو جامعی معیار تک بھی پڑھا سکتے ہیں۔ اس طرح جب نئی سہاج کی بنیاد پڑ جائے گی اور نئے فنون ہماری درسگاہوں میں بار پالیں گے تو کون کہہ سکتا ہے کہ عملی فنون کی تعلیم کے لئے راہیں نہیں کھلیں گی اور خدا ان کے لئے اسباب مہیا نہیں کریگا، میرا خیال ہے کہ مذہبی تعلیم میں جذب کی ہوئی عصری تعلیم ہماری درسگاہوں کی معرفت کافی سستی اور زیادہ مفید ثابت ہوگی زبان کا مسئلہ بھی اب زیادہ دشوار نہیں ہے، عثمانیہ یونیورسٹی کے دارالترجمہ نے کام چلانے کے لئے اردو میں کافی سالہ جمع کر دیا ہے جسے اگر چاہیں تو بھارت میں تنہا ہی اٹھا سکتی ہیں اور یوں حکومت سے آزاد رہ کر اردو کی کھوس خدمت بھی انجام دی جاسکتی ہے۔

پوری تعلیم کو ایک اکائی کی صورت میں ضبط کرنا نہ طلبہ کے لئے مفید ہے اور نہ سرپرستوں کے لئے، خالص تعلیمی زاویہ نظر بھی اس طریق کار کی تائید نہیں کرتا۔ تعلیم کو چند اور مکمل بکار آمد مرحلوں میں تقسیم ہونا چاہیے۔ ابتدائی مرحلے کو چھوڑ کر ثانوی اور جامعی مرحلوں میں طلبہ کی ضرورتوں اور مسائل کے تحت اختیاری مضامین کی مجموعہ بندیاں کرنی چاہئیں۔ تخصص اور ہمارے پیدا کرنے کی سہولتیں بہم پہنچانی چاہئیں اس کے بغیر ہماری درسگاہیں ہر جہتی اور مفید نہیں بن سکیں، مضامین کی تقسیم مجموعہ

ندی اور مرقی تعلیم میں عصری تحقیقوں اور ماہرین تعلیم کی راہوں اور منصوبوں سے کام لینا چاہیے اس
روح ہم بہت سی کوششوں سے بھی نجات پالیں گے اور ہمارا نظام تعلیم خود بخود حرکی اور عصری روح
سے ہم آہنگ رہے گا۔

ہماری درس گاہوں کے مروجہ دینیاتی نصاب میں قرآن کو عملاً مرکزی حیثیت حاصل نہیں ملا
اس کو سمجھنے اور اس کا عام میلان و مزاج دریافت کرنے کا واحد ذریعہ قرآن ہی ہے۔ قرآن میں بلا واسطہ
نذر کی راہیں بڑی حد تک بند ہیں۔ آئندہ نصاب میں اس کو مرکزی مقام ملنا چاہیے اور بلا واسطہ تدریس
کی حوصلہ افزائی ہونی چاہیے احادیث کا دورہ حنفی فقہ اور اشعری کلام کی روشنی میں پورا کر دیا جاتا ہے اور اس
طرح احادیث کی تمام دوسری حیثیتیں نظر انداز ہو جاتی ہیں۔ احادیث کو جب تک شرح قرآن کا درجہ
نہیں دیا جائے گا ان کی تعلیم کا صحیح فائدہ حاصل نہیں ہوگا فقہ آج تقلید محض ہے تعلیم کے آخری مرحلوں
میں حقیقی تفقہ پیدا کرنا ہمارے نصاب کا مطمح نظر ہونا چاہیے۔ اصول فقہ کا درس بالکل بے مقصد ہو گیا
ہے اس کو بے مقصد بنانا وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ عقاید و کلام میں مختلف اسباب و
حوال کی بناء پر عجیب و غریب عقائد اور دودرازا کار نظری مباحث شامل ہو گئے ہیں۔ جو ممکن ہے کبھی
مفید اور ضروری ہوں مگر آج ان کی وجہ سے اسلامی عقاید کی سادگی چھپ جاتی ہے اور اس زمانے
کے ذہن کے لئے طابعت بخش ہونے کے بجائے الجھنوں کا باعث ہیں۔ دینیات کے لئے جدید نصاب
پر غور کرتے وقت ان سب باتوں پر نظر رکھنے کی ضرورت ہے تاکہ ہمارا نصاب اسلامی رجحانات سے
مناسبت رکھنے کے ساتھ ساتھ جدید ماحول کی ضرورتوں کو بھی پورا کر سکے۔

دوسرے فنون کی تعلیم میں تاریخی پس منظر کے طور پر ان خدمتوں کو جو مسلمانوں نے انجام دی
ہیں نمایاں کرنا اس لئے بھی ضروری ہے کہ مغربی تاریخ معلوم میں جو خلا ہے بھر جائے اور اس لئے بھی کہ ہمارا
موجودہ تعلیم اپنے ماضی کے ساتھ مربوط ہے اس طرح نہ ہم اپنے اسلاف سے بیگانے رہیں گے اور نہ
ہماری ملی وحدت زمانوں اور عصور سے پارہ پارہ ہوگی۔

ہمارے مدارس میں ابتدا سے بعض ایسے مضامین درس میں شامل ہیں جو ابتدائی موصفت میں بالکل

بے کار ہیں اور ان میں طلبہ کی قوت بے جا صرف ہوتی ہے ایسے مضامین کو ابتدائی مراحل سے خارج کر دینا بہتر ہے۔ ان کا درس بشرط ضرورت صحیح موقعوں پر ہونا چاہئے۔ معانی، بیان، اصول فقہ، منطق اور فلسفہ اسی قسم کے مضامین ہیں نہ صرف دشوار ابتدائی مرحلے کے لازم مضامین ہیں مگر ان کی مجرد حیثیت میں تعلیم طلبہ پر غیر ضروری بار ہے۔ ان کی تعلیم زبان کے ضمن میں ہونی چاہئے یوں طلبہ دلچسپی بھی محسوس کریں گے اور زبان کے ساتھ قواعد کی مشق بھی ہو جائے گی۔

زیر درس مضامین میں اصل اہمیت علوم کو دینی چاہئے نہ کہ کتابوں کو۔ کتابوں کی حیثیت ان یادداشتوں سے زیادہ نہیں جن میں اساتذہ اور طلبہ کی سہولت کے لئے متعین معیاروں کے تحت علمی مواد جمع کر دیا گیا ہے۔ بغیر خاص ضرورت کے کتاب کو موضوع درس بنانا تعلیم کو ناقص بنانے کے مترادف ہے۔

تعلیم میں اس کی خاص طور پر نگرانی کی ضرورت ہے کہ تعلیم کا موضوع طالب علم رہے تعلیم میں اس کی ضرورتوں، دلچسپیوں اور مناسبتوں کا خیال رکھا جائے اس کی ذہنی الجھنوں اور کشمکشوں کو سمجھنے کی کوشش کی جائے اور ان کو حل کرنے اور دور کرنے پر توجہ صرف کی جائے تعلیم کا فائدہ طالب علم کے انفرادی اور اجتماعی رجحانوں کو سدھار کر اس کو سماج کے لئے زیادہ سے زیادہ مفید اور بکار آمد بنانا ہے نہ کہ اس کو علوم کی کال کوٹھری بنانا اسی ضمن میں یہ بھی ضروری ہے کہ طلبہ میں تعمیری نقد کی حوصلہ افزائی کی جائے اس طرح نہ صرف یہ کہ اس کی تخریبی قوتوں کی اصلاح ہوگی بلکہ اس کی داخلی الجھنوں کی بھی تسکین ہوتی رہے گی اور دماغی اوج میں رہتی بھی۔

اس سلسلے کی آخری گزارش مدارس کے ارباب انتظام سے یہ کرنی ہے کہ اگر ہندستان کے محکمہ تعلیم کے منظور کئے ہوئے مراحل اور ان کے بنائے ہوئے نصابوں کو معیار بنا کر ضروری حذف و اثبات سے ان میں دینیات کو جذب کر دیا جائے اور میرا یہ تجربہ ہے کہ یہ کچھ زیادہ دشوار نہیں تو بہت سی کاغذوں سے نجات مل جائے گی اور ہمارا نصاب خود بخود زمانے کے ساتھ چلنے لگے گا، اساتذہ کا مناسب انتخاب تعلیم اور طرز تعلیم کی نگرانی طلبہ میں اسلامی روح پیدا کرنے میں معاون ثابت ہوں گے۔

ابتدائی مراحل میں اساتذہ کی تھوڑی سی توجہ سے عربی اور دینیات کو ایک دوسرے میں جڑا
 کیا جاسکتا ہے ابتدائی مراحل میں عربی کو لازم کرنے کا مقصد طلبہ کو ابتدا سے ہی ایسا ذریعہ فراہم کر دینا ہے
 جسے وہ دینیات کے ماخذوں سے براہ راست اور بقدر استعداد فائدہ اٹھا سکیں۔ اگر قرآن حدیث اور
 فقہ و عقاید سے الفاظ فقروں، جملوں اور عبارتوں کا انتخاب کر کے عربی کی تعلیم دی جائے تو یہ فائدہ بدرجہ اتم
 حاصل ہو جائے گا اور زبان کے اعتبار سے بھی عربی اتنی ہو جائے کہ آئندہ مراحل میں ادبی عربی کے
 لئے درجات کا کام دے۔

آخر میں مجھے ایسے تمام بزرگوں اور رفیقوں سے جن کو میری مفروضات سے دکھ پہنچا ہوا انہوں
 نے سوء ادب محسوس کیا ہو میں معافی چاہتے ہوئے عرض کروں گا کہ میری نیت جو دکھ دینا ہے اور نہ
 سوء ادب کا ارتکاب ”ان اس یلدا الا اصلاح ما استطعت وما توفیقی الا باللہ“

تفسیر منظر ہری

(تمام عربی مدرسوں کے کتب خانوں و عربی جانوروں کے لئے پیشکش)

ارباب علم کو معلوم ہے کہ حضرت قاضی ثناء اللہ بانی پتی کی یہ عظیم المرتبہ تفسیر مختلف خصوصیتوں کے
 اعتبار سے اپنی نظیر نہیں رکھتی لیکن اب تک اس کی حیثیت ایک گویا ناباب کی تھی اور ملک میں اس
 کا ایک قلمی نسخہ بھی دستیاب ہونا دشوار تھا۔

الحمد للہ۔ سالہا سال کی عرق ریز کوششوں کے بعد ہم آج اس قابل ہیں کہ اس عظیم الشان
 تفسیر کے شائع ہونے کا اعلان کر سکیں اب تک اس کی حسب ذیل جلدیں طبع ہو چکی ہیں جو کاغذ اور
 دیگر سامان طباعت و کتابت کی گرانی کی وجہ سے بہت محدود مقدار میں بھی ہیں۔ آخری جلد زیر کتابت ہے
 یہ غیر جلد اول تقطع ۲۹×۲۲ سائٹ روپے جلد ثانی سائٹ روپے جلد ثالث آٹھ روپے
 رابع بائیس روپے خامس سات روپے سادس آٹھ روپے سابع آٹھ روپے ثامن آٹھ روپے

حالاتِ حاضرہ

مسٹر آئزن ہاؤ کے اعلان کے بعد چین کا مستقبل

از

(جناب اسرار احمد صاحب آزاد)

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے سابق صدر مسٹر ٹرومین نے ارض چین پر مارشل چیاٹنگ کا ٹشک کی کامل شکست کے بعد ۲۷ جون ۱۹۵۲ء کو یہ اعلان کیا تھا کہ ————— میں نے ساتویں امریکی بحریہ کو فارموسا پر کئے جانے والے ہر حملہ کو رد کرنے کا حکم دے دیا ہے ————— لیکن امریکہ کے نئے صدر مسٹر آئزن ہاؤ نے ۲ فروری ۱۹۵۳ء کو ساتویں امریکی بحریہ کے متعلق جو اہم اعلان کیا ہے وہ یہ ہے کہ ————— میں یہ ہدایات جاری کر رہا ہوں کہ آئندہ ساتواں امریکی بحریہ کیونسٹ چین کی حفاظت نہیں کرے گا۔ ان ہر دو اعلانات کے الفاظ میں جو تضاد موجود ہے اس کی وضاحت کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی لیکن ان اعلانات میں مقصد کی جو یکسانیت معنر ہے اسے ضرور سمجھ لینا چاہئے۔ ۱۹۵۲ء کے وسط میں چیاٹنگ کا ٹشک اور ان کے ساتھیوں نے ارض چین سے فرار ہو کر فارموسا میں پناہ لی تھی اور اگر اس وقت چین کی عوامی حکومت فارموسا پر پورش کر سکتی تو چیاٹنگ کا ٹشک اور ان کے ساتھیوں

. کے لئے اس جزیرہ کی زمین بھی تنگ ہو جاتی اس لئے ۱۹۵۲ء میں چیاٹنگ کا ٹشک اور عوامی چین کے ہر تضادم کو رد کرنا ضروری تھا لیکن آج ۱۹۵۳ء میں جب صدر ٹرومین کے اعلان پر دو سال اور آٹھ ماہ کی مدت گزر چکی ہے اور غالباً چیاٹنگ کا ٹشک ان کے ساتھی اور ان کے حامی خود کو ارض چین پر حملہ کرنے کے قابل سمجھ رہے ہیں اس بات کی ضرورت باقی نہیں رہی کہ ساتواں امریکی بحریہ عوامی چین کو فارموسا پر اور فارموسا کو عوامی چین پر حملہ کرنے کی راہ میں حائل رہے۔

ارض چین میں عوامی حکومت کو قائم ہونے میں سال کی مدت گزر چکی ہے اور اس قلیل سی مدت میں چین کے عوام نے زندگی کے تقریباً تمام شعبوں میں جو قابل ذکر ترقی کی ہے دنیا کی کوئی قوم اس سے انکار نہیں کر سکتی اس کے باوجود امریکہ نے آج تک چین کی عوامی حکومت کو ملک کی جائز اور نامزدہ حکومت تسلیم نہیں کیا اور آج امریکہ کے نئے صدر زیادہ عزم اور استقلال کے ساتھ چین کی عوامی حکومت کی مخالفت پر آمادہ نظر آتے ہیں اور یہی وہ بات ہے جو دنیا کے ہر سمجھ دار انسان کو یہ سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ امریکہ کو عوامی چین کے ساتھ یہ نفرت اور شکست خوردہ چیلانگ کائی شک کے ساتھ وہ دانشگری کیوں ہے جس نے مشرق بعید کے سیاسی اور اقتصادی مسائل کو پیچیدہ تر بنا رکھا ہے اور جس کی بدولت کسی وقت بھی امن عالم تباہ اور برباد ہو سکتا ہے۔

یہاں چین میں مغربی سرمایہ دار نوآبادیات خواہوں کی سازشوں کی طویل تاریخ بیان کرنے کی ضرورت نہیں لیکن آج اس ملبوس صدی کے وسط میں جسے عوام کی صدی کہا جاتا ہے تمام جنوبی مشرقی ایشیا اور خصوصاً چین کے متعلق امریکہ کے برسر اقتدار سرمایہ دار طبقوں کا جو نظریہ رہا ہے کم از کم اسے بیان کئے بغیر مذکورہ بالا سوال کا جواب نہیں دیا جاسکتا۔ اور اس سلسلہ میں صرف انہیں باتوں کو مد نظر رکھنا کافی ہوگا جو دوسری عالم گیر جنگ کے بعد رونما ہوئی رہی ہیں۔

۱۹۴۷ء میں مشرقی دور آئنگ نے جو اس زمانہ میں امریکہ کے ایوان نمائندگان کی اس مجلس کے چیرمین تھے جو بحری امور سے متعلق ہوتی ہے کہا تھا کہ ————— بحر الکاہل ہمارا سمندر ہے ————— جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ————— امریکہ بحر الکاہل کے کناروں پر واقع دوسرے ملکوں مثلاً سوڈیت، یونین، چین، جاپان اور آسٹریلیا وغیرہ کے مفادات کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ لیکن مسٹر آئنگ کے مذکورہ بالا الفاظ کے پس پردہ امریکہ کے کیا مقاصد کار فرما رہے ہیں؟ انہیں اخبار "نیشنل ٹائمز" ۲۶ مارچ ۱۹۴۷ء میں شائع شدہ ایک مقالہ میں ایک امریکی مقلد نگار نے اس طرح بیان کیا ہے ————— امریکی کارخانہ دار تاجر ہندوستان اور مشرق بعید کے وسیع بازاروں پر قابو حاصل کرنا چاہتے ہیں اور ان میں مقدم ترین بازار چین ہے ————— اور چونکہ اس قسم کے بازاروں کے حصول اور

ان کی حفاظت کے لئے فوجی قوت کی نمائش ضروری ہوتی ہے اس لئے اسی سال ”آئزک کیٹی“ نے سبرالکاہل اور بھراؤ قیانوس میں ۲۷ بھری مستقر حاصل اور قائم کرنے کی سفارش بھی کی تھی۔

مسٹر آرتھر کلیگ نے اپنی کتاب ”نیا چین۔ نئی دنیا“ میں لکھا ہے کہ ————— دوسری عالم گیر جنگ کے زمانہ میں امریکی تاجروں کا منافع چھ ہزار ملین ڈالر سے بڑھ کر ۲۳ ہزار ملین ڈالر تک پہنچ گیا تھا۔۔۔۔۔ اور امریکی رہنماؤں کے سامنے سب سے اہم سوال یہ تھا کہ اس کثیر منافع کو کس طرح قائم رکھا جائے۔۔۔۔۔ اور اس سوال کو حل کرنے کے لئے امریکہ کے محکمہ خارجہ نے ”اقتصادی امور“ سے متعلق جو شعبہ قائم کیا تھا اس کے صدر اور محکمہ اقتصادیات کے انڈر سیکریٹری مسٹر کلیٹن نے ۱۱ نومبر ۱۹۴۶ء کو ایک تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ————— ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں بہت سی اہم اشیاء تیار کرنے کی اہمیت ہے اور بعض حالات میں ہماری تیار کردہ اشیاء باقی ماندہ دنیا کی تیار کردہ ایسی اشیاء سے بہت زیادہ ہوتی ہیں اور اگر ہمارے کارخانے باقاعدگی کے ساتھ کام کرتے رہیں تو ہماری تیار کردہ اشیاء بیچ رہتی ہیں جس سے ہمیں نقصان ہوتا ہے اس لئے ہمیں تمام دنیا کے ساتھ تجارتی تعلقات قائم کرنا چاہئیں، ہمیں بازار، بڑے بڑے بازار درکار ہیں۔۔۔۔۔ مسٹر کلیٹن نے مذکورہ بالا الفاظ میں جو کچھ کہا وہ اپنی جگہ قابل اعتراض نہیں لیکن یہ محض تمہید ہے ورنہ ان کے اس بیان کا حقیقی مقصد انھیں کے الفاظ میں ہے کہ ————— کارخانوں کی کثرت اور توسیع کی بدولت ہمیں دوسرے ممالک سے خام اشیاء حاصل کرنے کی بے حد ضرورت ہے اور چونکہ ہمارے کارخانوں کی زندگی اور ترقی کا مددافہام معدنیات اور دوسری خام اشیاء کی درآمد پر ہے اس لئے ہم جن ممالک سے یہ خام اشیاء حاصل کرنے میں ان کے مستقبل کا مسئلہ ہمارے لئے ایک ایسے مسئلہ کی حیثیت رکھتا ہے جسے قومی اہمیت حاصل ہو۔ جیسا کہ مسطور بالا میں عرض کیا جا چکا ہے۔ امریکہ کے سرمایہ دار تاجر خام اشیاء کے حصول اور تیار شدہ مال کی فروخت کے سلسلہ میں چین کو خصوصی اہمیت دیتے رہے ہیں اس لئے نومبر ۱۹۴۶ء میں چینگ کائی شک کی حکومت اور امریکہ کے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا اس کی رو سے امریکی قیدیوں کو چین میں کسی پابندی کے بغیر سفر کرنے، رہنے اور تجارت کرنے کے حقوق حاصل ہو گئے تھے امریکی تجارتی

سطور بالا میں، میں نے محض یہ بات ثابت کی ہے چیانگ کانگ کا شک کے ساتھ امریکی سٹریٹجی کی حدود کی پیمائش کے لئے ضروری درجہ بندی کے ساتھ۔

کی حدود کی پیمائش کے لئے ضروری درجہ بندی کے ساتھ۔

ترجمین سوال حل نہیں ہو جاتا کہ۔۔۔۔۔ اگر چیانگ کانگ کا شک کی الواج نے ارض چین پر حملہ کر دیا اور اس حملہ میں امریکہ نے چیانگ کانگ کی امداد بھی کی تو کیا ارض چین پر چیانگ کانگ کا قبضہ نہیں ہو سکتا؟ اور اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لئے سب سے پہلے ہمیں اس قرطاس ابھین (روہانٹ پیپر) پر ایک لنڈر ڈال لینا چاہئے جو چیانگ کانگ کا شک کی شکست کے بعد ۱۹۴۹ء کے اواخر میں بیاست ہائے متحدہ امریکہ کی طرف سے شائع کیا گیا تھا۔

اس قرطاس میں بعض کے پیش لفظ میں متحدہ امریکہ کے سابق ناظم امور خارجہ مشروٹین ایچسین نے لکھا تھا کہ ————— جاپان کی شکست کے بعد سے متحدہ امریکہ کی حکومت نیشنلسٹ چین کو امداد اور قرض کی صورت میں جو رقم دیتی رہی ہے وہ تقریباً دو ملین ڈالر تک پہنچی ہے یہ رقم نیشنلسٹ چین کے ممبرانہ کی نصف رقم سے زیادہ ہے اور جنگ کے بعد سے امریکہ نے مغربی یورپ کے کسی ملک کو اس قدر مالی امداد نہیں بہم پہنچائی اس امداد کے علاوہ امریکہ نے چین کو تقریباً ایک ملین ڈالر سے زیادہ قیمت کا جنگی سامان اور شہری ضرورتوں میں کام آنے والی اشیاء بھی دی ہیں اور ان کی قیمت کے طور پر محض ۲۳۲ ملین ڈالر وصول کرنے کا مقصد کیا گیا ہے۔ ————— امریکہ نے چین کی خانہ جنگی کے آخری دور میں

چیانگ کائی شک کو جو قابل ذکر امدادی تھی اس کا اعتراف کرنے کے بعد اسی قسط میں اس بات کا اقرار بھی کیا تھا کہ ————— چیانگ کا زوال چین میں ان کی شدید ترین اندرونی مخالفت کا نتیجہ تھا اور چین کے اندرونی حالات نے جو رخ اختیار کیا تھا امریکہ کے لئے اس پر قابو حاصل کرنا ناممکن تھا۔ اور چین میں موجود امریکی فوجی مبصرین کی بھی یہی یادداشتیں اس بات پر گواہ ہیں کہ ۱۹۴۷ء میں نیشنلسٹ چین کی فوجوں کو کسی ایک مقابلہ میں بھی سامان جنگ کی قلت کے باعث شکست نہیں ہوئی — اس کے بعد سترہویں سن کسی قدر تامل کے ساتھ اس بات کو بھی تسلیم کر لیا تھا کہ ————— امریکہ خواہ کتنی ہی امداد کیوں نہ دیتا لیکن چیانگ کائی شک کی شکست کو روکنا ممکن نہیں تھا۔ ————— اور مذکورہ بالا اقتباسات سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اگر امریکہ کی مالی اور عسکری امداد ۱۹۴۹ء میں ارض چین پر چیانگ کائی شک کی حکومت کو بچال اور برقرار نہیں رکھ سکی تو وہی امداد آج چیانگ کائی شک کو ارض چین پر کس طرح مسلط کر سکتی ہے ؟

یہ بات ظاہر ہے کہ آج سے چند سال قبل پورے چین پر چیانگ کائی شک کی حکومت قائم تھی اور ان کی حکومت کے خلاف چینی عوام ہی کی سرفروشانہ جدوجہد نے انھیں ارض چین سے فرار ہونے اور فارموسا میں پناہ لینے پر مجبور کیا تھا اس لئے یہاں قدرتی طور پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ————— کیا آج وہ حالات بدل گئے ہیں جن کی بدولت چیانگ کائی شک کو ارض چین سے فرار ہونا پڑا تھا اور کیا آج چین کے عوام چیانگ کائی شک کی حکومت کا خیر مقدم کرنے کے لئے آمادہ ہیں ؟

چین کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ڈاکٹر سن بت سین کے انتقال کے بعد ارض چین کا واحد رہنما چیانگ کائی شک ہی کو تصور کیا جانا تھا اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ دوسری عالم گیر جنگ کے آغاز سے قبل چین کے کمیونسٹ بھی اس سے منکر نہیں تھے اور جیسا کہ ایڈگر اسنو نے اپنی قابل قدر کتاب ریڈ اسٹار اور چائنا میں لکھا ہے ————— چین کے جنرل مارشل کے حکم سے چیانگ کائی شک کی گرفتاری کے بعد کمیونسٹوں نے انھیں محض اس بنا پر رہا کر لیا تھا کہ وہ ان کی ذات کو چین کے قومی اتحاد کا مرکز تصور کرتے تھے ————— لیکن جنگ کے بعد جب چین میں از سر نو خانہ جنگی شروع

ہوئی تو چین کے عوام آہستہ آہستہ اس نتیجے پر پہنچنے لگے ان کے لئے چیانگ کائی شک کی حکومت مفید نہیں ہو سکتی اور اسی لئے نیشنلسٹ فوجوں کو نہ صرف شکست ہی ہوئی گئی بلکہ نیشنلسٹ چین کے لاکھوں سپاہی چین کی عوامی فوج کے ساتھ شامل بھی ہوتے گئے پھر چین کا جس قدر علاقہ چیانگ کائی شک کی گرفت سے آزاد ہوتا رہا چونکہ وہاں کے عوام کی حالت بھی روز بروز بہتر ہوتی گئی اس لئے عوامی فوج اور نئی حکومت دونوں کی قوت و طاقت بڑھتی گئی اور آج جب ارض چین بالکل آزاد ہے اور چین کی عوامی حکومت کو عوام کی حالت بہتر بنانے کے زیادہ مواقع حاصل ہیں وہاں کے حالات کو قدرتی طور پر چیانگ کائی شک کے موافق نہیں بلکہ شدید زین مخالف ہونا چاہئے۔ اس سلسلہ میں صرف ایک بات اور سمجھ لینا چاہئے اور وہ یہ ہے کہ ارض چین پر چیانگ کائی شک کی شکست کے دو ہی اسباب ہو سکتے تھے اول یہ کہ عوام ان کے مخالف ہو گئے تھے اور اگر شکست کا بنیادی سبب اسی بات کو سمجھ لیا جائے تو جیسا کہ سطور بالا میں بتایا جا چکا ہے چین کے عوام اب ان کے موافق نہیں بن سکتے۔ اور دوسری وجہ چین کے کمیونسٹوں کی قوت کو قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس حال میں اول تو چین کے کمیونسٹوں کی قوت عوام ہی کی قوت کا دوسرا نام ہے لیکن اگر اس قوت کو عوام سے علیحدہ بھی فرض کر لیا جائے تو یہ بات بھی ماننا پڑے گی کہ چین کے کمیونسٹ اتنے طاقتور ہیں کہ وہ نہ صرف چیانگ کائی شک کی اس حکومت ہی کو شکست دے سکتے ہیں جس کی بفا کے لئے امریکہ ایسا طاقتور ملک ہر ممکن مدد دیتا رہا ہے بلکہ وہ چین کے ۴۴ کروڑ باشندوں کو ان کی مرضی کے خلاف زندگی بسر کرنے پر مجبور کر سکتے ہیں اور ظاہر ہے کہ چیانگ کائی شک ایک ایسی قوت کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ مختصر یہ کہ چیانگ کائی شک اور ان کے حامیوں کے لئے از سر نو ارض چین کی تسخیر اور اس پر تسلط ممکن نہیں اور اس قسم کی کوئی سعی موجودہ بین الاقوامی حالات کو بے حیدرہ تر تو ضرور بنا سکتی ہے لیکن اس کی بدولت چین کی عوامی حکومت کو تبدیل نہیں کیا جاسکتا۔

برنارڈ شا

مصنفہ ظ۔ انصاری

از

(جناب پروفیسر سید اعجاز حسین صاحب لکھنؤ یونیورسٹی)

برنارڈ شا انگریزی کے ان ادیبوں میں سے ہے جو اپنے ملک کی حدوں کو پار کر کے دوسرے ملکوں کے ادب اور ادیبوں کو متاثر کرتے ہیں، اس کی بے باکی، بلند حوصلگی، تیز نگاہی، زندگی کی توانا اور اعلیٰ قدروں سے محبت اور ادبیت نے تقریباً نصف صدی تک ذہنوں کو متاثر کیا اور آہ پرستوں اور اخلاق کے خود ساختہ مدعیوں کو جھنجھوڑا، اقتدار پرستوں کو کچھ کے لگائے اور ذہن د فکر کے لئے نئے دروازے کھولے۔ اردو جاننے والوں کی بد قسمتی ہوگی اگر وہ برنارڈ شا کی عظمت سے واقف نہ ہوں۔

ڈاکٹر عابد حسین اور پروفیسر آل احمد سرور کے پرمغز اور دلکش مضامین کے سوا ابھی تک کسی نے برنارڈ شا کے متعلق اردو میں کوئی قابل ذکر چیز نہیں لکھی، اس سلسلہ میں ظ۔ انصاری کی نئی تصنیف برنارڈ شا ایک اہم فرض انجام دیتی ہے۔ اس میں برنارڈ شا کی زندگی بھی ہے اس کا ماحول بھی اس میں اس کے ذہنی ارتقا کی تصویر بھی ہے اور اس کے افکار و خیالات کی تنقید بھی اور یہ سب کچھ دلکش ادبی زبان میں لکھا گیا ہے۔

انگریزی میں برنارڈ شا پر نہ جانے کتنا لکھا گیا ہے، خود برنارڈ شا نے اپنے متعلق اتنا لکھا ہے کہ اسی سے اس کی تصویر بنائی جاسکتی ہے لیکن ظ۔ انصاری نے ایک دیانت دار نقاد کی طرح نہ تو صرف اس کے اقوال پر اعتماد کیا ہے اور نہ دوسروں کے مخالف اور متضاد خیالات پر، بلکہ اس کے ذہنی پس منظر کا تجزیہ کر کے خود اس کے خیالات کی تنقید کی ہے کہیں اسے سراہا ہے اور کہیں

300

فخ بجا، اسرارِ حج، ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب کی یہ کتاب فی الحقیقت اپنے
کاغذ بہت بڑھاپا پر لکھی گئی تھی۔ خیر مجدد باجی روئے، مجددِ ہند ہے،

ندوة المصنفین کی نئی کتاب
”سیران اور تعمیر سیرت“

اور علاج غضب، زندگی میں غم کیوں، قانونِ تجاویز اور تحریرِ سیرت، فقر سے کتنا ہے حس کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ، مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا۔

اور علاج غضب، زندگی میں غم
کنارے سے کسی قدر وقفت کر

اک بیت نامکمل ”حضرت غالب“

از

(رئیس المتغزلین جسگر مراد آبادی)

اے وہ کہ تری ذات گرامی بہ بہ رنگ
اے وہ کہ ہر اک نغمہ ترا نغمہ فطرت
اے وہ کہ ترے معجزہ جنبش لب سے
ہر پھول ترے باغ کا فردوس بہ دامن
اے وہ کہ تری فکر بہ ہر صنف و بہ ہر طرز
اقلیم سخن ہے ترے اعجاز نفس سے
اک گوشہ دامن میں ترے دجلہ و جھوں
تھے ملک سخن میں ترے ہم عصر نزاروں
عربی و نظیری و ظہوری و قفا فی
تو نے اسے گنجائش کو مین عطا کی
تو نظم میں بھی نثر میں بھی مجتہد العصر
قدت کی جو ہر از نو فطرت کی ہم آہنگ
اے وہ کہ ہر اک نقش ترا روش آزاد رنگ
اک جنت شاداب ہر اک غنچہ دل تنگ
ہر خار ترے دشت کا انگشت شفق رنگ
ہم شعلہ و ہم شبنم و ہم نکبت ہم رنگ
ہم نغمہ و ہم دشنہ و ہم نکبت ہم رنگ
اک موج نفس میں ترے رقصا جن رنگ
تہا مٹی تری ذات مگر صاحب اورنگ
کوئی ترا ہم سر نہ ترا کوئی ہم آہنگ
ہر چند بہت تھا ابھی دامن غل تنگ
لیکن وہ ہے معذور کہ جس کی ہر نظر تنگ

الحق کہ تری وسعت تنہیل کے آگے
صہرا کھٹ خاکستر و گلشن نفس رنگ

بیباک خاتون

کناٹ سپیس میں چند خواتین کو بے عیالی کا مظاہرہ کرتے دیکھ کر

(جناب سبیل شاہ بہا پوری)

یہ سماں جس کی خموشی نغمہ جنگ درباب یہ ہوا جس کے نفس سے منفعل روح گلاب
یہ فضا نے مرمی یہ منظر برق انتساب یہ تھلی گاہ جس میں حسن فطرت بے حجاب

بادلوں سے یوں برآمد ہو رہا ہے ماہتاب

جس طرح کوئی ریخ روشن سے سرکائے نقاب

نغمہ نغمہ بربطِ دل کا ہم آوازِ سرودش غنچہ غنچہ گلشنِ عالم کا مے خانہ بدوش
ذرہ ذرہ محفلِ ہستی کا آئینہ فردش زندگی ساکت مشیتِ دم بخودِ فطرِ خموش

کس قدر پر کیفیت منظر کیا سہانی رات ہے

اے جانبِ عروسِ زندگی کیا بات ہے

سامنے سے آرہی ہے کون اٹھلاتی ہوئی ناز فرماتی ہوئی سبلی سی لہراتی ہوئی
ہر قدم پر کعبہ دبت خانہ ٹھکراتی ہوئی گفتگوئے زیر لب سے نغمے برساتی ہوئی

ہر ادا میں اک ادا ہر ناز میں اک ناز ہے

یہ وہ فتنہ ہے کہ محشر بھی نظر انداز ہے

وہ تھلی جس کا پر تو پر تو جامِ شراب وہ تبسم جس کی شوخی شوخی عہدِ شباب
وہ نظر جس کے اثر میں بلبلیوں کا اضطراب وہ اثر جس کے جلو میں کاروانِ انقلاب

وہ تھلی وہ تبسم وہ جوانی وہ شباب

اور پھر اس پر قیامت یہ کہ بالکل بے حجاب

ریشمی ساری برہنہ سر جوانی کی اُننگ آفکھ میں مستی نظر میں کیفِ غمزوں میں ترنگ
خندہ گل جلوہ ماہِ مہیں حسنِ فرنگ مسلکِ شرم و حیا سے جنگِ بیباکِ جنگ

مسرانی لہلہاتی ہاتھ پھیلاتی ہوئی
 آرہی ہے مجمعِ عشاق میں گاتی ہوئی
 چٹکیاں لیتی ہوئی آنکھوں کو ٹسکاتی ہوئی
 پھبتیاں کستی ہوئی مردوں کو شرتی ہوئی
 دیدہ و دانستہ ہر اک شے کو ٹھکراتی ہوئی
 فرطِ مدہوشی سے خود بھی ٹھوکریں کھاتی ہوئی
 حسنِ کج رفتار کی خدمت میں نظریں باریاب

انقلاب اے انقلاب اے انقلاب

آہ اے عورت تری وہ پہلی سی غیرت کہاں
 گوہرِ مکدانہ وہ نعلِ گراں قیمت کہاں
 جس کو مریم چوم لے وہ دامنِ عصمت کہاں
 دامنِ عصمت نہیں تو پھر تری عزت کہاں
 اس کا کیا غم شان و شوکت چھین گئی دولت گئی
 ہاں اگر غیرت گئی تو پھر بڑی نعمت گئی

اے کہ تو ناواقفِ انجام ہے مدہوش ہے
 مجمعِ اغیار میں مصروفِ ناؤ نوش ہے
 یہ نظارہ کیا بناؤں کس قدر غمِ کوش ہے
 میری آنکھوں میں لہو ہے اور لہوئیں جوش ہے
 بھگ کو میں اس حال میں بیکوں نہیں ہرگز نہیں

دور ہو جا دور ہو اے سنتِ دنیا و دین

کشتہِ حرص و ہوا بیگانہ عزت ہے تو
 بے حیا بے شرم بد اخلاق بد فطرت ہے تو
 اک سیہ کاری بہر پہلو بہر صورت ہے تو
 صنفِ نازک کے لئے اک مستقل نصیب ہے تو
 بھگی بھگی سی جہیں یہ بھگی بھگی سی نظر
 ڈوب کرنا ہی مناسب ہے تجھے جاؤ بمر

آہ اے سبیل یہ حال شہ جہاں آباد ہے
 دیکھ کر جس کو مرا دل مائل فریاد ہے
 خوفِ عقیقی ہے نہ فکرِ عالم ایجاد ہے
 کیا کہا عورت جہاں ہے فطرتاً آزاد ہے
 ہے مگر یوں دامنِ عصمت لٹلے کو نہیں

برق بن کر پارکوں میں جگمگانے کو نہیں

شعور علیہ

سورج کی توانائی چاند پر | پچھلے نمبر میں جو کیفیت درج کی گئی ہے وہ زمین پر سورج کی توانائی سے متعلق تھی لیکن جس شخص نے ۱۹۱۱ء میں یہ پیش گوئی کی تھی کہ دورناتی (Tele vision) اور راڈار (Radar) کی ایجاد ہونے والی ہے اس کو آج یہ خواب نظر آ رہا ہے کہ چاند پر ایسے اسٹیشن قائم کر دئے جائیں گے جہاں مشینیں سورج کی توانائی کو برق میں تبدیل کر دیں گی جس سے چاند کی دھاتیں چھلانی جاسکیں گی۔

وہ سوال کرتا ہے کہ برقیاتی کائنات (الکٹرونک یونیورس) سے ہم کو کیا فائدہ حاصل ہوگا؟ پھر

خود ہی جواب دیتا ہے کہ

ایک توبہ قیوں (الکٹروں) کے متعلق ہم کو نئی معلومات حاصل ہوں گی جس سے ہمارے علم میں اضافہ ہوگا۔ ہم کو یہ معلوم ہونا ہے کہ راست جوہر (ایٹم) سے ہم برقی اشعاع (الکٹریک ریڈیشن) حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ بات کبھی تجربہ خانے کی حد تک اسے سکین کل اسی کو تجارتی پیمانہ پر انجام دیا جاسکے گا۔ یہ آئندہ ہم سورج سے برقی توانائی حاصل کر سکیں گے ممکن ہے کہ زمین پر یہ کام کچھ عرصہ تک نہ انجام دیا جاسکے کیونکہ ہمارا کرہ ہوا اس میں مانع ہے۔ لیکن چاند پر ایسی کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ چونکہ چاند تک پہنچنے میں اب زیادہ رکت نہیں ہے اس لئے یہ یقینی ہے کہ ایسے آفتابی برقی اسٹیشن قائم کئے جائیں گے جن سے ہم کو اتنی طاقت حاصل ہو سکے گی کہ ہم چاند کی دھاتوں کو کام میں لاسکیں۔ اس سے ہم کو روشنی، حرارت اور دوسری چیزیں حاصل ہوں گی۔

لیکن وہ کہتا ہے کہ ہم کو سب سے زیادہ بھروسہ کوئی شعاعوں کا سمک ریز (پرہے) ہے۔ یہ شعاعیں ناقابل یقین حد تک طاقتور ہوتی ہیں۔ ان کے اندر اتنی زبردست توانائی موجود ہے کہ یہ نہ صرف سارے کرہ ہوا سے ہآسانی گزر جاتی ہیں بلکہ زمین کے اندر بھی بہت دور تک نفوذ کر جاتی ہیں۔ چنانچہ زمین کی

سطح سے ایک میل کی گہرائی پر بھی ان شعاعوں کا پتہ لگا ہے چونکہ ہمارے کرہ کی نہ ٹھک پہنچنے کے لئے ان شعاعوں کو تقریباً ۳ کھرب وولٹ کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان میں توانائی کا کتنا زبردست خزانہ پوشیدہ ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی یقینی ہے کہ یہ خزانہ ایک دن انسان کے کام میں آکر رہے گا۔ جب وہ دن آئے گا تو ہماری زندگی بالکل بدل جائے گی۔

سورج جو توانائی کا مرکز ہے اس سے بڑے زبردست پیمانے پر برقیے نکلتے ہیں جو زمین، چاند اور دیگر سیاروں پر برابر پڑتے رہتے ہیں۔

زمین پر جس شخص کا وزن ۵۰ پونڈ ہے اس کا وزن چاند پر صرف ۱۰ پونڈ ہوگا۔ جب سورج سے برق حاصل ہوگی تو چاند کے معدنیات کو کام میں لایا جاسکے گا۔ یہ دھاتیں تیار کر کے فضائی جہازوں، اسپیس شپ، میں روانہ کر دی جائیں گی زمین پر چونکہ سنجابی قوت کم ہے اسی لئے یہ جہاز نیرتے رہیں گے تا آنکہ زمین انھیں جذب کر لے گی۔ زمین کی معدنیات کے لئے چونکہ کھدائی زیادہ کرنی پڑتی ہے اس لئے چاند سے ان معدنیات کو حاصل کرنے میں زیادہ کفایت ہوگی۔ اب رہا یہ سوال کہ کتنی مدت میں یہ سب کچھ ہو سکے گا تو اندازہ کیا گیا ہے کہ ۱۰ تا ۲۰ برس میں یہ سب باتیں وقوع میں آجائیں گی۔

کالی روشنی | کچھ عرصہ کی بات ہے کہ چند سائنس دان اس کوشش میں تھے کہ بعض دھاتوں اور کیمیائی اشیاء کو جب برقا یا جانے تو وہ روشنی دینے لگیں۔ ان کے تجربوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ بعض اشیاء سے ایسی شعاعیں منعکس ہونے لگیں جو انسانی آنکھ کو نظر نہ آتی تھیں۔

ان شعاعوں کو بالا بنفشی شعاعوں (ULTRA VIOLET RAY) کا نام دیا گیا بعد میں ان ہی شعاعوں کا عرف ”کالی روشنی“ پڑ گیا۔ روشنی دراصل ایک ارتعاش کا نام ہے جو بہت فقیر ہوتے ہیں لیکن کالی روشنی کے ارتعاش اور بھی فقیر تھے اس لئے نظر ان کا ادراک نہ کر سکی۔

ان شعاعوں سے غذائی اشیاء کی اصلاح، صحت کی حفاظت وغیرہ کا کام لیا جا رہا ہے جس کے لئے مختلف طریقے کام میں لاتے جا رہے ہیں۔

تحقیق سے پتہ چلا کہ یہ کالی روشنی جب کسی شے پر ڈالی جاتی ہے تو اس کی صورت بدل جاتی ہے اور اس کے متعلق ایسی باتوں کا علم ہوتا ہے جو معمولی روشنی سے کبھی نہیں ہوتا۔

یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر شے پر ایسا مسالا لگا دیا جائے جو روشن ہو سکے تو کالی روشنی ڈالنے پر ان اشیاء سے دکھائی دینے والی روشنی نکلنے لگتی ہے۔

ان خاصیتوں سے فائدہ اٹھا کر کالی روشنی کو صنعت میں استعمال کیا جا رہا ہے اور ایسے میدانوں میں اس سے کام لیا جا رہا ہے جو ہماری زندگی کو متاثر کرتے ہیں۔

چنانچہ غذائی جاپخ کرنے والے ایک تجربہ خانے میں ان کالی شعاعوں کی بدولت معلوم ہوا کہ جس روغن کو خالص روغن زیتون بتلایا گیا اس میں روغن بنولہ موجود ہے۔ خالص روغن زیتون سے جو روشنی ان شعاعوں کے زیر اثر نکلتی ہے وہ سبزی مائل ہوتی ہے جب اس سے نیلی دمک خارج ہوتی تو معلوم ہوا کہ اس میں بنولہ کے تیل کی آمیزش ہے۔

ایک کمپنی نے ایک مرکب تیار کیا جس کے متعلق دعویٰ کیا گیا کہ اس میں حیاتین شامل ہیں لیکن اس کے ذائقہ کے متعلق شکایتیں وصول ہوئیں تو مرکب پر بالانفشتی شعاعیں ڈالی گئیں تو مرکب سے جو دمک نکلتا چاہئے تھی نہیں نکلی۔ اس سے معلوم ہوا کہ ترکیب میں خالی ہے لہذا اس کی اصلاح کی گئی اور اس طرح ہزاروں کے نقصان سے کمپنی بچ گئی۔

کپڑے کی صنعت میں بھی اس کالی روشنی سے فائدہ اٹھایا جا رہا ہے۔ ایک کمپنی نے اپنے تیار کردہ کپڑے کا امتحان کیمیائی طریقہ سے کرایا تو اس میں کوئی نقص نہیں نکلا لیکن جب کالی روشنی سے جاپخ کی گئی تو پتہ لگا کہ کپڑے کی رنگائی میں نقص رہ گیا ہے چنانچہ کپڑے کو دوبارہ رنگا گیا تو اس سے وہ نقص دور ہوا۔ اور کپڑے کی پائنداری میں اضافہ ہو گیا۔

تبصرے

پاکستان کے چند انگریزی اسلامی رسالے
جیسا کہ توقع تھی آج کل پاکستان میں اسلامی ثقافت

کے علاوہ انگریزی میں بھی مجلات و رسائل کی اشاعت کی بڑی گرم بازاری ہے اسلامی ثقافت کے احیاء اور اس کی تنظیم جدید کے مقصد کے پیش نظر نئی نئی سوسائٹیاں اور انجمنیں بن رہی ہیں اور اس مقصد کی تکمیل و اشاعت کی غرض سے اپنے اپنے آرگن نکال رہے ہیں آج ہم قارئین کرام سے ان میں سے بعض اہم مجلات کا تعارف کرتے ہیں۔

دی اسلامک لٹریچر | یہ غالباً پاکستان کا سب سے پہلا ماہنامہ ہے جو لاہور کے مشہور تاجروں
ناشر کتب جناب محمد اشرف صاحب کے زیر اہتمام و انتظام نکل رہا ہے
مضامین کم و بیش ڈیڑھ سو صفحات ہوتی ہے۔ گٹ اپ بہت خوبصورت اور جاذب نظر، ٹائپ
متوسط درجہ کا اور کاغذ اعلیٰ قسم کا مثیلاً دیتا ہے قیمت فی کاپی ایک روپیہ پتہ: شیخ محمد اشرف کشمیری
بازار لاہور

اس رسالہ میں عموماً بلند پایہ مضامین و مقالات ہوتے ہیں جو اسلامیات سے متعلق ہوتے ہیں
اس حیثیت سے ہم کو اسلامک کلچر حیدر آباد کا مثنیٰ کہہ سکتے ہیں اس رسالہ کی جنوری ۱۹۵۳ء کی اشاعت
صرف ایک ہی عنوان یعنی ”اسباب زوال امت“ پر دو مضمونوں کے لئے مخصوص کر دی گئی تھی یہ دو
مقالات علی الترتیب ہنگری میں بوڈاپسٹ یونیورسٹی کے پروفیسر عربی حاجی ڈاکٹر عبدالکریم اور پاکستان
کی ایک خاتون کے قلم سے ہیں دونوں مقالہ نگاروں نے اپنے اپنے نقطہ نظر کے ماتحت اسلامی تاریخ
و روایات اور اسلامی فلسفہ و سیاسیات کی روشنی میں مسلمانوں کے زوال و انحطاط کے اسباب کا جائزہ
لیا ہے اور ان کے مذاکر کی صورتوں کی طرف اشارہ کیا ہے قارئین کی سہولت کے لئے فاضل ڈو میٹر

نے شروع میں ہی دونوں مقالات کا خلاصہ دے دیا ہے اور اس پر اپنی رائے بھی ظاہر کر دی ہے۔ اگرچہ
وصوف کی طرح ہم کو بھی ان دونوں مقالات کے بعض اجزاء سے اتفاق نہیں ہے علی الخصوص ان اجزاء سے
واحادیث کی صحت و استناد سے یا اسلام میں عورتوں کی حیثیت۔ تعدد ازدواج یا تقدیر وغیرہ سے
سعلق میں تاہم اس میں شبہ نہیں کہ دونوں مقالات غور و فکر اور محنت و تلاش سے لکھے گئے ہیں اور اس
لحاظ سے اس قابل ہیں کہ ان کا مطالعہ کیا جائے۔ اسلامی تاریخ و فلسفہ کے ایک طالب علم کو غور و فکر کرنے
کے لئے ان میں کافی مواد مل سکتا ہے اس خاص نمبر کے علاوہ اسلامک لٹریچر کی ہر اشاعت بھی اس
لائق ہوتی ہے کہ اربابِ ذوق اس کا مطالعہ کریں اور اس سے فائدہ اٹھائیں۔

یقین | یہ دارالتصنیف لمیٹڈ کراچی کا پندرہ روزہ رسالہ ہے جس کے اب تک اکیس نمبر نکل چکے
ہیں اس کا مقصد اسلام کو قرآن و سنت کی روشنی میں پیش کرنا اور ناواقفوں کو اسلام کی
تعلیمات اور اس کے افکار سے واقف کرنا ہے۔ اب تک یقین کے چھ نمبر ہماری نظر سے گزرے ہیں
ان کے پیش نظر یہ بوثوق کہا جاسکتا ہے کہ رسالہ اپنے مقصد میں کامیاب ہے اور دوسرے مقالات
و مضامین کے علاوہ جو مختلف اربابِ قلم کے لکھے ہوئے ہوتے ہیں خود لائق اڈیٹر اور دوسرے ارکان
ادارت کے لکھے نوٹ اور افتتاحیے بھی دلچسپ مفید اور موثر ہوتے ہیں امید ہے کہ انگریزی داں اصحاب
اس کی توسیع اشاعت میں حصہ لے کر ثواب دارین حاصل کریں گے۔

مغربی پاکستان میں اس کی قیمت سالانہ چار روپیہ اور مشرقی بنگال میں بذریعہ ہوائی جہاز پانچ روپیہ

آٹھ آنہ۔ فی کاپی ۲ روپے :- دارالتصنیف لمیٹڈ کراچی

صوت اسلام | انگریزی میں اس کا نام **Muslim Voice** ہے۔ یہ ابھی حال میں کراچی سے
جناب محمد فضل الرحمن صاحب انصاری کی ادارت میں نکلنا شروع ہوا ہے

”مسلمانوں کی خاص تعلیمی مشکلات“ خاص طور پر مفید۔ پُر از معلومات اور ولولہ آفریں ہیں یہ ماہنامہ جمعیتہ انقلاب کا آرگن ہے اس بنا پر اس کی ہر اشاعت میں جمعیت کی سرگرمیوں اور اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے سلسلہ میں اس کی کوششوں کا بھی تذکرہ ہوتا ہے تعداد صفحات ۸۰ قیمت سالانہ دس روپیہ پاکستان میں اور سیردنی ملک میں ایک پونڈ دس شلنگ پتہ :- اے۔ ایم نمبر ۲۰ کراچی۔

ا تقطیع متوسط کتابت و طباعت بہتر۔ ضخامت ۲۳۰ صفحات قیمت تین روپیہ بازار آنہ
طبقات ناصری پتہ :- کتاب خانہ نورس۔ کبیر اسٹریٹ۔ اردو بازار لاہور

طبقات ناصری جو سلطان ناصر الدین محمود بن سلطان شمس الدین التمش کے عہد میں ۶۵۵ھ میں مولانا مسیح سراج کے قلم سے مکمل ہوئی تھی اسلامی ہند کے ابتدائی عہد کی مشہور و مستند تاریخی کتاب ہے جس میں اس سال تک کے عالم اسلام کے تمام اہم واقعات کا تذکرہ ہے یہ کتاب تینیس ۲۳ طبقات پر مشتمل ہے جن میں سے ہر طبقہ میں ہر حکمران خاندان کے حالات الگ الگ بیان کئے گئے ہیں یہ کتاب سب سے پہلی بار بنگال انشیاٹک سوسائٹی کلکتہ نے ۱۸۶۴ء میں شائع کی تھی لیکن ایک مدت سے یہ مطبوعہ نسخہ ناپید ہے اس بنا پر ہمارے فاضل دوست ڈاکٹر محمد عبداللہ جتانی نے اس کتاب کے پانچ طبقات جن کا تعلق ہند اور پاکستان کی تاریخ سے ہے ان کو آج کل کے طریقہ کے مطابق اوٹ کر کے شائع کیا ہے موصوف نے شروع میں ایک مختصر مقدمہ لکھا ہے جس میں مولانا مسیح سراج کے حالات ہیں اور آخر میں اعلام و املینہ کی فہرستیں دی ہیں اس کے علاوہ متن کتاب میں جا بجا حواشی کے ذریعہ مختلف الفاظ کی تصحیح یا تشریح کی ہے امید ہے کہ ارباب علم و ذوق اس کتاب کی قدر کر کے لائق مرتب کی محنت و سعی کی داد دیں گے۔

آہنگ از جناب مجاز۔ کتابت و طباعت اور کاغذ اعلیٰ ضخامت ۲۱۶ صفحات قیمت مچھلے، چار روپیہ آٹھ آنہ پتہ :- آزاد کتاب گھر کلاں محل۔ دہلی

جناب مجاز اردو کے ان ترقی پسند شاعروں میں ہیں جن کو پرانے جام میں بادۂ نو کو پیش کرنے کا بہت عمدہ سلیقہ ہے اور جن کا کلام ”ادب برائے زندگی“ کا منظر ہونے کے ساتھ ساتھ ”زندگی برائے ادب“ کا بھی ترجمان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام بزم اور رزم دونوں موقعوں پر پڑھا جاسکتا ہے

اور فردوس گوشتِ نغمہ اور طبلِ جنگ دونوں کا کام دے سکتا ہے۔ مجاز کی اصل فطرت میں محبت کی نیازمندی۔ عشق کا سوز و گداز اور الفت کی خود سپردگی پائی جاتی ہے لیکن جب ان کی نیازمندی کو غرورِ حسن سے ساقط پڑتا ہے تو یک بیک یہ نیازمندی ناز کی سرکشی میں تبدیل ہو جاتی ہے اور اب مجاز کی زبان سے میٹھے اور سریلے نغموں کے بجائے غمناک و غضب اور انتقام کی چنگاریاں برسنے لگتی ہیں یہی وہ وقت ہوتا ہے جب کہ وہ ایک انقلابی شاعر کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں بہر حال زیر تبصرہ کتاب جو مجاز کے کلام کا مجموعہ ہے اسی طرح کے نشیب و فراز اور آثارِ بگڑھاؤ سے پر ہے اور اس لائق ہے کہ اس کا مطالعہ کیا جائے اور اس سے لطف اٹھایا جائے۔ (س)

شانِ محفل تقطیع ۳۰ x ۲۰ صفحات ۱۲۸، کتابت طباعت متوسط قیمت مندرجہ دور و پیچے
 ”شانِ محفل“ منشی رگھوناتھ سنگھ ہاجر دہلوی کی غزلیات کا مجموعہ ہے جس کو ان کے لائق صاحبزادے جناب کویراج رگھندن سنگھ سآحر نے شائع کیا ہے، پیشِ لفظ اردو کے منہر و معروف محسن پنڈت برہمچوہن دتتا نے کئی نے تحریر فرمایا ہے اور دراصل یہ چیز سطور ہی اس ”گلدستہ غزلیات“ کی عمدگی کی ضمانت کے طور پر پیش کی جاسکتی ہیں۔

کئی صاحب نے ہاجر کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے

”ہاجر آج بہت پرانے آدمی نہیں ان کے انتقال کو قریباً تیس برس ہوئے ہوں گے مگر اس عرصے میں جو انقلابی اور مہندوستان کی معاشرت میں ہوئے اور جنہوں نے ادب اور شاعری کی کایا ہی پلٹ دی، انہیں سب جانتے ہیں ادب کی قدریں آج وہ نہیں جو ہمیں برس پہلے تھیں شاعری کا رنگ اب وہ نہیں ہے جہاں اسے دلخیز انداز میں نے چھوڑا تھا اس لئے ”شانِ محفل“ کو آج کل کی کسوٹی پر کسانفاذ کی بد مذاقی کا ثبوت ہو گا دیکھنا تو یہ ہے کہ جس کلچر کی جناب ہاجر پیداوار تھے اس کے معیار کو سامنے رکھ کر ان کے کلام کا درجہ کیا ہے، چنانچہ ایسا کیا جائے تو ”شانِ محفل“ کو بہت اونچی جگہ دینی ہوگی“

ہاجر کے کلام میں سلاست و شگفتگی، بندشوں کی چستی اور اسلوبِ بیان کی فصاحت، مختلف خوبیوں کے نمونے ملتے ہیں اور انہوں نے حسن و عشق، وصل و ہجر، شاد و شراب، گل و بلبل اور طاؤس

ریاب کی پرانی داستانوں کے جسم میں خونِ تازہ دوڑانے کی کوشش کی ہے،

عام اندازِ بیان ملاحظہ ہو

مجھ سے کیا پوچھتا ہے اے زاہد دیکھ لے تو بھی مے کشی کر کے
کوئی مجھ سا نہ پار سا ہوگا تو بہ کرتا ہوں مے کشی کر کے
کچھ سبب معلوم ہو تب تو کہوں پوچھتے ہیں لوگ کیوں مغموم ہے
بے وفاؤں سے وفا کرتے رہو عاشقی کا کیا یہی مفہوم ہے
آہ کیسی ہے راتِ فرقت کی جاگتا ہوں نصیب سوتا ہے
چھوڑ کر دل آپ جاتے ہیں کہاں یہ مکاں آباد رہنا چاہیے
ایک ایسے دور میں جب کہ ہندو مسلمانوں کے ملے جلے کلچر کی سب سے روشن اور نکھری
ہوئی نشانی کے مطلق پر فرقہ پرستی کے گند خنجر چلائے جا رہے ہیں اس طرح کے مہجوعوں کی اشاعت ہمارے
حنیال میں ملک کے مستقبل کے لئے فالِ نیک ہے۔ (ع)

فلسفہ کیا ہے؟

یہ ملک کے مشہور ناغل اور جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے شعبہ فلسفہ کے صدر ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب
ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی صدر شعبہ فلسفہ جامعہ عثمانیہ و رفیق اعزازی ندوۃ المصنفین کے قیمتی مقالات
کا مجموعہ ہے۔

ہنگل کا قول ہے کہ

”جس ہندو قوم کا فلسفہ نہیں ہوتا اس کی مثال ایک عبادت گاہ کی سی ہے جو ہر قسم کی زیب و زینت سے آراستہ

ہے مگر جس میں ”قدس الاقداس“ ہی کا وجود نہیں“

ڈاکٹر صاحب کے مقالات پڑھ کر آپ نہ صرف اپنے فلسفہ سے باخبر ہو جائیں گے بلکہ اپنے آپ
کو روزِ جانیت کے حسین حصین میں محفوظ پائیں گے۔ مقالات کے جذبے بڑے بڑے سرنامے ملاحظہ فرمائیے
قرآن اور فلسفہ، فلسفہ کیا ہے؟ ہم فلسفہ کیوں پڑھیں، فلسفہ کی دشواریاں۔ قیمت ۲۰/-، مجلد ۱

معص القرآن جلد چہارم حضرت عیسیٰ
بر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات اور
نعلہ واقعات کا بیان۔ دوسرا ایڈیشن جس میں
تم نبوت کے اہم اور ضروری باب کا اضافہ کیا گیا ہے۔
قیمت چھ روپے آٹھ آنے بے جلد سات روپے آٹھ آنے
اسلام کا اقتصادی نظام وقت کی اہم ترین
کتاب جس میں اسلام کے نظام اقتصادی کا مکمل نقشہ پیش
کیا گیا ہے جو تھا ایڈیشن قیمت پندرہ روپے
اسلام نظام مساجد قیمت پندرہ روپے
مسلمانوں کا عروج و زوال۔
جدید ایڈیشن۔ قیمت للعمم جلد ۱۴

لکھل لغات القرآن مع فہرست الفاظ
لغت قرآن پر بے مثل کتاب۔ جلد اول طبع دوم
قیمت للعمم جلد ۱۴

جلد ثانی قیمت للعمم جلد ۱۴

جلد ثالث قیمت للعمم جلد ۱۴

جلد رابع (زیر طبع)

مسلمانوں کا نظم و ملکت مصر کے مشہور مصنف

ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن کی محققانہ کتاب **النظم الاسلامیہ**

کا ترجمہ۔ قیمت للعمم جلد ۱۴

ہندوستان میں مسلمانوں کا

نظام تعلیم و تربیت

جلد اول۔ اپنے موضوع میں بالکل جدید کتاب

قیمت چار روپے للعمم جلد پانچ روپے ۱۴

جلد ثانی۔ قیمت چار روپے للعمم جلد پانچ روپے ۱۴

قرآن اور تصوف حقیقی اسلامی تصوف پر
محققانہ کتاب۔ قیمت ۱۴۔ جلد ۱۴

ترجمان السنہ جلد اول۔ ارشادات نبوی کا

بے مثل ذخیرہ۔ قیمت ۱۴۔ جلد ۱۴

ترجمان السنہ جلد دوم۔ اس جلد میں چھ سو کے

قریب مدشیں لگئی ہیں قیمت للعمم جلد ۱۴

تحفہ النظر یعنی خلاصہ سفرنامہ ابن بطوطہ

مع تنقید و تحقیق از مترجم و نقشبند سفر قیمت ۱۴

قرون وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات

قرون وسطیٰ کے حکماء اسلام کے شاندار علمی کارنامے

جلد اول۔ قیمت ۱۴۔ جلد ۱۴

جلد دوم قیمت ۱۴۔ جلد ۱۴

عرب اور اسلام۔

قیمت تین روپے آٹھ آنے بے جلد چار روپے آٹھ آنے للعمم

وحی الہی

مسئلہ وحی اور اس کے تمام گوشوں کے بیان پر پہلی

محققانہ کتاب جس میں اس مسئلہ پر اچھے دل پذیر

انداز میں بحث کی گئی ہے کہ وحی اور اس کی صداقت

کا ایمان افروز نقشہ آنکھوں کو روشن کرتا ہوا دل کی

گہرائیوں میں سما جاتا ہے۔

جدید ایڈیشن۔ قیمت ۱۴۔ جلد چار روپے

منہج زندگی مصنفین۔ اردو بازار جامع مسجد دہلی۔ ۴

مختصر قواعد ندوۃ المصنفین دہلی

۱۔ **محسن خاص** جو مخصوص حضرات کم سے کم پانچ سو روپیہ یکمشت مرحمت فرمائیں وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنین خاص کو اپنی شمولیت سے عزت بخشیں گے ایسے علم نواز اصحاب کی خدمت میں ادائے اور مکتبہ برہان کی تمام مطبوعات نذر کی جاتی رہیں گی اور کارکنان ادارہ ان کے قیمتی مشوروں سے مستفید ہوتے رہیں گے۔

۲۔ **محسنین** جو حضرات پچیس روپے مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنین میں شامل ہوں گے۔ ان کی جانب سے یہ خدمت معادضہ کے نقطہ نظر سے نہیں ہوگی بلکہ عطیہ خاص ہوگا۔ ادارے کی طرف سے ان حضرات کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات حق کی تعداد تین سے چار تک ہوتی ہے۔ نیز مکتبہ برہان کی بعض مطبوعات اور ادارہ کار سالہ "برہان" بلا کسی معادضہ کے پیش کیا جائیگا۔ جو حضرات اٹھارہ روپے پیشگی مرحمت فرمائیں گے ان کا شمار ندوۃ المصنفین کے حلقہ معاونین میں ہوگا۔ معادضہ میں ہونے والی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات ادارہ اور سالہ برہان جس کا سالانہ چندہ چھ روپے ہے) بلا قیمت پیش کیا جائے گا۔

۳۔ **اجتہاد** نذر روپے ادا کرنے والے اصحاب کا شمار ندوۃ المصنفین کے اجتہاد میں ہوگا۔ ان کو سالانہ بلا قیمت دیا جائے گا اور طلب کرنے پر سال کی تمام مطبوعات نصف قیمت پر دی جائیں گی۔ یہ حلقہ خاص طور پر علماء اور طلبہ کے لئے ہے۔

۴۔ **قواعد رسالہ برہان** (۱) برہان ہر انگریزی مہینے کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔ (۲) مذہبی، علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین اگر وہ زبان و ادب کے معیار پر پورے اتریں برہان میں شائع کئے جاتے ہیں۔ (۳) باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاک خانوں میں ضائع ہو جاتے ہیں جن صاحب کے پاس نہ پہنچے وہ زیادہ سے زیادہ ۲۵ تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیں۔ ان کی خدمت میں پرچہ دوبارہ بلا قیمت بھیجا جائے گا۔ اس کے بعد شکایت قابل اعتنا نہیں سمجھی جائے گی۔

(۴) جواب طلب امور کے لئے ۲۴ گھنٹے یا جوابی کارڈ بھیجنا چاہئے۔ خریداری نمبر کا حوالہ ضروری ہو۔ (۵) قیمت سالانہ چھ روپے۔ دوسرے ملکوں سے ساڑھے سات روپے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ۔ (۶) منی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھئے۔

مولوی محمد ادریس پرنٹر پبلشر نے جتید برقی پریس میں طبع کر اگر دفتر برہان جامع مسجد ہلی سے شائع کیا

ندوة اہلین دینی کا علمی و دینی مآہنامہ

برکات

مرتب
سعید احمد کسرا بادی

ندوة المصنفین کی دینی اور اجتماعی کتابیں

اسلام کا اقتصادی نظام

وقت کی ایک اہم انقلاب انگیز کتاب جس میں اسلام کے معاشی نظام کا جامع نقشہ پیش کیا گیا ہے جو تھا ایڈیشن۔ قیمت ۷۰۰، جلد ۱۰۰

اسلام کا نظام مساجد

نظام مساجد کے تمام گوشوں پر دل پذیر بحث اور اس کی منفعتوں اور برکتوں کی تفصیل۔ قیمت ۷۰۰، جلد ۱۰۰

اسلام میں غلامی کی حقیقت

مسئلہ غلامی کی تحقیق پر ندوة المصنفین کی معرکتہ الآراء کتاب جس میں افسردہ اور اجتماعی غلامی کے ایک ایک پہلو پر اسلام کا نقطہ نظر پیش کیا گیا ہے، قیمت ۷۰۰، جلد ۱۰۰

قرآن اور تعمیر سیرت

ایک عظیم الشان اصلاحی کتاب
قرآن مجید کی تعلیم و تربیت کا انسانی سیرت کی تعمیر میں کیا دخل ہے اور اس تعلیم کے ذریعہ اس سیرت و کردار کا کس طرح ظہور ہوتا ہے یہ تبرک کتاب خاص اسی موضوع پر لکھی گئی ہے۔ ایک ایسے وقت میں جب کہ مسلمان عام طور پر احساس بہتری کے اندھیروں میں پھنسے ہوئے ہیں یہ گراں اہم تالیف ان کے روحانی رشتے کو مضبوط کرنے میں چرب زار کا کام دے گی۔ قیمت ۷۰۰، جلد ۱۰۰

ارشادات نبوی کا لائٹانی ذخیرہ

اردو زبان میں

ترجمان السنہ :- ہماری زبان میں حدیثوں کی ایسی جامع اور مستند کتاب آج تک وجود میں نہیں آئی تھی اس میں وہی متن مع جواب بھی ہے اور صفات و سلیس ترجمہ بھی ساتھ ہی تحقیق تشریحی نوٹ بھی ہیں۔ ترتیب میں کتاب التوحید کو پہلے رکھا گیا ہے پھر اسے مناسبت سے پوری کتاب کی ترتیب قائم کی گئی ہے پہلی جلد کے شروع میں کئی توصفات کا ایک مقدمہ ہے

جلد اول قیمت ۷۰۰، جلد ۱۰۰
جلد دوم قیمت ۷۰۰، جلد ۱۰۰
فہم قرآن :- قرآن مجید کے آسان ہونے کے کیا معنی ہیں کلام ربانی کا قطعی نشانہ معلوم کرنے کے لئے آنحضرت کے ارشادات و اقوال کا معلوم کرنا کیوں ضروری ہے اس کتاب کا اہل موضوع بھی ہے ایک بہترین تبلیغی اور اصلاحی کتاب جو ہے

دعوی الہی :- مسئلہ دعوی کے تمام گوشوں پر دل پذیر بحث، دعوی کی حقیقت اور اس کی صداقت سمجھنے کے لئے اس کتاب کی قیمت ۷۰۰، جلد ۱۰۰

مختصر ندوة المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی

بُرْہان

شمارہ نمبر ۴

جلد نمبر ۳

اپریل ۱۹۵۳ء مطابق رجب المرجب ۱۳۷۲ھ

فہرست مضامین

۱۹۴	سعید احمد	نظرات
۱۹۷	حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی	کس لئے؟
۲۱۳	جناب انعام اللہ خاں صاحب ناصر ایڈیٹر روزنامہ الجمعیتہ دہلی	حکیم سنائی
۲۲۹	جناب پروفیسر عبد الماجد صاحب سابق اسٹنٹ ڈائریکٹر تعلیمات اسلامی بہاؤ	ہمارا عروج و زوال
۲۳۹	جناب ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب مدد شعبہ فلسفہ جامعہ عثمانیہ	التقریظ والانتقاد
		اقبال کی کہانی کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی
		ادبیات
۲۵۰	جناب آلم مظفر نگری	غزل
۲۵۱	م - ۱ - ع	شعرون علیہ
۲۵۲	(سب)	تبصرے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نَظَرَات

ہماری زبان اردو بھی کچھ عجیب تقدیر لے کر پیدا ہوئی ہے۔ کبھی بنتی ہے اور کبھی بگڑتی ہے۔ کہیں ڈوبتی اور کہیں ابھرتی ہے۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد اس پر ایک وقت آیا تھا جب کہ بہر سید احمد خاں مرحوم نے ریڈیکل کے نام سے عربی اور فارسی کی سرے سے تعلیم کی ہی مخالفت میں مضامین لکھے تھے اور مسلمانوں کی عام پستی و زبوں حالی کا سبب اسی طرز قدیم کی تعلیم کو قرار دیا تھا۔ اسی زمانہ میں موصوف کے بعض رفقا کو اُچھ سو بھی تو انھوں نے اردو کے خلاف آواز اٹھائی اور مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ اس زبان کو ترک کر کے یورپ کی کسی زبان خصوصاً انگریزی کو اپنی زبان بنالیا جائے اور پھر طبع یہ ہے کہ ڈاکٹر مرزا محمد ہادی لکھنوی کے بقول یہ مشیر مستفینہ انگریزی کی ابجد سے واقف تھے اور نہ کسی اور یورپین زبان سے یہی وہ دور تھا جب کہ ایک طرف قدیم تعلیم یافتہ طبقہ فارسی اور عربی میں خط و کتابت کرنے کے بجائے اردو کو شایانہ اعتنا نہیں سمجھتا تھا اور دوسری جانب جدید تعلیم کے لوگ انگریزی چھوڑ کر اردو میں گفتگو کرنے کو اپنے لئے تنگ دے جانے لگے تھے لیکن اردو نے بڑی سخت جانی کے ساتھ ان حوادث و آفات کا مقابلہ کیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو جو پہلے محض شعرو شاعری اور افسانہ و داستان سرائی کی زبان تھی زتی کرتے کرتے ایک نہایت وسیع - موثر - ہمہ گیر اور علمی زبان بن گئی۔

ایک انقلاب عظیم کے طوفان سے کامیابی کے ساتھ گزر جانے کے بعد آج پھر اس زبان پر ایک نازک دور آیا ہے جب کہ وہ اپنے دیس میں پردیسی اور اپنے وطن میں بے وطن ہو گئی ہے اس کے بعد توقع تھی کہ اسلام کے نام پر ایک اسٹیٹ بنی ہے وہاں اس کو پنپنے - ابھرنے اور زتی کرنے کی سہولتیں ملیں گی اور اس طرح اس کو جو جوٹ یہاں لگی ہے اس کی تلافی دوسری جگہ ہو جائے گی لیکن رمیزی کے بقول وہاں بھی اس کا حال ”بہر زمین کہ رسیدم آسمان پیدا است“ کا مصداق بنا ہوا ہے اور اب تک اسے وہاں دلجمعی کے ساتھ بیٹھنا اور جہنا نصیب نہیں ہوا ہے اس ریاست کے ایک حصہ میں جو اس کا مشرقی بازو ہے وہاں تو اس زبان کی مخالفت کا یہ جوش و خروش ہے کہ اس کا نام سننا تک بھی طبع نازک پڑے رہ گیا اس ریاست کا دوسرا حصہ جو مغربی پاکستان کہلاتا ہے اور جو پہلے

حصہ کی بہ نسبت زیادہ ترقی یافتہ۔ ہندو اور شائستہ ہے وہاں ایک طبقہ ایسا پیدا ہو گیا یا پہلے سے موجود ہے جو ریاستی معاملات میں ٹرکی کے نقش قدم پر چلنے کو ریاست کی ترقی کے لئے ضروری اور لازمی یقین کرتا ہے اس طبقہ کا قبضہ مقصود ٹرکی یا مشرق وسطیٰ کی بعض اور مسلمان حکومتیں ہیں۔ اس بناء پر اس طبقہ کا خیال ہے کہ پاکستان کی بھلائی اسی میں ہے کہ مغربی تہذیب و تمدن کو اختیار کر لیا جائے اور اردو کے بجائے انگریزی کو ہی ریاستی زبان کی حیثیت سے تسلیم کر لیا جائے۔

اسی سلسلہ میں ہمارے فاضل اور عزیز دوست لفٹنٹ کرنل خواجہ عبدالرشید صاحب جن سے قارئین برہان اچھی طرح واقف ہیں ۱۸ مارچ کے سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور میں موصوف کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کا سب سے بڑا عنوان ہی یہ ہے کہ ”مسلمانوں کی بستی کا سبب اردو ہے“ موجودہ عبوری دور میں بھی پندرہ بیس برس تک انگریزی کو دفتری زبان کی حیثیت سے باقی رہنا چاہئے یا نہیں؟ ہم اس کے متعلق کچھ نہیں کہنا چاہتے البتہ جناب موصوف نے اپنے مذکورہ بالا مقالہ میں ”برہان“ اور ”معارف“ کے بعض مضامین کا تذکرہ کرنے کے بعد اردو زبان کی نسبت جو بعض خیالات ظاہر کئے ہیں ان کے متعلق کچھ عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

ہمارے فاضل دوست کو اردو زبان پر سب سے بڑے اعتراضات دو ہیں ایک یہ کہ اردو ایڈمنسٹریشن کی زبان نہیں ہے اور دوسرا یہ کہ اس زبان کا سرمایہ ادب شعر و شاعری، افسانہ و ناول، اور تاریخ و مذہب پر مبنی مشتمل ہے اس میں جدید علوم و فنون کا کوئی ذخیرہ نہیں ہے۔ امر اول کی نسبت گزارش یہ ہے کہ انگریزوں کے عہد سے پہلے ہندوستان کی عدالتی اور دفتری زبان فارسی تھی اور پھر اردو ہو گئی تھی۔ اسی وجہ سے ڈاکٹر گلکرسٹ نے فورٹ ولیم کالج میں اردو میں راجم کا ایک مستقل محکمہ قائم کیا تھا اور خود کمپنی کے عہد میں ہی اردو زبان کی ہمہ گیری کا یہ عالم تھا کہ کلکتہ کے مذہب کالج میں امتحانات کے پرچے اردو میں ہوتے تھے تو پھر کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس زمانہ میں چونکہ اردو عدالتی اور دفتری زبان تھی اس بناء پر اس زمانہ کا ایڈمنسٹریشن ناقص اور نامکمل تھا۔ اور دور کیوں جائے ابھی کل کی بات ہے ریاست حیدر آباد دکن جو ہندوستان کی بہترین ترقی یافتہ ریاست تھی وہاں کے تمام دفتری اور سرکاری معاملات، احکام و فرامین وغیرہ اسی اردو زبان میں ہوتے تھے پس اگر اس زبان میں ایڈمنسٹریشن کی زبان بننے کی صلاحیت نہیں تھی تو پھر حیدر آباد نے علمی، تہذیبی و تمدنی اور دفتری حیثیت سے اس قدر شان دار ترقی کس طرح کی۔

رہ گئی دوسری بات! تو ہمارے لائق دوست کو معلوم ہونا چاہئے کہ آج عالم اسلام میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک ٹرکی۔ مصر اور ایران ہی سمجھے جاتے ہیں اور ان تینوں ملکوں نے مغربی تہذیب و تمدن کو پورے طور پر اختیار بھی کر لیا ہے۔ لیکن ترکی زبان سے ہم واقف نہیں ہیں اس بناء پر اس کی نسبت کوئی

ہات وٹوق سے نہیں کہہ سکتے۔ البتہ مصر اور ایران کے جدید سرمایہ ادبیات اور ذخیرہ علوم و فنون سے ہم واقف ہیں اور اس بناء پر وٹوق سے کہہ سکتے ہیں کہ جہاں تک جدید علوم و فنون کا تعلق ہے یہ دونوں ملک بھی ابھی تک تراجم کی حد سے آگے نہیں بڑھ سکے ہیں اور طبعی طور پر بھی ان کو بڑھنا بھی نہیں چاہیے۔ جہاں تک جدید علوم و فنون میں مطبوعات و تصانیف اور تحقیقات کا تعلق ہے بحیثیت مجموعی وہ عربی اور فارسی میں ناپید ہیں اور اردو میں بھی رہ گئے تراجم! تو واقعہ یہ ہے کہ اس لحاظ سے اردو کا قدم عربی اور فارسی سے کسی طرح پیچھے نہیں ہے یہ معلوم کرنے کے لئے زیادہ زحمت اٹھانے کی ضرورت نہیں۔ مطبوعات مصر و ایران کی فہرستوں کے ساتھ ساتھ دارالترجمہ حیدر آباد دکن، انجمن ترقی اردو اور بعض اردو اداروں کی مطبوعات کی فہرست پر بھی ایک نگاہ ڈال لینا کافی ہوگا! پھر جہاں تک فنی بصیرت و مہارت کا تعلق ہے تو ہماری رائے میں معیار تحقیق۔ فنی زرف نگاہی اور علمی ذہانت و طباعی کے لحاظ سے بھی ہندوستان کے مسلمان مصر و ایران سے آگے ہیں ڈاکٹر سرشاہ محمد سلیمان۔ ڈاکٹر سر صیاء الدین۔ ڈاکٹر ولی الدین۔ ڈاکٹر اقبال ڈاکٹر ظفر الحسن۔ ڈاکٹر ابراہیم اقبال قریشی کیلکی اسلامی ملک میں آج ان کا جواب موجود ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی پستی آج کل کی زبان میں ایک سخن تکیہ بن گیا ہے ورنہ کہا جاسکتا ہے کہ جس طرح ہندوستان کے مسلمان عوام غریب اور جاہل ہیں اسی طرح ملک اس سے زیادہ بدتر مصر و ایران، عراق و شام و فلسطین کے مسلمان عوام غریب اور جاہل ہیں لیکن جہاں تک تعلیم یافتہ طبقہ کا تعلق ہے تو واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے انگریزوں کے عہد میں اپنی غلامی کے باوجود پچاس ساٹھ سال میں وہ کچھ کر کے دکھا دیا جو نامور اسلامی ملک اپنی آزادی کے باوجود کر کے نہیں دکھا سکے۔

انگریزی زبان کی اہمیت اور ضرورت اور اس کی بین الاقوامی اور علمی عظمت و برتری سے انکار نہیں اور اس بناء پر ہند اور پاکستان کے مسلمانوں کے لئے اس زبان سے غفلت برتنا انتہائی نقصان رساں ہوگا لیکن پرانے شگون اپنی ناک کٹنا کوئی عقل مندی نہیں ہے انگریزی کی اہمیت و ضرورت جتانے کے لئے یہ آخر کیوں ضروری قرار دے لیا گیا ہے کہ اردو کا جو اصل مقام ہے اس سے ہی انکار کر دیا جائے اور مسلمانوں کی پستی کا سبب اسی کو بتایا جائے۔

کس لئے؟

از

(حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی)

ہستی کا یہ نظام محسوس جس میں ہم (یعنی بنی آدم) بھی شریک ہیں، اسی کے متعلق عموماً انسان فطرت میں اس قسم کے بنیادی سوالات جو اٹھتے رہتے ہیں مثلاً یہی کہ اس کی ابتداء کیا ہے، انتہاء کیا ہے اسی سلسلہ کا آخری سوال یہ بھی ہے، کہ آخر یہ جو کچھ بھی ہے اس کا مدعا کیا ہے؟

اپنی کتاب ”الدین الیقین“ کے پہلے حصہ میں اس آخری سوال کے سوا تقریباً ان تمام سوالوں کے ان جوابوں کو بیان کر چکا ہوں جن پر اسلام کے علمی اور فکری نظام کی بنیاد قائم ہے، عام طور پر ان ہی کی تعبیر لوگ ”عقائد“ کے لفظ سے کرتے ہیں، مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمیں کیا جاننا اور کیا ماننا چاہئے گویا اسی سوال کا جواب کتاب کے اس پہلے حصہ میں دیا گیا تھا۔ متعدد بار مختلف مقامات میں یہ کتاب جھپٹ چکی ہے۔ اور متعلقہ حلقوں میں کافی روشناس ہو چکی ہے۔

لیکن اسلام کے عملی نظام یعنی ایک مسلمان کو دینی حیثیت سے کیا کرنا چاہئے جو اسی آخری سوال مدعا کیا ہے؟ اسی سوال کا گویا جواب ہے، وعدہ کیا تھا کہ اس کی تفصیل کتاب کے دوسرے حصہ میں کی جائے گی لیکن ایفاء عہد نامہ وقتہ ہی نہیں مل رہا تھا، اب اپنے خاص کرم فرما مولانا عتیق الرحمن مدظلہ برہان“ (ایداہ اللہ بروح منہ) کے اصرار مبلغ سے قلم اٹھالیا گیا ہے۔ تاکہ اس پرانے وعدہ کو پورا کیا جائے۔ نہیں جانتا کہ ”اجل مسمیٰ“ میں اتنی گنجائش باقی بھی رہ گئی ہے یا نہیں کہ جو کچھ ارادہ کیا گیا ہے وہ پورا ہوگا، بہر حال حق سبحانہ و تعالیٰ ہی کی طرف سے توفیق رفیق ہوگی، اس کی مشیت ہوگی، تو کام ختم ہوگا، ورنہ

گر بہ میریم غدر ما بہ پذیر اے با آرزو کہ خاک شدہ

طے ہی کیا گیا ہے کہ جیسے جیسے مسودہ قلم بند ہوتا جائے قسط وار مجلہ برہان میں وہ شائع ہوتا

رہے کام شروع کیا جاتا ہے وَاللّٰہُ تَعَالٰی وَکُوْحْسِبِیْ وَلِنَعْمَ الْوکیل

کس لئے؟ کے اس عنوان کا غمون کی پیشانی پر درج کیا گیا ہے، مطلب اس کا یہی ہے

کہ یہ آسمان و زمین، ہوا، مٹی، پانی، جمادات و نباتات و حیوانات، انسان، الغرض وہ سب کچھ ہمارے

سامنے ہے اس کی پیدائش و آفرینش کا مدعا کیا ہے؟ اسی سوال کا جواب دیا جائے، اور بتایا جائے

کہ قدرت کے کس نصب العین کی تکمیل ان کے وجود سے ہوتی ہے،

اس سلسلہ کی سب سے پہلی دلچسپ بات تو یہی ہے کہ کائنات کی ان طویل و عریض صفوں

کے درمیان سے اگر بنی نوع انسانی کو باہر نکال لیا جائے یعنی بنی آدم کے سوا دنیا کے دوسرے مادیات

انسانی حقائق و موجودات کے متعلق کس لئے کے اسی سوال کو اٹھا کر اگر پوچھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے

کہ اس کا جواب گویا ان میں سے ہر ایک کے منہ پر رکھا ہوا ہے۔

آدمی کے سوا آپ دنیا کی کسی چیز کو بھی اٹھا لیجئے، ہوا ہی کو لیجئے، پانی ہی سے پوچھئے، آگ

ہی سے دریافت کیجئے، آپ کے سامنے ان میں سے ہر ایک اپنے وجود کے منافع کی ایک

طویل فہرست لے کر کھڑی ہو جائے گی، ان اشیاء کی افادیت کا پہلا تسلسلہ واضح آئینہ اور روشن

ہے کہ اس پر بحث کرنے کی بھی ضرورت نہیں، کون نہیں سمجھتا کہ صرف ہوا ہی کا عنصر اگر فضائی احاطہ سے

باہر نکال لیا جائے، یا پانی ہی کا ذخیرہ کرۂ زمین پر ختم ہو جائے، تو ساری جان رکھنے والی ہستیاں بھڑ

پھڑا کر اسی دقت دم توڑ دیں گی عالم کا سارا نظام ہی درہم و برہم ہو کر رہ جائے گا۔ زندگی کی ان ناگزیر

ضرورتوں کے سوا کائنات کے اسی دائرہ میں بڑا ذخیرہ ایسی چیزوں کا بھی ہے جن کے متعلق تجربہ

مسلل ہی ثابت کرتا چلا آ رہا ہے کہ کل تک جو قطعاً انکی اور بے کار سمجھی جاتی تھیں پوچھنے والے ان ہی

سے جب پوچھتے رہے کہ تو کس لئے ہے، تو دیکھا گیا کہ فوائد و مصالح کے سمندر ان ہی سے اُمتڈڑے،

آخر شکم زمین کا رہی سہا ہوا بدبو، متفنن، سیال مادہ جسے پٹرول یا عوام مٹی کا تیل کہتے ہیں۔ کل اسی غریب

کا کیا حال تھا، سر پیٹ لیتا ہو گا جس بد قسمت کے کنوئیں میں بجائے پانی کے یہی مٹی کا تیل اُبل پڑا ہو گا

لیکن زمین کے پیٹ کا یہی گندہ، غلیظ ذخیرہ کون نہیں جانتا کہ آج حکومتوں اور سلطنتوں کے بازوؤں کی سب سے بڑی قوت، اور طاقت بنا ہوا ہے، تعمیری کارروائیاں ہوں یا تخریبی، سب کی روح نواں آج ہی سٹرا ہوا مستغن، بدبو پانی بنا ہوا ہے یا چند صدی پہلے ان کالے کلوٹے پتھر کے ڈھیلوں کی کیا قدر و قیمت تھی، جنہیں ہم پتھر کا کوند کہتے ہیں مگر آج معدن زغال سے نکلنے والے بھی سیاہ پتھر اور ان کے ٹکڑے انسانی تمدن و عمران کے جوہری ستون بنے ہوئے ہیں، صنعتی سرگرمیاں، میکائیکی اور الوغزیاں عموماً ان ہی کی رہنمائی میں، ریلیں ان ہی کے بل بوتے پر دوڑانی جا رہی ہیں، فیکٹریوں کا سارا زور و شور ان ہی کے دم قدم سے قائم ہے، اور زندگی کے جن جن گوشوں میں ان سے کام لیا جا رہا ہے اس سے کون ناواقف ہے،

سچ تو یہ ہے کہ جنگل کی گری پڑی جڑی بوٹیاں آج ہی نہیں، تاریخ کے نامعلوم زمانے سے مسلسل ہی سبق پڑھاتی چلی جا رہی ہیں کہ

خالکسار ان جہاں را بجمارت مسگر توجہ دانی کہ دریں گرد سوائے باشد
مشاہدہ بتا رہا ہے کہ کائنات کی حقیر سے حقیر شے، صرف اسی وقت تک بے کار رہتی ہے جب تک کہ کام لینے والوں نے اس سے کام نہیں لیا لیکن پوچھنے والوں نے جب کبھی ان کے سامنے کس لئے؟ کے اسی سوال کو پیش کیا دیکھا گیا کہ امت کے دھارے اور آبِ حیات کے سرچشمے اسی سے پھوٹ پڑے، کیمیا گر تو ان ہی کے منہ سے سونا اگلوتے ہیں، اطباء ان ہی کے اندر انسانی زندگی کی ضمانت سمجھتے ہیں کہ مستور ہے، طرہ تماشائی ہے کہ کس لئے کا یہی سوال جس کے جواب سے مادراء انسانی موجودات گویا لب ریز نظر آنے میں فقط چھپنے کی ضرورت ہے، کہ جواب کے لئے معلوم ہوتا ہے ان میں ہر ایک مضطرب اور بے چین تھا، نفوس سے جیسے ستار کے تار معمور ہوتے ہیں زخم کی چوٹ لگی نہیں کہ وہ گنگنا اٹھتے ہیں، کچھ بھی کیفیت اس سوال کے جواب میں ان کی نظر آتی ہے۔

لیکن جوں ہی کہ اسی کس لئے کے سوال کا رخ غیر انسانی حقائق اور مادراء بشری موجودات سے پھیر کر نبی آدم کی طرف موڑ دیا جاتا ہے تو اب اسے کیا کہنے کا چانک سکوت کا عالم طاری ہو جاتا ہے

ستانا چھا جاتا ہے، اور ہم میں ہر ایک دوسرے کا منہ نہ لگتا ہے،

مطلب یہ ہے کہ اس خاکدانِ ارضی سے بنی آدم کے ایک ایک فرد کو چُن چُن کر اگر ختم کر دیا جائے، ان کے اونچوں کو بھی ختم کر دیا جائے اور نیچوں کو بھی صاف کر دیا جائے نہ وہی باقی رہیں جو ان میں بڑے گئے جاتے ہیں اور ان کا بھی نام و نشان مٹا دیا جائے جو سمجھے جاتے ہیں کہ چھوٹے ہیں، نہ کہتوں کو چھوڑا جائے اور نہ مہتوں کو، نہ عالموں کو نہ جاہلوں کو، الغرض بسطِ زمین کو فرض کر لیا جائے کہ نسلِ انسانی سے قطعی طور پر خالی ہو چکی ہے تو اب خود سوچئے کہ یہ سب کچھ ہو جانے کے بعد بھی ہوائیں اپنی اٹھکیلیوں سے کیوں رک جائیں گی، پانی کا بہاؤ کیوں قائم جائے گا، یقیناً اس وقت بھی زمین کا یہی فرش اسی طرح بچھا رہے گا، جیسے اس وقت بچھا ہوا ہے، نیلگوں آسمانوں کا شامیانہ اسی طرح تیار ہے گا، جیسے اس وقت تیار ہوا ہے، آفتاب اسی طرح طلوع ہوتا رہے گا۔ جیسے اس وقت طلوع ہو رہا ہے، دریا اسی طرح فراتے بھرتے رہیں گے جیسے آج بھر رہے ہیں، ندیاں اپنی دایلوں میں اسی طرح کھیلتی رہیں گی، درخت جھومتے رہیں گے، پھول کھلتے رہیں گے جیسے آج یہ سب کچھ ہو رہا ہے، خلاصہ یہی ہے کہ کائنات کا یہ سارا کارخانہ نسلِ انسانی کے بغیر بھی اسی طرح چلتا رہے گا جیسے اس وقت جاری ہے، قطعاً کسی چیز میں نہ کسی قسم کا خلل ہی پیدا ہوگا، نہ حرج ہی واقع ہوگا، ہر چیز اپنے حال پر رہے گی، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ہواؤں میں اڑنے والے تنکوں، اور گلی کوچوں میں بکھرے ہوئے سنگریزوں اور ٹھیکریوں کو بھی اس کی پروا نہ ہوگی کہ آدم کی اولاد کہاں جا کر دفن ہو گئی۔

سامنے کا یہی وہ واقعہ ہے جسے سوچنے والے سوچتے ہیں اور مبہوت ہو کر رہ جاتے ہیں، حیرت ہوتی ہے، کہ وہی جو یہاں سب سے زیادہ مکرم و محترم نظر آتا ہے کمالات کی ساری ارتقائی منزلیں جس پر پہنچ کر معلوم ہوتا ہے کہ ختم ہو جاتی ہیں، وہی جو اپنی بے پناہ تسخیری قوتوں سے ہر ایک کو یہاں اپنے نیچے دبائے ہوئے ہے، پہاڑوں کو توڑ رہا ہے، ادیاؤں کے رخوں کو موڑ رہا ہے۔ تناور درختوں کو ڈھلا رہا ہے جس پر جی چاہتا ہے چھا رہا ہے، چھانا چلا جا رہا ہے۔ شیر بھی اپنے کچاڑوں میں اس سے کانپتے ہیں، ہاتھی بھی جنگلوں میں اس سے پناہ مانگتے ہیں، سمندر کی مچھلیوں میں بھی غلام برپا ہے،

پرندوں میں بھی کھل بلی بھی ہوتی ہے، چرندے بھی جس سے سر اسیمہ اور پریشان ہیں، یہ اور اسی قسم کی ساری بڑائیوں کا یہی قدرتی حقدار انسان جب کس لئے کے اسی سوال کے سامنے لا کر کھڑا کیا جاتا ہے تو اچانک معلوم ہوتا ہے، کہ جو سب کچھ تھا وہ کچھ بھی باقی نہ رہا، ہوائیں بھی اسے ٹھکرا رہی ہیں، پانی بھی اسے در در رہا ہے زمین بھی اسے اگل رہی ہے، آسمان بھی اسے واپس کر رہا ہے، گویا ساری خلقت ہی کا یہ منفقہ فیصلہ ہے کہ آدم کی اولاد کے ساتھ کسی کی کوئی ضرورت وابستہ نہیں ہے۔

اللہ اللہ سب بول رہے ہیں کس لئے کے ہی سوال کے جواب میں سب کی زبانیں کھلی ہوئی ہیں، گھاس اور بھوسہ، بلکہ بول و براز جیسی عفونتوں اور غلاظتوں تک جیسی چیزیں بھی اپنی اپنی بساط کے مطابق اپنے خدمات کے ساتھ حاضر ہو جاتی ہیں، کس لئے کے سوال کا جواب کسی نہ کسی رنگ میں ہر ایک کی طرف سے مسلسل پیش ہوتا رہا اور ہوتا رہتا ہے، کھاد ہی بن کر سہی، یا اُپلوں ہی کا قالب اختیار کر کے۔ لیکن آپ دیکھ رہے ہیں، کہ ناکارگی اور نکماپنی کے الزام کو ان میں کوئی بھی بخوشی برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہے، ان میں بھی ہر ایک اسی کی شہادت ادا کر رہا ہے کہ پیدا کرنے والے نے ان کو بھی بے کار بنا کر پیدا نہیں کیا ہے، جتنا ڈھونڈھا جائے پتہ ہی چلتا ہے کہ افادیت، اور نفع بخشی کے منت نئے پہلوؤں کی ضمانت ان کے وجود میں بھی پوشیدہ ہے، لیکن یہ کیسی عجیب بات ہے کہ وہی جو ذرہ ذرہ، تنکے تنکے سے کس لئے کے اسی سوال کا جواب حاصل کر رہا ہے، آہ کہ اسی انسان آدم کی اولاد سے جب پوچھا جاتا ہے کہ

آخر تبرے وجود سے بھی قدرت کے کسی نصب العین کی تکمیل ہوتی ہے، ؟

تو سب سے جواب لینے والا یہی انسان اسی کس لئے کے جواب میں ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ گویا گونگا، بہرا بن گیا، دریافت کیا جاتا ہے کہ پیدا کرنے والے نے آخر تجھے کس لئے پیدا کیا ہے؟ تبرے وجود کی غرض و غایت کیا ہے؟ تو اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ اپنے آپ کو کس کے لئے بنائے، نیچے سے اوپر تک ساری خلقت اور اس کے مختلف طبقات کی ایک ایک چیز کا جائزہ لیتا ہے ہر ایک پر اپنے آپ کو پیش کر کر کے دیکھتا ہے اور سر جھکا لیتا۔ ہے کہ ساری کائنات میں اس کا اور اس کی

خدمات کا کوئی خریدار نہیں، اس کا گاہک کوئی نہیں، کسی کی کوئی ضرورت، کسی حیثیت سے آدمی اور آدمی کے وجود کے ساتھ اٹکی ہوئی نہیں ہے۔

اس موقع پر بعض لوگ کچھ مغالطوں سے کام لینا چاہتے ہیں، ایک ممانعت اور سلجھی ہوئی بات کو الجھا دینا چاہتے ہیں، یعنی بجائے غیروں کے ایک آدمی کی ضرورت دوسرے آدمی سے جو پوری ہوتی ہے یا ہو سکتی ہے اسی کو اتنی وجود کی کافی قیمت ٹھہرا کر چاہتے ہیں کہ خود بھی مطمئن ہو جائیں اور دوسروں کو بھی مطمئن کر دیں۔ بجائے خود یہ ایک مستقل اور جداگانہ مسئلہ ہے تفصیلی بحث نہ تو اس کی آئندہ آرہی ہے لیکن سر دست ایک مثال کو تو گوش زد کر ہی دینا چاہئے، کہنا یہ چاہتا ہوں کہ بیچنے والا آپ کے سامنے بیچنے کے لئے کسی ایسے پودے کو پیش کرتا ہے جسے آپ نے نہ کبھی خود دیکھا تھا نہ اس کے صفات و خصوصیات کا ذکر کسی سے سنا تھا نہ کسی کتاب میں پڑھا تھا، انگریزی میں آپ کے لئے وہ قطعاً بھولالذات والصفات پودا ہوا، اسی وجہ سے آپ بیچنے والے سے پوچھتے ہیں کہ یہ کس لئے ہے اس کے پھلوں سے کیا کام لیا جاتا ہے یا لیا جاسکتا ہے جواب میں پودے کا بیچنے والا اگر یہ کہے کہ جناب والا اس پودے کی جڑ تو اس کے تنے کے لئے ہے، اور تنے شاخوں کے لئے، شاخیں پتوں کے لئے اور یہ سب مل ملا کر بالآخر اس کے ان پھلوں کے لئے ہیں جن میں تخم اور بیج پیدا ہوتے ہیں آئندہ اسی شکل و صورت کے پیدا ہونے والے پودوں کی پیدائش میں وہ کام آتے ہیں پھر یہ پیدا ہونے والے پودوں کی جڑیں تنوں کے لئے تنے شاخوں کے لئے، شاخیں برگہ بار پھولوں اور پھلوں کے لئے اور پھلوں کے تخم آئندہ پیدا ہونے والے پودوں کے لئے یوں ہی ایک دوسرے کے لئے بنتے چلے جاتے ہیں پتی، اس ہدائی مضحکہ خیز تقریر کو پودے کا بیچنے والا اگر آپ کے اس سوال کا یعنی یہ پودا کس لئے ہے اور اس کے پھلوں سے کیا کام لیا جاتا ہے اسی کا جواب قرار دے تو سوچئے کہ آپ کا غصہ کیا قائم کیا اپنی عقلی تفحیک کے سوا اس کی یہ عجیب و غریب تقریر آپ کو کھچوڑ بھی محسوس ہو سکتی ہے؟ اور ایک پودا ہی کیا کسی جانور کا فروخت کرنے والا جو خود نہ جانتا ہو کہ جس جانور کو بیچنے کے لئے وہ نکلا ہے اس کا کیا فائدہ یا اس سے کیا کام لیا جاسکتا ہے باوجود اس کے لوگوں کے سامنے کہتا پھرے کہ گو میں خود یہ نہیں جانتا کہ قدرت نے اس جانور کو کس کام کے لئے پیدا کیا ہے اور اس سے کیا فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے لیکن چونکہ اس کا معدہ اس کے خون کے لئے ہے، جو اس کے ہجر میں پیدا ہوتا ہے، اور خون

اس کے گوشت پرست چربی اور ہڈیوں اور اس تولیدی مادہ کے لئے ہے جس سے پھر اسی قسم کا جانور پیدا ہو جاتا ہے یہی اس جانور کی کافی قدر و قیمت ہے اگر ہڈیاں اور جنون کے سوا اس کی یہ کچھ نہیں ہے تو بنی نوع انسانی کے افراد کے متعلق اس سوال کے جواب میں یہی ہے کہ وہ کس لئے ہیں؟ یہ کہنا کہ باہم ایک دوسرے کے وہ کام آتے ہیں اور اگلی نسلیں پھلی نسلوں کی پیدائش کا ذریعہ بن کر ہر اگلی نسل پھلی نسل کے لئے بنتی چلی جاتی ہے اور اسی قصہ پر انسانی وجود کی قدر و قیمت کو ختم کرنے کی جرأت خود سوچئے کہ ابلہ فری کے سوا اور بھی کچھ ہے؟

مان بھی لیا جائے اور ایسا ہو بھی جائے کہ ہم میں ہر فرد اپنے خاندان کے لئے خاندان قوم کے لئے قوم سارے انسانوں کے لئے اور انسانوں کی ہر اگلی نسل پھلی نسل کے لئے کام کرتی چلی بھی جائے، تو زیادہ سے زیادہ مطلب ان سارے طول، طویل قصوں کا وہی تو ہوا کہ پودے کی جڑ تنے کے لئے، تنہ شاخوں کے لئے، شاخیں پنوں کے لئے، پھولوں اور پھلوں کے لئے، پھل تخم کے لئے، تخم آئندہ ان ہی جیسے ان کے جھول ان خواص والصفات پودوں کی پیدائش کے لئے، اور نئے پودے پھر ان ہی منزلوں سے گذرنے ہوئے دوسرے نئے پودوں کے لئے، ”درمجموعہ جراثیم جیسے اس گھن جگر میں گردش دینے کے بعد بھی، یہ سوال کہ پودا کس لئے ہے؟ صرف سولل ہی بنا رہتا ہے اسی طرح آپ خود سوچئے کہ باہم انسانی افراد کے تعلقات کا یہ تسلسل اس سوال کا یعنی پیدا کرنے والے نے انسان کو کس لئے پیدا کیا ہے؟ اس سوال کا مغالطہ آمیز اور مضحکہ خیز نہیں بلکہ واقعی صحیح منطقی جواب کیسے بن سکتا ہے میں پوچھتا ہوں کہ زید نے عمر کے منہ میں ہتھ ڈالا، اور عمر نے زید کو کپڑے پہنائے، اس میں شک نہیں کہ ایک دوسرے کے کام ضرور آئے لیکن دونوں مل کر پھر کیا کریں؟ سوال تو انسانیت کے متعلق ہے کہ مصائب ہستی میں اس کے وجود سے قدرت کے کس نصب العین کی تکمیل ہوتی ہے کرۂ زمین پر انسانی وجود کا جو ظہور ہوا، اس کا مقصد اور اس کی غرض و غایت کیا ہے فرد پر ہی یہ سوال مائد ہوتا ہے اور بنی آدم کی ساری اگلی پھلی نسلوں کا مجموعہ اس سوال کے جواب میں ایک دوسرے کے کام آنے کے بعد بھی اسی مقام پر ہے جہاں پہلے تقابلاً سرمو، بال برابر بھی یہ سوال اپنی جگہ سے نہ ہلا ہے اور نہ ہل سکتا ہے۔

اسی لئے تو میں کہتا ہوں، اور یہی کہتا ہوں گا جس کے کہنے سے مجھے کوئی ردک نہیں سکتا کہ وہی

بیٹو، نکھو آدمی نہیں جس کی جوانی ساری کدو کاوش کا آخری محور صرف اپنی ذاتی شکم پروری کو بتاتے ہوئے
ہے اکبر مرحوم نے جسے سامنے رکھ کر کہا تھا کہ

جو پوچھا دل سے اس جینے کا کچھ حال بھی آخر ہے شکم بولا کہ اس کی فکر کیا بندہ تو حاضر ہے

ان کی اس طرافت کو پیڑوں کے اسی طبقہ تک محدود نہ سمجھا جائے بلکہ اپنے ساتھ اپنے ہاں
بچوں اقرباء و اعزہ کو بھی اپنی کمائیوں میں جو شریک سمجھتے ہیں، یا ان سے اونچے ہو کر کسی قوم و ملت کی
خدمات کو اپنی کوششوں کا جو نصب العین بنائے ہوئے ہیں اور ان سے بھی آگے بڑھ کر سہاری انسانیت
ہی کے صلاح و بہبود کو جنہوں نے اپنے سامنے رکھ لیا ہے یا یہ جو سمجھایا جاتا ہے کہ ہر پچھلی نسل کے لئے
دنیا کے ماحول کو مکلفہ حد تک خوش گو اور مسرت بخش بناتے چلے جانے کی غیر منقطع دوامی کوشش
یہی انسانیت کا آخری بلند ترین نصب العین ہے ان سارے قصوں اور قصیوں کی بنیاد اس پر قائم ہے
کہ خود انسانیت بھی بجائے خود کچھ قدر و قیمت رکھتی ہے بلاشبہ ایسی صورت میں ہر وہ قدم جو انسانیت کے
اٹھارنے اور سنوارنے کی راہوں میں اٹھایا جائے گا وہ قابل قدر و مستحق تحسین و ستائش ہوگا۔ پھر فادیت
میں جدوجہد سی و کوشش کا دائرہ قتنا زیادہ وسیع ہوگا، اسی حد تک اس کی قیمت بھی بڑھتی چلی جائے گی
بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ذاتی شکم پروری والوں کی کوششیں اپنی شخصی ذات ہی کی حد تک کیوں محدود نہ ہوں، لیکن
انسانیت ہی کے ایک حصہ کو یعنی خود بیٹو آدمی کو چونکہ اس سے فائدہ پہنچتا ہے اس لئے اس کی اہمیت
بھی چاہئے تو یہی کہ نظر انداز کرنے کی مستحق نہ ہو، کچھ نہ سہی، لیکن بہر حال ایک آدمی ہی کی تو بے چارہ پیڑ پرورش
کرتا ہے لیکن سرے سے انسانیت ہی اگر نظام عالم کا ایک لائینی، لا حاصل، عبث، غیر مفید عنصر ہے،
تو انفرادی شکل میں ہو یا اجتماعی قالب میں، زمین کی پشت کے ایک ناکارہ بوجھ کے سوا وہ کچھ اور بھی
باقی رہتی ہے۔ عربی کی مثل مشہور ہے ثبت الجدار ثمر النفس یعنی پہلے دیوار تو بنا لو اس کے نقش
و نگار آرائش و زیبائش کا مسئلہ تو اس کے بعد پیدا ہوگا، بقول شخصہ: "تار باقی نہیں کرتا ہے تو دامن پیدا"
آخر بتایا جائے کہ فرد خاندان کیلئے خاندان قوم کے لئے، قوم ساری انسانیت کے لئے، اور انسانوں کی ہر گلی
نسل، پچھلی نسلوں کے لئے ہے، ان نصب العینوں کو ملان لینے کے بعد جیسا کہ بار بار کہتا چلا آ رہا ہوں، وہی

سوال کہ آخر یہ سب کس کے لئے پیدا ہوئے، اور کس لئے پیدا ہونے چلے جا رہے ہیں، ہم آپ کو کھلائے جائیں، آپ ہمیں بتائیں، آپ کی مدد ہم کریں، ہماری مدد آپ کریں، یوں ہی ایک دوسرے کے ساتھ لپٹے ہوئے قبروں میں گرتے چلے جائیں، دھنستے چلے جائیں سڑتے چلے جائیں اور کچھ نہ سوچیں کہ دنیا کی حقیر سے حقیر شے کا حال جب یہ ہے کہ آج ہمارے سامنے سے اگر وہ ہٹائی جائے، تو ساری انسانیت تھلا اٹھتی ہے، لیکن ایک ہم میں کہ نہ زمین ہی کے کام کے ہیں، نہ آسمانوں کے، نہ ہوا ہی کی کوئی ضرورت ہم سے پوری ہوتی ہے اور نہ پانی کی، کسی حقیر ذرہ کے کان پر جوں بھی نہیں رنگتی اگر ساری نسل انسانی زمین کے اس کرے سے پوچھ لی جائے، آخر یہ کیا ہے کہ دنیا کی چیزیں تو بالواسطہ یا بلاواسطہ انسانی ضرورتوں میں کام آ کر اپنے وجود کے مفاد، اور اس کی قدر و قیمت کو مسلسل پوری قوت کے ساتھ ثابت کرنی چلی جاتی ہیں لیکن ساری خلقت میں ایسا کوئی نہیں جس کے لئے انسانی وجود بھی کوئی قدر و قیمت رکھتا ہو،

غور و فکر کی یہی نازک ترین منزل ہے، جہاں پوچھنے والے جب پہنچتے ہیں اور سنتے ہیں کہ قرآن پکار رہا ہے ان ہی کو خطاب کر کے پکار رہا ہے۔

آفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا
کیا تم خیال کرتے ہو کہ ہم نے تم کو نکمنا بنا کر پیدا کیا ہے
تو ان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، ان کے اندرونی احساسات میں تہلک مچ جاتا ہے، ارزہ بر اندام ہو جاتے ہیں، جب یہی قرآن پوچھتا ہے کہ

أَفَحَسِبْتُمْ أَنِلنَّاسَ أَن يُتْرَكَ سُدًى
کیا آدمی یہ سوچتا ہے کہ وہ نکمنا بنا کر چھوڑ دیا جائے گا
بلکہ یہ دیکھ کر کہ دنیا کی چیزیں تو انسانی ضرورتوں میں کام آ کر اپنی قیمت حاصل کر رہی ہیں، خدا نخواستہ اگر یہ مان لیا جائے کہ خود انسان اور انسانی وجود کی کوئی قیمت نہیں ہے تو بالآخر اس کا حاصل بھی نہ ہوگا کہ ہر وہ چیز جس کی قدر و قیمت انسانی وجود کے ساتھ وابستہ تھی، وہ بھی بے قیمت بن کر رہ گئی آخر جس کے لئے سب کچھ ہے جب وہی کچھ نہ رہا، تو یقیناً سب کچھ بے کار، لا حاصل، عبث و بطل ہو کر رہ گیا جس باغ کے درخت ہی بے ثمر بن کر رہ گئے ہوں، یقیناً وہ باغ بھی بے کار ہوا، اور جو کچھ باغ

کی شادابی و سیرابی کے لئے کیا گیا تھا سارا ساز و سامان سب ملایا بیٹ ہو کر رہ گیا، انسان اور انسانی وجود کو بے مقصد ٹھہرائے گا یہی ناگزیر منطقی نتیجہ ہے قرآن میں

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا
بَيْنَهُنَّ إِلَّا طَلًا

ہم نے زمین اور آسمان کو بے کار پیدا نہیں کیا

اور اسی قسم کی بے شمار آیتوں سے آدمی کے دماغ پر جس کی ٹھوکریں لگائی گئی ہیں اپنی نیکمائی اپنے وجود کی لا حاصلی سے جن میں چونک پیدا نہیں ہوتی شاید نظم عالم کے بطلان اور بے حاصلی ان کو فکر معقول کی طرف متوجہ کرے اسی مسئلہ کے سمجھانے کی یہ دوسری قرآنی تعبیر ہے

ان کائنات کا یہ حیرت انگیز نظام جس کی رگ رگ ریشہ ریشہ میں حکمت و دانش کا خون دوڑ رہا ہے مصالح اور داناتوں کی نازک ترین رعایتیں جس کے ذرہ ذرہ سے اہل رہی ہیں کیسا عجیب تماشا ہے کہ سبک مغزوں کی ہلکی سی فکری لغزش نے کائنات کے اسی محکم و مرتب، مہیب و مدہش نظام کو لا حاصل ہولات کا ایک ڈھیر اور دفتہ بے معنی بنا کر چھوڑ دیا، یہ سچ ہے کہ دنیا تو دنیا اسی دنیا کی معمولی انفرادی شخصیت، بازار کا بدترین بے فکر استغویہ ابھی، ناکارہ اور نچکے ہونے کے اس دشنام کو برداشت نہیں کر سکتا، واقعہ خواہ کچھ ہی بد لیکن انسانی جبلت اس الزام کو ہضم نہیں کر سکتی، شوق ہو تو تجربہ ہی کر کے دیکھ لیجئے اس الزام کا رد عمل گالیوں اور طاجیوں ہی کی حد تک محدود ہو کر گرہ جائے لاکھوں اور جوتیوں سے بواب نہ دیا جائے تو سمجھنا چاہئے کہ جان بچی لاکھوں پائے ۔

بہر حال فطرت و جبلت کا اقتضا خواہ کچھ ہی ہو، لیکن غریب عقل کیا کرے؟ دنیا میں جب ایسی کوئی چیز ہے ہی نہیں، جسے انسان اور انسانی وجود کی ضرورت محسوس کر کے، دنیا میں آدمی کیوں ہے؟ اس سوال کا جواب حاصل کیا جائے آخر کس کی پیٹھ پر لادے اس بوجھ کو جسے لاونے کے لئے یہیں کوئی تیار نہیں اور کس کے سر کا درد نہائے اس نیکی ہستی کو جس سے بات پوچھنے پر کوئی آمادہ نہیں بلکہ حق تو یہ ہے کہ خلقت ہی کے ہجوم میں جب تک انسانیت ٹھسکتی رہے گی پکارنے والے اسی ہجوم میں آدمی کو کھڑا کر کے جب تک پکارنے اور چلاتے رہیں گے کہ

ہے کوئی آدم کے ان بچوں "خسردار؟

فوصرت یہی نہیں کہ زمین کے اس کرہ پر آدمی کے قیام و بقاء کے جواز کی سند اور کسی منطقی بنیاد کی فراہمی ہی میں عقل اپنے آپ کو ششدر و حیران پاتی رہے گی، بلکہ جن زندگی اور زندگی کے احساسات رکھنے والی ہستیوں کا وہ طبقہ جن کے گوشت سے اپنے گوشت میں اور چربی سے اپنی چربی میں آدم کی اولاد اضافہ کا کام لیتی ہے اور کام لینے کی عادی ہے، اپنے منہ کو جن جانداروں کا مذبح اور پیٹ کی جن زندہ ہستیوں کا مذبح بنائے ہوئے ہے اور وہی کیا زراعت کو سیراب کرنے کے لئے آب گیروں کے آبی ذخیروں کو اپنے کھیتوں میں جو منتقل کرتے ہیں جن کے صرف اسی ایک فعل سے خدا ہی جانتا ہے کہ خشکی اور تری کی کتنی زندگیاں موت بنتی چلی جاتی ہیں اور جیسا کہ کہنے والے کہتے ہیں کہ شاید ہی کوئی قدم آدمی کا ایسا اثنا ہو جس کے نیچے ہزار جانیں نہ مسلی جاتی ہوں، ایک ایک گھونٹ میں لاکھوں زندوں کو جو گھونٹ جاتا ہو اور اپنی ہر سانس میں انھیں شکر رہا ہو، الغرض دوسروں کی میت سے جو اپنی زندگی پیدا کرتا ہو، دوسروں کو اجاڑ کر اپنے گھر آباد کرتا ہو، تعمیری ضرورتوں کے لئے ایک درخت ہی جب کاٹا جاتا ہے تو کون بنا سکتا ہے کہ اس درخت پر سیرا لینے والے پرندوں کے کتنے گھونٹے تباہ ہوتے ہیں، ان چوہنیوں، مکرچوں اور بھانت بھانت کے جانداروں پر کیا گذرتی ہے، جن کی واحد پناہ گاہ وہی درخت اس کے مختلف گوشے اور حصے تھے ہر دم کے اس فرد کو جیسا کہ ہم میں ہر ایک جانتا ہے، جتنا چاہے دراز کیا جاسکتا ہے، ایسی صورت میں آپ ہی بتائیے کہ انسان کا ناکارہ وجود اس کی بے معنی لاعمل ہستی کے جواز کی سند بھی غریب عقل کے پاس کیا باقی رہتی ہے، آدمی کی عقل چونکہ بہر حال آدمی ہی کی عقل ہے، اس لئے بے جا طرفداری یا خواہ مخواہ کی رو رعایت، چشم پوشی اور مروت سے اگر کام نہ لے تو انسانیت کی یہ ساری تسخیری اولوالعقاب اقتداری سر بلندیاں، عقل کی آزاد تنقید کے معیار پر پہنچ کر اگر زور اور زبردستی کے ظالمانہ مظاہرے کا قالب اختیار کر لیں، تو اس عقلی فیصلہ کو مشکل ہی سے غیر منصفانہ فیصلہ قرار دیا جاسکتا ہے انسانی وجود کا کوئی ایسا ہی نصب العین جب تک سامنے نہ لایا جائے، جس پر سب کچھ قربان کیا جاسکتا ہے، اس وقت تک یقین ماننے کہ آدمی کے سارے تسخیری کرامات اور اس کے سارے اقتداری تصرفات جنہیں

وہ اپنا پیدائشی حق قرار دے رہا ہے، یہ سارا قصہ صرف بھینس اور لاکھی کا قصہ بن کر رہ جاتا ہے، جس کی بنیاد سچائے عقل و انصاف کے ماننا پڑے گا کہ صرف بربریت و وحشت، جہالت اور سفاہت ضد اور ہٹ پر قائم ہے،

اور یہی آیا، احترامی حقوق، اور نگرہی واجبات کے وہ سارے شریفانہ آداب و ضوابط، حکیمانہ نظریے اور قوانین، جو باہم انسانوں میں ایک دوسرے پر عاید کرنے گئے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں جو کچھ چلی کیا جا رہا ہے، عقل و خرد کی پشت پناہیوں میں کیا جا رہا ہے، میں پوچھتا ہوں کہ نیکیوں کے سارے ابواب غم خواروں کی غم گساری، دل افکاروں کی دل داری بے یاری کی یاری، بیماروں کی نیارداری یا در اسی شتم کے مشورے نہیں سمجھا جاتا ہے کہ انسانیت و شرافت کے غیر مسئول تقاضے ہیں جن کے خلاف لب بولنے کی بھی کوئی جرأت نہیں کر سکتا لیکن ان نیکیوں و در معصوم مشوروں کی بنیاد کیا ہے؟ لا حاصل ہے تو ان ہی انسانوں میں جو معذور اور ابلہ ہو چکے ہیں، کیوں ان پر تو انا اور تندرست آدمیوں کی کمائی ہوئی آمدنیاں برباد کی جاتیں؟ ادا معنی کے مقابلہ میں جو اپنی سپردِ مال چکے ہیں، ان کی بیماری ہی بتا رہی ہے کہ مرض کی مدافعت کی قوت سے وہ محروم تھے، پھر ان ہی پر اس سرمایہ کو کیوں ضائع کیا جائے، جن سے مدافعت کے اسی میدان میں جیتنے والے صحت مندوں کی صحت و قوت میں اضافہ ہو سکتا ہے، شبابی توانائیوں کو سجاتے بڑھنے اور زرقی کرنے کے اس لئے کیوں پژمردہ اور افسردہ ہونے کا موقعہ دیا جاتے کہ قبروں کے جھانکنے والے فرتوت از کار رفتہ بڈھے باپوں کی خبر گیری، جوان بیٹیوں کا انسانی فرض ہے، پردوں کی جڑیں تنوں کے لئے، تنے شاخوں کے لئے، شاخیں برگ و بار کے لئے، پھولوں اور پھلوں کے لئے، پھلوں کا وجود آئندہ پیدا ہونے والے پردوں کے تخم اور بیج کے لئے یہ عمل تو خیر اس لئے جاری ہے اور اسے روکا بھی نہیں جاسکتا کہ اختیار و انتخاب کی قوت سے پردوں کا نباتی وجود محروم ہے لیکن آدمی کا اختیاری وجود خواہ مخواہ کے ان گھن چکروں میں کیوں پڑے، بتایا جاتے کہ افراد خاندانوں کے لئے، خاندان قوم کے لئے قوم سارے انسانوں کے لئے، انسانوں کی ہر اگلی نسل پچھلی نسل کے لئے، قربانیوں سے آخر کیوں کام لے؟ راحت و آرام اور لذائذ حیات کے جس ذخیرے اور سرمایہ سے جو بھی جس حد تک

مستفید ہو سکتا ہے، ان سے بجائے خوش کے درویش کو فائدہ اٹھانے کا موقعہ آخر کیوں دیا جائے آخر ان مسلمات معروفہ کی صحیح منطقی بنیاد بھی تو ہو۔

اگرچہ اسی کے ساتھ اس کا بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اقتدار کی تصرفات جن سے آدمی یہاں کام لے رہا ہے اور احترامی حقوق و واجبات کا وہ سلسلہ جن کی پابندی کا مطالبہ باہم نبی نوع انسانی کے درمیان کیا جاتا ہے ان دونوں راہوں میں عقل کا حال جو بھی ہو، لیکن جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کر چکا ہوں کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہماری جبلت اور فطرت دونوں سلسلوں کی عام کاروائیوں سے اصولاً مطمئن نظر آتی ہے انسانی وجدان کا فیصلہ یہی ہے، کہ جو کچھ ہو رہا ہے ٹھیک ہو رہا ہے درست ہو رہا ہے نہ کسی قسم کا

۱۔ اصولاً سے میری غرض یہ ہے کہ دوسروں کی موت سے اپنی زندگی، اور ذرائع زندگی کی فراہمی ہی کے مسئلہ کو مثلاً لیجئے۔ بنی آدم میں ایسا کون ہے کہ جو اس سے بچ کر زمین کے اس کرے پر جی سکتا ہے، یا جینے کا تصور کر سکتا ہے، خشکی اور تری کے جانداروں کو زندگی سے محروم کئے بغیر جب آدمی اپنے پیٹ میں ایک دانہ اور پانی کے ایک گھونٹ کو بھی پہنچا نہیں سکتا تو زندگی سے محرومی کی بعض خاص شکلوں مثلاً ذبح وغیرہ کے طریقوں کو دیکھ کر کسی خاص طبقہ ہی پر یہ الزام لگانا کہ دوسروں کی موت سے وہ اپنی زندگی پیدا کرتے ہیں، بجز ایک بے بنیاد الزام کے اور کبھی کچھ ہے؟ خون سے جن کے دامن تر ہیں وہ دوسروں کی آسین کے خونی پھینٹوں پر کیوں متوجہ ہیں، کسان تالابوں سے اپنے کھیتوں میں جب پانی دیتا ہے تو کہہ چکا ہوں کہ وہ یہ سب جان بوجھ کر کرتا ہے کہ پانی میں زندگی گزارنے والوں کی بھی بڑی تعداد میرے اس فعل سے اپنی زندگی سے محروم ہو رہی ہے اور خشکی میں رہنے والے جانوروں، کیڑوں، مکوڑوں پر بھی زہریت کی راہیں بند ہوتی چلی جا رہی ہیں، ایسی صورت میں ذبح وغیرہ مسئلہ کے اختلافات کو اصولی اختلاف قرار دینے کی آپ خود سوچئے کیا وجہ ہو سکتی ہے بلکہ میں تو حیران ہو جاتا ہوں جب بچائے اپنے ذاتی رجحانات کے اس قسم کے اختلافات کو لوگ مذہب کی طرف منسوب کرنے کی جرات کر گزرتے ہیں گو یا وہ یہ سمجھنا چاہتے ہیں کہ زندگی سے محروم کرنے کی یہ خاص شکل مثلاً ذبح کرنے کا طریقہ اس کو خدا ہی نے ناجائز قرار دیا ہے حالانکہ ساری چھپی ڈھکی باتوں کا خدا جب عالم ہے تو وہ ایسا حکم کیسے دے سکتا ہے جس سے بچ نکلنے کی کوئی ممکن صورت ہی نہیں ہے اس نے اس عالم کے نظام کو بنایا ہی اس طریقہ سے ہے کہ ایک کی زندگی دوسروں کی موت ہی سے پیدا ہوتی ہے ۱۲

کوئی دغدغہ ہی ہم اس فیصلہ کے متعلق اپنے اندر پاتے ہیں، اور نہ کوئی مخصوص یا خرخشہ سچ پوچھتے، تو جبلت کا یہ سکون، فطرت کی یہ خشکی، اشارہ کر رہی ہے کہ عقل کے سامنے سے اس راہ میں کوئی اہم مقدمہ جھل ہو گیا ہے، یا ڈالنے والوں نے قصداً اسے اوٹ میں ڈال دیا ہے؟ اور یہ ساری کش مکش جو اپنی عقل اور فطرت و جبلت کے اقتضاؤں میں ہم پاتے ہیں، اسی مقدمہ سے ذہنوں کا نتیجہ ہے

آئیے اور پڑھئے آسمانی کتابوں کے آخری قالب القرآن الحکیم میں نبوت و رسالت کی جو طویل تاریخ کے ناصیہ کا سب سے زیادہ نمایاں سب سے زیادہ درخشاں ”نوشتہ“

يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِنْ إِلَهٍ غَيْرُهُ ۚ لَوْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۚ مَا كُنْتُمْ عَابِدِينَ لَهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَرِيمٌ عَلِيمٌ ۚ

اس کے سوا نہیں ہے،

از آدم تا خاتم (صلی اللہ علیہ وسلم) پیغمبروں کے پیش کئے ہوئے لامہوتی فرائین، کی پیشانیوں کا یہی اختصاصی طغراء اور دوامی لازمی چھاپ ہے جس میں انسان کس لئے ہے؟ اسی سوال کے جواب میں جو واقعہ تقاسم سے پرہیز دیا گیا ہے ماحصل جس کا یہی ہے کہ خالق کائنات نے انسان کو صرف اپنے لئے پیدا کیا ہے کھول دیا گیا ہے کہ یہی حقیقت ہے آفرینش کائنات کے سلسلے میں انسانیت کا یہی تخلیقی موقف اور قدرتی مقام ہے، اور یہی وہ ذرا موش شدہ مقدمہ، یا گم گشتہ کردی ہے جس سے ہٹ کر بے چاری عقل حیرانی اور سرسبکی کی دادیوں میں بھٹک رہی تھی آدمی کے وجدانی و جبلتی رجحانوں اور اس کے عقلی اقتضاؤں میں کش مکش برپا تھی، اس درمیانی کردی سے جوڑ دینے کے بعد تراجم و تحالف کے یہ سارے قصے اچانک ختم ہو جاتے ہیں اب عقل بھی وہی سوچنی ہے، اور اس کے سوا سوچ ہی کیا سکتی ہے، جس کے ساتھ ہمارا وجدان اور ہماری جبلت راضی و مطمئن ہے اصولی غلطی یہی تھی کہ پیدا کرنے والے نے جسے مخلوقات کے لئے پیدا ہی نہیں کیا ہے اسی انسانیت کو بغل میں دبائے مخلوقات ہی کے دروازوں پر بکارنے والے۔ بکار رہے تھے کہ ہے کوئی اس غریب آدمی کا بھی خریدار؟ ظاہر ہے کہ قیود استغناء کی یہ قطعاً غیر منطقی کوشش تھی، آنکھیں جو دیکھنے کے لئے بنائی گئی ہیں ان سے سننے کا کام کیسے لیا جاسکتا ہے کانوں پر رکھ کر گلاب کے

بھول کو کوئی لاکھ سو ننگھنے کی کوشش کرے؟ لیکن اس میں کیا کامیاب ہو سکتا ہے، پیدا کرنے والے اور بنانے والے نے سو ننگھنے کے لئے جب ناک ہی کو بنایا ہے، تو قدرت کے اس قانون سے جنگ کر کے کان کو سو ننگھنے کے کام کا کون بنا سکتا ہے۔

بہر حال انسان خدا کے لئے ہے؟ اور خالق کائنات نے خود اپنے لئے اس کو پیدا کیا ہے اس کا مطالب کیا ہے، اور اس کی تشریح میں جن بوجہ عجبیوں کا انسانی ذہن شکار ہوا، تعبیروں کی کثرت نے جن پریشاں خوابوں کا طلسم اس سیدھی سادی حقیقت کو بنادیا اس پر تو کافی بسط و تفصیل کے ساتھ انشاء اللہ آئندہ بحث کی جاتے گی۔

سردست میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اپنے اس تخلیقی موقف اور طبعی مقام پر پہنچ جانے کے بعد آپ دیکھ رہے ہیں، کہ وہی انسانیت جو ساری خلقت، حتیٰ کہ بول و براز جیسی عفونتوں و غلطیوں تک کے مقابلہ میں بھی بے قیمت ٹھہرنی چلی جاتی تھی، کم از کم ان گندگیوں سے بھی کھاد کا کام لیا جاتا، زرعی پیداواروں کی نشوونما میں ان سے کافی مدد ملتی ہے لیکن آدمی تو اس کام کا بھی نظر نہیں آتا تھا مگر آپ دیکھ رہے ہیں جس کا سب کچھ ہے کائنات کے اسی خالق کے لئے ہو جانے کے بعد وہ سب کچھ جو آدمی کے تسخیری اقتدارات کے نیچے دبے ہوئے ہیں اور جن سے وہ کام لے رہا ہے، قرآن میں جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے،

هُوَ الَّذِي يُسَخِّرُ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَمِیْعًا

اللہ ہی نے تمہارے لئے آسمان اور زمین کی تمام

چیزوں کو مسخر کیا ہے۔

گویا نسل انسانی کو خطاب کر کے فرمایا جا رہا ہے جب تم میرے لئے ہو، تو وہ سب کچھ جو میرا ہے وہ تمہارے لئے ہے، وقفہ وقفہ سے اسی واقعہ کو ازل سے آخر تک قرآن دہراتا جا گیا ہے، کائنات کی شاید ہی کوئی ایسا اساسی وجود یا جوہری حقیقت رہ گئی ہو جس سے استفادہ کا حق بنی آدم کو اس کتاب میں نہیں دیا گیا ہے اسی کے مطابق بے مہابا، بے دھڑک لوگ اپنے اس حق کو استعمال کر رہے ہیں اور اپنے اس قدرتی حق سے مستفید ہو رہے ہیں، الغرض یہ سارے تسخیری مظاہرے اور بنی آدم کے

اقتداری نعرنات كے تماشے جو ہمارے سامنے ہيں، بنائے كہ اس كے سوا آخر ہو نا كيا؟

جو سب كا خالق، سب كا مالك سب كا رازق، سب سے بڑا ہے انسان جب اسی سب سے بڑے كے لئے ہے تو مخلوقات ميں بڑائی كا دعوى اس كے مقابلہ ميں اب كون كر سكتا ہے آپ ديكر رہے ہيں، اپنے طبعي موقف سے ہٹ جانے كے بعد وہي آدمي جو سب سے چھوٹا بن كر رہ گيا تھا، فكري تصحيح كي ايك جست نے اسي كو کہاں سے کہاں پہنچا ديا ساري كائنات كو چير يا پھاڑنا، وہاں پہنچ كيا، جہاں خالق كے سوا كوئي مخلوق نہيں ہے، انسان خدا كے لئے ہے؟ اس كا مطلب جو كچھ بھی ہو، اور وہ مطلب بيان ہی كيا جانے كا، ليكن سوال يہي ہے كہ خدا كے لئے ہو جانے كے بعد انساني وجود كي قدر و قيمت كا بھلا كوئي اندازہ كر سكتا ہے اس كے بعد انسان خواہ كسي قالب ميں ہو، طفوليت كے عہد ميں ہو، يا شباب كے زمانہ ميں، كهولت كي منزل ميں ہو، يا پيرانہ سالي كے دور ميں ہو، انفرادي شكل ميں ہو، يا اجتماعي رنگ ميں، مردانہ سا پنچے ميں ہی انسانيت جلو كر ہوئي ہو يا صنف نازك كے حسين و جميل پيكر ميں ڈھل كر سامنے آئي ہو يقيناً اس كے بعد وہ مسخ ہو جاتي ہے كہ اس كا احترام كيا جائے، اس كي قدر و قيمت پہچاني جائے اس كي قدرتي صلاحيتيں ابھاري جائیں، ان كے سنوارنے كي ممكنہ كوششوں ميں سعی و سرگرمي كا كوئي دقيقہ اٹھانہ ركھا جائے، اس كي حفاظت و نگراني كے لئے حكومت كا نظام قايم كيا جائے۔ عدل و انصاف كے قوانين بنائے جائیں، عدل و انصاف كے محكموں كا جال بچھايا جائے، پوليس ركھی جائے، فوجي دستے بنائے جائیں، اس كے بال بال كي نگراني كي جائے شفا خانے كھولے جائیں سينیٹوريئم قايم كئے جائیں، اس كے لئے مواصلات كے ذرائع ميں سہولتیں پيدا كي جائیں، مدارس و مكاتب، كليات و جوامع سے ان كي آباديوں كو بھرويا جائے۔ الغرض جو كچھ كيا جانا ہے اور ان رايوں ميں جو كچھ كيا جا سكتا ہے، آدمي قدر ثمان سارے نكرمي حقوق كا پيدائشي حقدار بن جاتا ہے ليكن يہ سب جو كچھ بھی ہے، اس وقت تك ہے جب تك كہ سمجھا جائے كہ سب سے بڑے كے لئے آدمي پيدا كيا گيا ہے، اسي وقت تك وہ سب سے بڑا بھی ہے، سب چھوٹے اس كے لئے ان ہی حالت ميں تو بن سكتے ہيں كہ سب سے بڑے كے لئے اس كو سمجھا جائے، اس كي ساري قدر و قيمت، عظمت و شرافت، احترام و كرامت اس كے وجود كے صرف اسي نصب العين ميں پوشيدہ ہے كہ جو سب سے بڑا ہے مانا جائے كہ اسي كے لئے وہ پيدا كيا گيا ہے ليكن خالق كائنات كے قدموں سے ہٹنے لے بدآپ ديكر چلے كہ مخلوقات كے دائرے ميں پہنچ كر انسانيت كي

كوئي قدر و قيمت باقی رہي ہے۔ جو خالق آئندہ

حکیم سنائی

(جناب انعام اللہ خاں صاحب ناشر)

ایڈیٹر روزنامہ الجمعیتہ دہلی

(۳)

سرجان مالکم اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں کہ سلطان نے جو مسجد بنائی وہ شہر کی تمام عمارتوں سے ممتاز تھی۔ سنگ رخام کی وضع فرشوں، کارنگ اور طلائی تندلیوں کی چمک یہ تمام اسباب جو اس کی زمینت کا موجب تھے۔ دیکھنے والوں کے دل میں ایک عجیب کشادگی پیدا کرتے تھے۔ مسجد جامع کا نام عروس ملک تھا۔ اس مسجد کے بیرونی صحن میں فوارے بنائے گئے تھے۔ جن کا پانی بڑی حوض میں گرتا تھا اور اس کے لبریز ہونے کے بعد چھوٹی نالیوں کے ذریعہ بڑی نہر میں چلا جاتا تھا۔ یہ منظر عجیب کیفیت پیدا کرتا تھا کہ اس میں رنگ صنعت کے ساتھ آثار قدرت ملے جملے نظر آتے تھے۔

امین احمد ازمی مؤلف ہفت اقلیم لکھتا ہے کہ ہندوستان کی فتح کے بعد سلطان نے مدینۃ السلام غزنی میں خالص سنگ رخام سے ایک مسجد بنائی جسے عروس الملک کہتے تھے لیکن اب غزنی میں اس مسجد کا کوئی نشان ان سفید پتھروں کے سوا جن پر محراب کی شکلیں بنی ہوئی ہیں نہیں رہا۔ ایک محراب مزار جمع اولیاء میں نظر آتا ہے اس کے بعض حصے ٹوٹے ہوئے ہیں زیارت کی غرض سے دیوار کی طرف نصب ہیں اور اس کے حواشی پر آیات قرآنی منقوش ہیں بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ پتھر اسی مسجد کا محراب ہے اور وہ مسجد یہیں تھی لیکن یہ کہ مسجد جامع ہیں ہو لیکن یہ قیاس کہ پتھر اسی مسجد کا محراب ہے میرے خیال سے بعید از صحت ہے۔

اول تو اس وجہ سے کہ اس پتھر کی جنسیت ایسی خوبصورت اور شاندار مسجد کے محراب کے شاہاں نہیں۔ دوسرے اس وجہ سے کہ پتھر بہت چھوٹا ہے کہ اس کو ایسی بڑی مسجد کا محراب نہیں سمجھا جاسکتا۔ لیکن ایسے پتھر جنہیں جامع محمودی سے متعلق قرار دیا جاسکے غزنی میں اب بھی بکثرت ہیں۔ مزارات عرفاء اور ہر ایک قبر اور مسجد میں یہ پتھر نظر آتے ہیں۔

ان میں سے کچھ پتھر مصلوں کے برابر ہیں اور ہو سکتا ہے کہ یہ اس مسجد سے تعلق رکھتے ہوں۔ ان پتھروں پر ایک حسین خط بصورت محراب بنا ہوا ہے اور کچھ پتھروں پر جو دیوار مسجد سے تعلق رکھتے ہوں بنائے خوشنما پھول اور پتے بنے ہوئے ہیں اور ان کے وسط میں ایک شکل بنی ہوئی ہے۔ جو ہمارے امروزہ رسمی نشان سے جزئی فرق کے ساتھ ملتی جلتی ہے۔ ان پتھروں کے علاوہ جو مسجد سے تعلق رکھتے ہوں بعض اور سفید پتھر بھی برآمد ہوئے ہیں کہ ان پر گھوڑے، ہاتھی، بادشاہوں، سرداران جنگی کی صورتیں بنی ہوئی ہیں۔ ان پتھروں میں سے کچھ پتھر عمارات شاہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک سنگ سفید جو حال میں غزنی کے اندر سید کی علیہ الرحمۃ کی تربت کی دیوار سے نکلا ہے اور کابل کے عجائب خانہ میں موجود ہے۔ اُس پر ایک آدمی کی تصویر بنی ہوئی ہے جو ایک گھوڑے پر سوار تلوار ہاتھ میں لئے ہرن پر حملہ کر رہا ہے اور دوسرے ہاتھ سے شیر کو دفع کرتا ہے جو اس پر چھپے سے حملہ کر رہا ہے۔ اس پتھر کی دوسری طرف حاشیہ میں افیس ہل بوٹے بنے ہوئے ہیں، اور ان پر یہ الفاظ پڑھے جاتے ہیں۔

_____ زمانہ _____ جمال _____ کمال _____

بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ پتھر اُس مکان کا ہے جو فردوسی کے لئے بنایا گیا تھا اس زمانے کے تاریخی پتھروں میں سے جو پتھر اپنی اصلی حالت میں باقی ہے وہ خود اعلیٰ حضرت سلطان محمود کا سنگ ذرا ہے یہ خاں اعلیٰ اور شفاف سے بنایا گیا ہے کہ اس کی مانند پتھر کم نظر آتے ہیں شبلی شعر الجہم میں لکھتے ہیں کہ اس وقت غزنی میں دارالعلوم کے علاوہ ایک عجائب خانہ بھی تھا جس میں اشیاءِ نادر اور گراں بہار بھی ہوتی تھیں غزنی کی ان بیش بہا اور تاریخی چیزوں میں سے مانی کی کتاب ارتنگ بھی تھی ابوالمعالی محمد الحسن بنی طویلی

نے اپنی کتاب بیان الادیان میں جو سال ۴۸۵ ہجری میں تالیف کی گئی لکھا ہے کہ کتاب ارتنگ مانی خزان غزنی میں موجود ہے اس وقت غزنی کو جو عظمت و شہرت حاصل تھی اس کا حال ابن اثیر کی مندرجہ ذیل روایت سے قیاس کیا جاسکتا ہے ابن اثیر مشہد ہجری کے واقعات میں لکھتا ہے۔ جب سلطان سنجر سلجوقی بہرام کو تخت غزنی پر بٹھانے کے لئے آیا اور بہرام شاہ کے بھائی ارسلان شاہ نے شکست کھائی تو مال عنینت میں دوسری اموال کے ساتھ سلطان سنجر کو پانچ شاہی تاج بھی ملے جن میں سے ہر ایک کی قیمت ہزار دینار تھی ایک ہزار اور تین سو قطعات جڑاؤ سونے کے ہاتھ آئے امین احمدازی مؤلف ہفت اقلیم کہتا ہے کہ اس وقت کے غزنی کی وسعت کا اندازہ اس امر سے کیا جاسکتا ہے کہ اس کے مدرسوں اور مسجدوں کی تعداد بارہ ہزار کے قریب تھی۔

یعنی غزنی کی عمارتوں کے متعلق لکھتا ہے کہ سلطان محمود کے ہاتھیوں کے واسطے ایک ہزار احاطے تعمیر کئے گئے تھے۔ اور ہر ایک احاطے میں فیل بانوں کے واسطے ایک بڑا مکان بنایا گیا تھا۔

بہیقی لکھتا ہے کہ ایک بار مسعود سپرین الدولہ نے جنگ کے لئے سفر کرنے سے پیشتر سپدان شاہ میں سے ایک ہزار آٹھ سو ستر زوداؤں کو بھی لے کر غزنی کی دوسری عمارتوں میں سے وہ بندھے جن سے غزنی کی آبیاری ہوتی تھی۔ بابر نے اپنے ترک میں ان بندوں کا ذکر کیا ہے ایک بند کا نام بند سلطان۔ دوسرے کا سخن (مکمل ہے کہ یہ زن خان ہو) اور تیسرے کا نام بند سردا بتاتا ہے۔ یہ اب بھی اسی نام سے معروف ہے۔ جب سلطان علاء الدین نے غزنی کو تباہ کیا تو ان بندوں کو بھی تباہ کر دیا۔ (اعلیٰ حضرت امیر حبیب اللہ خاں شہید نے بند سلطان کی مرمت کرائی تھی) اور بند سردے کی مرمت اعلیٰ حضرت محمد نادر کے حکم سے کی گئی تھی۔

سنائی کے عہد میں غزنی شوکت و قہر کے منتہائے عروج پر تھا اور سنائی خود اس پر مہمیاں کرنے میں۔

اگر آرزوئے معراج است خاک غزنی ترا بہ از تاج است

اگر تجھے عروج کی آرزو ہے تو غزنی کی خاک تیرے لئے تاج سے بہتر ہے

اور حدیقہ میں فرماتے ہیں

عرصہ مملکت چو باغ بہشت مشک از فرس رشتہ با گل و خشت
عرصہ مملکت باغ بہشت ہے اس کی تعمیر میں منتیں مشک از فر کے کارے سے لگائی گئی ہیں
خاک این مملکت شدہ کافور چشم بد باد ازیں حوالی دور
اس ملک کی خاک بھی کافور ہے چشم بد اس سے دور رہے
گر بہ مینی تو ملکت عنزین باز نہ شناسی از بہشت بریں
اگر تو غزنی کو دیکھے گا تو اس میں اور بہشت بریں میں امتیاز نہ کر سکے گا۔

معاصرین سنائی

سلاطین | اس باب میں کہ سنائی نے سلاطین غزنی میں سے کس کا زمانہ پایا۔ مورخین کے درمیان اختلاف ہے
دولت شاہ سمرقندی لطف علی بیگ آذر صاحب خزینہ و صاحب مجمع الفصحا کی تحریریں سے معلوم
ہوتا ہے کہ سنائی سلطان ابراہیم ابن مسعود کے معاصر تھے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ جب سنائی مجذوب لائے خوار
سے دوچار ہوا اس وقت اس نے سلطان ابراہیم کی مدح میں قصیدہ لکھا تھا۔
صاحب مجمع الفصحا کی رائے ہے کہ سنائی کا قصیدہ سلطان ابراہیم کی تعریف میں تھا اور سنائی سلطان
محمود بن الدولہ کے اخیر عہد میں پیدا ہوئے۔

فرشتہ لائے خوار کے واقعہ کو عہد مسعود سے منسوب کرتا ہے لیکن اس تحریر سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ
کون سا مسعود مراد ہے، سلطان محمود کا فرزند مسعود شہید یا سلطان ابراہیم کا بیٹا مسعود تذکرہ دولت شاہ سے
دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ سنائی نے ابراہیم کے آخر عہد میں شاعری شروع کر دی تھی دولت شاہ
نقاری کے اس قصیدے کو جو ردیف شین میں ہے سلطان ابراہیم کی مدح میں سمجھتا ہے اور اس کے
مطلع کو اس طرح لکھتا ہے

ع مسلمان کشن آئین کرد چشم نامسا نش

نمٹاری کے تمام قصائد میں یہ مطلع کسی قصیدے کا نہیں اور اگر یہ قصیدہ وہی ہے جس کا ذکر دولت شاہ نے کیا تو اس قصیدے میں نمٹاری نے سنائی کی تعریف کی ہے

سنائی راہلت ہا بخش تا او ہم چاہے بہر دازد کہ ہمتا نیست اندر شعر اقرانش
فرواندیش تا اورا چہ قادر خاطر ی بخشد کہ در معنی و لفظ خوش مسلم کرد عثمانش

اس قصیدے سے اور خصوصاً اشعار مذکورہ بالا سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سنائی نے عہد ابراہیم میں بھی شعر کہے تھے جتنی نے نفحات میں سنائی کے قصیدے کو سلطان محمود کے نام بتلایا ہے لیکن جیسا کہ خود سنائی کے بیان اور تاریخی استدلال سے ثابت ہوتا ہے حقیقت حال صرف اسی قدر ہے کہ سنائی نے سلطان ابراہیم کا عہد تو دیکھا لیکن اس عہد میں ان کی شاعری کا آغاز نہیں ہوا تھا یا کم از کم مجذوب کی بڑ اور سلطان کی تعریف میں قصیدہ کہنے کا واقعہ نہیں ہوا اس لئے کہ سنائی نے بقول خود حقیقہ کی تصنیف ۵۲۹ھ میں مکمل کی چنانچہ فرماتے ہیں

بنج صد بست و چار رفتہ ز عام پنج صد بست دینج گشتہ تمام
ایک اور جگہ فرماتے ہیں

عمر دادم ۷۰ بہ جنگی برباد بر من آمد ز شصت صد بیداد
میری تمام عمر برباد ہو گئی۔ ۷۰ سالہ ہونا میرے لئے تکلیفوں کا موجب بن گیا
ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے

پائے بر پاتم آمد از غم شصت ۵ جرم دست مینرم بر دست
۷۰ سالہ ہونے کے غم نے جینے سے مجبور کر دیا۔ اب کف افسوس مل رہا ہوں

اس صورت میں کہ سنائی کی عمر حقیقہ کی تالیف کے وقت ۷۰ سال تھی اور وفات ۵۴۵ ہجری میں ہوئی ان کی عمر ۸۰ یا ۸۵ سال کے قریب تھی سلطان ابراہیم نے بقول منہاج سراج ۵۹۲ھ میں وفات پائی سلطان کی وفات کے وقت سنائی کی عمر ۲۷ سال کے قریب ہوگی اور ۵۹۲ھ میں جب سلطان ابراہیم نے

ہندوستان پر لشکر کشی کی سنائی کی عمر سات سال کے قریب ہوگی اور یہ خورشنگی شاعری کے منافی ہے اس کے علاوہ سنائی کے اقوال میں کسی جگہ بھی سلطان ابراہیم کا ذکر موجود نہیں۔ صاحب مجمع الفصحا کا یہ قول کہ سنائی کی ولادت سلطان یمن الدولہ محمود کے آخر عہد میں ہوئی صحت سے بعید ہے اس لئے سلطان محمود نے بقول جلد مورخین ۵۲۷ھ میں وفات پائی، اور سنائی نے ۵۴۷ھ میں۔ مگر سنائی کی ولادت سلطان محمود کے سال وفات میں ہوئی ہو تو اس صورت میں سنائی کی عمر ۱۲ سال ٹھہرتی ہے اور یہ حدود عمر طبعی سے زیادہ ہے، دوسرے یہ کہ سنائی نے حدیقہ میں اپنی جو عمر بتائی ہے اس سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ ان کی عمر ۸۰ یا ۸۵ سال کے قریب ہوئی۔

نعمانی کا قصیدہ بھی اس امر کی دلیل نہیں بن سکتا سنائی نے سلطان ابراہیم کے عہد میں شاعری شروع کی تھی اول اس وجہ سے کہ قصیدہ میں مدوح کا نام نہیں لیا گیا اور یقین کے ساتھ معلوم نہیں ہو سکتا کہ یہ سلطان ابراہیم کی مدح میں ہے دوسرے اس قصیدہ میں مدوح کو ہندوستان کے انتظام کی ترغیب دی گئی ہے۔

یہ ہندوستان بن کر ہے جہاں کالے پر از شمت کہ عبرت نامہ، از مذموران در خراسانش

ہندوستان میں وہ کار نامہ کر جس سے خراسان کے لوگ سبق حاصل کریں

سلطان ابراہیم نے جیسا کہ مذکور ہوا ۵۳۷ھ میں ہندوستان پر فوج کشی کی تھی اس وقت رنجا

کی عمر کم از کم بیس سال ہوئی چاہئے تھی کہ سلطان کی مدح کر سکتا اور یہ پہلے ہی واضح کیا جا چکا ہے کہ سنائی کی عمر اس وقت سات سال تھی۔ اس سے ثابت ہوا کہ سنائی کی ولادت سلطان ابراہیم کے عہد میں ہوئی اور انھوں نے سلطان مسعود پسر ابراہیم کے عہد میں شاعری شروع کی جو بہرام شاہ کے عہد میں ختم ہوئی۔

سلطان ابراہیم ظہیر الدین سلطان ابراہیم بن مسعود (انار اللہ برہانہ) اپنے بھائی فرخ زاد کی وفات کے بعد تخت

نشین ہوئے (فرخ زاد نے ۵۳۷ھ میں بگرامہ قریب وفات پائی)، اس وقت تخت و تاج محمودی حوادث

روزگار کا کھلونا بنا ہوا تھا ایک طرف امر کا اتفاق اندرون ملک سلطنت کی جڑوں پر تیر چلا رہا تھا دوسری

طرف ترکان سلجوقی کا بڑھتا ہوا اقتدار اس کی بنیاد پر متھوڑے لگا رہا تھا۔ سلطان ابراہیم کے پیش نظر وہ مقام

تھے ایک آل سلجوق کے فتنہ کو کچلنا جو خاندان سلجوق کے دیرینہ دشمن تھے اور دوسری طرف ملک کے داخلی نظام میں ترمیم و اصلاح جس کی خرابی بنا ہی کو قریب تر لا رہی تھی۔

سلطان نے پہلا اقدام جو کیا وہ داؤد بن میکائیل سلجوقی سے صلح اور بھائی بندی کا عہد تھا۔ ابن اثیر رقم طراز ہے کہ سلطان ابراہیم نے ۵۵۸ھ میں داؤد سلجوقی سے صلح کر لی دونوں بادشاہوں کو یہ احساس تھا کہ جنگ سے خوزیری اور لشکروں کی زحمت کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوا۔ اس واسطے ایک دوسرے کے مقصودات کی حفاظت کا عہد کر لیا۔ منہاج سراج رقم طراز ہے کہ جب داؤد کو سلطان ابراہیم کے جلوس کی خبر پہنچی تو مغربی خراسان کو بھیج کر سلطان سے صلح کر لی سلطان ابراہیم خاندان سلجوق کے سرنگین کے مردان کا آزمودہ میں شمار ہوتا ہے وہ عظمت محمود کے چراغ کو مکرر روشن کرنا اور اسلاف کی مفتوحہ کشور کو از سر نو مسخر کر کے اپنی سلطنت کی حدود بڑھانا چاہتا تھا، لیکن اس راہ میں بڑی بڑی مشکلیں عائل تھیں۔ سلطان محمود کی وفات کے بعد اس خاندان میں جو تفرق پیدا ہو گیا تھا وہ بڑھتا جا رہا تھا اور جس نسبت سے یہ تفرق ترقی کر رہا تھا اسی نسبت سے خاندان محمودی کی طاقت کم ہو رہی تھی اور دشمنوں کی طاقت بڑھتی جاتی تھی۔

ناصر دین اللہ سلطان مسعود کا اپنے بھائی امیر محمد کے ہاتوں شہید ہونا۔ مسعود اور محمود کے جمع کئے ہوئے مال غنیمت کا غزنی کی فوج کسا ہوا تھا۔ حق ناشناس طغرل کی شورش اور خاندان محمودی میں قتل عام کا ہونا یا ایسے جانگداز صدمے تھے کہ ان سے یکے بعد دیگر اس خاندان ذی شان کے اقتدار کو سخت نقصان پہنچا جس وقت ظہیر الدولہ ابراہیم نے تخت سلطنت غزنی پر جلوس فرمایا اس وقت سلطنت محمود کے دو بڑے حصے یہاں تک بلخ، بست اور ہرات بھی سلاجقہ کے قبضہ میں تھے۔ بہر حال ابراہیم نے غزنی میں اپنی سلطنت کی بنیاد کو مستحکم کیا اور ہندوستان میں اپنے اقتدار کا اثر بڑھایا منہاج سراج لکھتا ہے کہ سلطنت غزنی میں حوادث ابام اور دقلع عجیبہ کے باعث جو غفلت پڑا تھا سلطان ابراہیم کے عہد میں اس کا ازالہ ہو گیا مملکت محمودی از سر نو سرسبز و آباد ہونے لگی ابن اثیر و ابوالفداء سلطان ابراہیم کو شاہ عادل و مجاہد کریم کہتے ہیں اور اس کے فضل و دانش کی تعریف کرتے ہیں ان مورخین کا بیان ہے کہ سلطان سال بھر میں

۱۔ اسکی تفصیل تاریخ سلاجقہ مؤلف عماد کاتب

ایک بار کلام مجید کو اپنے ہاتھ سے لکھتا اور کعبہ شریف میں بھیج دیتا۔ ہر سال تین مہینے روزہ رکھتا۔ فرشتہ
 جوالہ جامع الحکایات رقم طراز ہے کہ سلطان ابراہیم ہر سال ایک بار امام یوسف سجاذندی کو اپنی مجلس میں
 بلاتا امام یوسف وعظ اور پسند کے دوران میں جو سخت باتیں بے محابا کہتے سلطان ان سے آزرہ نہ ہوتا۔ دوسرے
 شاہ سمرقندی جوالہ مقامات ناصری رقم طراز ہے کہ سلطان راتوں کو غزنی کے محلوں میں گھومتے اور تیمانی
 اور بیوگان کو اپنے ہاتھ سے کھانا دیتے۔ سلطان کے عہد میں تمام بیماروں کو دوا اور غذا حکومت کی طرف سے
 مہیا کی جاتی سلاطین سلجوقی سلطان سے تعلیم حاصل کرتے اور اس کا احترام بجالانے۔

سلطان ابراہیم کے عہد میں غزنی کی فوج نے شہر سلکند شہر پر حملہ کر کے اس کو لوٹ لیا اور سلطان
 ملک شاہ سلجوقی کے چچا عثمان کو جو امیر الامرا کا لقب رکھتا تھا گرفتار کر کے غزنی لے آئی سلطان ابراہیم نے
 اسی سال ہندوستان پر فوج کشی کی اور لاہور کے قریب قلعہ اجود کو فتح کر لیا۔ محصور فوج نے جس کی تعداد
 دس ہزار تھی مہتیار ڈال دئے سلطان اجود کی تسخیر کے بعد قلعہ رویال پر حملہ آور ہوا۔ ابن اثیر رقم طراز ہے
 کہ قلعہ رویال ایک پہاڑی پر واقع تھا قلعہ کے ایک طرف درباراں تھا اور دوسری طرف ایک گھنا جنگل
 واقع تھا قلعہ کی طرف صرف ایک گینڈنڈی جانی تھی اس کے سوا اور کوئی راہ نہ تھی۔ اس قلعہ کی حفاظت
 کے لئے ایک کثیر فوج موجود تھی محصور فوج کے پاس ہاتھی بھی تھے لیکن سلطان نے عزم آہنی سے قلعہ کو
 فتح کر لیا۔ اس کے بعد دوسرے دو مقامات کو تین مہینے اور اٹھارہ روز کے محاصرہ کے بعد فتح کر لیا اور بنجیریت
 مل غنیمت لے کر غزنی واپس آیا۔ ابوالفرج اولی نے اس فتح کی نسبت میں قصیدہ لکھا ہے۔ سلطان ابراہیم
 کے عہد کے دوسرے اہم واقعات میں سے یہ ہے کہ سلطان نے ملک شاہ سلجوقی کی بیٹی سے اپنے فرزند
 مسعود کا عقد کر لیا۔

منہاج سراج ملک شاہ کی دختر کا نام عہد عراق میں بتا رہا ہے اور فرشتہ بھی اس کی تائید کرتا ہے
 ابن اثیر لکھتا ہے کہ مسعود کی شادی میں آل سلجوق کے مشہور وزیر نظام الملک نے ایک لاکھ دینار اپنے
 لئے سلکند بفتح اول سکون ثانی طغارسٹان میں ایک بستی کا نام ہے معجم البلدان نے یہ وہ قلعہ ہے کہ جہاں بابا
 فرید شکر گنج رحمۃ اللہ علیہ کا مزار ہے۔

سلطان ابراہیم کے عہد کے دوسرے واقعات میں وہ حبشہ بھی قابل ذکر ہے جو اس نے ملک شاہ سلجوقی کے ساتھ کیا اور اس کو مشرق میں جنگ کا بڑا حیلہ سمجھا جاتا ہے۔

واقعہ یہ تھا کہ سلطان ملک شاہ سلطان ابراہیم کے ساتھ عہد نامہ صلح ہونے سے پہلے غزنی پر حملہ کرنا ہونا چاہتا تھا۔ جس وقت اس کی فوج حملہ کرنے کے لئے جمع ہو گئی سلطان ابراہیم نے ایک تدبیر سوچی اور اپنی طرف سے ملک شاہ کے امراءے لشکر کے نام ایک مکتوب لکھا اور اس میں درج کیا کہ آپ نے عہد کیا ہے کہ جس وقت ملک شاہ کا اور میرے لشکر کا مقابلہ ہو گا اس وقت ملک شاہ کو گرفتار کر کے میرے حوالہ کر دو گے میں آپ کے اس عہد سے بہت خوش ہوں۔ اس مکتوب کو سر بہ ہر کر کے ملک شاہ کے لشکر میں بھیج دیا اور قاصد سے کہہ دیا کہ ملک شاہ کے حضور میں پہنچ جانا۔ اور اول مکتوب لانے کا اقرار نہ کرنا۔ ملک شاہ مجبور کرے تو اس وقت یہ مکتوب اس کو دے دینا۔ ملک شاہ کو شکار کا بہت شوق تھا قاصد جنگل میں ہی ایک مقام پر اس کے سامنے پہنچ گیا۔ ملک شاہ نے اس سے ہر چیز استفسار کیا لیکن اس نے جواب نہ دیا۔ آخر ملک شاہ نے حکم دیا کہ اس کے تازیانہ لٹائے جائیں۔ قاصد کے تازیانہ زنی کے وقت مکتوب اس کے کیسہ سے نمایاں ہو گیا۔ ملک شاہ اس مکتوب کو دیکھ کر اپنے امراءے بدظن ہو گیا اور جنگ کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ سلطان ابراہیم کی وفات کے متعلق اختلاف ہے۔ بعض مورخین سال وفات ۸۴۷ھ بتاتے ہیں محققین متاخر کے نزدیک دوسری روایت صحت سے زیادہ قریب ہے۔

سلطان علاء الدین مسعود سلطان ابراہیم بن سلطان مسعود بن سلطان محمود بن سلطان محمود بن سلطان ابراہیم (مسعود ثالث) ۱۱۸۷ء میں تخت بادشاہی پر جلوس فرما ہوئے۔ طبقات ناصری میں بقول منہاج سراج

ان کا سال جلوس ۹۲ھ ہجری تھا۔ سلطان مسعود خاندان محمود کا نیک نام بادشاہ تھا۔ اس کے عہد میں غزنی راحت و آرام کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ سلطان نے سلجوقیوں کے حملے سے اپنی سلطنت کو محفوظ کر لیا تھا اور ہندوستان میں اپنی سلطنت کی حدود بڑھالی تھیں۔ مسعود کی افواج دریائے گنگا کو عبور کر کے اس مقام تک پہنچی جہاں سلطان محمود کبیر کی فوج کے سوا امرائے اسلام میں سے کسی کی فوج نہیں پہنچی تھی۔

حکیم سنائی مسعود کے عہد میں خاندان محمودی کی سلطنت کو ایک سمندر سے تشبیہ دیتا ہے خاک
غزنی کو آسمان بلند اور اس خاک کے نقش کو عرش کا ہمسر ٹھہراتا ہے دوسرے شعرا نے اس عہد کو غزنی کی نئی
جوانی کے دور سے تعبیر کیا اور اس کی سعادت اور خوش بختی کی تشریہیں کی ہیں۔ اس عہد میں افواج غزنی دہانے
گنگا کو عبور کر کے آگے بڑھیں۔

اور طغان تلگین نامی سردار لشکر نے قلعہ جنگوان فتح کر لیا۔ ابن اثیر لکھتا ہے کہ سلطان نے شوال
۶۷۵ ہجری میں وفات پائی۔ بقول فرشتہ منہاج سراج سلطان نے ۶۷۵ ہجری میں بمقام غزنی داعی اجل
کو لبیک کہا۔

اگر سلطان کے جلوس کا سال ۶۹۲ھ مقرر کریں تو ان کی بادشاہی کی مدت ۱۷۰ سال یعنی اگر ۶۷۵ھ
فرض کریں تو یہ مدت ۲۸ سال ہوتی ہے۔ دولت شاہ نے سلطان مسعود کی حکمرانی کا زمانہ ساٹھ سال
بتایا۔ اور یہ بالکل بعید از قیاس ہے۔

ارسلاں شاہ | تمام مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ سلطان مسعود کی وفات کے بعد اس کا فرزند ارسلاں شاہ
تخت نشین ہوا لیکن حمد اللہ مستوفی تاریخ گزیدہ میں لکھتا ہے کہ مسعود کی وفات کے بعد اول اس کا بیٹا شیراز
بادشاہ ہوا اور ایک سال کے بعد ارسلاں شاہ نے اسے قتل کر کے عنان سلطنت اپنے ہاتھ میں لے لی لیکن
مسند فرما زودائی پر ممکن ہونے کے بعد سلطنت کے ثبات و قیام کی کوشش کرنے کی بجائے وہ اپنے خاندان
کی تباہی و بربادی کا موجب بن گیا۔ اپنی والدہ ہمد علق کو ذلیل کیا اور آل سلجوق کو اپنے اوپر ولیر اور جبری
کر لیا جس انتظام کو مسعود اور ابراہیم نے از سر نو درست کیا تھا اس کا سلسلہ توڑ دیا۔ اپنے بھائیوں کو قید خانے
میں ٹھونسنا۔ بعض کو مار ڈالا۔ اور بعض کی آنکھوں میں سلائی بھرادی لیکن بہرام شاہ اس سے بھاگ کر
اپنے ماموں سخر سلجوقی کی پناہ میں چلا گیا۔ سخر اس وقت اپنے بھائی سلطان محمد کی طرف سے حکومت
خراسان پر مامور تھا۔ اس نے بہرام شاہ کی حمایت کی اور ارسلاں شاہ کو لکھا کہ بہرام شاہ کے ساتھ چھا سلوک
کرے لیکن ارسلاں شاہ نے قبول نہ کیا۔ آخر کار سخر نے بہرام شاہ کی مدد کے لئے ایک فوج تیار کی اور بہرام
کو تخت و تاج دلانے کے لئے حملے کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔

سنجر کے شکر نے پوری تیاری کے بعد ابو الفضل نصر بن خلف حاکم سجستان کی قیادت میں غزنی پر حملہ کیا۔ ارسلان شاہ کو ہزیمت پر مجبور کر دیا ارسلان شاہ نے ہر چند منت و سماجت کی اور عدا اور فوج کے سرداروں کے لئے احسان کا جال بچھایا لیکن وہ اس میں نہ پھنسے۔ سنجر خود بھی غزنی پہنچ گیا۔ ارسلان نے اپنی والدہ ہدیہ عراق کو سفارش کے لئے سنجر کے پاس بھیجا کہ اس کو بہرام شاہ کی مدد اور غزنی کی فتح سے باز رکھے۔ ہدیہ عراق بے شمار تحائف لے کر جس میں دو لاکھ دینار بھی تھے سنجر کے پاس پہنچی لیکن سنجر کو غزنی پر حملہ کرنے سے باز رہنے کی بجائے اس پر قابض اور متصرف ہونے کی زغیب دی۔ سنجر نے غزنی پر حملہ کیا شہر سے ایک فرسخ کے فاصلے پر دونوں افواج کی ٹڈ بھڑ ہوئی۔ مورخین کا بیان ہے کہ اس معرکے میں ارسلان کے پاس تیس ہزار سوار کئی ہزار پیادے اور ایک سو بیس ہاتھی تھے ہر ایک ہاتھی پر چار سپاہی سوار تھے اور ہاتھیوں کے پاؤں میں زنجیر ڈال دی گئی تھی لیکن لشکر اور اسلحہ کی کثرت کے باوجود ارسلان کو شکست ہوئی اور بقول ابن اثیر بہرام شاہ اور سنجر شوال ۳۵۷ھ ہجری میں فاطمہ اور متعاً دبا خل غزنی ہوئے سنجر نے چالیس روز غزنی میں قیام کیا اور ارسلان شاہ کی طرف سے پورے طور پر مطمئن ہونے کے بعد طوس چلا گیا لیکن زیادہ روز نہیں گزرنے پاتے تھے کہ ارسلان شاہ نے ہندوستان سے ایک لشکر لے کر غزنی کا قصد کیا۔ بہرام متعلبے کی تاب نہ دیکھ کر بامیاں چلا گیا اور سنجر سے مدد کا طالب ہوا۔ سنجر نے پھر ایک لشکر جرار مرتب کئے ارسلان شاہ کے مقابلے کے لئے بھیج دیا ارسلان شاہ لشکر سنجر کے آنے کی خبر سن کر غزنی سے چلا گیا اور ایک مہینہ تخت سلطنت پر جلوہ فرما رہے کے بعد ایک کوہ نشین افغان قبیلہ کے پاس پناہ لی۔ سنجر کی فوج نے تعاقب کر کے اسے گرفتار کر لیا اور سنجر کے پاس لے جانا چاہتے تھے لیکن بہرام شاہ نے روک دیا اور غزنی میں تلوار کے گھاٹ اُتار دیا قتل کے بعد ارسلان شاہ کی نعش اس کے باپ کی تربت کے پاس دفن کر دی گئی ابن اثیر اور قرشد نے اس کی عمر ستائیس سال بتائی ہے اور منہاج سراج نے ۳۵ سال ابن اثیر کے نزدیک یہ واقعہ ۳۵۷ھ میں ہوا۔ منہاج سراج کے نزدیک ۳۵۸ھ میں۔

بہرام شاہ | بہرام شاہ علم دوست اور معارف پرور بادشاہ تھا۔ لیکن تدبیر و سیاست بادشاہی میں زیادہ دوراندیش نہ تھا۔

بہرام شاہ کے عہد سلطنت میں شعروادب کا نیا دور شروع ہوا۔ جس طرح سلطان محمود غزنوی نے شعرو شاعری کو حیاتِ جاوداں بخشی تھی اسی طرح شہریار کی عہد میں شاعری کا سنگ بنیاد اخلاق و تصوف کی اساس پر رکھا گیا۔ عصر محمودی نے فردوسی اور عنصری پیدا کئے تھے۔ بہرام شاہ کے عہد نے سنائی سے کسب افتخار کیا۔ شعراء کی جو قدر اور عزت عہد محمود انارشد برہانہ میں تھی وہی بہرام شاہ کے عہد میں تھی بہرام شاہ بھی سلطان محمود کبیر کی طرح اپنے ملک کے علما کی قدر کرتا تھا اور شعراء کے ساتھ محترمانہ پیش آتا تھا۔ اسی وجہ سے شعراء بھی اسے دل سے دوست رکھتے تھے۔

، سید حسن شاعر کہتا ہے

سلطان یمن دولت بہرام شاہ شاہ کہ اقبال او گرفت با انصاف در برم

سلطان یمن دولت بہرام شاہ کے اقبال نے انصاف کے ساتھ مجھے پہلو میں بٹھایا

اے کاشکہ پذیر دے و کارش آمدے تا خان نہادہ در طبقے پیش او برم

کاش وہ قبول کرتا اور اس کے کسی کام آتی تو میں اپنی جان ایک طبق میں رکھ کر نذر کر دیتا

حکیم سنائی فرماتے ہیں

عرش اگر بارگاہ را زبید شاہ بہرام شاہ را زبید

عرش اگر کسی کی بارگاہ کے لئے موزوں ہے تو بہرام شاہ کے لئے زبید چکا

بر خور اے بر شدہ سپہر بلند تو بہ پیرانہ سراز چین فرزند

اے ادبچے آسان اپنی پیرانہ سالی میں اس فرزند سے فائدہ اٹھا

شہ جوان دہان جوان و زماں در اماں ہجو روضہ رضواں

بادشا جوان ہے جہان جوان ہے اور زمانہ روضہ رضواں کی طرح امن میں ہے

سلطنت بہرام شاہ کے عہد کی ایک یادگار کتاب کلید و دمنہ کا ترجمہ ہے یہ کتاب مدتوں سے دنیا

کے دانشمندوں اور عالموں کی منظور نظر تھی اول اس کو ابی جعفر منصور عباسی کے کاتب عبداللہ بن المقفع

نے پہلوی سے عربی میں ترجمہ کیا اس کے بعد ترجمہ خلافت ہدی ۱۶۵۷ء میں عبداللہ بن الہلال الہوازئی نے

فارسی سے عربی میں ترجمہ کیا اور مشہور وزیر بجی بن خالد برکی بلخی کی خدمت میں پیش کیا اور سہل بن زبیر حکیم نے اس کو بجی بن خالد کے لئے رشتہ نظم میں منسلک کیا۔ آل سامان کے عہد میں نصر بن احمد نے اپنے معاصر علماء میں سے ایک کو حکم دیا کہ اس کتاب کو عربی سے فارسی میں ترجمہ کریں اس خاندان کے مشہور شاعر استاد رودکی نے اس کو فارسی میں منظوم کر دیا۔ دولت غزنوی کے عہد میں بہرام شاہ نے نصر اللہ بن عبد الحمید (۵۵۹ - ۵۸۳) کو حکم دیا کہ اس کو دوبارہ عربی سے فارسی میں عبد اللہ بن المقفع کے نسخہ سے ترجمہ کرے۔ نصر اللہ نے بہرام شاہ کے نام پر اس کا ترجمہ کیا۔ اور اس طرح ادب کی بڑی خدمت کی۔ اس کی محنت نے اس کتاب کو جو کئی ملتوں کے دانشمندیوں کے افکار کا پتھر اور تجربات کا نتیجہ تھی زندہ کر دیا۔

بہرام شاہ پینتیس سال تک مسند فرما کر دانی پر متمکن رہا اور اس مدت میں کئی بار ہندوستان پر فرج کشی کر کے نمایاں فتوحات حاصل کیں ایک بار محمد باہلیم نے جو ہندوستان میں ارسلان شاہ کا سپہ سالار تھا ہندوستان کا جھنڈا بلند کر دیا۔

بہرام شاہ نے ۵۱۲ھ ہجری میں اس کو گرفتار کر لیا لیکن چند روز بعد اس کی جاں بخشی کر کے پھر ہندوستان کی سب سالاری پر سرفراز کر دیا۔ باہلیم نے پھر بہرام شاہ کی مخالفت پر کمر باندھی۔ بہرام شاہ اس کی گوشمالی کے لئے ایک لشکر جوار لے کر ہندوستان پہنچا نواح ملتان میں دونوں لشکروں کی ٹڈبٹیر ہوئی۔ باہلیم کے لشکر نے شکست کھائی اور اپنے فرزند سمیت ایک دلدل میں اس طرح بھنس گیا کہ راکب اور مرکوب کا کوئی نشان نہ رہا۔ لیکن افسوس بہرام شاہ کے عہد میں غزنی کو جو خوشحالی نصیب ہوئی تھی وہ دولت مستعمل تھی اور جلد ہی محو اور ناپید ہو گئی۔ بہرام شاہ نے غور کے شہر یار آتشیں کر و علاء الدین بھجیاں سوز کے بھائیوں کو قتل کر کے جس غلطی کا ارتکاب کیا وہ سلطنت غزنی کی بنیاد کو تباہ کرنے کا موجب ہو گئی۔ غزنی بھجیاں سوز | یہ واقعہ اس طرح ہے کہ سلطان علاء الدین کا بھائی قطب الدین محمد بن عزالدین حسین معروف بلک الجبال غور میں اپنے بھائیوں سے کسی قضیہ کی بنا پر ناراض ہو کر غزنی چلا آیا۔ بہرام شاہ نے اس کو اپنا داماد بنالیا اور غزنی میں ٹھہرایا۔ مخالفین نے بہرام شاہ کو قطب الدین کی طرف سے یہ کہہ کر

بدگمان کر دیا کہ یہ آپ کے تخت و تاج کی فکر میں ہے۔ بہرام شاہ کے حکم سے قطب الدین کو پوشیدہ طور پر شربت میں زہر ملا کر ہلاک کر دیا گیا یہ واقعہ قتل سوری کے بعد دوسری بار خاندان غزنوی اور غوری میں عداوت کا موجب بن گیا۔ سیف الدین غوری نے اپنے بھائی کے خون کا بدلہ لینے کے لئے ایک لشکر کے ساتھ غزنی پر حملہ کر دیا۔ اور بقول فرشتہ بہرام شاہ مقابلہ کی تاب نہ لا کر کرمان چلا گیا۔ وبقول ابن اثیر ہندوستان چلا گیا۔ سیف الدین نے ۵۴۳ھ ہجری میں غزنی کو فتح کر لیا۔

باشندگان غزنی اگرچہ ظاہر میں سیف الدین غوری کے حامی تھے لیکن باطن میں اس نسبت نفی کے باعث جو سلاطین غزنی سے رکھتے تھے اور احسان و مروت کے ان حقوق کی بناء پر جو خاندان محمودی کے متعلق اپنے زہر سمجھتے تھے۔ بہرام شاہ کے ہوا خواہ تھے اور اس سے خفیہ خط و کتابت جاری رکھتے تھے۔ سیف الدین نے مطمئن ہو کر اپنا لشکر غزنی سے غور بھیج دیا۔ بہرام شاہ نے دقت سے فائدہ اٹھا کر ۵۴۳ھ میں ایک بڑا لشکر مرتب کیا اور ابراہیم علوی کو سردار سپاہ بنا کر غزنی پر حملہ کر دیا۔

سیف الدین بھی غزنویوں کا ایک لشکر فراہم کر کے بہرام شاہ کے مقابلے کے لئے نکلا۔ لیکن جوئی دونوں لشکر مقابل ہوئے سپاہ غزنی سیف الدین سے برگشتہ ہو کر اپنے قدیم دلی نعمت سے جا ملی۔ اور سیف الدین کو گرفتار کر کے بہرام شاہ کے حوالے کر دیا۔ بہرام شاہ نے حکم دیا کہ سیف الدین کا منہ کالا کرں اور ایک مڑیل سے بیل پر بٹھا کر محلات غزنی کے گردا گرد گھمائیں اور غزنی کی عورتیں اس بیل کے گرد ایک دائرہ کی صورت میں دف بجا بجا کر سیف الدین کی ہجو میں باواز بلند اشعار گاتی جائیں اور اس کے بعد سیف الدین کو بھانسی پر چڑھا دیں۔ جب سلطان علاء الدین کو یہ معلوم ہوا کہ اس کے بھائی کو ایسی ذلت اور رسوائی کے ساتھ ہلاک کیا گیا ہے تو اس کے انتقام کے لئے کمر باندھی اور غور اور غرجستان سے ایک لشکر مرتب کر کے سیف الدین کے خون کا بدلہ لینے کے لئے غزنی پر حملہ کر دیا اور اس سے پہلے یہ بُرائی جو خود اس نے تصذیب کی تھی قاضی القضاۃ غزنی کے پاس بھیج دی۔

اعضائے ممالک جہاں را بد نم جو بندہ خصم خویش و لشکر شکنم
اعضائے ممالک جہاں کے لئے میں بدن کی حیثیت رکھتا ہوں میں اپنے دشمن کو تلاش کرتا ہوں اور
لشکر شکن ہوں

گر غزنی لازب و بن بر نکتم بس من نہ حسین ابن حسین حسن
 اگر میں غزنی کی بنیاد اکھیر کر نہ پھینک دوں تو حسین کا بیٹا حسین نہیں ہوں۔
 جہاں سوزاود بہرام شاہ کے لشکر کے درمیان تین بار لڑائی ہوئی تینوں بار بہرام شاہ کے لشکر کو شکست
 ہوئی آخری بار بہرام شاہ کی فوج کا سپہ سالار دولت شاہ جو اس کا فرزند تھا ہلاک ہو گیا اور بہرام شاہ دل
 شکستہ ہو کر ہندوستان بھاگ آیا۔

خواجہ رشید دیر تاریخ جامعہ میں لکھتا ہے کہ بہرام شاہ اور علاء الدین کا مقابلہ آب باراں کے قریب
 ہوا۔ بہرام شاہ کے پاس بائیس ہاتھی بھی تھے لیکن اس کے باوجود علاء الدین سے شکست کھائی۔ اور
 سردی سے بچنے کے لئے ایک کسان کی جھونپڑی میں پہنچا اور اس سے کہا تمہارے پاس کھانے کے لئے
 کیا چیز ہے۔ کسان نے فطیری روٹی اور پودینہ پیش کیا۔ بہرام شاہ طعام سے فارغ ہونے کے بعد جھونپڑی
 کے لئے لیٹ گیا۔ اور کسان سے کہا کہ کوئی کپڑا لاؤ۔ اس نے کہا کہ اے جوان خدا کی قسم بل کی جھول کے علاوہ
 میرے پاس کوئی کپڑا نہیں اگر تو اجازت دے تو وہ ہی تیرے اوپر ڈال دوں۔ سلطان نے کہا کھلے بد بخت
 اس کا نام کیوں لیا۔ خیر اب جلدی کر اور میرے اوپر ڈال دے دوسرے روز کسان نے سلطان کو پہچان لیا
 اور کہا کہ اس شجاعت اور فیضان جنگی اور مردان شجاع کے باوجود آپ نے ایک غوری سے کیوں شکست
 کھائی سلطان نے کسان سے کہا اپنا سیلو اٹھاؤ کسان نے اس کی تعمیل کی۔ سلطان نے کمان اٹھا کر سیلچے
 پر تیر چلا یا۔ تیر سیلچے سے آسانی گزر کر زمین میں جا گرا۔ سلطان نے قسم کیا اور کہا کہ زور بازو کا یہ تو حل ہے
 لیکن نصیب روگرداں ہے۔

کہتے ہیں کہ سلطان علاء الدین اس حد تک خشمگین تھا کہ لڑائی کے وقت سرخ اطلس کا جامہ پہنا۔
 حاضرین نے عرض کی کہ اس میں کیا حکمت ہے۔ فرمایا کہ جب میرے اعضاء زخمی ہو جائیں اور خون جسم
 پر دال ہو تو میری فوج کو یہ معلوم نہ ہو سکے کہ میں زخمی ہوں اور میری آنکھ بھی خون کو نہ دیکھے۔ آخر کار علاء الدین
 نے غزنی کو فتح کر لیا اور اپنے دو بھائیوں کا انتقام لینے کے لئے ایک قول کے مطابق تین شبانہ روز اور
 ایک قول کے مطابق سات شبانہ روز شہر میں قتل و غارت اور آتش زنی کا بازار گرم رکھا۔ دارالعلوم شرعی

کو جلادیا۔ محمود کی خوابگاہ کو اس کی اولاد کے خون سے رنگین کیا۔ اور حکم دیا کہ سکتگین اور محمود اور مسعود اور
اور ابراہیم کے سوا تمام سلاطین محمودی کی ہڈیاں قبروں سے نکال کر جلادی جائیں ان سات روز میں ^{الدین} علاء
غزنی کے قصر سلطنت میں محو عیش رہا۔ سات روز کے بعد لشکر کو قتل غارت سے ہاتھ کھینچنے کا حکم دیا اور
یہ اشعار اپنی مدح میں لکھے اور مطرووں کو اپنے حضور میں گانے کا حکم دیا۔

جہاں داند کہ من شاہ جہاں نم چراغ دودمان غور یا نم

دنیا جانتی ہے کہ میں شاہ جہاں ہوں۔ اور خاندان غوریان کا چشم چراغ ہوں

علاء الدین حسین ابن حسینم کہ دایم باد ملک جاد دامنم

علاء الدین حسین ابن حسین ہوں میرا ملک ہمیشہ رہے

جو بر گلگون دولت بر نشینم بچے باشد زمین و آسمانم

جب میں سمندر دولت پر سوار ہوتا ہوں تو میرے لئے زمین اور آسمان ایک ہو جاتے ہیں

ہمہ عالم بگردم جو سکندر بہر شہرے شہے دیگر نشانم

لوگ سکندر کی طرح میرے گرد بھی جمع ہیں ہر شہر میں ایک نئے بادشاہ کو تخت نشین کرتا ہوں

بر آں بودم کہ از نغاں بہ غزنی ز تیغ نیز جوی خوں برانم

میرا ارادہ تھا کہ نغان سے غزنی آکر تیغ نیز سے خوں ریزی کروں

ولیکن گندہ پیرانند و طفلان شفاعت می کند سخت جوامم

لیکن یہاں بوڑھے اور بچے رہ گئے ہیں اور میرا سخت جواں ان کی جاں بخشی کی سفارش کرتا ہے

بہ بخشیدم بہ انشاں جان انشاں کہ بادا جان شاں پیونہ جوامم

میں نے ان کی جاں بخشی کر دی ہے ان کی اور میری جان ہمیشہ وابستہ رہے

ہمارا عروج و زوال

از
جناب پروفیسر عبدالماجد صاحب

(سابق اسسٹنٹ ڈائریکٹر تعلیمات اسلامی (بہار))

اوروں کی بے عملیوں کے الزامات ہمارے سر پہ چلنے میں ہمیں حیرت ہے کہ اس علم و دانش کے دور میں اتنی تاریکی اور واقعات و حقائق سے اتنا بُد ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ رہبانیت کی تعلیم اور ترک عمل کی تلقین ترک دنیا کی ہدایت کا رہبری عالم سے ہمیں کتنا دور بھینک سکتی ہے یونان اور روم کے عروج و ترقی کی راہ میں پوپ سدرہ ہوئے طرح طرح کی مشکلیں پیدا کیں یہاں تک کہ بالآخر قوم کو ان سے بغاوت کرنی پڑی۔ اس سے تو ہم واقف ہیں لیکن اس سے یہ نتیجہ برآمد کرنا کہ مذہب اسلام کی تبلیغ و ہدایت بھی دنیاوی ترقی کی منافی ہے بڑا ظلم ہے۔ میں ایک عام فضا دیکھتا ہوں کہ دورِ حاضر کے نو خیز نڈل داوگان سیاست مذہب کے نام سے بدکتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ مذہب ہماری ترقی کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرے گا۔ مجھے افسوس ہے کہ وہ نہ تو اپنی کچھلی تواریخ سے استفادہ کرتے ہیں اور نہ مذہبی زندگی کو غور سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کی ایک جماعت انھیں ایسی بھی نظر آتی ہے جو دنیا و مافیہا سے بے تعلق رہتی ہے۔ وہ صوفیاء کرام کی جماعت ہے یا علماء کا ایک ایسا گروہ ہے جس نے اپنا فرض منصبی محض پڑھنا پڑھنا مقرر کر رکھا ہے۔ موزر الذکر جماعت تو آج بھی ترقی یافتہ دنیا میں بکثرت پائی جاتی ہے۔ یعنی اکثر فنون کے پروفیسر رات دن اپنی فنی تحقیقات میں مصروف رہتے ہیں۔ میں نے سر، بی۔ سی۔ رائے سے ایک دفعہ ملاقات کی خواہش کی اور میں منٹ وقت مانگا تو انھوں نے بہت غور کر کے کہا کہ تم بہار سے کلکتہ آئے ہو اور مجھ سے ملنا چاہتے ہو مگر منٹ وقت تو میں دو ہی صورتوں میں دے سکتا ہوں ایک تو شام کے ٹہلنے کے دوران میں دوسرے لاہور میٹری کے اندر جب میں اپنے آلات

کیمیائی، مرتب کرتا ہاؤں گانم سے باتیں بھی کرنا رہوں گا۔ میں نے موخر الذکر وقت کو پسند کیا اور سچائے تین مہینوں کے ایک گھنٹے باتیں کیں۔ عرض یہ ہے کہ جب تک علم و فن میں اتنا اہٹاک نہ ہو کوئی کمال حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ہمارے علماء جو اپنے علم و فضل میں بلند مقام رکھتے ہیں وہ درس و تدریس کے بعد جو اوقات ہوتے ہیں وہ مطالعہ میں صرف کرتے ہیں اور دنیا و مافیہا سے کم تعلق پیدا کرتے ہیں۔

دوسری جماعت صوفیائے کرام کی ہے۔ اس جماعت کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے، کلا یہ سیاست کی شکست خوردہ جماعت ہے کیونکہ ابتدائے اسلام میں کوئی ایسی جماعت سنی نہیں جاتی جو عمل و جہاد سے الگ رہ کر عبادت میں وقت صرف کرتی سوائے چند اصحابِ صفہ کے جن میں اکثر معذور تھے اور بعض عشقِ الہی میں از خود رفتہ۔ دنیا سے علیحدگی کنارہ کشی اور گوشہ نشینی کی ابتدا تو اس وقت سے وجود میں آئی جب یزید کی خلافت پر حیرہ بیعت لی جانے لگی اور حق شناس بزرگ اس فتنہ سے بچنے کے لئے شہر سے دیہات اور دیہات کی بستیوں سے پھاڑوں کے دروں میں جا چھپے کیونکہ جنگ صفین کا نتیجہ دیکھ لینے کے بعد ان کی ہمت مقاومت پست ہو چکی تھی اور یہ سلسلہ دورِ عباسی کے اخیر تک جاری رہا کیونکہ اس دور میں اہل بیت رسول کے شیعہ انہوں کا گندہ شہروں میں دشوار ہو گیا تھا۔

میں آپ کو اس جماعت کی طرف متوجہ کرانا چاہتا ہوں۔ جس نے عرب کے دورِ ظلم و استبداد کا مقابلہ کیا اور جس نے روم کی بڑھتی ہوئی زنی کو باال کر دیا جس نے ایران کی شہنشاہیت کو صفوی ہستی سے مٹا دیا۔ جس نے نصف صدی کی مدت قلیل میں آباد دنیا کے نصف حصہ پر اپنا غلبہ قائم کیا اور ایک صدی ہونے ہوتے فرانس سے ہندوستان اور ملایا تک اپنا سکہ بٹھلایا۔

اور یہ نہیں کہ کسی ملک پر انگریزوں کی طرح جس کی زنی کی روشنی نے آپ کی نگاہوں کو چکا چوندہ کر دیا ہے۔ صرف سو ڈیڑھ سو برس تک کمزور سی سلطنت کی ہے اور جس نے سلطنت کا لا امداد محض حکمت عملی اور فریب پر رکھا ہو بلکہ وہ جہاں گئے وہاں جڑ کاٹ دی آپ کو یہ خیال دلا کر پست کیا جا رہا ہے کہ اسپین سے مسلمان نکال دئے گئے۔ ہاں نکال دئے گئے کب نکال دئے گئے سات آٹھ سو برس کے بعد اور کب نکال دئے گئے اپنے دین سے غافل ہونے کے بعد کب نکال

دئے گئے۔ افتراق اور جنگ باہمی میں بری طرح الجھنے کے بعد۔ وہ نکال دئے گئے خدا اور رسول سے بغاوت کرنے کے بعد۔

میں آپ کو ان ہی برے دنوں سے متنبہ کرنا چاہتا ہوں۔ جو مجھے تیزی کے ساتھ سامنے آتے نظر آ رہے۔ لیکن میں انھیں روکنے سے اپنے آپ کو معذور نہیں سمجھتا۔ میں ان کو اپنی قوت ایمانی سے زیادہ قوی نہیں پاتا۔ میں اپنے غم اور اپنی جرأت کو سارے آنے والے خطروں پر غالب پاتا ہوں بشرطیکہ آپ ہماری باتوں کو دیوانوں کی بڑبڑ سمجھیں۔ ہمارے سامنے دلائل ہیں۔ میں اصول سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ میں سلسلہ عروج و زوال سمجھانا چاہتا ہوں۔ میں آپ کو نفسیاتی اثرات سے پاک کرنا چاہتا ہوں میں آپ کے احساس کمتری کو دور کرنا چاہتا ہوں۔ میں آپ میں وہ اعصابی انحطاط پاتا ہوں جس میں زوسس (Zosimus) کے جراثیم نشوونما پاتے ہیں۔ اور بالآخر اعضاء انسانی کو مفلوج کر دیتے میرے دوست اور عزیز ہمارے طبیب حقیقی (حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) نے جب صدیق اکبر میں خوف دہرا اس کے آثار پائے۔ تو کیا کیا۔ وہ نسخہ مجرب استعمال فرمایا جس کا اثر آج بھی ایک ایماندار انسان کے اعصاب میں تناؤ اور دل میں جوش اور خون میں گرمی پیدا کرنے کو کافی ہے وہ تھا آپ کی زبان مبارک سے نکلا ہوا ایک فقرہ ”لَا تَخَفْ وَلَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا“ اور وہ نہ منہم ہوا اللہ ہمارے ساتھ ہے عزیز و لفظ ”معا“ (ہمارے ساتھ) کا اطلاق ہر اس شخص اور اس جماعت پر صادق آتا ہے جو ”معہم“ (ان کے ساتھ) ہے یوں سمجھو کہ جب تک ہم ان کے ساتھ ہیں اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ اور جب اللہ ہمارے ساتھ ہے دنیا کی کوئی طاقت کوئی جادو کوئی سحر ہم پر غالب نہیں آسکتا۔

اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ ہماری ترقی کا سبب کیا تھا۔ اور اب زوال کا سبب کیا ہے گین (Gladstone) نے مسلمانوں کے عروج کا سبب یہ بتایا ہے کہ بانی اسلام نے اپنے متبعین کے دل سے موت کا خوف اٹھادیا تھا۔ لین پول (Lane Poul) نے کہا کہ مسلمانوں کی ترقی کا سبب ان کا اتحاد ہے۔ گلڈاسٹن (GLADSTONE) نے کہا ہے کہ جب تک مسلمانوں میں مساوات اور

رواداری ہے۔ کوئی ان کو مٹا نہیں سکتا اور ایک دوسری جگہ کہا کہ حسب تک مسلمانوں میں قرآن ہے یہ قوم مٹ نہیں سکتی۔ یہ اخیر تجویز زیادہ وقع ہے۔

دوسروں نے اسلام کو دور سے دیکھا اور اپنی عقل کے مطابق ایک رائے قائم کی جو ایک حد تک صحیح ہے۔ لیکن میں آپ کو آپ کی ترقی اور عروج کا گرد بنادینا چاہتا ہوں جس کی تفصیل فقہ الدین رازی آٹھ سو صفحے کی آٹھ جلدوں میں پورا نہ کر سکے وہ ہیں یہ دو فقرے ”ایمان“ اور ”اتباع سنت“ میں دو پیرا گراف میں دونوں کی تفصیل کا اختصار کر کے آپ پر چھڑ دینا چاہتا ہوں کہ واقعی محض یہی دو چیزیں ساری ترقیوں کا سبب بن سکتی ہیں کہ نہیں۔

خدا کو ماننا۔ کائنات کا ایک خالق ماننا۔ اس کو ہر جگہ حاضر و ناظر ماننا۔ ہر چیز کا موجد۔ اور سبب ماننا یہ ماننا کہ وہی مارتا ہے وہی جلاتا ہے۔ وہی رزاق ہے۔ وہی مصائب کو دور کرنے کی طاقت رکھتا ہے اسی نے اشیاء میں افعال و خواص دئے ہیں۔ وہی ان کو بدل سکتا ہے۔ وہ نیکی پسند کرتا ہے اور برائی ناپسند کرتا ہے۔ نیکیوں کی مدد فرماتا۔ ظلم و زیادتی کو بالآخر فنا کرتا ہے۔ وہی قوموں کی اور افراد کی قسمت بدل سکتا ہے۔ وہی فتح دیتا ہے۔ وہی مغلوب کرتا ہے۔ غرض وہ قادر مطلق ہے۔ حکیم ہے دانا ہے کوئی دوسرا اس کی قدرت میں شریک نہیں۔

اتباع سنت کیا ہے۔ خدا سے اتنا ڈرنا جتنا ڈرنا چاہئے۔ اس پر بھروسہ رکھنا۔ انسانوں کے ساتھ محبت کا برتاؤ۔ جانوروں کے درد و دکھ کا خیال رکھنا۔ محتاجوں کی مدد کرنا۔ کسی کو اپنے آپ سے بچا نہ سمجھنا۔ بے ضرورت وقت ضائع نہ کرنا۔ جسم اور کپڑے کو صاف و ستھرا رکھنا بے ضرورت کوئی عمل نہ کرنا۔ اسراف نہ کرنا۔ مال جمع کرنے کے شوق میں نہ پڑنا۔ دقت کی پابندی کرنی۔ ہر وقت کے لئے کاموں کا مقرر کر دینا۔ خود غرضی اور نفس پروری سے باز آنا۔ حلال کھانا اور سچ بولنا۔

سنت کا اصل الاصول نیک عمل اور نیک اخلاق اور یہی انسانیت کا راز ہے۔ اقوام کے زوال کا سبب اخلاق کا بگڑ جانا ہوتا ہے اور نیک اخلاق پیدا ہو جانے سے قومیں بنتی ہیں۔ آپ یہ فرمائیں گے کہ بس اسی ایمان اور سنت پر عمل کرنے سے ساری دنیاوی ترقیاں ہو جائیں گی عقل کے

خلاف میں یہ کہوں گا کہ اس کو سچ ماننا ہی خلاف عقل ہے۔ کیونکہ عقل کے موجد عقل کے خالق اور عقل کو نشوونما دینے والے کا بتلایا ہوا یہ راز ہے مجھے خدا نے عقل بتائی ہے اور خدا کے بنائے ہوئے یہ طریقے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ جب مسلمانوں کو مصر کے قلعہ کے فتح کرنے میں دقت ہوئی تو رسول خدا کے فدائیوں نے یہ سوچنا شروع کیا۔ کہ شاید کوئی سنت ترک ہوئی ہے جس کی وجہ سے فتح میں دقتیں واقع ہو رہی ہیں۔ چنانچہ یہ بات بالاتفاق طے پائی کہ مسواک کرنا بھول گئے ہیں چنانچہ سب لوگوں نے مسواک کرنا شروع کی۔ مصریوں نے دیکھا کہ آج سب کے سب دانت سجا رہے ہیں شاید آج ہمیں جیاجائے خوف کھا کر قلعہ خالی کر دیا۔ یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس میں کہاں تک خوش خیالی کو دخل ہے لیکن کیا آپ اس کو محال سمجھتے ہیں کہ اللہ پاک ہمارے کسی عمل یا کسی نیک خیال سے خوش ہو کر ہمارے دشمن کے دل پھیر دے ہمارے نوجوان کہیں گے کہ عروج و ترقی کے لئے کوئی اقتصادی پلان ہونا چاہئے۔ اور کسی صنعت و حرفت کی طرف قوم کو متوجہ کرنا چاہئے نہ کہ محض بوسیدہ اور پارینہ خیالات کو قوم کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ میرے عزیزو کا شکر کہ جب کوئی فصل لگانا چاہتے ہیں پہلے زمین کی تیاری کرتے ہیں زمین کی تیاری میں قبضہ وقت صرف کرتے ہیں۔ اور جس قدر سرگرمی سے مشغول کار ہوتے ہیں اس سے ہزار گونا گم بیج بونے میں وقت لگاتے ہیں اس طرح قوموں کی ترقی اور عروج کے لئے پہلے اصلاح خیال اور اصلاح اخلاق کی ضرورت ہے۔ ورنہ بہتر سے بہتر اسکیم اعلیٰ سے اعلیٰ تدبیر بیکار ہو جاتی ہے جیسے بانگر زمین میں دانہ چھٹنے سے دانہ کو ضائع کرنا ہے۔ کیونکہ زمین میں صلاحیت دانوں کو چھپانے کی نہ ہوگی تو دانے پر بندے کھا جائیں گے۔ اور جو پرندوں سے بچیں گے وہ کیڑے کھا جائیں گے۔ نہ کھیت سرسبز ہوگا اور نہ فصل تیار ہوگی۔

میں نے اس زندگی میں بہت ساری تجویزیں اور ان گنت پلان دیکھے۔ لیکن کسی کو پروان چڑھتے نہ دیکھا بلکہ اکثر ایسے ہوئے جن سے الٹا اثر پیدا ہوا۔ اچھی ہمارے سامنے کی مثالیں ہیں ہندوستان ہی کو لیجئے۔ کانگرس نے بڑی ترقی کی یہاں تک کہ تیس سال کی تنگ و دو کے بعد ہندوستان کو غیر ملکی اثرات سے پاک کیا۔ غلامی دور کی آزادی ملی۔ لیکن آج دیکھئے گلی کوچے میں غریب انسان یہی کہتے

کہتے ہیں کہ گاندھی جی کے سوراخ سے انگریز راج کہیں بہتر تھا۔ کھانے کو غلہ اور پہننے کو کپڑا ملتا تھا۔ آج تو کھانے اور پہننے کو ترس گئے۔ بات کیا تھی زمین ہموار نہیں تھی۔

گورنمنٹ نے طرح طرح کے پلان تیار کر لئے ہیں لیکن غربت بڑھتی جاتی ہے سبب یہ ہے کہ افراد کی تربیت پوری طرح نہ ہو سکی۔ نفاق، عداوت، جنگ جہل، لوٹ مار، دھوکا فریب، جوا، بلیک مارکیٹنگ، رشوت، فضول خرچی، سخی، خود غرضی سارے عیوب موجود ہیں، ابھی چند دن ہوئے ہم نے اپنی آنکھوں سے جاپان کا اقتصادی عروج دیکھا۔ صفت اور تجارت کی ایسی ترقی کہ ہندوستان میں ۵ ریام رگزہ بھیلے اور چکدار کپڑے گھر گھر پہنچا دئے۔ جن کو دیکھ کر حیرت تھی۔ آج وہ قوم ہم سے زیادہ حقیر ہم سے زیادہ پریشان اور ہم سے زیادہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے۔

جرمنی کی سائنس کی ترقی کا کیا پوچھنا ہے۔ جنگ اعظم میں طرح طرح کے حربے نکال دئے۔ وہ تیس گھنٹے گولا کہ جس کی حالت سن کر ہم ہندوستان میں سہمے جا رہے تھے۔ انگلستان والوں کا کیا حال ہوگا۔ خدا ہی جانتا ہے۔ یکایک التوائے جنگ ہو گیا۔ جرمن کو اخراجات جنگ ادا کرنے پڑے ہیں برس بٹاہ عالی میں گذرے لیکن سائنس اک چیز تھی۔ پھر دوبارہ دم خمہ حاصل کر لیا۔ اور ساری دنیا سے لڑنے اور سب کو مغلوب کرنے کوئل گیا۔ وہ حیرت انگیز ایجادیں اور وہ روح فرسا حملے اور وہ ہمت شکن منصوبے کہ اللہ اللہ دنیا چشم براہ تھی کہ جرمنی کہاں کہاں پہنچے ہیں اور کیا کیا اودھم مچاتے ہیں۔ مگر دیکھا یکایک کیا ہوا۔ ایٹم بم کی ایجاد بھی مکمل ہو گئی لیکن جرمنی کا وقار صفحہ ہستی سے مٹ گیا برطانیہ کا وہ عروج کہ سلطنت میں آفتاب غروب نہیں ہوتا تھا۔ وہ حکمت عملی وہ چال پوسی۔ وہ ہشیاری وہ کیا دی کہ دنیا مقابلہ کرنے سے عاری تھی۔ ان کی ہر روش پسندیدہ ان کی ہر بات دلآویز۔ ہر ادا دلکش۔ اور ہر حرکت مہلکی۔ عقلوں کو مفلوج کرنے والی۔ آج مصدق انھیں انگلیوں پر سچا رہا ہے۔ اور کوئی داؤ نہیں چلا اور کوئی جادو اس کے سر نہیں چڑھتا۔

آپ کیا مجھ سے یہ ہی توقع رکھتے ہیں میں آپ کو وہی ہلکی ہلکی تدبیریں بتاؤں جس سے چند دنوں کے تماشے دکھا کر تھینٹ لیا جائے۔ نہیں میں وہ بتاؤں گا جس میں اصلیت ہوگی حقیقت ہوگی۔

جس میں پائنداری ہوگی۔ زراعت کرو تو وہ بیج لگاؤ۔ افغان کی سرزمین پر بار آور ہوا اور ہزاروں سال سے قائم ہے۔ وہ پودا جماؤ جو ایران کی سرزمین پر اگا اور آج تک موجود ہے۔ وہ پیڑ سمٹاؤ جو مصر میں بار آور ہوا اور پھوڑا ہے۔ وہ درخت اگاؤ جو عرب و شام میں جڑ بکڑ گیا ہے۔ پھیلا اور پھیلا پھیلا وہ کام کرو جس میں تائید غنی شامل ملے ہو۔ جس کی طاقت انسانی تدبیر و کوشش سے کہیں بلند و بالا ہو جس کو حقیقت سے لگاؤ ہو۔

وہ کھیل کھیلو جو کھیل جاتے اس مادی مجازی چند روزہ اور مٹ جانے والی دنیا میں اور اس کی داوے۔ نہ مٹنے والے۔ نہ بدلنے والے۔ ہمیشہ قائم رہنے والے عالم میں ”سَرَبْنَا آمِنًا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً“ میں وہ تدبیر بتا رہا ہے جس میں دنیا و آخرت دونوں عالم کی فلاح ہے قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكَّى وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلَّى بَلْ تُؤْثِرُونَ الْحَيَاتِ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ لَّكُمْ مِيرَے دوستو کیا تمہیں اس کا یقین نہیں کہ دنیا و مافیہا۔ اسی ایک مالک کے قبضہ و اختیار میں ہے۔ اس پر جس کو چاہتا ہے تسلط دیتا ہے۔ اور جس سے چاہتا ہے لے لیتا ہے۔ قُلِ اللَّهُمَّ مَالِكُ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ جود بنے والا ہے اور جودے کر چھین لینے والا ہے۔ اُس کی طرف جھکو۔ اُس سے اپنے تعلقات استوار کرو اس کو اپناؤ۔ میں اس سے بہتر کیا تدبیر بتاؤں اس سے اچھی کون سی اسکیم پیش کروں۔ وہ مسبب ہے وہ تدبیریں سمجھانے والا ہے۔ وہ راہیں نکالنے والا ہے اس وقت تو مجھے ہر طرف تاریکی ہی تاریکی نظر آتی ہے۔ ساری راہیں بند معلوم ہوتی ہیں اور ساری تدبیریں مفلوج۔ اس لئے میں اسی کی طرف متوجہ کرانا چاہتا ہوں جو قوتوں کا پیدا کرنے والا ہے۔ جو راہیں کھولنے والا ہے۔ جو اسباب پیدا کرنے والا ہے۔

آپ کو عرب کا حال معلوم ہے، عرب کی وہ پستی۔ وہ تاریکی و ظلمت، وہ دشمنی وہ عداوت، وہ خانہ جنگیاں، اور قبائلی استبداد، غربت و پستی کا حال نہ پوچھئے، فردوسی نے ان کی معاشرتی زندگی کو یوں بلا اختصار بیان کیا ہے۔

پس از خوردنِ کرگس دسوسما
عرب را بجائے رسد است کار
کہ تخت کیاں را کند آرزو
تقویر تو اسے چرخ گردن تقو
اس پستی اور بد حالی سے عربوں کو یکایک سر بلندی اور عروج تک جس تدبیر نے پہنچ کر ہنچایا
وہ محض طاقتِ ایبائی تھی۔ یا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اخلاق۔ اپنے پچھلے دور پر نگاہ ڈالو
اور موجودہ حالت سے ملاؤ۔ اور اس تنزل اور انحطاط کے اسباب و علل پر غور کرو پھر جو تدبیر اور جو
علاج سمجھ میں آئے اس پر ہم اور آپ سب مل کر کار بند ہو جائیں۔

ممبئی، دلی اور کلکتہ جیسے بڑے شہروں میں دیکھتا ہوں کہ ایک بٹن دبانے سے سارا گھر روشن
ہو جاتا ہے۔ پنکھے بھی چل پڑتے ہیں۔ چولہے بھی روشن ہو جاتے ہیں اور ہیٹر بھی گرم۔ کبھی ایسا بھی اتفاق
ہوتا ہے کہ یکایک سارے گھر کے نمقے سمجھ جاتے ہیں پنکھے بند۔ چولہے ٹھنڈے۔ اور ہیٹر سرد۔
ہوتی ہے کہ آخر کیا سبب ہے کہ یکایک جلگاتے ہوئے نمقوں کی روشنی کیا ہوتی اور پنکھے بھی بند ہو
چولہے اور ہیٹر ٹھنڈے پڑ گئے۔ پادر ہاؤس میں تو کوئی گڑ بڑی نہیں ہوتی۔ نہیں سڑکوں پر روشنی تو ہے۔
لامحالہ معلوم ہوتا ہے کہ کنکشن خراب ہو گیا ہے۔ یا تو عدم ادائیگی ٹیکس کی وجہ سے کمپنی نے تار کاٹ دیا
یا یوں ہی تار کمزور ہو کر ٹوٹ گیا ہے یا تار کا رخ کسی اور طرف جا ملا۔

ان ہی اسباب میں سے کوئی سبب تو ہوگا۔ ورنہ وہ ہماری چمک دمک، وہ شان و شوکت وہ
برعب و داب وہ عزت و وقار یکایک کیوں مٹی میں مل گیا۔ اس خلاق عالم کا کاروبار اپنی جگہ پر ہے۔ وہ
تو میں جو پست تھیں۔ وہ جامعین جو گری ہوئی تھیں وہ عروج پر ہیں اور ہم مائل زوال۔ عرب نے
توفیکٹر یاں کھول کر وہ دولت نہیں حاصل کی تھی کہ خیرات لینے والا کوئی منفرد ڈھونڈھنے سے نہیں
ملتا تھا وہ امن و سکون کہ ایران سے مدینہ تک ہاتھوں میں اشرفیاں لئے چلا جائے کوئی اس کی طرف
نگاہ بھی نہ کرے۔ کہاں کی چوری اور کبساڈاکہ، بات یہ تھی کہ ہمارا ایبائی سلسلہ اس قدر مطلق سے ملا ہوا
ہمارا عمل تعلیم محمدی کے مطابق تھا اسی لئے ہماری زنتی بھی عقلوں کو متحیر کر دینے والی ہماری طاقت
طاقتوروں کی بہت توڑ دینے والی تھی۔

ہمارا سخن نکیہ ہو گیا ہے کہ زمانے کے مطابق کام کرنا چاہئے۔ زمانہ کے ساتھ چلنا چاہئے۔ لیکن تجربہ تو یہ ہے کہ ہر زمانے کی ترقی کو پسپا کرنے کے لئے اس قادر مطلق نے ایک نیا طریقہ کار ایجاد فرمایا۔ قوم عادی بڑی بڑی عمارتوں کو منہدم اور پسپا کرنے کے لئے تو مخنیق یا قلعہ شکن ڈائنامائیڈ (Dynamite) تیار کرنا تھا۔ لیکن ایک زلزلے نے اس قوم کو تباہ کر دیا۔ اور ساری عمارتیں منہدم ہو گئیں۔ ٹھوڑے دیکھا کہ عادی زلزلے سے برباد ہو گئے، مکانات گر جاتے اور آدمی اس سے دب جاتے ہیں اس لئے پہاڑ کے چٹانوں میں کھود کھود کر مکانات بنائے تاکہ زلزلوں سے تباہ نہ ہو سکیں، تراخے کی ایک آواز پیدا ہوئی جس سے ساری قوم ہلاک ہو گئی۔ مکانات پڑے کے پڑے رہ گئے۔ موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کا مقابلہ کرنا تھا اور فرعون کے پاس تو گھوڑوں کی کثیر تعداد فوج تھی۔ موسیٰ علیہ السلام کو گھوڑے خریدنے تھے، اور ایک فوج مرتب کرنی تھی۔ لیکن وہ کس طرح تباہ ہوا اور اس کی فوج کس طرح غارت ہوئی دریا ئے نیل میں ڈبا دیا گیا اور پوری فوج غرق ہو کر ہلاک ہوئی۔

ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں۔ روم اور ایران کی دو بڑی طاقتیں تھیں جو آپس میں ایک دوسرے سے لڑتی تھیں تو کبھی یہ ہارتی اور کبھی وہ بعثت کے گھوڑے دن قبل۔ دونوں میں جنگ ہوئی تھی تو ایرانیوں نے دشمن پر اس طرح قبضہ کر لیا تھا کہ نئی قسم کی کشتیاں بنالی تھیں جس پر ردی حملہ نہیں کر سکتے تھے۔ ایرانی اپنی آہنی کشتی کی ٹھوکروں سے ردی کشتیوں کو ڈبا دیتے تھے غرض کہ دونوں کے پاس طرح طرح کے اسلحہ موجود تھے لیکن جب اسلامی فوج تبوک کو روانہ ہوئی تو ادھر چند ہزار فوجی اور بوسیدہ اسلحہ اور نہایت ناکافی رسد ساتھ لے گئے۔ ادھر رومیوں کی فوج دو لاکھ سے زیادہ اور مسلح جس میں پیدل کم اور گھوڑ سوار زیادہ یہاں دو آدمیوں پر ایک سواری مشکل سے تھی۔ دو ماہ تک وہاں ٹھہرے لیکن رومیوں کو مقابلے کی ہمت نہ پڑی۔ اور رفتہ رفتہ تمام سلطنت پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔

میں یہ بتانا چاہتا ہوں زمانہ ہمیشہ آگے بڑھتا جاتا ہے۔ آپ کے لئے کسی منزل پر پڑاؤ نہ ڈالے گا کہ آپ اس کی رفتار سے آگے بڑھ سکیں۔ قومیں جب آگے بڑھی ہیں تو اسباب غنی سے۔

بس قامت خوش کہ زیرِ چادر باشد! چوں باز کنی مادرِ مادر باشد!

زبان جس میں تصورات و مفہومات کو ادا کیا گیا ہے علامہ عنایت اللہ مشرقی کے ”تذکرہ“ سے مستعار لی گئی ہے اور شروع سے آخر تک رجز ہی رجز ہے! کتاب کی زبان کو اہلال مرحوم کی طبیعت کا احیاء قرار دینا صحیح نہیں! اہلال کے مدیر کا قلم جو جالباتی و قلمونی رکھتا ہے اس کا یہاں ہلکا سا اثر بھی نہیں ملتا، تذکرہ کے مصنف اور ہمارے مصنف دونوں کی زبان فلسفے اور شعر کے وقار و رنگینی سے یکساں بے گانہ ہے اور دونوں کے ہاں ”ادعائے ہمدانی“ بہ یک انداز فراوانی موجود ہے! بزرگوں کی نصیحت مٹتی کہ گرمی مجھے آتش درونی، یہاں گرمی ملتی ہے لیکن یہ آتش درونی کا اثر نہیں معلوم ہوتی، درون تو تودہ خاک نظر آتا ہے ”ملتِ ملبسی“۔ ”انا خیر منہ“ ہم عصروں پر مکروہ تنقید و خرد گیری کی صورت میں پڑھنے والے کی رگوں میں آتش انتقام بھڑکا دینی ہے اور وہ کتاب کو ہاتھ سے پھینک کر کہتا ہے۔

نہ سہمی تو مرا، راہِ خوش گیر دردِ ترا سعادت باد، مرا نگوں ساری

علامہ اقبال کو سمجھنے کے لئے ہمارے مصنف کا دعویٰ ہے کہ فلسفے و عمرانیات (1600/500) جدید و قدیم کے ساتھ نہایت بلند ادبی و شاعرانہ تخیل کی بھی ضرورت ہے لیکن پیش نظر کتابچہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارا بلند بانگ رجز خواں مصنف دونوں دائروں میں اپنی محرومی کے غلاء کو زورِ الفاظ سے اس طرح پُر کرنے کی جرأت کرتا ہے کہ گویا دنیا میں اس کے سوا کوئی صاحبِ نظر موجود نہیں! پڑھنے والے کو حضرت مومن کا معاملہ یاد آتا ہے:

مومن تم اور عشقِ بجاں! اے پیر و مرشدِ حیرت! یہ ذکر اور منہ آپ کا، صاحبِ خدا کا نام لو

دعویٰ تو یہ ہے کہ اقبال کے ہمہ گیر فلسفے کی درست کے لئے مقدمہ لکھا گیا ہے، تنقیدی (CRITICAL) اور تحلیلی (ANALYTICAL) طریقہ اختیار کیا گیا ہے اور کتاب میں اقبال کے فلسفے کی نہ تحلیل ہی موجود ہے اور نہ تنقید ہی! ان کے ہم عصروں نے اقبال کے بنیادی خیالات کی جو تنقید و تحلیل کی ہے اس کو منہ زوری سے باطل و خرافات قرار دینا کافی نہیں اپنی صحیح و باعصوب تحقیق بھی پیش کرنی ضروری ہے اور اس کا

ان ۱۳۲ والے بقامت کہتر ”عجلانہ نافقہ“ میں کہیں نشان تک نہیں ملتا! نقاد کو کہنا ہی پڑتا ہے:

طلب منصب فانی نکلند صاحب عقل عاقل آست کہ اندیشہ کند پایاں را

بات یہ ہے کہ ع پایہ پیش آمد پس دیوار، دیوار کھڑی کرنے سے پہلے پایہ یا بنیاد قائم کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، مصنف رجز خواں کے ہاں زور الفاظ کے سوانہ فلسفہ کی قابلیت نظر آتی ہے نہ عمرانیات کی، نہ بلند پایہ شاعرانہ تخیل ملتا ہے، نہ سیرت ساز ادبیت! کتابچہ میں نہ اقبال کے فلسفیانہ افکار کی تخیل ہے نہ شاعرانہ حلاوت کی توضیح یا تنقید! بتلائیے اقبال کے فلسفہ کے مخصوص و منفرد افکار نظریہ خودی، رمز بے خودی، نظریہ عشق و عقل، حیرت قدر، نظریہ آرزو یا تمنا کے سوا اور کیا ہیں؟

شاعرانہ تخیل میں اقبال کی انفرادیت پس یہی تو ہے نہ کہ وہ ایک نصب العین (IDEAL) شاعر ہیں، ہماری صدیوں کی بے مقصد شاعری کو وہ نئی نصب العین سے باندھتے ہیں، وہ اس صدی کا ایک عظیم نشان مصلح ادبیات اسلامی ہے! وہ ہم سے چھین لیا گیا اور اس کے اٹھ جانے سے ہماری دنیا تاریک ہو گئی ہماری بزم برہم ہو گئی۔

رفتم و از رفتن من عالمے تاریک شد من گر شمم چو رفتم بزم برہم ساختم!

مصنف کے ہم عصر علماء نے اقبال کے ان منفردات کی وضاحت کی ہے، ہمارے رجز خواں نے ان سب کی تحقیقات کو ”مجموعہ باطلیل و زخرفات“ قرار دیا ہے اور خود ان پر ایک سطر بھی نہیں لکھی! وہ ان سب پر حملہ کرتا ہے نہیں جانتا کہ وہ خود اپنے ہی پر حملہ کر رہا ہے!

حملہ بر خود کنی اسے سادہ مرد! ہجو آں شیرے کہ بر خود حملہ کرد!

زیر نظر کتابچہ پر سب سے زیادہ اہم تنقید پس یہی ہے، لیکن کہیں کہیں اس نے مذہب و فلسفہ پر اپنے خیال کا اظہار کیا ہے اور جہاں کہیں اس نے کوئی ایجابی بات کہی ہے اس کو بڑھ کر بے اعتبار کہنا پڑتا ہے،

نہ متبعت روپنا نہ ز دیں نصیب منظر بہ فنون بے کمالی چہ قدر کہاں داری

ہمارے اس بیان کی تائید میں اس ”عجلانہ نافقہ“ کے اپنی مقامات کی نشاندہی ہمارے لئے ضروری ہے:

ہم اہل حق سے انصاف کے خواہاں ہیں، یہ معاملہ دین و مذہب کا ہے، اس کے ماخذ کا ہے، اس سے معاشرہ کے فلق کا ہے!

(۱) حقیقت وحی کے متعلق ہمارے مصنف کا الحاد: فرماتے ہیں کہ ”اقبال نے حسب معمول (۱۱: ۵) اپنے ہر ممکن اور باوقار لہجہ میں کہا:

عقل بے مایہ امامت کی سزاوار نہیں راہبرِ وطن و تہمین تو زبوں کارِ حیات
فکر بے نور ترا اور عمل بے بنیاد سخت مشکل ہے کہ روشن ہو شبِ حیات
خوب و ناخوب عمل کی ہو گرہ و کیونکر گر حیات آپ نہ ہو شارحِ اسرارِ حیات

”حقیقت وحی کے اس مہمانہ خیال کو... سن کر ایک عجیب وجد اور سرشاری کی کیفیت لگتی جو صرف محسوس ہی کی جاسکتی ہے الفاظ میں بیان نہیں کی جاسکتی... یہ واقعہ ہے کہ حقیقت وحی کو جس ساحرائے یاسیتِ مہمانہ اختصار کے ساتھ اقبال نے اس قطعہ میں سمودیا ہے وہ آپ اپنی مثال ہے! الہیات کے ایک طالب علم کی حیثیت سے دیانت داری کے ساتھ اپنے اس تاثر کے اظہار میں مجھ کو کوئی تامل نہیں ہے کہ آج تک اسلامی فکر کی پیداوار عقاید و کلام کی بڑی سے بڑی سنجیدہ بحث میں بھی حقیقت وحی کے متعلق اتنی دوس اور اتنی دل نشین فکر نہیں دیکھنے میں آئی... اس مادہ تجل نے وحی کے متعلق اہمیت اور غیریت کے ہر گونہ احساس کو یک لخت فور کر کے یہ محسوس کر لویا کہ وحی باہر سے مجھ پر مسلط کیا ہو کوئی اجنبی حکم نہیں بلکہ یہ تو خود دینی ضمیر کی گہرائیوں سے ابلا ہوا چشمہ ہے... اس طرح چمکا شریعت جس کا سرچشمہ وحی ہے انسان پر چھا ہوا کوئی اجنبی حکم نہیں بلکہ اعلیٰ حیات سے نکلے ہوئے احکام کا مجموعہ ہے... عِزِ حیات آپ نہ ہو شارحِ حیات والے مصرعہ میں ہمارے لفاظ مصنف کے خیال کی رو سے علامہ اقبال نے حقیقت وحی کو مہمانہ انداز میں ادا کر دیا ہے! اور وحی کی حقیقت کیا ہے؟ وحی حدیثِ نفس ہے! خدائے کائنات کی طرف سے روح القدس کے ذریعہ خارج سے، النفس و آفاق سے باورِ احوال و انبیاء پر نازل کی ہوئی کوئی چیز نہیں، بلکہ حدیثِ نفس کی طرح اپنے ہی اندر سے نکلی ہوئی کوئی چیز ہے! ”اعماقِ حیات“ سے ”ضمیر کی گہرائیوں سے ابلا ہوا چشمہ ہے“!!

قرآن مجید میں وحی کے مختلف مراتب کے متعلق کیا کہا گیا ہے؟

(۱) وحی بلا واسطہ مکالمہ الہی ہے:

لَمَّا دَخَلْنَا فِي الْفَنِّ لِي فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ
أَوْ أَدْنَىٰ فَأَوْحَىٰ إِلَىٰ عَبْدِهِ مَا أَوْحَىٰ
(سورہ نجم)

میں خدا آپ سے قریب ہوا اور نزول اجلال فرمایا
اور دو کمان بلکہ اس سے بھی زیادہ قریب ہو گیا
اور اپنے بندے کی طرف وحی بھیجی جو کچھ بھی بھیجی یعنی کلام الہی

(۲) وحی تکلم الہی من وراء الحجاب ہے:

وَكَلَّمَ اللَّهُ مُوسَىٰ تَكْلِيمًا
وَلَمَّا جَاءَ مُوسَىٰ لِمِيقَاتِنَا وَكَلَّمَهُ رَبُّهُ
قَالَ رَبِّ آتِنِي أَنْظُرَ إِلَيْكَ
يَا مُوسَىٰ إِنِّي اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ
بِرِسَالَتِي وَبِكَلَامِي

اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرمایا
اور جب موسیٰ علیہ السلام وقت معین پر پہنچے اور
رب العالمین نے ان سے کلام کیا تو موسیٰ نے کہا
کہ اے رب تو مجھے دکھا کہ میں تجھ کو دیکھوں
اے موسیٰ میں نے تجھ کو اپنے پیغام اور کلام سے برگزیدہ بنایا

(۳) وحی: ارسال ملک، کما قال تعالیٰ:

أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ يَا ذُنُوبُهُ مَا
بِشَاءٍ

یا بھیجتے ہیں حق تم کوئی فرشتہ پس وہ نازل کرنا ہے
ان کے حکم سے جو وہ چاہتے ہیں!

ابتداء نبوت میں جبریل امین اصلی شکل میں وحی الہی لے کر نمودار ہوئے، باقی اکثر اوقات
حضرت وحی کلمی کی شکل میں تشریف لائے تھے جیسا کہ سنن نسائی میں باسناد صحیح عبد اللہ بن عمر رضی
مروی ہے۔

(۴) وحی: صلصلة الجرس۔ گھنٹہ کی طرح گونج اور آواز کا سنائی دینا، جیسا کہ صحیح بخاری میں ام المؤمنین

عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے:

ان الحارث بن عصفار سال رسول
اللہ صلعم فقال يا رسول الله كيف

حارث بن ہشام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ آپ کے پاس

یٰٰتٰیكَ الْوَحٰیؕ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم
اَحْبَابًا یٰٰبَنٰی مِثْلَ صَلَیْلَہٖ الْبَحْرِ
وَهُوَ اَشَدُّ عَلٰی فِیْقَصْمٍ عَنِ وَقْدٍ
وَعِیْتَ عَنْہُ مَا قَالِؕ وَاَحْبَابًا مِثْلَ
لِ الْمَلِٰکِ سِرْجَلَا فِیْ کَلَمٰتِیْ فَاَعٰی
مَا یَقُوْلُؕ قَالَتْ عَالِشَدَّ رُفُوْلُہٗ
رٰبِتَہٗ فِی الْیَوْمِ الشَّدِیْدِ الْبَرِّ
فِیْقَصْمٍ عَنْہُ وَاَنْ جَبِیْنِہٖ یَقِیْقَصْمُ
کیسے دھمی آتی ہے! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے
یہ ارشاد فرمایا کہ کہیں کہیں تو گھنٹہ کی آواز کی طرح آتی
ہے اور دھمی کی یہ قسم میرے اوپر سخت ہے پھر دھمی
مجھ سے منقطع ہو جاتی ہے حالانکہ میں اس کو بہت
محفوظ رکھا ہوتا ہوں جو کچھ کہ فرشتہ نے کہا ہے اور
کہیں کہیں فرشتہ مرد کی صورت میں آتا ہے اور مجھ سے
کلام کرتا ہے اور وہ جو کچھ کہتا ہے اس کو میں محفوظ
رکھتا ہوں۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے
آنحضرت کو سخت سردی کے دن میں دیکھا ہے
کہ دھمی آپ سے منقطع ہوتی تھی اور پسینہ آپ کی

پیشانی سے ٹپکتا تھا

پھر قرآن کریم کی یہ اور اس قبل کی دوسری آیتیں:

اِنَّا اَنْزَلْنٰہُ فِیْ لَیْلَۃٍ الْاَقْدَسِ نَزَّلَہٗ بِرُوحِ الْاَمْرِ عَلٰی قَلْبِکَ

اِنَّہٗ نَزَّلَہٗ عَلٰی قَلْبِکَ بِاِذْنِ اللّٰهِ

ثابت کرتی ہے کہ دھمی خالق کائنات کی طرف سے قلوبِ انبیاء پر نازل کردہ شے ہے نہ کہ چہرہ انداز
کی حدیث نفس، نہ کوئی پر قوت اخلاقی جذبہ کی محجوبی!! اب میں مصنفؒ کہانی سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ
کیا وہ اپنے تخیل کی من مانی شرح اقبال سے دست بردار ہوتے ہیں یا ان آیات و احادیث پر مبنی
کل دین سے دست بردار ہوتے ہیں؟ مصنف جامد عثمانیہ میں شعبہ دینیات کی عداوت کی کرسی
پر فائز ہیں وہ کرسی جس پر کسی زمانہ میں علامہ عبدالقدیر صدیقی مدظلہ اور علامہ مناظر احسن گیلانی مدظلہ
جیسے اکابر فائز تھے! ع

شرعے شرعے کہ رفت اباں شرعے

۱۷) شریعت و معاشرت دو علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں !

ہمارے فاضل مصنف فرماتے ہیں :

داد ضائع معاشرت کو اور ضائع شریعت کے ساتھ خلط ملط کر دینے کا میلان بھی درحقیقت فکری جڑ اور انحطاط کی پیداوار ہے۔ ص ۶۸

اس فیصلہ کا نفاذ درامائی انداز میں ہوا ہے، اس کے لئے ایسٹج اچھی طرح سٹ کیا گیا ہے، اچھے اچھے ایکٹریوہ پریش کئے گئے ہیں، خوب رجز خوانی ہوئی ہے اور پھر فیصلہ سنایا گیا ہے!! ہم پوچھتے ہیں کہ کیا معاشرت کی بنا شریعت کے علاوہ کوئی اور چیز ہے؟ اگر ہے تو براہ کرم اس کو واضح کیا جائے اور ساتھ ہی ”معاشرت“ اور ”شریعت“ کی وضاحت کے ساتھ تعریف کر دی جائے اور دونوں کے حدود متعین کر دئے جائیں !

اگر شریعت و معاشرت کے باہمی رابطہ و تعلق اور ان کی اپنی اپنی حدود کو سمجھنے سے پہلے یہ ملفوظات قلم بند کر لئے گئے تھے تو اس کا بھی اعلان کر دیا جائے، ہم یقین دلاتے ہیں کہ جرمی اردو کی حیثیت سے کتابچہ کی قیمت میں کوئی فرق نہ آئے گا !

فمن یکن الخراب لہ دلیلہ کثر بہ علی جیف الکلاب !
(۳) مولویت کی تضحیک و تذلیل !

ہمارے رجز خواں مصنف نے اپنے اس کتابچہ میں مولویت کی جو تضحیک و تذلیل کی ہے اس کا جواب جمعیتہ العلماء کے کسی عالم کا کام ہے ہم صرف اتنا پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا ہمارے مدن میں مولویت جس غلا کو پر کرتی ہے اس کا کوئی بدل منصرم صدر شعبہ مذہب و ثقافت جامعہ عثمانیہ نے دریافت کر لیا ہے؟ اگر کر لیا ہے تو اس کو کب پیش فرمایا جائے گا۔ علماء اس کے منتظر ہیں !
نف بردوستے قمر بردستے خود است !

(۴) ہمارے مصنف کی فلسفہ دانی : شیخ محی الدین ابن عربی کی اعیان نامہ اور افلاطون کی اعیان

(IDEAS) دونوں ایک ہیں ص ۸۶ - ۹۰

سارے کتا بچہ میں سب سے زیادہ مکروہ اور خبیث چیز مصنف کی وہ ذہنیت ہے جو "ملت
المیسی۔ انا خیر منہ" سے پوری طرح منضج ہو کر ہم عصر علماء کو جنہوں نے اپنی تحقیقات سے
قوم کو فائدہ پہنچایا ہے مکروہ القاب سے یاد کر کے (مثلاً "مسٹر۔ مولانا" "جامد فکر" "تنگ نظر"
"لکیر کے فقیر" "نام نہاد صوفی" وغیرہ) ان پر بعض اقوال، افعال، حرکات کا اتہام رکھ کر، خاص فرنی
واقعات کو ان کی طرف منسوب کر کے فاتحانہ شان سے ان فرنی اقوال و واقعات کی تردید کرتی
چلی جاتی ہے اور (DONALD XOTE) کی طرح اپنے ہی پیدا کردہ وہی مہوتوں کو قتل کرتی
جاتی ہے اور اپنے سیر و دیوے کا اعلان کرتی جاتی ہے اور لذت، شیطانی لذت لینے جاتی ہے!
اسی سلسلہ میں ارشاد ہوا ہے کہ

"اقبال تو افلاطون کے نظریہ اعیان ثابہ کو سلک گو سفندی قرار دیتا ہے الخ (ص ۸۲-۹۰)
پہلے تو افلاطون کے (IDEAS) کا ترجمہ "اعیان ثابہ" نہیں ہو سکتا، اقبال نے
"اعیان نامشہود" کے الفاظ سے ایک جگہ ان کو ادا کیا ہے
شکر ہنگامہ موج و گشت خالق اعیان نامشہود گشت
دوسرے افلاطون کے (IDEAS) اور وحدت الوجود کے قائلین کے "اعیان ثابہ"
میں زمین آسمان کا فرق ہے اقبال نے اگر (IDEAS) کی تردید کی ہے تو یہ ہرگز لازم نہیں آتا کہ وہ
"اعیان ثابہ" کی تردید کر رہے ہیں۔

افلاطون کے IDEAS

(۱) جوہر میں (SUBSTANCE) جو اپنا مستقل بالذات وجود رکھتے ہیں، اپنے وجود میں کسی کے
محتاج نہیں خدا کے بھی محتاج نہیں، وہ مطلق و انتہائی حقائق ہیں، تمام چیزیں ان کی محتاج ہیں وہ کسی کے
محتاج نہیں۔ وہ خدا کے تصورات نہیں معلومات نہیں،

اس کے برخلاف شیخ اکبر کے ہاں اعیان ثابہ خدا کے تصورات یا معلومات ہیں، وہ خدا کے
ذہن یا علم میں پائے جاتے ہیں اور ان کا اپنا کوئی مستقل بالذات وجود نہیں۔

(۲) افلاطون کے (IDEAS) کلیات میں (UNIVERSALS) ہیں۔ افلاطون کے خیال میں

کوئی جزی شے نہیں مثلاً گھوڑے کا IDEAS کوئی جزی گھوڑا نہیں۔ وہ تو تمام گھوڑوں کا کلی نوعی تقص

بالتصور ہے۔ اسی وجہ سے زمانہ جدید میں IDEAS کو کلیات (UNIVERSALS) کہا جاتا ہے

اس کے برخلاف شیخ اکبرؒ کے ہاں اعیان ثابۃ کی تعداد اتنی ہی ہے جتنی کہ عالم شہود یا عالم غیب

میں جزی مخلوقات ہیں، چیزیں ہیں، جزئیات ہیں اور وہ ایک دوسرے سے مختلف و متمیز ہیں۔ ان

کا ایک نظام ہے۔

ہمارے ”الہیات کے اس طالب علم“ کی الہیات دانی پر افسوس ہوتا ہے کہ وہ اتنے فرق کو سمجھ

خدا عالم ہے، جاہل نہیں، اس کا علم قدیم ہے، جیسی اس کی ذات قدیم ہے، عالم میں علم اور

معلومات کا ہونا ضروری ہے، عالم، علم، معلومات لازم و ملزوم ہیں جیسے قتل اور مقتول اور قاتل

جس طرح قاتل بدون قتل ممکن نہیں اسی طرح عالم بدون علم ممکن نہیں اور نہ علم بدون معلوم کے اور نہ

معلوم بدون علم کے بلکہ یہ تینوں عقلاً متلازم ہیں، ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔ جو شخص عالم کو

علم سے علیحدہ سمجھتا ہے اس کو چاہئے کہ عالم کو معلوم سے اور علم کو عالم سے جدا سمجھے کیونکہ ان نسبتوں

میں کوئی فرق نہیں، سب ایک ہی سے ہیں۔

عالم (حق تم) کے ان ہی معلومات کو شیخ اکبرؒ ”اعیان ثابۃ“ قرار دیتے ہیں۔ یہ ان کی اصطلاح ہے

اس اصطلاح کے وضع کرنے کا ان کو حق حاصل ہے جس طرح محدثین و نقباء کو اپنی اپنی اصطلاحات

وضع کرنے کا حق حاصل ہے اور بموجب ”لامناقشۃ فی الاصطلاح“ تمام علوم ایجابی (

میں اصطلاحات کے بغیر گفتگو کرنی محال ہے

قرآن کریم میں حق تم کہتا ہے اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ وہ ہر چیز کو جان کر

پیدا کرتا ہے، نہ جان کر جاہل سے نہیں اب ہر چیز قبل تخلیق و بعد تخلیق خدا کی معلوم ٹھہری۔ کسی عامی کو

بھی اس سے اختلاف نہیں ہو سکتا ورنہ اس کا خدا جاہل ٹھہرتا ہے! کیا ہم سمجھ سکتے ہیں کہ اقبال

کا خدا اس کے عقیدے کی رو سے جاہل ہے، علم سے موصوف نہیں، معلومات نہیں رکھتا؟ اگر یہ محال

ہے تو کیا پھر اقبال اعیانِ نابہ حق سے انکار کر سکتا ہے؟ ہرگز نہیں وہ ”اعیانِ نامشہود“ کا ضرور منکر ہے جو افلاطون کی تخلیق ہیں، جو خدا کے معلومات نہیں، مستقل بالذات حقائق ہیں، جو اہلِ اصول کائنات ہیں! ”کہانی“ لکھنے والا اس نازک فلسفیانہ نکتہ سے کیسے واقف ہو سکتا ہے۔

وَإِنْ كُنْتَ لَا تَدْرِي قَتْلَكَ مُصِيبَةٌ وَإِنْ كُنْتَ تَدْرِي فَالْمُصِيبَةُ عَظِيمَةٌ

اقبال کا مقام ہماری ملیات کی تدوینِ جدید میں کہا ہے؟

اس سوال کا تعلق صرف ہمارے رجز خواں مصنف سے نہیں بلکہ پوری نسل سے ہے۔ علامہ اقبال ہماری صدیوں کی بے مقصد ادبیت کو اپنے ملی نصب العین سے بانڈھنے والے پابندِ معنی کی کوشش کرنے والے ایک نصب العینی شاعر ہیں! ہندوستان میں ہماری ادبی بامقصدیت کا دورِ عالی نذیر احمد، شبلی، اکبر سے گذرتا ہوا اقبال میں آکر اپنے معراجِ کمال پر پہنچ جاتا ہے اقبال ہماری اس صدی کا سب سے بڑا مصلح ادبیاتِ اسلامی ہے! یہ اس کا ٹھیک مقام ہے! یہاں پر یہ سوال مجبوراً اٹھانا ہی پڑتا ہے کہ کیا کسی ملت کی اساس اس کا دین ہوتا ہے اور ادبِ صالح بعد میں خود اس سے پیدا ہوتا ہے اور قصرِ ملت میں محض آرائش و زیبائش کا کام دیتا ہے اور اس طرح اس ملت کی مہارت نظر و فکر کو باقی رکھنے کے لئے مدد و معاون ثابت ہوتا ہے یا برعکس معاملہ یہ ہے کہ کسی ملت کی اساس تو ادبِ صالح کو قرار دیا جائے اور حقائقِ دین کو اس ادب کی تشریح میں محض ضمنیات کی حیثیت سے محض تیزی و شوخی کی خاطر اسٹپا کیا جائے؟ ان دو میں سے ہم کس موقف کو صحیح قرار دے سکتے ہیں؟

ہم بھی اقبال کے مداحوں میں رہے ہیں، مگر ہم خدا کی پناہ مانگتے ہیں اگر ہم نے کہیں اقبال کو ایک مذہبی شخصیت قرار دیا ہو کہ جن کے اشار ہمارے لئے اساسِ دینی کے متعلق محاکمہ کا کام دے سکیں! اگر ہم سے کبھی ایسا مبالغہ ہوا ہے تو رب العزت ہمیں معاف کرے!

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ لَمْ یُکَلِّمْہُمْ اِلَّا نِعْمَۃً اَلْغَمْتَ بِہَا عَلٰی عَقُوْبِہِمْ اَعْلٰی مَعْصِیَتِہِمْ

بین الاقوامی جمہوریت کا جو طوفان مغرب سے اٹھ کر پورے ایشیا و مشرق کو گھیر رہا ہے پوری ملت اسلامی کو بھی ایک دور رس معاشرتی تجدید کے لئے بہت جلد مجبور کر دے گا۔ اس وقت ہمارے فیوضِ

فکری الجہاد سے اور ہماری ناہموار سطح اعتقاد ممکن ہے کہ ہمیں کوئی صحیح راہ عمل اختیار کرنے سے عرصہ دراز تک روک دے۔ ہمیں اچھی طرح جان لینا چاہئے کہ اقبال، سعدی و رومی کے مثیل ہیں اور یہ تینوں ہمارے ادب صالح کے جزا تو ضرور ہیں لیکن ہمارے دین غافل کی اساس مطلق نہیں! اس دوسری حیثیت سے ان کی جس قدر تعبیر کی گئی اور کی جا رہی ہے اسی قدر ملت کے اعتقاد و عمل کے لئے الجہاد سے پیدا ہوتے اور ہو رہے ہیں! زیر تنقید کتابچہ میں اقبال کو اس دوسری حیثیت ہی میں پیش کیا گیا ہے مگر عیشہ کے دامن کہستان از کیست؟

کچھ عرصہ سے یہ دھیمی دھیمی آواز کہیں کہیں سنائی دیتی ہے کہ چونکہ اقبال کے تخیل نے آج کے ہندوستان کی اس شفقہ میت (سٹینلزم) کو نہیں سراہا تھا جو ایک غیر قومی اقتدار کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لئے ملک کے طویل و عرض میں پرورش پا رہی تھی اور اس کے مقابل اس نے مسلمانوں کو اتحاد اسلامی کا سبق دیا لہذا ہندوستان سے اس کے اثر و ختم کر دینا چاہئے! ہندوستان کی تعمیری روح سے میری پروردگار خواست ہے کہ وہ اپنے ”برہمن شراؤشاہکار اقبال“ کو اس نظر سے دیکھے کہ گویا بیسویں صدی کے ہندوستان نے اقبال کے رد میں اسلام کا وہ فرض ادا کیا ہے جو امیر خسرو اور عبدالرحیم خاننماں کی شکل میں ملت اسلامیہ نے ہندوستان کو صدیوں پہلے دیا تھا! اس اقبال کو جو اپنے آپ کو ”برہمن زادہ رمزا شائے روم و تبریز“ اور ”آبا میرے لاتی و مناتی“ کہتے نہیں چوکتا اور پھر بھی ملت اسلامیہ کو توحید باری اور اخوت انسانی کے پیغام کو زندہ کرنے کی دعوت دیتا ہے، ہندوستان کا اپنے جدید قومی سرمایہ کے ایک قیمتی ہیرے کی حیثیت سے تسلیم کرنے کی بجائے اس کو اپنے آئینہ سے خارج کرنا اپنے آپ پر ظلم عظیم کرنا ہے! خدا ہمارے دوا اندیش مفکروں کو اس تنگ نظری کا مقابلہ کرنے کی توفیق دے!

اقبال کی شاعرانہ حیثیت کس قدر بلند تھی اس کا اندازہ کرنے کے لئے میری خواہش ہے کہ بڑا کثرتیج بہاندہ کا وہ بیان تلاش کر کے اخباروں کی فائل سے نکالا جائے جو کہوں نے کچھ عرصہ پہلے علامہ اقبال اور شاعر اعظم ٹیگور کا تقابل کرتے ہوئے دیا تھا۔ ہر ادیب کے لئے ضروری ہے کہ اس پر ایک نظر ڈال لے فلسفے کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میرن رائے میں ایک فن کار شاعر (ARTIST POET) و ادیب کی حیثیت سے ٹیگور کا درجہ اقبال سے بلند ہے لیکن ایک نصب العین شاعر کی حیثیت سے اقبال ٹیگور سے بدرجہا بلند ہے ایک زبان و تشبیہ استعارے کا۔

احسابیت

غزل

(جنابِ اتم منظر نگری)

حسن تو چھایا ہو اکوئین کی محفل پہ تھا
 پارکشتی لگ گئی تو بارشورش دل پہ تھا
 ڈوبنے پر اس حقیقت سے ہوا آگاہ میں
 شمع کے دل پر سحر تک سوز برساتا رہا
 عمر گزرنی ہے امید و بیم کے گرداب میں
 یہ نہ کہتے تھاجوں پرور فقط یسلی کا ناز
 عمر بھر کرتا رہا روشن شبِ تاریک غم
 دیکھتا تھا جب تمہیں کو دیکھتا تھا ہر طرف
 حاصلِ دردِ شکسہ پائی اچھا تو ملا
 اب ہوا محسوس رنجِ حسرتِ آسودگی
 دیکھ اے منعم ہی تھا مجھ میں تجھ میں امتیاز
 قدرِ مشکل کا نہ اندازہ محبت میں ہوا
 یہ نہ لیکن کھل سکا خود عشق کس منزل پہ تھا
 میں ہی کیا ساحل پہ تھا طوفانِ بھی ساحل پہ تھا
 جو نہ دریا میں جا پہنچا وہی ساحل پہ تھا
 وہ فسانہ جو پر پردانہ محفل پہ تھا
 میں کبھی طوفان کی موجوں میں کبھی ساحل پہ تھا
 حسن پیرِ اقیس بھی نہ ہر پردہ تحمل پہ تھا
 صرف وہ اک درِ غنا کامی جو میرے دل پہ تھا
 اعتبار اتنا مجھے ہر جلوۂ باطل پہ تھا
 ساری دنیا راہ میں تھی اور میں منزل پہ تھا
 دوسرا طوفان تھا وہ شور جو ساحل پہ تھا
 تیرا قبضہ تھا جہاں پر میرا قبضہ دل پہ تھا
 دل جو آمادہ مرا آسانی مشکل پہ تھا

ان کے کوچے میں اتم کو آج دیکھا اس طرح

آنکھ سونے آسمان تھی دستِ حسرتِ دل پہ تھا

شعور علیہ

عمر کی گنتی | پچاس برس کی عمر تک انسان اپنی زندگی کے لمحوں کو کس طرح گزارتا ہے اس کا ایک تخمینہ مغربی طرز کی زندگی کے لئے شائع ہوا ہے۔ اس کے اعداد و شمار دلچسپی سے خالی نہیں۔

ایک شخص، بجے صبح اٹھتا ہے۔ اور ۱۱ بجے شب کو گھرواپس آتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ اس نے بہت مصروف دن گزارا۔ اب اس کی اس نام نہاد مصروفیت کا جائزہ لینا ہے۔

کناڈا کے مشہور ماہر طبیعیات ڈاکٹر میری سیل نے ڈاڑھی چھوڑ دی ہے وہ کہتے ہیں کہ ڈاڑھی مونڈنے میں وقت بہت صرف ہوتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے حساب لگایا کہ اگر ہر ”مونڈ“ پر ۶ منٹ صرف ہوں تو روزانہ ۶ منٹ کے حساب سے ۵۰ برس میں ۱۸۰۰ گھنٹے ”مونڈن“ کی تذر ہو جاتے ہیں۔

یہ مساوی ہوئے کام کے ۲۲۵ دن کے جن میں جوہری طبیعیات کی بہت کچھ تحقیق کی جاسکتی ہے۔

یہ تو ”صاحب خانہ“ کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہوا۔ اب ”اہل خانہ“ کو لیجئے۔ روزانہ جو کام اسے کرنا پڑتا ہے اس میں وہ سال بھر میں ۳۰۰۰ میل کی مسافت طے کرتی ہے۔ تو ۵۰ برس میں مسافت ۱۵۰،۰۰۰ میل کی ہو جائے گی۔

اب ذرا سگرٹ نوشی کو دیکھتے۔ برطانیہ میں ہر سال ۴۰،۰۰۰،۶۹،۸۹،۴۵ (۴۵ ارب ۸۹ کروڑ ۶۹ لاکھ دو ہزار ۴۵ سو) سگرٹ نوش کئے جاتے ہیں ہر سگریٹ پر اگر ۵ منٹ صرف ہوں اور ہر سگریٹ نوش اوسطاً ۲۰ سگرٹ سالانہ نوش کرے تو تخمیناً ۶ لاکھ ۱۶ گھنٹوں کی مدت ہوئی جس میں سے نصف تو یوں ہی گزر جاتے ہیں۔

پس ہر سال کے ۸ گھنٹے نکالے جائیں تو ۵۰ برس میں یہ مدت تقریباً ۱۵ دن کی مدت ہوگی ۲۲۵ دن کی میزان پہلے آچکی۔ لہذا اب جلد ۲۲۵ دن ہو گئے۔

یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ہر روز کی آبادی میں کوئی ۲ کروڑ ٹکٹ ایک کے فروخت ہوتے ہیں اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک شخص ڈھائی دن کے اندر ایک مرتبہ ضرور ٹکٹ چسپاں کرتا ہے۔ اگر ہر "چسپ" کے لئے ۲ سکندر کھے جائیں تو سال بھر میں چسپیوں کی تعداد ۴۴ ہوگی اور پھر ۵ برس میں جلد مدت ۴ گھنٹہ ہوگی۔

آدمی مصافحہ بھی کرتا ہے یا اس کے قایم مقام جو عمل ہوا سے انجام دیتا ہے اس میں کہا گیا ہے کہ ۱۲ سکندر کی مدت صرف ہوتی ہے۔ لیکن احتیاطاً اگر ہم ۵ سکندر کی مدت اس عمل کی قرار دیں تو پھر ۵۰ برس میں ۲۵ گھنٹے مصافحہ بازی کے ہوئے۔

پھر باتھ منہ کا دھونا ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس میں روزانہ ہر شخص کو ۲۵ منٹ صرف کرنا پڑتے ہیں۔ پس ایک اوسط پاک صاف آدمی کو ۵۰ برس میں ۳۲ دن اس کی نذر کرنا پڑتے ہیں۔

ایک نوزائیدہ بچہ ۲۲ گھنٹہ روزانہ سوتا ہے۔ آگے چل کر نیند کے ۸ گھنٹے رہ جاتے ہیں۔ کوئی کتنا ہی زور مارے لیکن مسلسل ۱۰ گھنٹوں سے زیادہ جاگ نہیں سکتا۔ پس ایک تہائی عمر ستر پر کوٹ بدلنے میں صرف ہو جاتی ہے۔ ۵۰ برس میں یہ مدت ۱۷ برس کی ہوئی۔

اب ذرا لباس کو لیجئے۔

مرد کے مقابلے میں عورت لباس پر وقت زیادہ صرف کرتی ہے لیکن اوسطاً ہر روز ۱۸ منٹ کپڑے اتارنے اور پہننے میں صرف ہوتے ہیں۔ لیکن ہے کہ بعض لوگ جلد ز لباس تبدیل کر لیتے ہوں۔ مگر یاد رکھئے یہ اوسط ہے۔ اس لئے ۵۰ برس میں ۲۴ دن لباس میں طے ہو جاتے ہیں۔

پھر کھانا پینا الگ رہا۔ روزانہ ۴۰ منٹ اس پر صرف ہوتے ہیں۔ عمر زیادہ ہو جاتی ہے تو یہ مدت ایک گھنٹہ ہوتی ہے۔ پس محتاط اندازہ یہ ہوا کہ ۴۰ منٹ روزانہ اس چکی پیسنے میں صرف ہو جاتے ہیں ۵۰ برس کی مدت میں یہ سب مدت ۱۷ دن کی ہوئی۔ اور ہر کے ۲۴ دن جمع کئے تو مدت ۲ برس ۸۶ دن ہوئی۔

غرض کہ ۵۰ برس میں سے ۲۱ برس کے قریب ان سب باتوں کے نذر ہو گئے۔ اب یہ نہ بھولنے کہ آدمی خاموش نہیں رہتا ہے۔ بولتا بھی ہے بحث بھی کرتا ہے اگر اوسطاً ۴۵ منٹ اس روزانہ مشق کے لئے رکھئے تو ۵۰ برس میں ۲۶ دن ہو گئے۔ پھر بھی یاد رکھئے کہ بعض لوگ بھولتے بہت ہیں اس لئے ان کو ایک ہی کام دوبار یا تین بار کرنا پڑتا ہے۔ روزانہ ۲۴ منٹ اس کو دیجئے تو ۵۰ برس میں ۳۱ دن ہونے اسی طرح کی اور باتیں ہیں جن کو اگر حساب میں لایا جائے تو ۵۰ برس میں سے ۲۶ برس

تیسرے

پارہ اول قرآن مجید مع ترجمہ و تفسیر از جناب مولانا عبدالمجید دریابادی، تقطیع کلاں ضخامت ۴۵ صفحہ کاغذ۔ کتابت اور طباعت نہایت اعلیٰ اور شاندار و دیدہ زیب، ہدیہ مرقوم نہیں شائع کردہ تاج کمپنی لمیٹڈ۔ لاہور و کراچی۔

اردو میں قرآن مجید کے تراجم کی کمی نہیں ہے، لیکن ان میں سے بعض تو ایسے تحت الفاظ میں کرانہیں پڑھکر مطلب سمجھنا انتہائی مشکل ہے اور بعض ترجمے صاف اور سیاٹ ہیں تو ان میں بعض دوسری قسم کے نقائص ہیں مثلاً مترجم خود اگر عقائد صحیح نہیں رکھتا تو اس نے ترجمہ میں کھینچ تان کر کے مطلب کچھ سے کچھ کر دیا ہے یا کم از کم ترجمہ اجتہادی شان کے ساتھ کیا ہے جس کے باعث سلف صالحین کے مسلک سے بُد پیدا ہو گیا ہے، اس بارِ ضرورت تھی کہ قرآن مجید کا ایک ایسا اردو ترجمہ کیا جائے جو عام فہم سلیس شگفتہ دروان ہونے کے ساتھ آزاد ترجمہ بھی ہو اور بس میں سلف صالحین کے مسلک سے عدول بھی نہ پایا جائے۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ جناب مولانا عبدالمجید دریابادی نے ایک عرصہ کی محنت شاقہ کے بعد قرآن مجید کا ترجمہ لکھ کر اس ضرورت کو بڑی حد تک پورا کر دیا ہے ترجمہ میں اس بات کی پوری رعایت رکھی گئی ہے کہ اردو کے الفاظ قرآن مجید کے الفاظ کے مطابق ہی رہیں، نہ کم ہوں اور نہ زیادہ، لیکن چوں کہ اس پابندی سے بعض اوقات مطلب گنجلک ہو جاتا تھا، اس لئے اس قسم کے مواقع پر قریب میں کچھ الفاظ بڑھا کر عبارت کو مربوط قابل فہم اور آسان بنا دیا ہے۔ اس اہتمام کے باعث اب یہ ترجمہ اس لائق ہے کہ جو متوسط الاستعداد اردو داں ان کو پڑھیں گے اسے قرآن مجید کی آیات کا مطلب سمجھنے میں شولہ نہ ہوگی! ترجمہ کے علاوہ تفسیر بھی نہایت مفید پر از معلومات اور بصیرت افروز ہے، تفسیر میں مولانا نے پہلے الفاظ کی لغوی تحقیق عربی لغت کی مشہور و مستند کتابوں کی روشنی میں اور ان کے حوالہ سے کی ہے، اور اس سلسلہ میں بلا تخریف عبارتیں تک نقل کرتے چلے گئے ہیں، پھر کسی آیت کا مطلب یا اس سے مستخرج حکم کے بارہ میں جو

مشہور تفاسیر منقول ہیں ان کو نقل کیا ہے اور اس کے بعد جو قول مرشح ہے اس کو دلائل و براہین کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اس ذیل میں فرق باطلہ کا ذکر آگیا ہے تو ان کی تردید بھی ہوتی گئی ہے اور جہاں کہیں موقع ملا ہے قرآن مجید کی سچائیوں کو ثابت کرنے کے سلسلہ میں عہد حاضر کے جدید علمی اکتشافات یا بعض علماء مغرب کے اقوال و آراء بھی بیان کر دئے گئے ہیں اس میں شبہ نہیں کہ مولانا دریا بادی نے ترجمہ و تفسیر کا یہ کام بڑی محنت و عرق ریزی اور مسلسل انہماک و مصروفیت سے انجام دیا ہے۔ خود انہوں نے کتب لغت و تفاسیر اور دوسرے علوم متعلقہ کی کتابوں کا مطالعہ دیدہ ریزی کے ساتھ کیا، اور دوران مصروفیت میں حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے جن کے جگہ جگہ حوالے بھی ہیں۔ ایک ایک آیت اور لفظ کے ترجمہ و تفسیر کے متعلق تقریراً مشورہ بھی کرتے رہے ہیں، ان خصوصیات کی بنا پر ترجمہ و تفسیر موجود اردو تراجم و تفاسیر میں ایک نمایاں مقام کا مستحق ہے۔ حق تعالیٰ فاعل توفیق کو اس کا اجر جزیل اور مسلمانوں کو اس سے استفادہ کی توفیق عطا فرمائے اور جناب ناشر نے جس ذوق و شوق اور اہتمام و انتظام کے ساتھ شائع کیا ہے اللہ تعالیٰ ان کو بھی اس کا بدلہ عنایت فرمائے ۱۱

از مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی تقطیع کلاں، ضخامت ۴۰۵ صفحات کتابت و طباعت اعلیٰ قیمت ہے چھ روپیہ آٹھ آنہ۔ پتہ دار المصنفین اعظم گڑھ۔

اسلام اور عربی تمدن

استاذ کرد علی شام کے نامور فاضل اور محقق ہیں۔ موصوف نے عرصہ ہوا ایک کتاب الاسلام والحضارة العربیہ کے نام سے لکھی تھی جو اسی زمانہ میں عربی دنیا میں بہت مقبول اور مشہور ہوئی تھی، اس میں اسلام اسلامی تاریخ اور اسلامی تہذیب و تمدن سے متعلق علماء مغرب کے اعتراضات کے مدلل اور محققانہ جوابات دینے کے ساتھ ساتھ عربوں کے تہذیبی و تمدنی لمالات اور اس کا خط و خال اور یورپ پر عربوں کے علمی و تمدنی احسانات اور ان کے نتائج و اثرات کو بڑی خوبی اور عمدگی سے بیان کیا گیا ہے اگرچہ کتاب سے مصنف کی عربی عصیبت جگہ جگہ نمایاں ہے جس کے باعث وہ عربوں کے مقابلہ میں منلوں اور ترکوں کو نہ صرف یہ کہ کوئی اہمیت ہی نہیں دیتے بلکہ بعض یورپین مصنفوں کی تقلید میں ظلم و جور اور اسلام ناشناسی کے ایسے

الزامات ان پر عائد کر دئے ہیں جو تاریخی اعتبار سے کسی طرح صحیح نہیں ہیں پھر جہاں تک فنونِ لطیفہ اور مادی زندگی کے مرغوبات و مسئلہات کا تعلق ہے۔ مصنف نے ان کے بیان کرنے میں بھی اسلامی نقطہ نظر کا خیال نہیں رکھا اور کتاب الاغانی وغیرہ جیسی کتابوں کی بنیاد پر عربی تمدن میں ان چیزوں کی اہمیت کو بھی نمایاں کر دکھایا ہے۔ تاہم مجموعی اعتبار سے یہ بہت قابل قدر اور پر از معلومات کتاب تھی اور اس بنا پر اردو خواں طبقہ کو فاضل مترجم کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ انہوں نے اس کو اردو میں منتقل کر کے اردو ادب میں ایک اچھا اور مفید اضافہ کر دیا، ترجمہ بہت صاف اور شگفتہ ہے جس سے ترجمہ پر اصل کا گمان ہوتا ہے۔ پھر کہیں کہیں مختصر حواشی بھی ہیں جن میں مصنف کی رائے سے اپنا اختلاف ظاہر کروایا گیا ہے۔ حق یہ ہے کہ اس کتاب کے اردو ترجمہ کا اور حواشی میں اس کتاب کے بعض بیانات سے اختلاف ظاہر کرنے کا حق اردو میں بسوٹا تاریخ اسلام کے مصنف کے علاوہ اور کس کو ہو سکتا تھا۔ امید ہے کہ ارباب ذوق اس کی قدر کریں گے۔

مرتبہ مولانا محمد منظور نعمانی تقطیع خور و ضخامت اہم صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت ایک روپیہ چار آنے علم پتہ:- کتب خانہ الفرقان لکھنؤ۔

تصوف کیا ہے؟

تصوف آج کل کی علمی دنیا کا بہت مقبول و محبوب موضوع ہے جس پر آئے دن انگریزی۔ عربی۔ اردو۔ ہندی اور دوسری زبانوں میں کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں لیکن جہاں تک اسلامی تصوف کا تعلق ہے تو انسوس ہے کہ بعض ارباب ضلال کی علمی و عملی گمراہیوں کے باعث اس کی اصل حقیقت اس طرح گم ہوئی ہے کہ اس کا پتہ چلانا بھی مشکل ہے۔ اس کتاب میں اسی حقیقت گمشدہ کو ڈھونڈ نکالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ دراصل کوئی مستقل تصنیف نہیں بلکہ لائق مرتب نے جو غالباً اب تک تجربہ۔ تلاش۔ اور تحقیق و جستجو کے دور سے ہی گزر رہے ہیں پہلے اپنی ایک سرگزشت بیان کی ہے اور پھر ایک بزرگ کے فیضانِ صحبت سے تصوف کی جو حقیقت ان پر واضح ہوئی ہے اس کی اور اس کے اعمال و اشغال کی نسبت آپ نے چند یقین بیان کئے ہیں اس کے بعد مولانا محمد اویس ندوی اور مولانا

ابوالحسن علی مددی کے مختصر مختصر حید مقالات ہیں جن میں تصوف سے متعلق بعض شکوک و شبہات کا جواب دیا گیا ہے اور تصوف کے لطائف و مزایا۔ اور اس کی دینی برکات بیان کی گئی ہیں اگرچہ تصوف جیسے اہم وسیع اور گراں مرتبت موضوع پر اس کتاب کو سیر حاصل نہیں کہا جاسکتا تاہم تصوف کے ایک طالب علم اور مبتدی کے لئے اس کا مطالعہ مفید ہوگا اور اس کو اس میں بہت سی کام کی باتیں بھی نظر آئیں گی

از مولوی محمد طاہر قاسمی مرحوم تقطیع متوسط کتابت و طباعت بہتر خدمات

عقاید الاسلام قاسمی ۱۹۲ صفحات قیمت بچہ پتہ :- محمد آصف قاسمی منیجر کتب خانہ قاسمی

دیوبند ضلع سہارنپور (وی۔ پی)

اس کتاب میں پہلے مولانا سید سلیمان مددی کے قلم سے اسلام میں عقاید کی حقیقت و اہمیت پر ایک مقالہ ہے اور اس کے بعد بچوں کو خطاب کر کے اسلام کے مختلف عقاید اور ان کے علاوہ دوسرے دینی، علمی، اخلاقی اور تمدنی مسائل و احکام پر آسان اور سلیس و دلنشین سیرایہ میں گفتگو کی گئی ہے اور اس طرح اگرچہ یہ کتاب بچوں کے لئے لکھی گئی ہے لیکن اس لائق ہے کہ بڑے بھی اس کا مطالعہ کریں اور اس سے فائدہ اٹھائیں اور اس کو اسکولوں اور مکاتب کے نصاب و دینیات میں شامل کیا جائے

غلامانِ اسلام

اسٹی کے قریب ان صحابہ تابعین، تبع تابعین، فقہاء اور محدثین اور ارباب کشف و کرامات اور اصحاب علم و ادب کے سوانح حیات اور کمالات و فضائل بڑی تحقیق و تدقّق سے جمع کئے گئے ہیں جنہوں نے غلام یا آزاد کردہ غلام ہونے کے باوجود ملت کی عظیم الشان خدمتیں انجام دیں جنہیں اسلامی سوسائٹی کے ہر درجہ عظمت و بلند ار کا فلک لافلاک سمجھا گیا اور جن کے علمی، مذہبی، تاریخی اور سماجی کارنامے اس قدر شاندار اور اس قدر روشن ہیں کہ ان کی غلامی پر آزادی کو رشک کرنے کا حق ہے اور سچا ہے یہ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ ایسی محققانہ و تحسین و معلومات سے بھرپور کتاب اس موضوع پر اب تک کسی زبان میں شائع نہیں ہوئی اس کے مطالعہ سے غلامانِ اسلام کے حیرت انگیز اور شاندار کارناموں کا نقشہ آنکھوں میں سما جاتا ہے۔ دوسرا ایڈیشن ۸۸۸ بڑی تقطیع قیمت پانچ روپے ۸۸۸ جلد ہے

ندوة المصنفین کی تاریخی کتابیں

علامان اسلام

انہی سے زیادہ علامان اسلام کے کمالات و فضائل
اھکار ناموں کا ایمان افروز بیان

عرب اور اسلام

ڈاکٹر حقی کی مشہور و معروف کتاب کا آسان اور
نفیس ترجمہ۔

قیمت چھ مہلے سے

قیمت چھ مہلے سے

تاریخ اسلام آٹھ جلدوں میں

تھوڑے وقت میں تاریخ اسلام پڑھنے والوں کے لئے یہ کتاب بہت
مفید ہے۔ تاریخ ملت کے یہ تمام حصے مستند و معتبر بھی ہیں اور جامع و
مکمل بھی طرز بیان نہایت شگفتہ و رواں ترتیب دل نشین

تاریخ اسلام پر ایک نظر

تاریخ اسلام کے تمام
ادوار کے ضروری حالات

قرون وسطیٰ

مسلمانوں کی علمی خدمات

قرون وسطیٰ کے مہلے

اسلام سائنس دانوں

اور فلاسفوں کے پیشانی

علمی کارناموں کا بیان

قیمت چھ مہلے سے

قیمت چھ مہلے سے

قیمت چھ مہلے سے

قیمت چھ مہلے سے

قیمت چھ مہلے سے

قیمت چھ مہلے سے

خلافت راشدہ

خلافت عباسیہ

خلافت عثمانیہ

خلافت عثمانیہ

خلافت عثمانیہ

خلافت عثمانیہ

خلافت عثمانیہ

خلافت عثمانیہ

خلافت عثمانیہ

خلافت عثمانیہ

مسلمانوں کا نظم مملکت

مسلمانوں کے نظم حکمرانی کی بصیرت افروز تاریخ جس میں
مسلمانوں کے آئین جہان بینی کے تمام شعبوں کو متعلق نہایت
کاف اور روشن معلومات دی گئی ہیں یہ وقت کی ایک
حق مطالعہ کتاب ہے اصل کتاب کے مصنف مصر کے
شہر فاضل اور جدید و قدیم علوم کے باخ نظر عالم ڈاکٹر
ابو الہیاء حسن ایم لے پی ایچ ٹی ہیں اور ترجمہ
ندوة المصنفین کی نگراں میں کیا گیا ہے۔

قیمت چھ مہلے سے

تاریخ مشائخ حشت

سلسلہ حشت کے صوفیہ کرام کا اعتقاد تذکرہ اور ان کے مقبول
حیات نظام صلیح و تربیت پر عمل بحث قیمت چھ مہلے سے

قیمت چھ مہلے سے

مینجر ندوة المصنفین اردو بازار خاں مسجد علی

مختصر قواعد ندوة المصنفین دہلی

۱۔ **محسن خاص** جو مخصوص حضرات کم سے کم پانچ سو روپیہ یکمشت مرحمت فرمائیں وہ ندوة المصنفین کے دائرہ محسنین خاص کو اپنی شمولیت سے عزت بخشیں گے ایسے علم نواز اصحاب کی خدمت میں ادائے اور مکتبہ برہان کی تمام مطبوعات نذر کی جاتی رہیں گی اور کارکنان ادارہ ان کے قیمتی مشوروں سے مستفید ہوتے رہیں گے۔

۲۔ **محسنین** جو حضرات پچیس روپے مرحمت فرمائیں گے وہ ندوة المصنفین کے دائرہ محسنین میں شامل ہوں گے۔ ان کی جانب سے یہ خدمت معادضہ کے نقطہ نظر سے نہیں ہوگی بلکہ عطیہ خاص ہوگا۔ ادارے کی طرف سے ان حضرات کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات حق کی تعداد تین سے چار تک ہوتی ہے۔ نیز مکتبہ برہان کی بعض مطبوعات اور ادارہ کا رسالہ "برہان" بلا کسی معادضہ کے پیش کیا جائیگا۔ جو حضرات اٹھارہ روپے پیشگی مرحمت فرمائیں گے ان کا شمار ندوة المصنفین کے حلقہ ۳۔ **معاونین** معادین میں ہوگا ان کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات ادارہ اور رسالہ "برہان" (جس کا سالانہ چندہ چھ روپے ہے) بلا قیمت پیش کیا جائے گا۔

۴۔ **اجتہاد** نورپے ادا کرنے والے اصحاب کا شمار ندوة المصنفین کے اجتہاد میں ہوگا۔ ان کو رسالہ بلا قیمت دیا جائے گا اور طلب کرنے پر سال کی تمام مطبوعات نصف قیمت پر دی جائیں گی یہ حلقہ خاص طور پر علماء اور طلبہ کے لئے ہے۔

قواعد رسالہ برہان (۱) برہان ہر انگریزی ہینے کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔ (۲) مذہبی، علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین اگر وہ زبان و ادب کے معیار پر پورے اتریں برہان میں شائع کئے جاتے ہیں۔ (۳) باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاک خانوں میں ضائع ہو جاتے ہیں جن صاحب کے پاس لیا نہ پہنچے وہ زیادہ سے زیادہ ۲۵ تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیں۔ ان کی خدمت میں پرچہ دوبارہ بلا قیمت بھیج دیا جائے گا۔ اس کے بعد شکایت قابل اعتنا نہیں سمجھی جائے گی۔

(۴) جواب طلب امور کے لئے آٹھ ماہ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا چاہئے۔ خریداری نمبر کا حوالہ ضروری ہو۔ (۵) قیمت سالانہ چھ روپے۔ دوسرے ملکوں سے ساڑھے سات روپے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ۔ (۶) منی آرڈر روانہ کرنے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھئے۔

مولوی محمد ادریس پرنٹر پبلشر نے جید برقی پریس میں طبع کر اگر دفتر برہان جامع مسجد ملی سے شائع کیا

ندوة ائمة دینی کا علمی و دینی مآبنا

میرپان

مرتب
سعید احمد کسرا بادی

ندوة المصنفین کی دینی اور اجتماعی کتابیں

اسلام کا نظام مساجد

نظام مساجد کے تمام گوشوں پر دل پذیر بحث اور اسکی
منفعتوں اور برکتوں کی تفصیل۔

قیمت ہر مجلد للہ

اسلام کا اقتصادی نظام

وقت کی ایک اہم انقلاب انگیز کتاب جس میں اسلام
کے موافقی نظام کا جامع نقشہ پیش کیا گیا ہے چوتھا

ایڈیشن۔ قیمت ہر مجلد للہ

اسلام میں غلامی کی حقیقت

مسئلہ غلامی کی تحقیق پر ندوة المصنفین کی موکیتہ الآراء کتاب جس میں انفرادی اور اجتماعی غلامی کے ایک ایک
پہلو پر اسلام کا نقطہ نظر پیش کیا گیا ہے، قیمت ہر مجلد للہ

قرآن اور تعمیر سیرت

ایک عظیم نشان اصلاحی کتاب

قرآن مجید کی تعلیم و تربیت کا انسانی سیرت کی تعمیر میں کیا دخل ہے اور اس تعلیم کے ذریعہ سے اس سیرت و کردار کا کس طرح ظہور
ہوتا ہے یہ تبرک کتاب خاص ہی موضوع پر لکھی گئی ہے۔ ایک ایسے وقت میں جب کہ مسلمان عام طور پر احساس کمتری کے
اندھیریوں میں پھنسے ہوئے ہیں یہ گراں مایہ تالیف ان کے روحانی رشتے کو مضبوط کرنے میں چرب راہ کا کام دے گی۔

قیمت ہر مجلد للہ

ارشادات نبوی کا لائٹانی ذخیرہ

اردو زبان میں

ترجمان السنہ :- ہماری زبان میں حدیثوں کی ایسی جامع اور مستند کتاب آج تک وجود میں نہیں آئی تھی اس میں
وہی متن مع عربی ہی اور مصنف و سلیس ترجمہ بھی ساتھ ہی متعلقہ تشریحی نوٹ بھی ہیں۔ ترتیب میں کتاب التوحید کو پہلے لکھا گیا
ہے اور پھر اسی مناسبت سے پوری کتاب کی ترتیب قائم کی گئی ہے پہلی جلد کے شروع میں کئی سو صفحات کا ایک مقدمہ ہے

جلد اول قیمت ۵۰۰ مجلد ۵۰۰

ترجمان السنہ :- ہماری زبان میں حدیثوں کی ایسی جامع اور مستند کتاب آج تک وجود میں نہیں آئی تھی اس میں
وہی متن مع عربی ہی اور مصنف و سلیس ترجمہ بھی ساتھ ہی متعلقہ تشریحی نوٹ بھی ہیں۔ ترتیب میں کتاب التوحید کو پہلے لکھا گیا
ہے اور پھر اسی مناسبت سے پوری کتاب کی ترتیب قائم کی گئی ہے پہلی جلد کے شروع میں کئی سو صفحات کا ایک مقدمہ ہے

جلد دوم قیمت ۵۰۰ مجلد ۵۰۰

قیمت ہر مجلد للہ

مختصر ندوة المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی

بُرْہَان

جلد نمبر ۳۰

شمارہ نمبر ۵

مئی ۱۹۵۳ء مطابق شعبان المعظم ۱۳۷۲ھ

فہرست مضامین

۲۵۸	سعید احمد	نظرات
۲۶۱	حضرت مولانا سید مناظر حسن عمامہ گیلانی	کس لئے؟
۲۷۳	جناب ڈاکٹر خورشید احمد صاحب فارتق ایم۔ اے	قاضی شریع
	پی۔ اچ۔ ڈی پروفیسر دہلی کالج	
۲۸۵	جناب نعام اللہ خاں صاحب ناٹھراڈ ٹیبر روزنامہ بحیثیت	حکیم سنائی
۲۹۷	جناب عابد رضا خاں صاحب بیدار	شیخ علی بخش بیار
		حالات حاضرہ
۳۰۴	جناب اسرار احمد صاحب آزاد	ایک سیاسی جائزہ
		ادبیات
۳۱۱	جناب آلم مظفر نگری	غزل
۳۱۲	جناب برج لال جلی رعنا	اُردو رباعیات
۳۱۴	م۔ ا۔ ع	شعرون علم
۳۱۰	جناب ڈاکٹر ظہیر الدین احمد صاحب جامعہ	اقبال کی کہانی پر تبصرے سے متاثر ہو کر

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نَظَرِ

افسوس ہے پچھلے دنوں چند گفتگوں کے فصل سے ہندوستان کی عموماً اور دہلی کی خصوصاً دو نامور ہستیوں نے اس دنیا کو خیر آباد کہا۔ آصف علی مرحوم نے وطن سے بہت دور دیار غیر میں جان جانِ آفریں کو سپرد کی لیکن وطن کی خاک نے یہ کشش دکھائی کہ ان کی نفس ہوائی جہاز کے ذریعہ سوئٹزرلینڈ سے دہلی پہنچی اور شفیق الرحمن صاحب قدوائی اور وہ دونوں یہیں دفن ہوئے، سیاسی مسلک کے علاوہ دلی کی خاص دھندلاری اور شرافت، خوش اخلاقی اور وسعتِ نظر و عالی حوصلگی کے اعتبار سے دونوں میں بہت کچھ مشابہت و مماثلت تھی۔ تاہم ہر ایک کی چند خصوصیات تھیں جن کے باعث دونوں اپنا اپنا الگ مقام رکھتے تھے۔ آصف صاحب نہایت ذہین، انگریزی اور اردو دونوں زبانوں کے خوش بیان مقرر اور ادیب تھے اور اردو زبان کے خوش گو شاعر بھی تھے چنانچہ انھیں ترقی اردو ہند کے سہ ماہی رسالہ اردو کے ابتدائی دور میں ان کی بعض نظمیں شائع ہوئی تھیں اردو طرزِ تحریر میں ان پر ٹیگوریت غالب تھی جس کا ثبوت ان کی کتاب پڑھیں سے ملتا ہے تحریکِ آزادی کے زمانہ میں ان کا شمار صفِ اول کے کانگریسیوں میں رہا آزادی حاصل ہونے کے بعد وہ امریکہ میں ہندوستان کے سفیر رہے پھر اٹلیہ کے گورنر بنا دیئے گئے اور اب آخر میں سوئٹزرلینڈ میں اپنے ملک کی سفارت کی خدمات انجام دے رہے تھے کہ اسی عہد پر داعیِ اجل کو لبیک کہا

حقِ مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

شفیق الرحمن صاحب قدوائی اگرچہ آصف علی صاحب کی طرح آل انڈیا شہرت کے مالک نہیں تھے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ نہایت مخلص قومی کارکن تھے ملک کی تحریکِ آزادی کے سلسلہ میں وہ جیل

بھی گئے۔ لیکن وہ طبعاً ہنگامہ پسند اور اسٹیج کے لیڈر نہیں تھے۔ خاموشی مگر نہایت مستعدی اور گرم جوشی کے ساتھ ٹھوس اور تعمیری کام کرنے کے عادی تھے۔ انھیں سب سے زیادہ دہلی تعلیم بانچان کے کام سے تھی اس سلسلہ میں انھوں نے جس بیدار مغزی۔ تن دہی اور قوت تنظیم و عملی سرگرمی کا ثبوت دیا ہے وہ ان کی تاریخ حیات کا روشن باب ہے، اسی بنا پر یونیورسٹی کی طرف سے وہ انڈونیشیا میں تعلیم بانچان کے ناظم اعلیٰ بنا کر بھیجے گئے۔ وہاں سے واپسی پر دہلی اسٹیٹ کے وزیر تعلیم منتخب ہو گئے اس حیثیت سے ان کا ایک یادگار کارنامہ یہ ہے کہ اردو زبان دہلی کی علاقائی زبان تسلیم کر لی گئی لیکن غالباً ان کی آزاد طبیعت وزارت کی گراں بار ذمہ داریوں کی متحمل نہیں ہو سکی۔ اور وہ چند ماہ بیمار رہ کر ۵۲، ۵۳ سال کی عمر میں ہی عالم جادو دانی کو سدھار گئے۔ نئی زندگی میں مرحوم بڑی خوبیوں کے انسان تھے۔ نماز روزہ اور اسلامی شعار کے پابند۔ نہایت سادہ اور بے تکلف ہر ایک کے ساتھ ہمدردی اور خلوص کا تعلق رکھنے والے۔ بڑے ملنسار اور سنہن مکھ۔ متواضع اور بامروت۔ ذہین اور معتدل المزاج حق تعالیٰ ان پر اپنے انوار و برکات کا نزول فرمائے اور جنت الفردوس میں ان کو مقام عطا فرمائے۔ آمین

مسلمانوں کی زندگی کے دو ہی شعبے ہیں ایک دنیوی اور دوسرا دینی "اور ان دونوں شعبوں کے بہتر اور کامیاب ہونے سے ہی زندگی بہتر اور کامیاب ہو سکتی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں بھی ان دونوں کی حسنت کے لئے دعا مانگنے کی تلقین کی گئی ہے دنیوی زندگی کی خوشحالی کے معنی یہ ہیں کہ انسان تندرست ہو۔ معاشی اعتبار سے خوش حال اور فارغ البال ہو اور وہ اس خوش حالی سے خود اپنی ذات اور اپنے اہل و عیال کے لئے نفع بھی اٹھا سکے۔ دنیوی زندگی کی خوشحالی کے ثمرات و نتائج میں اگرچہ تندرستی کا نمبر سب سے پہلا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ تندرستی اور صحت کا دار و مدار بھی معاشی رفاہیت پر ہے۔ جو شخص دونوں وقت اپنا پیٹ نہیں بھر سکتا۔ وہ کس طرح ایسی غذاؤں سے بھرا کر سکتا ہے جن کو انسانی صحت کی حفاظت و بقا میں بڑا دخل ہے وہ ایک صحت بخش مقام پر ایک عمدہ پرفضا اور کھلے مکان میں کیوں کر رہ سکتا ہے اس بناء پر یہ بات صاف طور پر معلوم ہو جاتی ہے کہ دنیوی

زندگی کی خوشحالی کا سب سے بڑا ذریعہ معاشی رفاہیت ہے۔

بہر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ معاشی رفاہیت کا اثر صرف یہی نہیں ہوتا ہے کہ انسان کی دنیوی اور مادی زندگی بہتر ہو جاتی ہے بلکہ اس کا اثر اخلاقی اور سماجی زندگی پر بھی پڑتا ہے۔ کامل مارکس تو ایک عرصہ دراز کی ریسرچ اور تھنک کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ دنیا میں جنگ و فساد، جرائم اور اخلاقی زبوں حالی و معاشرتی ابتری ان سب کا واحد سبب اقتصادی زبوں حالی اور معاشرتی ابتری ہے۔ لیکن اسلام کے داعی نے تو تقریباً ڈیڑھ ہزار برس پہلے کا >الفقر یكون کفر< فرما کر اس فلسفہ کے پورے دریگوں کو زہ میں بند کر کے پیش کر دیا تھا۔

آج ہندوستان میں جگہ جگہ مسلمانوں کے عظیم الشان جلسے اور کانفرنسیں ہوتی ہیں مختلف مسائل پر تقریریں کی جاتی ہیں متعدد معاملات پر غور و خوض کیا جاتا ہے۔ لیکن کبھی کسی نے اس پر بھی غور کیا کہ اگر ہندوستان کے مسلمانوں کی اقتصادی حالت روز بروز ابتر رہی ہوتی رہی اور صورت حال یہ رہی کہ ان کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی بے روزگاری کی مصیبت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ کاروبار اور تجارت میں بھی آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کے مواقع زیادہ نہیں ہیں زمینداروں کو الگ ختم ہو گئیں تو پھر آجران چار ساڑھے چار کرڈ افراد کا کیا ہوگا اور یہ کس طرح اپنے ملک کے مفید اور اچھے شہری بن کر عزت کی زندگی بسر کر سکیں گے قوم محض جلسے کرنے اور پر جوش تقریریں سن لینے سے زندہ قوم نہیں بنتی۔ اگر مسلمانوں کو ایک زندہ اور تندرست قوم کی حیثیت سے رہنا ہے تو لازمی طور پر یہ بھی سوچنا ہوگا کہ معاشی رفاہیت کے جو دروازے ان پر بند نظر آتے ہیں انھیں کس طرح کھولا جائے۔ اور اس راہ میں جو دشواریاں اور دقتیں ہیں انھیں کیوں کر دور کیا جائے۔

کس لئے؟

حضرت مولانا مناظر احسن صاحب

(۲)

لیکن کیا کیجئے، آدمی کس لئے ہی ہے اس کا یہ جواب کہ خالق کائنات نے خود اپنے لئے اس کو پیدا کیا ہی اپنے اپنے ذاتی رجحانات اور میلانات کے زیر اثر اسی کی تشریح و توضیح میں عجیب و غریب شگوفے کھٹکتے رہے۔ ایک طرف تو سمجھنے والوں نے یہ سمجھ لیا کہ خالق کے لئے جو پیدا ہوا ہے، اس کا فرض ہو جاتا ہے، رہبانیت روحانیت کہ مخلوقات سے جہاں تک دوری اختیار کر سکتا ہو، دور ہوتا چلا جائے۔ رہبانیت اور جوگیت اسی رجحان کی تعبیر ہے جس کی ابتدائی منزل میں سمجھایا جاتا ہے کہ غذا جیسی ناگزیر ضرورت سے تعلق کو کمزور کرنے کے لئے چاہئے، کہ بغیر کسی رغبت اور لذت گیری کے اس کو اس طرح کھایا جائے کہ کھانے والا مسلسل کھاتے ہوئے یہ بھی سوچتا چلا جائے کہ اس کی مثال اس شخص کی ہے، جو جنگل سے گزر رہا ہو، اور اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لئے اپنے بچے کا گوشت کھا رہا ہو ترجمہ کتاب ہندی فلسفہ از ڈاکٹر گیتاج اٹوالہ دار ترجمہ سرکار عالی

یہ ہندوستانی رہبانیت کے دائرہ کا مشہور اور عام فقہ ہے، بعض خاص مصلحتوں کی بنیاد پر اسی طریقہ زندگی کو رہبانیت و جوگیت کے ساتھ ساتھ روحانیت کے نام سے بھی موسوم کرتا ہوں، موجودہ مغربی اصطلاح میں چاہئے تو اسے اسپرٹچوزم بھی کہہ لیجئے۔ اس مسلک کی بنیاد یاروخ یہی ہے کہ جو بڑائیاں آدمی کو اپنے وجود کی اسی غرض و غایت کی وجہ سے حاصل ہوتی ہیں کہ وہ خالق کائنات کے لئے پیدا کیا گیا ہے اور اس کی ان ہی باتوں نے ادارہ انسانی مخلوقات سے استفادہ کے حق کو اس کا پیدائشی اور قدرتی حق بنا دیا ہے، اس مسلک میں گویا سمجھا جاتا ہے آدمی کے اسی پیدائشی حق سے دست برداری کا عملاً اعلان کیا جاتا ہے، اسی طرح اپنے وجود کے اسی بلند ترین نصب العین یعنی آدمی کا خدا کے لئے ہونا، اسی کی بدولت انسانیت کے متعلق یہ عام احساس ہو پایا جاتا ہے کہ تمام پیداواروں کے مقابلہ میں وہی زمین کی سب سے زیادہ قیمتی اور انمول پیداوار ہے۔

اسی بنیاد پر انسانی صلاحیتوں کی حفاظت و بقا اور پوشیدہ امکانات کے بہبود و ارتقاء کی کوششوں کو جو غیر معمولی اہمیت عام طور پر حاصل ہے، اس کی اہمیت کی چنداں پروا رہبانیت یا روحانیت کے دائروں میں نہیں کی جاتی، کیوں کہ کچھ بھی ہو، انسان بھی بہ حال خالق نہیں، بلکہ مخلوق ہی ہے، بال بچوں کے جھگڑوں یا سوچنا اور اجتماع کے جھگڑوں سے ممکنہ حد تک آزاد رہنے کا میلان اس طبقہ میں اسی نقطہ نظر کا نتیجہ ہے، کہ خدا یا خالق کائنات کے لئے ہونے کا مطلب ان کے نزدیک اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ اپنی اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ، خالق ہی کی تلاش و جستجو دھیان و گیان میں بسر کر دیا جائے۔

عملی مادیت یا | رہبانیت و روحانیت کے مذکورہ بالا طریقہ فکر، اور طرز زندگی کے بالکل برعکس ہر زمانہ میں پرمیکل میٹریزم | دوسرا گروہ بھی پایا گیا ہے، بلکہ عموماً عددی اکثریت اسی گروہ کی پہلے بھی رہی ہے، اور آج کل

بھی ہے، جس کی سمجھ میں ہی نہیں آتا، کہ خدا جو ہر قوم کی حاجتوں اور ضرورتوں سے پاک ذات کی تعبیر ہے، آدمی بھلا اس کے کام کا کیا ہو سکتا ہے، اسی لئے آدمی خدا کے لئے ہی ہے۔ سمجھا جاتا ہے اس کا مطلب اگر کچھ ہو سکتا ہے تو یہی ہو سکتا ہے، کہ آدمی خدا کے مخلوقات کے کام لئے، اور جو چیزیں آدمی کے لئے پیدا کی گئی ہیں ان سے مستفید ہو، ان کے افادہ کے ممکنہ پہلوؤں کو اجاگر کرے یہی وہ لوگ ہیں جن کی زندگی کے عملی خانوں میں خدا یا خالق کائنات کے لئے نہ کسی قسم کی کوئی گنجائش ہوتی ہے اور نہ اس گنجائش کو وہ رکھنا چاہتے ہیں۔ ان کے کاروبار کی ساری سرگرمیاں مخلوقات ہی کو محور بنا کر ان ہی کے ارد گرد گردش کرتی ہیں، وہ بھی کرتے ہی ہیں اور اس کے سوا کچھ کرنا بھی نہیں چاہتے، یہ ممکن ہے کہ بعض گئے چنے افراد ان میں ایسے بھی ہوں جو خدا کے یقین ہی سے اپنے قلوب کو محروم پاتے ہوں، اسی لئے روحانیت کے مقابلہ میں چاہا جائے تو زندگی کے اس خاص رویہ کا نام مادیت یا میٹریزم بھی رکھ دیا جاسکتا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ کافی معقول بڑی تعداد اس طبقہ میں ان ہی لوگوں کی ہمیشہ رہی ہے اور آج بھی ہے، جو بجائے مادہ کے خدا ہی کو کائنات کا خالق و آفریدگار تسلیم کرتے ہیں لیکن با این ہمہ اس خدا کی ذات سے ربط پیدا کرنے کا میلان ان میں نہیں پایا جاتا، وہ خدا کا انکار نہیں کرتے لیکن ان کی عملی زندگی بتاتی ہے کہ خالق کی ذات و صفات سے نہ ان کو کوئی دل چسپی ہے اور نہ ان سے تعلق قائم کرنے کی کوئی خواہش یا آرزو اپنے اندر وہ رکھتے ہیں بلکہ جہاں تک

مشاہدہ کا تعلق ہے ان کی اکثریت دنیا کے کسی نہ کسی مذہب و دین کی طرف بھی اپنے آپ کو عموماً منسوب کرتی رہی ہے اور آج بھی کسی نہ کسی مذہبی ٹولی میں اپنے آپ کو شمار کرنے والے ہی ان میں اکثر دیکھے جاتے ہیں مگر ان کے مشاغل کی فہرست آپ کو بتائے گی کہ خالق کے لئے اس میں کوئی مد نہیں رکھی گئی ہے اسی لئے ایسے سارے اعمال و افعال جو مذاہب و دیانات میں خالق ہی کے تعلق سے انجام دئے جاتے ہیں وہ چند اہم اور مستحق توجہ نہیں سمجھے جاتے۔

اسی لئے بجائے خالص مادیت (میٹریزم) کے زندگی کے اس طریقہ کی تعبیر علی مادیت پر مکمل میٹریزم سے کرنا غالباً زیادہ موزوں ہوگا کیوں کہ مادیت جو فلسفہ کے ایک خاص مکتب خیال کی تعبیر ہے اس میں بجائے خدا کے مادہ ہی کو عالم کا مصدر و سرچشمہ سمجھا جاتا ہے کچھ بھی ہو یہ واقعہ ہے کہ علی مادیت کی اسی ذہنیت کے زیر اثر زندگی گزارنے والے آپ کو عیسائیوں، یہودیوں، ہندوؤں وغیرہ کے سوا خود مسلمانوں میں بھی ملیں گے بلکہ اکثریت پر یہی رنگ روز بروز ہوتا چلا جا رہا ہے

عبادت بجز خدمتِ خلق نیست بہ تسبیح و سجادۂ دلق نسبت
سے خود شعر کہنے والے شاعر کی مراد واقع میں جو کچھ بھی ہو، لیکن اسی قسم کی شاعرانہ تعبیروں سے ان فطری جذبات و عواطف کے تقاضوں کی تسکین بخشی میں عموماً سہارا لیا جاتا ہے جو براہ راست خالق ہی سے ربط پیدا کرنے کے لئے انسانی سرشت میں محفوظ کئے گئے ہیں،

بلکہ کہتے ہوئے اسی لئے جی ڈرتا ہے کہ شاید پہلی دفعہ کھا جا رہا ہے۔ پڑھنے والوں کو ممکن ہے تعجب ہو مگر کیا کیجئے کہ اپنی سمجھ میں یہی آیا ہے۔

لے آج کل مسلمانوں میں بھی ایک ایسی ٹولی اٹھ کھڑی ہوئی ہے جو اپنے کاغذی اور زبانی اعلانات میں دعویٰ کرتی ہے کہ عصر حاضر میں دینِ اسلامی کی تنہا علم بردار وہی ہے، لیکن اسی کے ساتھ بغیر کسی خوں اور جھجک کے اسی ٹولی کے لوگ بھی کہتے ہی پھرتے ہیں اور لکھتے بھی ہیں کہ نماز روزہ وغیرہ جیسی دینی عناصر دین کے جوہری عناصر میں ہیں اور کاروبار کے ان ہی شعبوں کو دین کا وہ سب کچھ قرار دیتے ہیں، جن میں جو کچھ بھی کیا جاتا ہے اس کا تعلق مخلوقات ہی سے ہوتا ہے اپنے اسی میلان کو اپنی دینی زندگی کی نسب سے بڑی خصوصیت باور کرتے ہیں۔

بت پرستی یا اصنامیت ہی کہنا یہ چاہتا ہوں کہ بت پرستی، یا مشرکانہ ذہنیت جس کا دور دورہ تاریخ کے مختلف قرون،
عملی مادیت کی ایک شکل ہے اور میں مختلف ممالک و اقوام میں رہا ہے اور اب بھی بنی آدم کی اچھی خاصی آبادیوں
میں اس کا رواج مردہ نہیں ہوا ہے۔

میرا خیال یہ ہے کہ یہ بھی عملی مادیت ہی کا ایک قدیم بھلا پارینہ و فرسودہ قالب ہے، سمجھ میں ہی آتا ہے
کہ خالق سے بے گانگی اور مخلوقات میں استغراق جو اس ذہنیت کی سب سے بڑی خصوصیت ہے جب اس
ذہنیت کی شکل تو میں ہوئی، جیسا کہ اس وقت تک ہوتی رہتی ہیں تو گو خالق کے وجود کا انکار نہیں کیا جاتا۔
لیکن تعلق صرف مخلوقات ہی کی حد تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے پھر جیسا کہ عرض کر چکا ہوں منجانب دوسرے کا دہندہ
کے مخلوقات سے استفادہ کی راہ میں آج کل تو صرف یہی کیا جاتا ہے کہ عقلی قوت کی مدد سے استفادہ کا دائرہ
جس حد تک وسیع ہو سکتا ہو نوگ اپنی کوششوں کو اس دائرے تک محدود رکھتے ہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے
کہ عقلِ انسانی ارتقائی مارچ کے طائر سے ابتدائی منزلوں ہی میں جب تک رہی اس وقت تک سبھی ایسی
مخلوقات جن سے لوگ فائدہ اٹھاتے تھے یا منافع کی توقع رکھتے تھے یا ضررِ رسانی کے پہلوؤں کو جن چیزوں
کے متعلق کم کرنا چاہتے تھے خصوصاً نفع و ضرر کے اس باب میں جن مخلوقات کو گو نہ اہمیت حاصل تھی ان
کی افادیت یا ضررِ رسانی کا پہلو زیادہ نمایاں تھا، ان ہی چیزوں کو قابو میں لانے کے لئے جہاں عقل و دانش سے
کام لیا جاتا تھا وہیں عام طریقہ یہ بھی مروج تھا کہ خالق سے رشتہ قائم کرنے کے لئے جو جذبات و عواطف فطرت
انسانی میں دو بیت کئے گئے ہیں یعنی دعا، عبادت وغیرہ کے فطری رجحانات جو حال ہے ان ہی جذبات کا
رنج بولے خالق نے اسی عملی مادیت، ”کی ذہنیت والے مخلوقات کی طرف پھیر دیا کرتے تھے۔ مثلاً کسی
ملک کے مختلف حصے یا قطعات پانی کے کسی سیلابی راہ کے بن جانے کی وجہ سے ایک دوسرے سے
جدا ہو جاتے تھے، یعنی کوئی دریا باندی نالہ درمیان میں حائل ہو کر لوگوں کی آمد و رفت کی سہولتوں کو
دشواریوں سے اگر بدل دیتا تھا، تو آج کل کے دستور کے مطابق ان دریاؤں ندیوں نالوں سے گزرنے
کے لئے میکانیکی ذرائع اختیار کئے جاتے ہیں انجینیری کی ہارتوں سے کام لیا جاتا ہے لیکن عقلِ انسانی
جب تک ترقی کر کے اس درجہ تک نہیں پہنچی تھی جہاں آج پہنچ چکی ہے تو ابتداء میں کچھ شادوی اور

پیرا کی کہ ذریعہ سے عبودیت اور کی دشواری کو لوگ حل کرتے تھے یا اس سے بھی آگے بڑھ کر کشتیوں اور ہوا کے ہاؤس پر چلنے والے بادبانی جہازوں سے بھی کام لینے لگے۔ مشکلات پر قابو پانے کی یہ عقلی تدبیریں تھیں لیکن ظاہر ہے کہ بااوقات کشتیاں ڈوب بھی جاتی تھیں، جہاز پانی کی موجوں سے ٹکرائے جاتے تھے اسی قسم کے مواقع جہاں دیکھا جاتا تھا کہ عقلی سہارے ختم ہو چکے ہیں اپنی فطرت کے دعائی اور عبادتی رجحانات کا رخ پانی کے اسی مجموعہ کی طرف پھیر دیا کرتے تھے جو نام بھی اس مجموعہ کا رکھ دیا جاتا تھا۔ اسی نام کے ساتھ جیکارے لگاتے تھے ہمارے ملک میں آج تک یہ رواج موجود ہے کہ گنگا یا جمنہ کے کنارے پہنچ کر گنگا ماا کی جے جمنہ جی کی دہائی وغیرہ الفاظ کے ساتھ لوگ چلانے لگتے ہیں اور پانی جیسی غیر قرار پذیر حقیقت جب پوجی گئی جو ہر سال ندیوں اور دریاؤں کی راہ سے گذر کر سمندر میں گم ہوتی رہتی ہے اور نیا سال پانی کے نئے ذخیروں کو لا رہا ہے تو سورج چاند ستارے جو نامعلوم زمانہ سے ایک ہی حال میں نظر آتے ہیں، ان کے معبود بن جانے پر کیوں تعجب کیا جائے، الغرض عناصر جمادات نباتات حیوانات جن میں نفع و ضرر کا پہلو نمایاں تھا، بہ تدریج معبودوں کی فہرست میں ان کا اضافہ ہوتا رہا حتیٰ کہ ایسے انسانی افراد جن سے کسی قسم کا نفع لوگوں کو پہونچا تھا، جب اپنی مدتِ حیات ختم کر کے اس دنیا سے چلے گئے تو ان سے استفادہ کی راہ پوچھا پاٹ کی اسی راہ سے کھلی رکھی گئی اور ان کی ورتیاں بنانا کر لوگ پوجتے رہے۔

بہر حال عقلی ذرائع کے ساتھ ساتھ دعائی اور عبادتی رجحانات کا بھی نفع بخش اور ضرر رساں مخلوقات کے ساتھ تعلق قائم کر کے ان سے استفادہ یا ان کے ضرر رساں پہلوؤں سے استغناء اور بچاؤ کا سامان کرنا، میرے نزدیک بت پرستی کی یہی صحیح توجیہ واقعات کے مطابق ہے، کوئی شبہ نہیں کہ ہے تو یہ عقل انسانی کے عہد طفولیت اور نابالغی ہی کی یادگار لیکن اسی کے ساتھ یورپ کے عام مفکرین و مصنفین کی مشہور و معروف توجیہ، جہاں تک میرا خیال ہے ایک قسم کے فریب ستم ظریفی کے سوا شائد وہ اور کچھ نہیں ہے انسانی عقل و دانش کے ساتھ ایک تسخیر ہے لیکن ذکر اس کا ہر علم و فن کی چھوٹی بڑی کتابوں میں کچھ اس طرح کیا جاتا ہے کہ گویا واقعہ کی اصل حقیقت بھی وہی ہے یعنی یہ جو کہا جاتا ہے کہ شروع میں اپنی کم عقلی کی وجہ سے لوگ آفتاب و ماہتاب، برق و درند، الغرض ہر ایسی چیز جس سے آدمی مرعوب یا غیر معمولی طور پر اثر

غیر ہوتا تھا، وہ خدا مان لی جاتی تھی، لیکن ترقی کی منزلوں کو جوں جوں عقل طے کرتی چلی جاتی تھی خداؤں کی تعداد بھی گھٹتی چلی گئی تا آنکہ آخر میں ایک خدا کو مان لیا گیا جس سے گویا یہ سمجھانا مقصود ہے کہ توحید کا عقیدہ شرک ہی کے عقیدے کا جانشین ہے، آدمی پہلے مشرک تھا اور عقلی ارتقاء کے بعد لوگ موصد ہوئے اور گواہی اس توحید کو بیان کرنے والے عموماً اسی نقطہ تک پہنچا کر خاموش ہو جاتے ہیں، لیکن درحقیقت ایک خاص قسم کا الحادی اشارہ اس توجیہ میں بھی پوشیدہ ہے، انسانی ذہن کو اس توجیہ کی راہ سے ایک ایسی لغزش گاہ تک پہنچا دیا جاتا ہے جس پر پہنچنے والا باسانی انکار خدا کے نتیجے کی طرف پھسلا کر پہنچا دیا جاسکتا ہے یہ خود ہی بیک عنود اسی الحادی چٹان پر منہ کے بل گر سکتا ہے یعنی باسانی لہذا دیا جاسکتا ہے کہ موجود زمانہ میں آدمی کی عقل جیسا کہ دیکھا جا رہا ہے پچھلے دنوں کے لحاظ سے چونکہ بہت زیادہ ترقی یافتہ ہو چکی ہے اس لئے "ایک خدا" کی ضرورت بھی آخر کیوں باقی رکھی جائے۔ بت پرستی کی اس خود تراشیدہ مغربی توجیہ کا یہ ایک قدرتی لیکن ایک ایسا نتیجہ ہے جس کی طرف اس راہ پر چلنے والے یا چلائے جانے والے چاہئے تو یہی کہ پھنسل کر خود پہنچ جائیں۔ حیرت تو اس پر ہوتی ہے کہ یورپ کے عام پیشہ ورانہ باب فکر و نظر ہی نہیں بلکہ مستند پادریوں بڑے بڑے مذہبی پیشواؤں کی کتابوں میں بھی کسی پس و پیش کے بغیر بت پرستی کی توجیہ کا تذکرہ انتہائی سنجیدگی کے ساتھ اس طور پر کیا جاتا ہے کہ گویا جس دین یا مذہب کے وہ ماننے والے ہیں اس پر کسی قسم کی کوئی رد اس توجیہ سے نہیں پڑتی بلکہ افسوس کے ساتھ اس کے اظہار پر اپنے آپ کو محجود پاتا ہوں کہ یورپ والوں کی اس ذہنی پھندے کا شکار کچھ دنوں سے یہ دیکھا جا رہا ہے کہ ہمارے ہاں کے مولویوں کا ایک طبقہ یہی شعوری یا غیر شعوری طور پر ہو چکا ہے اپنی تحریروں اور تقریروں میں شرک و بت پرستی کی اسی توجیہ کا چرچہ وہ بھی کرنے لگے ہیں، حالانکہ اور کچھ نہیں تو ان کو یہی سوچنا تھا کہ پہلے انسان جب تورات و انجیل اور قرآن کے بیان کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔

العباد باللہ اگر اسی کو واقعہ مان لیا جائے کہ توحید کا عقیدہ بنی آدم میں عقیدہ شرک کے بعد پیدا ہوا تو اس کا مطلب آپ خود سوچئے اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ آدم علیہ السلام اور ان کے بعد بنائے آدم شرک میں مبتلا رہے، توحید کا عقیدہ پچھلی نسلوں میں عقیدہ شرک کے بعد پیدا ہوا ان کو سوچنا چاہئے

کہ یہ مان لینے کے بعد کیا ان کی آسمانی کتابیں جنہیں وہ خدا تعالیٰ کی کتابیں یقین کرتے ہیں خدا کی کتابیں باقی رہتی ہیں خود ہندو سارے ابراہیم کے جو کچھ بھی ہوا لیکن مہا بھارت جیسی آسمانی کتاب تک یہ اطلاع آج تک پائی جاتی ہے یعنی یہ بیان کرتے ہوئے کہ ”جگ جس کو ست جگ کہتے ہیں“

بھرت جگ جو انسانی تاریخ کے سب سے پہلے دور کی ہندی تعبیر ہے، اسی عہد کی دوسری خصوصیتوں کا ذکر کرتے ہوئے یہ خبر بھی دی گئی ہے کہ

اس جگ میں دھرم رایان، کائنات میں نہیں ہوتا تھا یعنی اس میں خلل نہیں پیدا ہوتا تھا

دھرم کے تاش نہ ہونے کا مطلب آگے یہ بیان کیا گیا ہے کہ

دیوتا، دانو، گندھریا، کنھر جلش، شش ایک پرشوتم، بھگوان کی پوجا کرتے تھے ربن پر بکتھراں

(ادھیائے)

شرک اور بت پرستی زمین کا جو حصہ سب سے زیادہ بدنام ہے، بلکہ آج تو شاید ساری دنیا میں سمجھا جاتا خود ہندوستان کا حال بعد کو کچھ بھی ہوا لیکن مہا بھارت جیسی کتاب میں یہ اطلاع آج تک پائی جاتی ہے کہ بت پرستی اور شرکانہ کاروبار کا سب سے بڑا علم بردار صرف ہمارا یہ ملک ہی باقی رہ گیا ہے، اب دیکھ رہے ہیں کہ اس کی بھی ایسی کتابوں میں جو دینی کتابوں ہی کے ذیل میں شمار ہوتی ہیں یہی معلوم ہوتا ہے کہ آدمی پہلے موحداور تنہا خالق کائنات کا پرستار تھا، دھرم میں ناش ہونے کی کیفیت یعنی شرکانہ جراثیم بعد کو شریک ہوئے تو پھر یورپ والوں کا یہ پھیلاتے پھرنے والے آدمی پہلے مشرک تھا، اور یہ تبلیغ عقلی ترقیوں کے بل بوتے پر وہ توحید کے موجودہ عقیدہ تک پہنچا ہے کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے۔ اور یہ تو خیر نقی شہادتیں ہیں لیکن ان کے سوا انسانیت کی تاریخ کا جو حصہ اس وقت تک محفوظ رہ گیا ہے۔ اسی کا مطالعہ کیا جائے اور بتایا جائے کہ خالق عالم کے ساتھ دوسری چیزوں کو

سہ مختلف قسم کے غیبی مخلوقات جن میں بعض ادنیٰ اور بعض اعلیٰ سمجھے جاتے تھے ان ہی کو ہندوستان قدیم میں مذکورہ بالانااموں سے موسوم کیا کرتے تھے آخری دو لفظ جلش و نش کے معنی وہی ہیں جو ہمارے جن و نِس کے الفاظ سے ملو لیتے ہیں لہٰذا پرشوتم لاندلہ و لاندلہ کی تعبیر ہے، یعنی جس کی نظر اور جس کا کوئی مد مقابل نہ ہو۔

پوچھنے والے وقتاً فوقتاً جو پوچھتے رہے ہیں، اور اپنے معبودوں میں ان کو شریک کرتے رہے ہیں کیا کسی زمانہ میں ان کو خدا یعنی یہ مانا گیا ہے کہ عالم کی افریش و تحقیق کا کام انہوں نے انجام دیا ہے۔ اس سلسلہ میں پرانی تاریخ ملک مصر کی ہے، اس میں شک نہیں کہ اپنے عروج و اقبال کے زمانہ میں مصر والوں کے پاں بے شمار معبودوں کے پوجنے کا رواج تھا، کچھ دن ہوئے برہان میں فقیری ہی کا ایک مقالہ شائع ہو چکا ہے جس میں بتایا گیا تھا کہ سائڈ کٹے بلی وغیرہ جیسی چیزیں بھی مصر میں پوجی جاتی تھیں، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اپنے ان سارے معبودوں کو مصر والے خدا کے مخلوقات ہی میں شمار کرتے تھے ان میں کسی کے متعلق یہ خیال نہیں پایا جاتا تھا کہ دنیا کو وہ پیدا کرنے والے اور اس کے خالق ہیں، اسی مقالہ میں میں نے لکھا تھا کہ مصر والوں کے چند ممتاز معبودوں میں وہ کیڑے بھی شریک تھے جنہیں عربی زبان میں جملان اور ہم لوگ گریٹے کہتے ہیں، ان مصریوں کے متعلق یہ کیسے مان لیا جائے کہ اسی گریٹے کیڑے کو عالم کا خالق کسی زمانہ میں وہ مانتے تھے یہ تو یوں کے مادہ پرستوں ہی کا دل و جگر ہے کہ کائنات کے اس جیتے جاگتے نظام کے متعلق یہ ماننے پر تیار ہو گئے ہیں، کہ بے جان مردہ مادہ سے اہل پڑا ہے جس میں زندگی نہ تھی اسی سے زندگی جس میں علم و ادراک نہ تھا اسی سے علم و ادراک الفرض ہر قسم کے کمالات سے جو مادہ خالی تھا اچانک اسی سے کمالات کا یہ سمندر ٹپرا جس کا نام عالم ہو بہر حال پوچھنے والے اس میں شک نہیں کہ مختلف زمانہ میں مختلف چیزوں کو پوجتے رہے ہیں اور آج تک ان پوجنے والوں کی کافی تعداد آدم کی اولاد میں باقی ہے ان میں جو گذر چکے ان کو جانے بھی دیکھے لیکن جو باقی رہ گئے ہیں ان ہی سے پوچھئے اور سنئے جواب میں بالاتفاق وہ یہی کہیں گے کہ چاند ہو یا سورج، آگ ہو یا پانی، سانپ ہو یا گائے ہل یہ سب کچھ خدا ہی کی پیدا کی ہوئی چیزیں ہیں یہی خیال ان کے بزرگوں کا بھی تھا اور اب بھی وہ یہی مانتے ہیں، باوجود اس کے وہی نفع و ضرر کے پہلوؤں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کے بزرگوں نے بھی ان خدائی مخلوقات کے ساتھ عام و عبادت کا رشتہ قائم کر لیا تھا اور اپنے باپ دادوں کی اسی روش پر اب بھی وہ گامزن ہیں۔

الفرض بت پرستی کی یہ مضحکہ خیز مغربی توجیہ کہ بہت سے خداؤں کو بہ تدریج گھٹاتے ہوئے ایک خدا کے عقیدے تک عقل انسانی پہنچی ہے، عقلاً نقلاً و لایعناً بجز ایک ایسی ادعائی توجیہ کے اور کچھ نہیں ہے جس کا خالق

واقعات سے قطعاً کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں رہے،

بالکل ممکن ہے کہ دنیا کی موجودہ موجود قوموں یعنی خالق عالم کے سوا کسی مخلوق کی عبادت کو جو دین نہیں بلکہ بے دینی ہی کا سب سے زیادہ خطرناک اور مہیب تائب یقین کرتے ہیں، ان کے قلوب میں بت پرستی کی اس مغربی توجیہ سے اس اغوائی و وسوسہ کا بھی ڈالنا توجیہ کرنے والوں کا مقصود ہو کہ پرانی مشرک اور بت پرست قوموں ہی کا یادگار اور جانشین دنیا کی موجودہ موجود قومیں ہیں، دونوں میں فرق اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ آہستہ آہستہ کثرت سے ملتے ہوئے وحدت کے نقطہ تک عقل و خرد نے ان کو پہنچا دیا ہے، قطع نظر اس سے کہ ذہن انسانی اس توجیہ کے زیر اثر جیسا کہ عرض کر چکا ہوں طبعاً اس لغزش کا تھک پہنچ جاتا ہے۔ جس پر پہنچنے کے بعد الحاد یعنی ایک خدا کے انکار کی گھاٹیوں میں پھنسل کر گر پڑنے کا خطرہ سامنے آ جاتا ہے، گویا الحادی ذہنیت کی زمین کی تیاری کا کام جہاں اس منحوس توجیہ سے لیا جاسکتا ہے وہیں خالق پرستوں کو دل میں اس خیال کو پیدا کر کے کہ پرانی مخلوق پرست مشرک قوموں ہی کی وہ یادگار اور جانشین ہیں اس سے استقامت و اطمینان، سکینت و ثبات کے ان جذبات کو مضمحل کرنا بھی مقصود ہو، جو ہر موجود توحید کا عقیدہ کے متعلق اپنے اندر پاتا ہے تو اس پر متعجب نہ ہونا چاہئے، اہل و فریب کے اس عہد تاری میں آنے والے جن جن راہوں سے آرہے ہیں، اور سبیل اللہ سے اللہ کے بندوں کو روکنے، بلکہ بھڑکانے، بدگمانے کی بے پناہ کوششیں نت نئی گونا گوں شکلوں میں ہر طرف جاری و ساری ہیں ان کو دیکھتے ہوئے میرے اس خیال کو صرف بدگمانی قرار دینے کی جرات مشکل ہی سے کوئی کر سکتا ہے حالانکہ اس راہ میں بھی اگر حقیقت پر نظر رکھی جائے تو باسانی معلوم ہو سکتا ہے کہ خالق سے بے گمانہ ہو کر مخلوقات ہی مخلوقات میں آج یورپ کے باشندے جو ڈوبے ہوئے ہیں صحیح معنوں میں پرانی مخلوقات پرست قوموں کی یادگار یا جانشین ہونے کی عزت اگر حاصل ہو سکتی ہے تو اس عزت کے جائز حقدار اور وارث وہی ہو سکتے ہیں آخر خود سمجھے بت پرست قوموں کی سب سے بڑی خصوصیت جیسا کہ آپ سن چکے ہیں تو تھی کہ بجائے خالق کے مخلوقات ہی سے اپنا رشتہ انہوں نے قائم کر لیا تھا، ان کا دستور ہی یہ تھا کہ نفع اور ضرر کے پہلو جن مخلوقات میں زیادہ نمایاں تھے۔ ان ہی سے عقلی رشتہ کے سوا عبادتی اور دعائی رشتہ بھی قائم کر لیا کرتے تھے وہ دریاؤں پر قابو حاصل کرنے

کے لئے عقل کے زور سے کشتی اور جہاز جیسی چیزیں بھی بناتے اور چلاتے تھے اور جہاں عقلی سہارا ختم ہو جاتا تھا وہاں دیکھا جاتا تھا کہ دعاء و عبادت کے جذبات جو خالق ہی سے ربط پیدا کرنے کے لئے انسانی فطرت میں ودیعت کئے گئے ہیں ان جذبات کا رخ بھی دریاؤں اور اس کے پانی کی طرف پھیر دیا کرتے تھے۔ یہ ماننا ہوں کہ یہ جو کچھ تھا ان کے عقول کی خامی ہی کا نتیجہ تھا شنوائی کی قوت جو آوازوں کے سننے کے لئے آدمی میں رکھی گئی ہے اس قوت سے رنگ، اور روشنی جیسی چیزوں کے جاننے کی کوشش جس کے لئے بینائی کی قوت ہمیں بخشی گئی ہے بدعتاً شنوائی کی قوت کا یہ غلط استعمال اور کچھ نہیں ہے، اسی طرح دعاء و عبادت، پوجا پاٹ، جب تب کے فطری اقتضاؤں سے بجائے خالق کے مخلوقات کو راہنی کرنے کی کوشش یہی عقل کی خامی اور نابالغی ہی زمانہ کا فیصلہ تھا لیکن بایں ہمہ خالق سے بے گانگی، اور مخلوقات ہی میں ہمہ تن استغراق، اس باب میں ان قدیم بت پرست قوموں کا حال ان ہی نئی قوموں کا تھا جن کی زندگی کی سرگرمیوں میں مخلوقات کے سوا خالق کے لئے کسی قسم کی کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی ہے فرق اگر کچھ ہے تو صرف یہی ہے کہ اپنے عقلی ضعف اور نابالغی کی وجہ سے عقلی رشتہ کے سوا دعائی رشتہ ہی پرانی بت پرست قومیں ان ہی مخلوقات سے قائم کئے ہوئے ہیں جن کے افادی پہلوؤں سے وہ نفع اٹھانا چاہتے تھے یا ضرر سے جن کے بچنا چاہتے تھے اور عقل کے اس عہد ارتقاء میں دعائی رشتہ کو ختم کر کے نئی قوموں نے صرف عقلی رشتہ کو ان ہی مخلوقات کے ساتھ باقی رکھا ہے جن سے وہ مستفید ہونا چاہتے ہیں یا ضرر رسانی سے جن کے اپنے آپ کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں اسی لئے صحیح معنوں میں پرانی بت پرست اور مخلوق پرست قوموں کی یادگار اور باضابطہ وارث اور جانشین اگر ہو سکتی ہیں تو اس زمانہ کی وہی قومیں ہو سکتی ہیں جو خالق سے قطعاً کنارہ کش ہو کر یکسوئی کے ساتھ مخلوقات ہی میں گڑی ہوئی ہیں، ان ہی کے ادھیڑ میں اور ان ہی کے اٹنے پلٹنے میں مصروف مشغول ہیں، لیکن خالق کے سوا کسی قسم کی کوئی مخلوق ہو نباتات و جمادات و حیوانات ہی نہیں بلکہ ملک ہو، جن ہو، یا کوئی بڑا آدمی ہی کیوں نہ ہو، ولی ہو، نبی ہو، رسول ہو، کچھ ہو کسی مخلوق کے ساتھ عبادتی و دعائی رشتہ قائم کرنا جن کے نزدیک بددینی کی بدترین شکل ہو بھلا ان خالق پرست بت پرستوں کو پرانی بت پرست یا مخلوق پرست قوموں کی یادگار یا جانشین قرار دینا تمسخر کے سوا اور بھی کچھ ہے۔

لیکن اس ظلم کا کوئی ٹھکانہ ہے، عرض ہی کر چکا ہوں کسی فن کی کوئی کتاب ہو، بڑی ہو، چھوٹی ہو، کسی نہ کسی جیلے سے بہت پرستی کی مذکورہ بالا توجہی اپج کو ہر چہ کر دہرانے والے کچھ اس طرح دھراتے رہے کہ تورات والوں کے دماغ سے تورات کا وہ سبق نکل گیا جو پہلے انسان آدم علیہ السلام کے متعلق پڑھایا گیا تھا انجیل والوں کو بھی یہ یاد تر ہے کہ بت پرستی کی اس توجہ پر ایمان لاسنے کے بعد انجیل پران کا ایمان باقی بھی رہتا ہے یا نہیں، اور جب قرآن کے ماننے والوں کے سامنے بھی قرآن کی ایتوں کا مفاد اس غوغائی ہنگامہ میں اوجھل ہو گیا جن میں بتایا گیا ہے کہ انسانوں کا پدر اول کن خصوصیتوں کا حامل تھا اسی لئے محراب مہر سے بھی اس دجالی توجہ کی آواز بازگشت ٹکرانے لگی ایسی صورت میں مہاجرات کی رزمیہ نظم کو اپنی دینی کتاب والوں سے بھلا کیا شکایت کی جائے کہ ست مگ معنی تاریخ انسانی کے سب سے پہلے دور اور قرآن کی سب سے بڑی خصوصیت ان غریبوں کو کیوں یاد نہ رہی ؟

اگرچہ شکر ہے کہ تقریباً چند صدیوں تک یورپ کے علمی نقارخانے بہت پرستی کی اسی توجہ قطعاً غلط، سراسر بے بنیاد توجہ سے جو گونجتے رہے، ان ہی نقارخانوں سے کبھی کبھی طوطی کی زبانوں سے اس قسم کے الفاظ بھی نکلنے لگے ہیں، کچھ دن ہوئے یورپ سے مارسٹن صاحب کتاب دی بائبل کما ریو

ہنامی آئی تھی جس میں بہت پرستی کی مذکورہ عام اور مشہور توجہ کے مقابلہ

میں یہ دعویٰ پیش کیا گیا ہے کہ

”نسل انسانی کی قدیم ترین مذہب کی تاریخ توحید سے آخری درجہ تک کے شرک اور بدروحوں کے

اعتقاد کی طرف ایک تیز رو پروانہ ہے“

اور تاریخی شواہد و بنیات کی روشنی میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ توحید ہی کا عقیدہ انسان کا ابتداء

عقیدہ ہی کچھ نقارخانوں میں طوطی ہی کی آواز سنی، لیکن جب وہ اٹھنے لگی ہے تو کون کہہ سکتا ہے کہ اس دجالی

فسوب کا پردہ آج نہیں توکل ہی چاک ہنہ ہوگا، خدا کرے کہ جیسے بہت سے مسائل میں یورپ والے

حقائق و واقعات کی روشنی میں نتیجے تک پہنچ چکے ہیں اس مسئلہ میں بھی ای کی توفیق بخشی جائے اور یہ تو

خیریت پرستی کی گو نہ نئی توجہ ہے چند صدیوں سے زیادہ اس کی عمر شاید آگے نہیں بڑھ سکتی لیکن اسی بت

پرستی یا مشرکانہ کاروبار کی ایک قدیم کہنہ توجیہ ہی ہے، جیسے بجائے توجیہ و تاویل کے آیا لوجی معذرت قرار دینا غالباً زیادہ درست ہوگا۔ عام طور کے ترک و توحید کا تذکرہ جہاں چھڑتا ہے پیش کرنے والے اس کو پیش کر دینے کے عادی ہیں یعنی نادیدہ، ان دیکھے خالق ہی سے رشتہ قائم کرنے میں پیش نظر دیگر مخلوقات سے سہارا لینے کی یہ کوشش ہے مطلب گویا یہ ہوتا ہے کہ بت پرستی کی روح بھی درحقیقت خالق پرستی ہی ہے، لیکن خالق چونکہ ہمارے سامنے نہیں ہے، اس لئے کسی ایسی مخلوق کو سامنے رکھ لیا جاتا ہے جس پر نظر بھی جم سکتی ہے اور دل و دماغ بھی ہر طرف سے سمیٹ کر ایک نقطہ پر ٹھہرانے میں مدد ملی ہے اس میں شک نہیں کہ کہنے والوں نے پہلے بھی یہی کیا ہے اور آج بھی دھرانے والے بت پرستی کی اس پرانی توجیہ کو عموماً دھراتے رہتے ہیں۔ المسودی جو چوتھی صدی کا سیاح و مورخ ہے، ہندوستان کی بت پرستی کا ذکر کرتے ہوئے اس نے بھی اطلاع دی ہے کہ

اللبیب منهم بقصد بصلاته الخالق
و یقیم التماثل من الاصنام والصور
مقام قبلۃ ص ۱۹۱ مروج الذهب
برکات ابن اثیر
یعنی ان ہندوستانی بت پرستوں میں جو صاحب مغزو عقل ہیں وہ تو اپنی پوجا پاٹ پر ارتقا میں غرق ہیں کو اپنا مقصود بناتے ہیں اور صورتوں یا تصویروں کو بطور قبلہ کے اپنے سامنے رکھتے ہیں (یعنی چہرہ بتوں کی طرف رہتا ہے اور توجہ خالق کی طرف)

غالباً ہندوستان میں اس کے سامنے یہی توجیہ معذرت کی شکل میں پیش ہوئی ہوگی، کیوں کہ اس ملک میں وہ خود بھی آیا ہے اور مختلف مقامات کی سیر کی ہے۔ باقی،

سیرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم

جس میں آسان اور دل نشین انداز میں سیرت ستر کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اہم واقعات کو بیان کیا گیا ہے دورِ حاضر کی مختلف سیرت بنوی کی کتابوں میں جامعیت کے اعتبار سے امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔

بلا جلد ۴

قیمت جلد ۱۰۰

قاضی شریح

از

(جناب ڈاکٹر خورشید احمد صاحب فاضل)

(ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ ڈی پروفیسر کالج)

شریح پہلی صدی ہجری کے ایک نہایت قابل قدر غیر سیاسی شخصیت ہیں ان کی زندگی کے مطالعہ سے جس کے مذہب و خال افسوس ہے کہ خوب واضح نہیں ہیں ان کی سچی عظمت و عزت کا دل متعجب ہوتا ہے وہ تقریباً ساٹھ سال اور بقول بعض ساٹھ سال سے زیادہ حج رہے یہ ایک لمبا عرصہ ہے اور پہلی صدی ہجری کے فتنہ پرور نیز تیزی سے بنتے بگڑتے سیاسی حالات میں جن کے دامن سے یہ وابستہ تھے حیرت انگیز بھی ہے۔ ان کی عظمت و عزت کا دل اس لئے معترف ہوتا ہے کہ وہ حقیقی طور پر خدائے حق، راست باز اور انصاف پسند انسان تھے، خدائی خدائے سی یا زبانی راستبازی نہیں بلکہ وہ خدائے سی و راستبازی جس کی پرکھ عمل سے ہوتی ہے، جو لَنْبِلُکْ اَتِکْکْ اَحْسَنُ عَمَلًا اور اَمْنًا و عَمَلًا الصَّالِحَاتِ کی صحیح مصداق ہے وہ خدائے سی و راستبازی ہی نہیں جو روزہ نماز، حج و زکات تک محدود ہے بلکہ وہ جو زندگی کی ہمہ گیر، مصروفیتوں، معاملات، خواہشوں اور خواہشوں کی تکمیل اور تکمیل کے طریقوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ یہ صفت ہم کو ان کے اکثر ہم رتبہ اور ہم لیش معاصروں میں صاف نہیں نظر آتی اور ان کے چاروں طرف جو سیاسی و قبائلی کردار ہیں جن کے ہاتھوں میں حکومت کی باگ ڈور ہے ان کی زندگی میں تو اس کے نقوش بہت دھندلے ہیں۔

شریح سنیہ میں قاضی ہوئے اور مکہ میں غالباً کبر سن کی بنا پر استعفاء دیا، یہ تاریخیں مورخ طبری مدنی سنہ ۳۱۰ھ نے دی ہیں۔ ان کی عمر بقول بعض ایک سو اسی سال بقول بعض ایک سو نوبیس

اور بقول بعض ایک سو سال تھی، قاضی بنے سے پہلے کی زندگی کے جو حالات دریافت ہو سکے ہیں یہ ہیں:

اُن کے باپ ایران سے آکر مین میں آباد ہوئے تھے، اس ہجرت کا شان نزول یہ ہے کہ ملک حبش کے بادشاہ نے مین کے بادشاہ سیف بن ذی یزن کے ملک پر قبضہ کر لیا تھا اور ایک لاکھ سے زیادہ فوج تیار کی تھی، سیف اتنی بڑی فوج کے مقابلہ سے عاجز تھا، وہ ایران کے بادشاہ نوشروان عادل کی خدمت میں حاضر ہوا اور حبشہ کے بادشاہ کے مقابلہ کے لئے مدد مانگی اور حکومت پانے کے بعد ایران کا باج گزار ہوئے کا وعدہ کیا۔ نوشروان ہمدردی سے پیش آیا لیکن وہ اپنی قیمتی فوج کو ایک غیر قیمتی علاقہ کی خاطر سمندری سفر کے ہولناک خطروں میں ڈالنے کے لئے تیار نہ ہو سکا اس کے دزیدوں نے مشورہ دیا کہ ملک کے قیدیوں کی ایک فوج بنا کر اس سے مدد کی جائے، چنانچہ ایک قابل سپہ سالار کی سرکردگی میں آٹھ سو قیدیوں کی ایک مسلح فوج آٹھ کشتیوں میں مین بھیجی گئی، دو کشتیاں سمندری سفر میں تباہ ہوئیں اور چھ بحیریت ساحل میں پہنچیں، حبش کی فوجوں کو شکست ہوئی اور سیف بن ذی یزن ایرانی حکومت کے تحت اپنے باپ دادا کے ملک پر قابض ہوا، ثوق سے نہیں کہا جاسکتا کہ شریح کے باپ سپاہی کی حیثیت سے آئے تھے یا فوج کے انتظامی یا خدمتی عمل سے ان کا تعلق تھا اگر سپاہی تھے تو جیسا کہ اوپر بیان ہوا قیدی ہوں گے جن کو حکومت کی طرف سے کسی جرم کی سزا دی گئی ہوگی، سیف کا مین پر قبضہ نوشروان کی حکومت کے ۵۴ سال بعد ہوا، محمد رسول اللہ کی عمر اس وقت ۵ سال کی تھی، مصنف اصحاب نے ایک قول نقل کیا ہے کہ شریح کی عمر قاضی ہونے کے وقت چالیس برس کی تھی اس اعتبار سے ہجرت کے وقت مین کی عمر بائیس برس کی ہوگی۔ یہ کب اور کس طرح مسلمان ہوئے؟ اس سوال کا یقینی جواب نہیں دیا جاسکتا ایک رائے یہ ہے کہ وہ معاذ بن جبل (متوفی ۳۸ھ) کی صحبت سے مستفید ہوئے تھے جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مین کے ضلع خبذ کا قاضی مقرر کیا تھا، اس مسئلہ میں کہ انھوں نے رسول اللہ کو دیکھا یا نہیں دو رائے ہیں ایک یہ کہ نہ دیکھا اور نہ کوئی حدیث

سنی، دوسری رائے اور شاید زیادہ قابل اعتماد یہ ہے کہ وہ رسول اللہ کے آخری زمانہ میں ان سے ملے تھے اور رسول اللہ کے ایما پر اپنے کنبہ والوں کو لینے میں گئے تھے اور جب لے کر آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو چکی تھی۔

پہلی بار گھر چھوڑ کر مدینہ آنے کا سبب یہ بتایا گیا ہے کہ ان کی ماں نے باپ کی وفات کے بعد دوسری شادی کر لی تھی جو ان کو ناپسند تھی۔

رسول اللہ کی وفات سنہ کی ابتدا میں ہوئی جس وقت شریح کی عمر تقریباً تیس سال ہوگی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قاضی بننے سے پہلے وہ تجارت کرتے تھے۔ اس رائے کی تائید ابن سیرین (متوفی ۱۱۰ھ) کے اس قول سے ہوتی ہے: شریح تاجر تھے اور ان کے ڈاڑھی نہ تھی۔

مصنف استیعاب نے لکھا ہے: شریح فیصلہ کی سمجھ بوجھ میں لکھتا تھا، ان کی معلومات وسیع اور صحیح تھی اس کے علاوہ عمدہ شاعر تھے جن کے پہلے مضامین پر مشتمل اشعار محفوظ ہیں، ان کے چہرہ پر ڈاڑھی کا ایک بال بھی نہ تھا۔ ابن خلکان لکھتے ہیں کہ پہلی صدی میں چار نامور بے ڈاڑھی والے ہوئے ہیں جن میں ایک شریح تھے باقی تین یہ ہیں، ابن الزبیر متوفی ۳۷ھ، قیس بن سعد بن عباد متوفی ۷۰ھ، احف بن قیس متوفی ۸۷ھ۔

شریح کے ایک معاصر کا کہنا ہے کہ "میں نے شرح کی ڈاڑھی سفید دیکھی" یہ قول مصنف استیعاب کی مذکورہ رائے کی تردید کرنا ہے کہ شرح کے چہرہ پر ڈاڑھی کا ایک بال بھی نہ تھا ان کے لئے کتابوں میں لفظ مزاح استعمال ہوا ہے، اور اس کی تائید میں ان کے متعدد قول نقل کئے گئے ہیں جن سے ان کی خشگفتہ مذاقی کا پتہ چلتا ہے، لیکن مذکورہ صفات اور ان کی سیرت میں رچی ہوئی خداترسی کے بعد جس صفت نے ان کو حیرت انگیز حد تک کامیاب بنج بیاوہ ان کی تحلیل و استنباطی عقل تھی، وہ بظاہر مٹے جلتے لیکن باطن بے میل مسائل کو خوب سمجھ لیتے تھے ان میں قرآن سے نتائج نکالنے اور ان کی مدد سے مسائل سلجھانے کا اچھا سلیقہ تھا، عربوں میں تحلیل

لے اصحابہ ۱۱۶ھ افغانی ۱۱۶ھ تہذیب التہذیب ۱۱۶ھ استیعاب بر حاشیہ اصحابہ ۱۱۶ھ

دوستنباہی عقل کیا ہے، وہ تقلید پسند لوگ تھے جو استنباطی عقل کی جگہ سلف کی مثالوں پر زیادہ بھروسہ کرتے تھے، جن کے فیصلے اکثر درائنکار و پیشہ گرد و پیش کے حالات نیز قبائلی و شخصی مصلحت اندیشی سے متاثر ہوتے تھے، شرح کی ان صفات کو بروئے کار لانے کے لئے قدرت نے ایک گویا زبان اور سلجھا ہوا انداز بیان عطا کیا تھا،

قاضی

جیسا کہ اوپر بیان ہوا شرح ۱۸۰ھ میں قاضی ہوئے۔ یہ حضرت عمر کا زمانہ تھا اور ان کی خلافت کا پانچواں سال ۱۸۱ھ میں بصرہ اور ۱۸۲ھ میں کوفہ کی فوجی چھاؤنیاں سرحد عراق پر وجود میں آچکی تھیں، عراق اور ملک ایران کا ایک اہم حصہ عرب مجاہدین کے ہاتھوں فتح ہو چکا تھا، مفتوحہ علاقوں کی نگرانی اور غیر مفتوحہ علاقوں کو فتح کرنے کے لئے ان دو شہروں میں حجاز کے بہت سے قبیلے مع اہل و عیال آباد ہو گئے تھے جن کی تعداد حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایک لاکھ سے زیادہ تھی اور دس سال بعد دو لاکھ سے متجاوز ہو گئی تھی، یہ اسلامی حکومت کے سب سے بڑے فوجی، قبائلی اور مالی مرکز تھے اور عنقریب باہمی قبائلی جھگڑوں، فتنہ انگیزیوں اور عربی حسدیت و انتقام کے بھی سب سے بڑے مرکز بننے والے تھے، کوفہ کی مجاہدین آبادی نے حضرت عمرؓ کے زمانہ سے بھی شورش و فتنہ کی چنگاریاں اڑانا شروع کر دی تھیں جیسا کہ سعد بن ابی وقاص رمتونی (۲۵۵ھ) اور ان کے بدعنوان یا سر رمتونی مسئلہ کی پے درپے مغزونی سے ظاہر ہوتا ہے، سعد ۲۱۱ھ میں معزول ہوئے، عمار ۲۳۲ھ میں، سعد کے خلاف یہ شکایت تھی کہ ان کو نماز پڑھانا نہیں آتی، عمار کے خلاف یہ شکوہ تھا کہ ان کو حکومت کا ڈھنگ نہیں آتا، حقیقت میں ان شکایتوں کے اسباب فتنہ پرور محرکات تھے۔

۱۸۰ھ سے پہلے بصرہ کے قاضی ابو مریم حنفی اور کوفہ کے قاضی ابو ذرۃ یا ابو فرودہ تھے، ان دونوں میں سے کسی کو رسول اللہؐ کی صحبت نہیں ملی تھی بلادی کی فتوح البلدان مصرائید نشین کے صفحہ ۲۵ پر ہے کہ پہلا شخص جس نے بصرہ آباد ہونے کے بعد وہاں کی مسجد میں بحیثیت قاضی فیصلے کئے اسود بن سربج تھے یہ رائے صحیح نہیں ہے، استیعاب اور اصحابہ ہر دو کے راوی متفق ہیں کہ اسود قاضی نہیں بلکہ داعط تھے، آیا

لے استیعاب عاتہ اصحابہ و اصحابہ

معلوم ہوتا ہے کہ سنت سے سنت تک جب ابو مریم کا تقرر ہوا بصوبہ قاضی کے فرائض گورنر انجام دیتا تھا اس خیال کی تابندہ حضرت عمر کے ان خطوط سے ہوتی ہے جو انہوں نے ابو موسیٰ اشعری (متوفی ۳۵ھ) کو جو سنت کے ادائل میں بصرہ کے گورنر ہوئے تھے قضا اور انصاف کے اصول کے بارے میں لکھے تھے۔

ابو موسیٰ چون کہ جنگی مہموں پر اکثر بصرہ سے باہر رہتے اس لئے غالباً خود انہوں نے ابو مریم کا تقرر کیا تھا۔
کوفہ کے قاضی سنت تا سنت ابو قرہ تھے، ابو قرہ کو ابو فریح بھی کہا گیا ہے، یہ موسیٰ یعنی آزاد کردہ غیر عرب تھے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ ان دونوں قاضیوں سے پوری طرح مطمئن نہ تھے اور ایسے آدمیوں کی تلاش میں تھے جو قضا کے بلند منصب پر ہر طرح پورے اترتے ہوں۔

سنت میں ان کو ایسے دو شخص ملے جو قاضی بننے کی پوری صلاحیت رکھتے تھے، ایک کعب بن سعد ازدی (متوفی ۳۵ھ) اور دوسرے شریح کعب ایک نہدانی خاندان کے نو مسلم تھے جن کو رسول اللہ کی صحبت نہیں ملی تھی، لیکن جو شریح کی طرح حماسہ باز تھے اور استقامت و تحملی دماغ رکھتے تھے، حضرت عمرؓ حضرت ابو بکرؓ کے زمانہ میں مدینہ کے قاضی تھے اور خلیفہ ہونے کے بعد بھی اکثر قضائے سنتے تھے، ایک بار ایک عورت آئی اور کہا میرا خاوند رات کو نماز پڑھتا ہے اور دن میں روزہ رکھتا ہے یہ درحقیقت اپنے شوہر کی ازدواجی بے تعلقی کی شکایت تھی جس کو عمرؓ نہ سمجھ سکے، انہوں نے شوہر کی عبادت گزار کی تعریف کی اور عورت چلی گئی، کعب بن سعد اتفاق سے موجود تھے، وہ عورت کا اشارہ پا گئے اور حضرت عمرؓ سے اس کی تصریح کی، عمرؓ نے عورت کو بلوایا اور بولے ”حق بات کہنے میں تمہارے لئے کچھ جرم نہ تھا، یہ رکعب کہتے ہیں تم اپنے شوہر کی ازدواجی بے تعلقی کی شاکی ہو“ عورت نے اس کا اقرار کیا حضرت عمرؓ نے شوہر کو بلوایا اور کعب سے اس معاملہ میں فیصلہ کرنے کو کہا، کعب کو امیر المومنین کے رد برویہ جرات کرتے ہوئے تردد ہوا لیکن حضرت عمرؓ کے منت آمیز اصرار پر وہ تیار ہو گئے اور بولے ”مرد کو چار شادیوں کی اجازت ہے، اگر اس کا شوہر چار دن میں ایک دن اس کی صحبت میں گزارے تو میرے نزدیک عین انصاف کے مقتضی ہے“ کعب کے اس قرآنی استنباط اور سلجھے ہوئے فیصلے سے بہت متاثر ہوئے، عورت کے

۳۵ طبری ۳۵ اصحاب ۳۴ ۳۵ استیعاب چاشیہ اصحاب

۱۴۰۳-۱۴۰۴

۷۲۲۰۱۹۸۶۱۸۸

حق میں یہ فیصلہ دیا اور کعب کو بصرہ کا قاضی مقرر کیا۔

شریح کے تقرر کا بھی کچھ ایسا ہی پس منظر ہے حضرت عمرؓ نے کسی سے ایک گھوڑی کی خریداری کی بات چیت کی جب قیمت طے ہو گئی تو انہوں نے آزمائش کے طور پر گھوڑے کی سواری کی یا جیسا کہ افغانی میں ہے کسی سے رائی۔ آزمائش کے دوران میں گھوڑا مر گیا مگر گھوڑے کے مالک کو گھوڑا لوٹانے لگے تو اس نے لینے سے انکار کیا حضرت عمرؓ نے کہا کسی کو بلا لاؤ جو ہمارے تہارے درمیان فیصلہ کر دے اور وہ شرح کلا یا جنہوں نے یہ فیصلہ کیا۔ امیر المومنین جو چیز آپ نے خریدی ہے اس پر قبضہ کیجئے یا جیسی لی تھی لوٹا دیجئے، عمرؓ اس فیصلہ سے بھڑک کر بولے ”کیا منصفانہ فیصلہ اس کے سوا اور کچھ ہو سکتا ہے!“ جاؤ تمہیں کو فکا قاضی بنا تا ہوں۔ ابن سعد نے اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ کا شرح سے یہ پہلا تعارف تھا۔

ابن عساکر نے شعبی کے حوالہ سے تاریخ دمشق ۵/۳۰۰ میں لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے شرح کی تنخواہ سو درہم تقریباً ساٹھ روپے، ماہانہ مقرر کی جب شرح کو فہ جانے لگے تو حضرت عمرؓ نے یہ ہدایت کی خدا کی کتاب میں جو فیصلہ تم کو ملے اس کی بابت کسی سے کچھ مت کہو سنو اور جب کوئی فیصلہ صاف صاف وہاں نہ ملے تو سنت کی طرف رجوع کرو، اگر وہاں بھی نہ ملے تو اجتہاد سے کام لو اس کے علاوہ مجلس قضا میں نہ کسی سے لڑو، نہ جھگڑو، نہ خریدو نہ بیچو۔

قاضی بشریح کے طویل منصب قضا ۱۸ تا ۴۹ھ کے عہد کی صرف جھلکیاں ہمارے سامنے آئی ہیں، ان کی سیرت اور قضا کے حالات قیمتی ہونے کے باوجود جہاں تک مجھے معلوم ہے استقصاء کے ساتھ کبھی مرتب نہیں ہوئے، متعدد کتابیں جو میری نظر سے گذری ہیں ان میں ان کے حالات بے سیاق و سباق اشاروں اور حکایتوں کی شکل میں بکھرے ہوئے ہیں اور متعدد کتابوں کا مواد ایک دوسرے سے مشترک اور ستعار نظر آتا ہے تاہم یہ جھلکیاں جب جمع ہو کر سامنے آتی ہیں تو ان کو شرح کی انفرادی سیرت، ان کی سیرت بحیثیت قاضی، ان کے انصاف کے طریقوں اور ان کے سیاسی طرز عمل کی ایک ایسی تصویر کھینچ جاتی ہے جس کے خد و خال واضح ہوتے ہیں اور جس کا خمیر ستبازی اور علیٰ خدا ترسی

نہ استیباب ماشیہ اصحابہ ۳/۳۳۰ طبری ۴/۲۲۲۱۶۸۴۱۸۸ ۳۵۹ اصحابہ ۴/۱۴

سے بنتا ہے۔

۱۸ھ کے بعد شریح سے ہماری ملاقات حضرت علیؑ کی زمانہ خلافت میں ہوتی ہے ۲۳ھ میں حضرت عمرؓ کے بعد حضرت عثمانؓ خلیفہ ہوئے اور ۳۶ھ میں حضرت علیؑ اس تیرہ برس کے عرصہ میں ایسے دور رس واقعات رونما ہوئے جو شاید تاریخ اسلام میں کبھی نہیں ہوئے ہوں گے، حضرت عثمانؓ اور ان کے عمل کے خلاف جو شورش و بد امنی پیدا ہوئی اس کا سب سے بڑا مرکز کوفہ تھا جہاں شریح قاضی تھے ۲۲ھ میں حضرت عمرؓ نے عبداللہ بن مسعود (متوفی ۳۲ھ) کو بیت المال کی نگرانی اور کونیوں کو قرآن و دین کی تعلیم دینے بھیجا تھا۔ ابن مسعود رسول اللہؐ کے مقرب اور لائق ترین ساتھیوں میں تھے اور قرآن و دین کی بہت اچھی بصیرت رکھتے تھے، ان کی زیر تعلیم قبائلی سرداروں کا ایک گروہ وجود میں آیا جس کو قراء کے لقب سے تاریخ میں یاد کیا گیا ہے، یہ لوگ کثرت سے قرآن پڑھتے اور لوگوں کی دینی معاملات میں رہنمائی کرتے۔

۲۳ھ میں حضرت عثمانؓ نے خلیفہ ہو کر حضرت عمرؓ کی حسب وصیت صحابی سعد بن ابی وقاصؓ کو جو عراق کے فارخ اور مؤسس کوفہ تھے گورنر مقرر کیا پھر ایک سال ہی کے بعد ان کو موزوں کر کے اپنے رشتہ کے بھائی ایک نوجوان کوحن کا نام ولید بن عقبہ تھا۔ کوفہ کا گورنر مقرر کیا عرب ہمیشہ جوانوں کے مقابلہ میں سن رسیدہ اور تجربہ کار لوگوں کی حکومت کو ترجیح دیتے تھے ولید بن سعد صحابی تھے نہ ان میں مذکورہ دو صفتیں تھیں کوفہ کے قراء اور وہ پرانے مجاہدین جنہوں نے ابتدائی جنگوں میں نمایاں حصہ لیا تھا اور فوجی و ظیفہ کی صنف اول (یعنی شرف عطاء ۲۰۰۰ تا ۲۵۰۰ درہم) سے مشرف تھے اور جواب تک چوٹی کے صحابہ کو گورنر دیکھنے کے عادی رہے تھے اس قدر سے بہت بد دل ہوئے ان کی اعتدال سے بڑھی ہوئی دینی و سنی و خدائی خود داری کو سخت ٹھیس لگی یہ بد دلی اور احساس توہین برابر بڑھتا رہا حتیٰ کہ چند سال میں اس نے شریح مخالفت کی شکل اختیار کی۔

گورنر ہونے کے کچھ دن بعد ولید نے ابن مسعود سے جو معلم دین کے ساتھ نگران خزانہ بھی تھے ایک رقم قرض لی اور مباد ختم ہونے پر واپس نہ کر سکے، ابن مسعود نے تقاضا کیا اور غالباً سختی سے

دلید نے حضرت عثمانؓ سے شکایت کی اور انہوں نے ابن مسعود کو لکھا: تم ہمارے خزانہ کے صرف خازن موقوف دلید کے ساتھ اس روپے کی وصولیابی میں جو انہوں نے تم سے لیا ہے کوئی سختی مت کرو ابن مسعود کی دیانتداری اس مداخلت کی تاب نہ لاسکی، انہوں نے غصہ میں آکر خزانہ کی چابیاں یہ کہتے ہوئے پھینک دیں: میں سمجھتا تھا کہ میں مسلمانوں کا خازن ہوں، لیکن اگر حبساکہ تم کہتے ہو میں تمہارا خازن ہوں تو مجھے ایسا خازن بننے کی ضرورت نہیں ہے، جو حاکم صحیح طرز عمل بدلتا ہے خدا اس کی خوشحالی بدل دیتا ہے۔ اس سے مراض ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں تمہارا خلیفہ بدل گیا ہے اور اس نے صحیح طرز عمل ترک کر دیا ہے یہ کتنا بڑا ظلم ہے کہ سعد بن ابی وقاص جیسے صحابی کو معزول کیا جائے اور دلید جیسے شخص کو گورز بنایا جائے یہ.....

..... دلید نے حضرت عثمانؓ کو لکھا کہ ابن مسعود لوگوں کو آپ کے خلاف بھڑکاتے اور آپ پر سخت تنقید کرتے ہیں، حضرت عثمانؓ نے لکھ بھیجا کہ ابن مسعود کو مدینہ روانہ کیا جائے اور ان کو اپنا دینی حلقہ چھوڑ کر جانا پڑا۔ ان دونوں وقوعوں سے قرآنی حلقوں اور پرانے مجاہدین میں سخت اشتعال پیدا ہوا ۲۹ھ میں دلید کے خلاف ایک سازش ہوئی جس میں ماخوذ ہو کر وہ گورزی سے معزول ہوئے اب حضرت عثمانؓ نے ایک دوسرے اموی رشتہ دار کو جو صحابی تھے نہ سن رسیدہ نہ پرانے مجاہد کو ذکاورز مقرر کیا، ان کا نام سعید بن عاص تھا دلید کی طرح یہ بھی سلامت رو اور لائق حاکم تھے انہوں نے قرآن اور پرانے مجاہدین کی عزت و دلدادگی کی لیکن مقبول نہ ہو سکے بلکہ جلد ان کی دشمنی کا شکار ہوئے۔ مخالفت کے انگاروں کو حضرت عثمانؓ کے خلاف مدینہ، بصرہ اور مصر کی تحریکوں نیز مدینہ کے ان صحابیوں کے خفیہ اشتعالی خطوط نے بھی ہوا دی جو خود خلیفہ بننے کے مشتاق تھے اور جن کو حکومت میں کوئی منصب حاصل نہ تھا اس کے علاوہ کوفہ میں دوسرے درجہ کے مجاہدین کا ایک طبقہ جو ۱۹ھ کے بعد کی فتوحات کے زمانہ میں ابھرا تھا قوت پکڑ رہا تھا اور پرانے مجاہدین پر چھٹانا جارہا تھا، سعید نے گورز ہو کر حضرت عثمانؓ کے مشورہ سے کچھ ایسے جاندار اور

۱۔ انساب الاشراف باذری (فلسطین) بیچ

مال سے تعلق رکھنے والے قدم اٹھائے جن سے پرانے مجاہدین کی قوت و عظمت بڑھ گئی اس اقدام کا دوسرے طبقہ پر بہت اثر پڑا اور وہ بھی حکومت اور حضرت عثمانؓ کے بدخواہوں میں ہو گیا پھر سعید کی سفارش سے جب ۳۳ھ میں حضرت عثمانؓ نے کوفہ کے دس قراء اور پرانے مجاہدین سرغنوں کو جو حکومت اٹھانے کے درپے تھے جلاوطن کیا تو سلگتی ہوئی بناوت بھڑک اٹھی، پرانے اور نئے طبقوں کے بہت سے مجاہدین مل کر باغیانہ پروگینڈے اور فتنہ انگیز کاموں میں لگ گئے اشتر مخفی کو ذ کے باشندہ اور صف اول کے قراء و مجاہدین میں تھے جن کی قیادت میں کوفہ سے ۲۰۰ آدمیوں کا ایک جتھا حضرت عثمانؓ کو برطرف یا قتل کرنے نکلا تھا ان ہی اشتر اور ان کے رفقاء نے حضرت عثمانؓ کی آخری گورنر ابو موسیٰ اشعری کو جو ایک صلح جو انسان تھے بدکلامیوں اور دھمکیوں سے قنارادت چھوڑنے پر مجبور کیا تھا اور ان کا سارا سامان لوٹ لیا تھا ۳۶ھ ابو موسیٰ کا قصور یہ تھا کہ وہ اہل کوفہ کو مسلمانوں کی باہمی لڑائی بینی حضرت علیؓ اور طلحہ زبیر عائشہ کی آویزش سے الگ رہنے کی تلقین کرتے تھے اور خود بھی الگ رہنا چاہتے تھے۔

غرض یہ کہ کوفہ میں فتنہ و بناوت کا دروازہ کھل گیا اور کوفہ ہی پر کیا منحصر بصرہ، مدینہ اور مدینہ سے بھی اس کی لپٹیں اٹھنے لگیں، عجمیابی و غیر عجمیابی سب اس کی زد میں آئے، فرق اتنا تھا کہ کوفہ ان سب کا پیش رو تھا، مدینہ اور مصر کی بناوت تو حضرت عثمانؓ کے قتل کے بعد فرزند ہو گئی لیکن بصرہ اور بالخصوص کوفہ میں یہ برابر بڑھتی اور پھلتی رہی جیسا کہ پہلی صدی ہجری کی تاریخ سے ظاہر ہے شورش و بناوت کوفہ کی روایات میں ہو گئی۔ جنگ جمل ۳۵ھ سے مارغ ہو کر حضرت علیؓ نے کوفہ کو اپنا پای تخت بنایا لیکن ان کی موجودگی نے اہل کوفہ کے شر انگیز رجانات دبانے کی بجائے ان کو اور زیادہ بھڑکایا ان کی نافرمانی نے ایک دن بھی انہیں سکھ سے نہ پیٹھنے دیا، ان کی شوریدہ سری کا داغ لے کر ۳۵ھ میں وہ رخصت ہوئے کوفہ ہی کے ایک باشندہ نے ان کو شہید کیا یہ کوفہ ہی تھا جہاں کے قراء اور علما نے خارجیت کا نعرہ بلند کر کے ایک ایسا باغی فرقہ پیدا کیا جس کی بناوت کی اس سوز چنگار پاں ۳۵ھ

۱۔ ملاحظہ ہو طبری سلسلہ کے تحت

سے لے کر پہلی صدی کے آخر تک براہِ کوفہ سے اٹھتی رہی۔ ۱۵۳۳ء میں بحرین عدی اور ان کے رفقاء کا قتل
انکا جوان کے قتل سے کچھ دن کے لئے دب گیا۔ معاویہ کی وفات (۶۸۰ء) کے بعد حضرت حسین کو
خلیفہ بنانے کی باغیانہ تحریک شد و مد کے ساتھ اٹھی اور جنگ کر بلا (۶۸۳ء) پر اس کا خاتمہ ہوا۔ ۱۵۳۳ء
میں تو امین شیخ اٹھے اور ۱۵۳۳ء ہی میں مختار بن ابی عبید نے اپنے سیاسی مقاصد کے لئے یہاں کی اقلیتی
پر در اور باغیانہ فضا کو استعمال کر کے حکومت حاصل کی۔ ۱۵۳۶ء میں اس کے خلافت کو فتنہ ہی کے لوگوں نے
ایک خوفناک بغاوت کی جس کا خاتمہ جنگِ بکین پر ہوا، پھر حجاج کی گورنری کے زمانہ میں متعدد بغاوتیں
ہوئیں جن میں ابن الاشعث کی بغاوت (۱۵۸۱ء تا ۱۵۸۳ء) سب سے نمایاں تھی۔ اس میں کوفہ کے قراء
کا خاص پارٹ تھا اور اس پایہ کے محدث فقہاء اور دینی لوگ شریک تھے جیسے شبی، سعید بن جبیر،
عبدالرحمن بن ابی یسلی، اور ابو النختری طائی۔

یہ اور دوسری بغاوتیں شدت سے اٹھیں لیکن کبھی اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوئیں۔ اپنے پیچھے
دکھنم اور بربادی کے سیاہ بادل چھوڑ جاتیں۔ سینکڑوں ہزاروں جانیں ضائع ہوئیں جن میں بے گناہوں
کی تعداد زیادہ ہوتی۔ سینکڑوں ہزاروں عورتیں یوں اور بچے یتیم ہو جاتے، خانگی شہزادہ زہریم برہم بیچنا
اور وہ محاسب پیدا ہوتے جو گھر کے ننگاں اور کھنڈ کے نہ ہونے سے پیدا ہوتے ہیں، مرنے والے اپنے
بچوں اور عزیزوں میں عربی انتقام کا جذبہ چھوڑ جاتے جو نشوونما پا کر ایک نئی بغاوت یا بدمعاشی کی صورت میں
کچھ دن بعد ظاہر ہوتا، اگر کسی کو یہ موقع نہ ملتا تو کوئی دوسری مہجرانہ شکل اختیار کرتا جس کی مناسبت تاریخ وادب
میں کم نہیں ہیں۔

شرح کے منصبِ قضا کا درخشاں اور سابق صدرِ انجمنِ پہلویہ ہے کہ انھوں نے شہرِ شہنشاہ
اور بغاوتوں سے گھرے ہوئے کے باوجود ان میں حصہ نہیں لیا، نہ کسی سیاسی پارٹی سے خود کو وابستہ
کیا نہ جہاں تک مجھے معلوم ہے کسی جنگ میں شرکت کی باوجود بیکہ اسی دورِ جہاد میں جنگ میں شرکت کیا
خدا کی انتہائی خوشخودی کا موجب خیال کیا جانا تھا۔ کتب میں سورج و ستارہ میں ان کے ساتھ بصرہ کے
قاضی ہونے کے بعد اپنی صلاح جوئی کے باوجود حضرت عائشہ کے ویاہ میں اگر جنگ جہل میں شریک ہونے

اور مارے گئے۔ اہل مدینہ نے بن میں اکثریت صحابہ کی بھی زبرد کے خلاف ۶۳ھ میں بغاوت کی اور اس روپے سے جو نہ بد نے ان کو عطیوں آرام و اعزاز کے طور پر دیا تھا صلح ہو کر لڑے اور ہزاروں کی تعداد میں تروہ کی مشہور جنگ میں مارے گئے جب کہ مہر بڑا اور چھوٹا جنگ و فتنہ کی طرف سمت مائل تھا شریح کا اس سے پرہیز کرنا تعجب خیز نظر آتا ہے۔ یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ وہ کیوں اس متعدی مرض سے محفوظ رہے اس کا جواب جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں ان کی غیر معمولی خداترسی اور قرآن فہمی میں وہ صلح جو آدمی تھے اور صلح جوئی کو خداترسی کا لازم سمجھتے تھے۔ وہ قرآن کی آیتوں کے خاص دعاء میں تیز کرتے تھے ان کی نظر میں قرآن کی انفرادی آیتوں کی جگہ مجموعی تصور تھا **وَ اتَّبِعُوا أَحْسَنَ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكُم مِّن سِرِّ النَّصِيحَةِ** کا فلسفہ وہ خوب سمجھتے تھے ان کا صاف ذہن ان اسباب کا بخوبی ادراک کرتا تھا جو فتنوں اور بغاوتوں کے محرک ہوتے تھے یہ محرکات بظاہر استنشار بالمال، تعطیل حدود، عدم شوری، افضلیت اہل بیت، حکومتی ظلم و جبر کی شکل اختیار کرتے لیکن ان کے ظاہر کے پیچھے ہوی کار فرما ہوتی، ہوی کہیں اپنے ذاتی اقتدار، ذاتی منفعت، خاندانی اقتدار، خاندانی منفعت، قبائلی اقتدار یا قبائلی منفعت کا لباس پہنتی، کہیں ذاتی مذہبی و دینی عظمت و تقدس کے اعتراف اور اس اعتراف کی معرفت سیاسی و دنیوی اقتدار کے حصول کی خواہش میں جلوہ دکھاتی کہیں یہ ہوی انتقام کا روپ بھرتی۔ خون کا انتقام، نقصان با بے جرمی کا انتقام کہیں یہ محض حسد بن کر دوسرے خاندان یا افراد یا قبیلوں کے اقتدار و خوشحالی چھیننے کے درپے ہوتی۔ شریح خوب جانتے تھے کہ ہوی اور اس کے مظاہر خداترسی کی ضد ہیں **وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَىٰ فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ** کا نقش ان کے دل پر ثبت تھا ان کو **فَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا** کے مقابلہ میں **فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ**، **وَلَمَنْ عَنِيَ وَغَفَرَ إِنَّ ذَلِكَ مِّنْ عِزِّ الْأُمُورِ** اور **وَالَّذِينَ يَتَّبِعُونَ بِأُحْسَنِ السَّيِّئَةِ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عِزٌّ بِالذِّمَارِ** کے فرمودات اسلام کی اسپرٹ سے زیادہ قریب نظر آتے تھے وہ **تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فِتْنَةً أَلَىٰ بَارِكِيوں** سے خوب آگاہ تھے۔

اس مقدمہ کے بعد جو ان کی سیاست و حکومت سے بندھی ہوئی زندگی کے باوجود حکومت

وساست اور اس کے بننے بگڑنے اور اس کی زد میں آنے والے اور اس کو زد میں لانے والے خون سے رنگنے اور رنگانے والے حوادث سے مکمل علیحدگی کی توجیہ کے لئے ضروری نقاب ہم وہاں لوٹتے ہیں جہاں شرح کو چھوڑا تھا یعنی حضرت علیؑ کا عہد خلافت

ابن ابی الحدید شارح پنج البلاء نے لکھا ہے: حضرت علیؑ نے شرح کو کوفہ کی بجائے بصرہ رکھا حالانکہ شرح بہت سے مسئلوں میں ان سے اختلاف رکھتے تھے جو فقہ کی کتابوں میں مذکور ہیں "اصاً" میں راوی ابن السکن کا یہ قول نقل کیا گیا ہے: "شرح کے حالات حضرت عمرؓ عثمانؓ اور علیؓ کے زمانہ میں بہت ہیں" یہ فقہی مسئلے اور کثیر حالات جن کی طرف ابن ابی الحدید اور راوی ابن السکن نے اشارہ کیا، افسوس ہے کہ فقہ کی متداول کتابوں اور پیش نظر تاریخی و ادبی کتابوں میں میری نظر سے نہیں گذرے ورنہ ان کی مدد سے شرح کو بحیثیت تاحی اور فرد کے زیادہ بہتر طریقہ پر سمجھنے میں مدد ملتی۔

لے شرح پنج البلاء (ایران) ج ۱، ص ۱۶۱

العلم والعلماء

یہ جلیل القدر امام حدیث علامہ ابن عبد البر کی شہرہ آفاق کتاب "جامع بیان العلم وفضلہ" کا ہنر صاف اور شگفتہ ترجمہ ہے مترجم کتاب مولانا عبدالرزاق صاحب بلخ آبادی اس دور کے بے مثال ادیب اور مترجم سمجھے جاتے ہیں موصوف نے یہ ترجمہ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کے ارشاد کی تعمیل میں کیا تھا جواب ندۃ المصنفین سے شائع کیا گیا ہے۔ علم اور فضیلت علم کے بیان۔ اہل علم کی عظمت اور ان کی ذمہ داریوں کی تفصیل پر خالص مدنیانہ نقطہ نظر سے آج تک کوئی کتاب اس مرتبہ کی شائع نہیں ہوئی اس متبرک کتاب کی ایک ایک سطر سونے کے پانی سے لکھنے کے لائق ہے ایک زبردست محدث کی کتاب اور بلخ آبادی صاحب کا ترجمہ موعظتوں و نصیحتوں کے اس عظیم الشان دفتر کو ایک دفعہ ضرور پڑھئے۔ صفحات ۳۰۰ بڑی تقطیع قیمت چار روپے آٹھ آنے۔ مجلد پانچ روپے آٹھ آنے

حکیم سنائی

مترجم

جناب انعام اللہ خاں صاحب ناظر

(ایڈیٹر روزنامہ المجیدہ دہلی)

ایک ہفتہ کے بعد اپنے بھائیوں کی عزاداری میں مشغول ہو گیا اور ان کی نقشیں تابلوئوں میں رکھ کر غور کروانہ کر دیں۔ اور عہد محمود کی تمام تعمیرات کو جو دنیا میں اپنا جواب نہ رکھتی تھیں تباہ کر دیا اور جب فیروز کوہ میں پہنچا تو بھائیوں کے انتقام کے جذبے کی تسکین ہو چکی تھی۔

یہ قطعہ لکھ کر سطروں کو دیا کہ ساز کے ساتھ گائیں اور خود عیش و نشاط میں مشغول ہو گیا۔

آئم کہ ہست خرز عدلم زمانہ را آئم کہ ہست جور ز بدلم خزانہ را

میں وہ ہوں کہ میرے اعداؤں سے زمانہ کو خمر ہے میری بخش خزانہ کے حق میں ستم ہے

انگشت دست خویش بد مال کند عدو چوں برزہ کمان نہم انگشت دانہ را

دشمن اپنی انگلیاں دانتوں سے کاٹتے ہیں جب میں کمان کھینچا ہوں

بہرام شاہ بکینہ من چوں کمان کشید کدیم بہ کینہ از کمر او کسانہ را

بہرام شاہ نے جب محمد سے لڑنے کو کمان پھینچی تو میں نے اس کی کمر سے ترکش اڑا لیا

کس تو ضن بتیغ در آمو ختم کنوں شاہان روزگار و ملوک زمانہ را

اب میں نے شاہان روزگار کو توار سے انتقام لینے کا سبق دے دیا ہے

دولت چو بر کشید شاید فرو گذاشت قول مغنی دے صاف معاف را

جب دولت حاصل ہو گئی تو مغنی کے غمے اور شراب فروشوں کی صاف شراب کو ترک نہیں کیا گیا۔

بہرام شاہ کی وفات کے متعلق اختلاف ہے، محمد اللہ مستوفی تاریخ گزیدہ میں لکھتا ہے کہ بہرام شاہ

جہاں سیر کے پہنچنے سے پہلے ۵۳ھ میں وفات پا چکا تھا۔ ابن اثیر لکھتا ہے کہ بہرام شاہ نے مقابلہ غزوی کی تاب نہ لا کر راہ فرار اختیار کی اور ۵۴ھ میں وفات پائی اس کے نزدیک غزنی کا قتل عام ۵۵ھ میں واقع ہوا۔ فرشتے نے یہی لکھا ہے کہ بہرام شاہ نے ۵۵ھ میں وفات پائی۔

سنائی کے معاصر شعرا مختاری غزنوی سنائی کے معاصر شعرا میں سے ایک مختاری ہے اس کا نام سراج الدین محمد عثمان ابن محمد تھا۔ آذر آتش کدہ میں اور ہدایت مجمع الفصحا میں رقم طراز ہے کہ مختاری پہلے عثمان تخلص کرتا تھا اس کا مولد اور وطن غزنی تھا۔ ایک قول کے مطابق ۵۵۵ھ اور دوسرے قول کے مطابق ۵۵۴ھ میں وفات پائی موفت تذکرہ حسینی لکھتے ہیں کہ مختاری حکیم سنائی کا استاد تھا لیکن یہ درست نہیں اس وجہ سے کہ سنائی نے اپنے اشعار میں مختاری کی مدح کرتے ہوئے اس کو جوان بتایا ہے اور اپنے کو شعر میں اس کا نظیر سمجھا ہے البتہ مختاری اور سنائی کے درمیان رابطہ مؤدت موجود تھا اور ایک دوسرے کی تعریف کرتا تھا۔

ہدایت کا بیان ہے کہ مختاری کے اشعار کی تعداد ۶ ہزار کے قریب ہے۔ قصائد کے علاوہ مختاری نے شہر یار نامہ کے نام سے ایک مثنوی بھی لکھی تھی صاحب انزال کرام نے اس سے گیارہ اشعار اپنی کتاب میں نقل کئے ہیں۔ اس مثنوی میں شہر یار بن برزہ پسر سہراب کے حالات بیان کئے گئے ہیں مختاری نے تین سال کی محنت میں اس مثنوی کو سلطان مسعود بن ابراہیم غزنوی کے نام پر تالیف کیا۔ چنانچہ لکھتا ہے۔

سنائی نے ۴۰ اشعار کے ایک قصیدہ میں مختاری کی تعریف کی ہے

انچہ نکرت بھی از عقل تو یابد کہ نظم بہ ہمہ عمر نیابد عدوت از ابر مسطیر
شعر کہتہ دقت تیرا فکر جو کچھ نیری عقل سے حاصل کرنا بہ وہ عدوت برسنے والے باداں سے عمر بھر مان نہیں سنتی
دہر در شعر نظیر ہم ندانست ولیک چوں ترا دید در این شغل مرا دید نظیر
فن شعر میں میری نظیر نہ تھی لیکن زمانہ لے جب تجھے شعر کہتے دیکھا تو میری نظیر دیکھ لی

سید غزنوی سنائی کے معاصر شعرا میں سے ایک سید شرف الدین حسن بن محمد ناصر حسینی ہے

سید حسن غزنوی کے ایک مشہور خاندان کا چشم و چراغ اور اس کشور کے مشہور شعرا میں سے تھا اس نے شاہان غزنوی کی مدح میں بھی قصائد لکھے اور سلجوقیوں کی تعریف بھی کی اس کا سال وفات معلوم نہیں بہر حال اس نے غزنوی پر غزلیوں کا تسلط دیکھا تھا

مولف آتش گدہ و جمع الفصحاء و قطراز میں کہ سید کے ساتھ عوام کو بے حد ارادت تھی بہرام شاہ اس سے خوف زدہ ہو گیا اور ایک غلام کو دیہاتوار میں دے کر اس کے پاس بھیجا سید حسن مرد سخن فہم تھا سلطان کا مطلب سمجھ گیا اور غزنوی سے جلد بغیر حج چلا گیا، حج سے واپس آنے کے بعد جوہی کے قریب وفات پائی اس کی نعش غزنوی میں دفن کی گئی۔ سال وفات ۵۱۵ھ تھا سید حسن کا مزار غزنوی کے باہر عام شترک کے قریب واقع ہے اعلیٰ حضرت امیر حبیب اللہ شہید کے عہد میں اس کے گنبد کی مرمت کرائی گئی، سید اپنے زمانہ کے مفکر شعرا میں تھا اور حکیم سنائی سے اس کی خط و کتابت تھی سید حسن نے اپنے ایک قصیدہ میں اظہارِ مبالغہ کیا ہے۔ یہ قصیدہ فارسی کے مشہور قصائد میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کا مطلع یہ ہے۔

داند جہاں کہ قرۃ عین پیمبرم شامید مہوۃ دل زہرا د حیدرم

دنیا جانتی ہے کہ میں پیغمبر کا نور چشم ہوں اور زہرا اور حیدر کے دل کا نور بصورت مہوہ ہوں

سنائی کا رمانہ بلخ میں سید حسن کی تعریف کرتے ہیں

شاخ دیگر جاں دیں حسنی آل جو نام خود از نکو سخنی

سید خوب رور و پاکیزہ سخش ہم جو غیب و دشمنی

فوت نظم و نثرش از سب است زانکہ از شاخ اصح العرب است

محمد بن ناصر علوی غزنوی | سنائی کے معاصر شعراء میں سے ایک محمد بن ناصر علوی ہے۔ عرفی اس کو السید الاصل

جمال الدین اکمل الشعرا محمد بن ناصر علوی لکھتا ہے اور اس کو سید حسن غزنوی کا بڑا بھائی بتاتا ہے

مولف مجمع الفصحاء رقم طراز ہے کہ محمد بن ناصر و بہرام شاہ میں بڑی عزت رکھتا تھا۔ حکیم سنائی

نے کا رمانہ بلخ میں اس کو ”بڑے از بحر مواج نو حید اور شاخ زباغ تابید“ لکھا ہے۔ فرماتے ہیں

شرف الدین محمد ناصر عقل از و کدو و ہم از و قاصر
فکرش مایہ یانی ذکر خاطرش قبدہ معانی ذکر
درے از موج سحر نو حید است شاخ از نخل باغ نابد است
خط او اصل طلعت نور است شعر او عقد گردن حور است
حکیم سنائی نے ایک قصیدہ لکھا ہے جس کا قافیہ سکندر اور گوہر اور رولف آتش و آب ہے
اس میں بھی محمد بن ناصر علوی کی تہنیت کرتے ہیں

سرکامد سید محمد آنکہ شدہ است بلند ہمت و نظمش بگوہر آتش و آب
میان طبع تو و طبع ماست در نظم کنایت است دریاں شعر و اور آتش و آب
اس قصیدہ میں حکیم صاحب اپنے مدح کی روانی طبع اور جولانی فکر کی تہنیت کے ساتھ
اس کے بدل و بخشش اور لطف و عدل کی مدح بھی کرتے ہیں۔

عمادی شہر یاری [سنائی کے معاصر شعرا میں سے ایک عمادی شہر یاری ہے اس کے متعلق تذکرہ نگاروں
میں اختلاف ہے بعض کہتے ہیں کہ عماد الدین غزنوی اور عمادی شہر یاری دو دنوں ایک ہیں۔ بعض
کہتے ہیں کہ عماد الدین غزنوی ایک اور شاعر تھا بعض کے نزدیک عمادی کا مولد غزنی ہے اور یہ بخاری
کا فرزند تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ موضع شہر یاری کا باشندہ تھا بہر حال عمادی نے سیف الدین عماد الدولہ
فرزند شہر یار مازندراں اور سلطان طغرل ابن محمد سلجوقی معروف بہ طغرل دوم کی مدح کی ہے اور عراق
میں اس کے ساتھ رہتا تھا شعرا میں سے انوری اور حسن غزنوی کی تہنیت کی ہے عمادی حکیم سنائی
سے نسبت شاگردی رکھتا تھا اور ان کے اراد مندوں میں شمار کیا جاتا تھا۔

نقی الدین رمنظر از ہے کہ عمادی مدتوں بلخ میں مقیم رہا اور حکیم سنائی سے تصوف حاصل کیا
عمادی کا سال وفات صحیح طور سے معلوم نہیں ہو سکا نقی الدین اپنے تذکرہ میں لکھتا ہے کہ ۷۵۵ھ
میں وفات پائی۔ عمادی معانی کی نزاکت اور الفاظ کی سلاست کے اعتبار سے اپنے عہد کے مشہور
شعرا میں شمار ہوتا تھا اور اکثر جلیل القدر شعرائے اس کے کلام کی عذارت کا اعتراف کیا ہے، عمادی

یہ حال و کمال سنائی سے حاصل ہوا اس کے اشعار کی تعداد ۶ ہزار کے قریب ہے۔
ابو حنیفہ اسکافی غزنوی | ابو حنیفہ اسکافی غزنوی کا باشندہ تھا ۵۴۴ھ میں شاعری شروع کی اس وقت سلطان
 براہیم بن مسعود بن محمود غزنوی تخت سلطنت پر ٹھکان تھا۔ ابو الفضل بیہقی نے اپنی تاریخ میں اس
 کی تعریف کی ہے اور متعدد مقامات میں اس کی دانش و حکمت کا ذکر کیا ہے۔ یہ بھی لکھتا ہے کہ ابو حنیفہ
 اس زمانہ کے مقتدر شعرا میں ہے۔ اور لوگوں کو علم و ادب کا درس دیتا ہے۔ یہ بھی نے ابو حنیفہ کے
 چار قصائد اپنی کتاب میں نقل کئے ہیں جیسا کہ اسکافی کے قصائد سے معلوم ہوتا ہے ۵۴۴ھ کے
 قریب وہ جوان تھا چنانچہ کہتا ہے

از انکہ ہستم از غزنی و جوانم نیز نمی نہ بینم مر علم خویش را بازار
 ابو حنیفہ کی تاریخ وفات یقین کے ساتھ معلوم نہیں ہو سکی ہر حال یہ بات یقینی ہے کہ اس نے
 سلطان مسعود بن ابراہیم کا عہد دیکھا اس لئے کہ سنائی نے کارنامہ بلخ میں اس کی تعریف کی ہے
 اور کارنامہ مسعود بن ابراہیم کے عہد میں لکھا گیا ہے اور سلطان مسعود نے بقول ابن اثیر شوال
 ۵۴۴ھ میں اور بقول مہناج سراج ۵۴۴ھ میں وفات پائی
 سنائی کا کارنامہ بلخ میں ابو حنیفہ کا ذکر کرتے ہوئے اس کو چاکر سید الشعرا کہتے ہیں ممکن ہے
 سید الشعرا سے سید حسن یا اس کا بھائی سید محمد مراد ہو لیکن سنائی نے کارنامہ بلخ میں اسکافی کا ذکر
 تعریف کے ساتھ نہیں کیا، لکھتے ہیں

از پس بو حنیفہ اسکافی کہ بر اشرف دارد اسرانی
 چاکر صدر سید الشعرا کہ براں چاکر سیت خانہ ما
 نیک مرد ست لیک بدخوی است از بردوں زرد و اندوں رو سیت

سنوئی سمرقندی | سنائی کے معاصر شعرا میں ایک سوزنی سمرقندی ہے اس کا نام محمد تھا اور باب کا نام
 ایک قول کے مطابق علی اور دوسرے قول کے مطابق مسعود تھا سوزنی سمرقندی اپنے عہد کے
 مشہور شعرا میں شمار ہوتا ہے سوزنی اوائل میں ہزل اور ہجو لکھتا تھا لیکن آخر میں اس سے تائب

صاحبِ مجمع الفصاحہ رقم طراز ہے کہ آخر میں حضرت حکیم سنائی سے بیعت کر کے تائب ہو گیا۔ بعض سخن و سخنوراں قول ہدایت کی تردید کرتے ہوئے رقم طراز ہے کہ اگر یہ دعویٰ صحیح ہوتا تو سوزنی کے کلام میں کم از کم اشارت اس کا کچھ ذکر پایا جاتا حالانکہ ہجویات میں حکیم سنائی کا نام کہیں کہیں نظر آتا ہے۔ سوزنی نے بردایت تقی الدین ۵۶۹ھ میں اور بقول دولت شاہ ۵۶۲ھ میں وفات پائی۔ عبد الواسع حبلی غرستانی | سنائی کے معاصر شعر میں ایک عبد الواسع حبلی ہے بعض اس کو بدایع الزماں بھی کہتے ہیں۔ غرستان اس دلاہیت کا نام ہے جو مغرب میں ہر امت مشرق میں غور جنوب میں غزنی اور شمال میں مرد سے محدود ہے۔ حال کے ہزارہ جات میں اس وقت کے غرستان کے مرکزی حصے شامل ہیں۔

یاقوت معجم البلدان میں رقم طراز ہے کہ غرستان ایک وسیع علاقہ ہے اس میں بہت بستیاں واقع ہیں۔ غرستان کا بادشاہ بشیر میں رہتا ہے۔ یاقوت بحوالہ اصطخری رقم طراز ہے کہ غرستان میں دو بڑے شہر ہیں ایک کا نام بشیر ہے دوسرے کو سور میں کہتے ہیں یہ دونوں شہر متصل واقع ہیں اور پائے تخت ایک اور مقام میں ہے جس کا نام بلیکان ہے۔

شاربائے غرستان سے بادشاہوں کا وہ سلسلہ مراد ہے جس نے زلاہیت غرستان میں حکمرانی کی اہل تاریخ ان کو شار کہتے ہیں۔

تاریخ ہینی میں مذکور ہے کہ شاربائے غرستان کی اقامت گاہ شہر آفتابن میں تھی محمود غزنوی نے شاربائے غرستان کے سلسلہ کو توڑ دیا۔ شاربائے غرستان میں ابونصر معروف ہے جو شمس الملک بقید حیات تھا آخر عمر میں سند شاری پر اپنے فرزند کو بٹھا کر خود فرماں روائی سے کنارہ کیا اور علم مہرمت کے حصول میں مصروف ہو گیا۔ ابونصر کے فرزند نے ہندوستان کے ایک غزوہ میں سلطان محمود کو مدد دینے سے انکار کر دیا۔ سلطان نے اس کو شاری سے ہر طرف کر دیا اور اس خاندان کی امارت کا سلسلہ منقطع ہو گیا ابونصر کو ہرات میں نظر بند کر دیا گیا جہاں اس نے شمس الملک میں وفات پائی۔ چونکہ عبد الواسع حبلی نے غرستان کے ملکہ کو ہستان میں پرورش پائی تھی اس لئے حبلی تخلص کیا۔ عبد الواسع صاحب

کا امام سمجھا جاتا ہے جبلی نے خاندان غزنوی میں بہرام شاہ اور سلجوقی میں سنجر کی مدح کی مورخین نے اس کا سال وفات ۵۵۴ھ لکھا ہے

ادیب صابر | سنائی کے معاصر شعرا میں ایک شہاب الدین ادیب صابر بن ادیب اسمعیل ترمذی ہے ادیب صابر کا وطن ترمذ ہے بلخ اور خوارزم میں بھی سکونت اختیار کی ہے سلطان سنجر کی تعریف میں قصائد لکھے ہیں بعض کہتے ہیں کہ سنجر نے اس کو اپنا بھائی بنالیا تھا۔ ۵۵۴ھ میں وفات پائی۔ بیان کرتے ہیں کہ سنجر نے ادیب کو انسر کے پاس فخری کے لئے بھیجا تھا اس اثنا میں انسر نے دو اشخاص کو پونیدہ طور سے مرد بھیجا تھا کہ سنجر کو قتل کر دیں۔ ادیب نے بہ تمام حال سنجر کو لکھ دیا سنجر نے انسر کے فرستادہ اشخاص کو گرفتار کر کے قتل کر دیا انسر کو یہ واقعہ معلوم ہوا تو اس نے ان دو اشخاص کے انتقام میں ادیب کو پکڑ کر جھجوں میں غرق کر دیا۔

شاہ ابورجائی غزنوی | حکیم سنائی کے معاصر شعرا میں ایک شاہ ابورجائی غزنوی ہے محمد عوفی صاحب کتابیات اس کو علیہ القدر شعرا میں شمار کرتا ہے۔ شاہ ابورجائی بہرام شاہ کا مداح تھا ۵۹۶ھ میں بقیہ حیات تھا غزوریوں کا زمانہ بھی دیکھا۔

مغزی | سنائی کے عہد میں دو اشخاص نے مغزی کے تخلص سے شعر کہے تھے ایک مغزی غزنوی اس کا نام سدید الدین تھا اور سراج الدولہ خسرو ملک کی مداحی کرتا تھا۔ محمد عوفی اس کی خلاوت طبع اور بلندی شعر کا معترف ہے اور اس کے دیوان کو رشک ارتگ مانی قرار دیتا ہے۔ اس کے سوا اس مغزی کے حالات کی تفصیل معلوم نہیں ہو سکی۔

دوسرا امیر مغزی جس کا نام اور لقب بقول محمد عوفی عبداللہ محمد بن عبدالملک برہانی تھا ہماری

مراد یہاں اسی امیر مغزی سے ہے بعض نے اس کا مولد نیشاپور بتایا ہے اور بعض نے سمرقند۔ امیر مغزی اپنے عہد کے مقتدر شعرا اور ائمہ ادب میں شمار کیا جاتا تھا امیر مغزی نے بہرام شاہ کی مدح کی ہے اور خوارزمیوں اور سلجوقیوں کی تعریف میں بھی قصائد لکھے ہیں شاعری میں دوبار محمودی کے ملک الشعراء ہنصری بلخی کی پیروی کی ہے مغزی کی وفات بقول صبح ۵۴۲ھ میں ہوئی اکثر روایات سے معلوم

ہوتا ہے کہ امیر مغزی سنجہ کی شکاری کمان کے تیر سے مجروح ہو گیا تھا دو سال تک زخم کا علاج کرتا رہا۔ علاج سے زخم بھر چلا تھا لیکن چند روز بعد پھر بگڑ گیا اور یہی اس کی موت کا سبب تھا۔ سنائی اور مغزی کے درمیان دوستانہ روابط تھے سنائی نے مغزی کی وفات کے بعد مرثیہ لکھا۔

مسعود سلیمان سنائی کے معاصر شعرا میں ایک مسعود بن سعد بن سلیمان ہے اس کا مولد لاہور ہے مسعود ان شعرائے نامور و مقتدر میں سے ہے جن کی تربیت غزنی کے معارف پرور سلاطین کے سایہ میں ہوئی۔ مسعود شعرو شاعری میں درجہ استاد کو پہنچا اس نے سلاطین غزنوی میں سے پانچ بادشاہوں کی مدح کی جن کے نام یہ ہیں سلطان ابراہیم بن مسعود۔ سلطان مسعود بن ابراہیم شیرزاد بن مسعود۔ ابو الملوک ارسلان بن مسعود۔ بہرام شاہ ان بادشاہوں کے علاوہ مسعود نے سیف الدولہ ابو القاسم محمود بن ابراہیم کی بھی مدح کی ہے اور اس کا اکثر مدحیہ کلام اسی شاہزادہ کی تفریح میں ہے لیکن انوس ہے کہ اس شاعر کی عمر کا بڑا حصہ قید و بند میں گذرنا قید خانہ کی تفصیل نے مسعود کے دفتر شاعری کو طومار ماتم بنا دیا اس کی عمر کے پندرہ سال قید خانہ کے تنگ و تاریک گوشہ میں بسر ہوئے۔ دس سال قلعہ سو دھک میں تین سال حصار نامے میں اور آٹھ یا ۹ سال حصار مرغ میں مقید رہا۔

تفصیل اس واقعہ کی یہ ہے کہ سیف الدولہ اپنے باپ کی طرف سے حکومت ہند پر مامور کیا گیا تھا مسعود سلیمان بھی اس کے طواریح خاص میں شامل ہو گیا تھا۔ مسعود سلیمان ابراہیم نے بدگمان ہو کر اپنے فرزند کو اس کے ندیموں سمیت گرفتار کر کے نظر بند کر دیا ان ہی ندیموں میں مسعود سلیمان بھی شامل تھا آخر کار سلطان ابراہیم کے ایک ندیم ابو القاسم نے سفارش کی کہ مسعود کو قید خانہ سے رہا کرایا اس اثنا میں سلطان ابراہیم نے وفات پائی۔ سلطان مسعود نے تخت سلطنت پر جلوس فرمایا۔ ہندوستان کی حکومت اپنے فرزند امین اللہ شیرزاد کو تفویض کی ابو نصر عبد اللہ فارسی کو اس کی پیش کاری اور ہندوستان کی سپہ سالاری پر مقرر کیا ابو نصر اور مسعود سلیمان کے درمیان دیرینہ محبت تھی۔ اس نے مسعود کو حکومت جالندھر پر مقرر کر دیا لیکن جب

ہی روز بعد ابو نصر معنوب ہو گیا اور مسعود کو پھر آٹھ یا نو سال تک حصارِ مرغ کے زنداں میں رہنا پڑا۔
 لیکن یہ امر موجب تعجب ہے کہ قید خانہ کی روح فرسا تکلیفوں نے مسعود کی شاعری کی
 روح کو فنا اور اس کے جذبہ حریت کو مغلوب نہیں کیا بلکہ اس کے اشعار میں جان ڈال دی اور اس
 کے نالوں کو زیادہ دل گداز اور سوزناک بنا دیا۔ حکیم سنائی کو مسعود سعد سلمان سے دلی محبت تھی۔
 اس کے دیوان کو جمع کیا اور اس طرح شاعرِ نامور کی بڑی مدد کی۔ گویا مسعود کے یتیم بچوں کو در بدر
 پریشان ہونے سے بچالیا، کہتے ہیں کہ جب سنائی نے مسعود کے دیوان کو جمع کیا تو سہو اور دوسرے
 شعرا کا بھی کچھ کلام اس میں درج ہو گیا۔

نقۃ الملک ظاہر بن علی نے سنائی کو اس سہو سے آگاہ کیا تو حکیم نے معذرت کے طور پر
 ایک طویل قطعہ لکھ کر مسعود سعد کو بھیجا جس میں لکھا کہ مجھے کیا معلوم تھا کہ شاعروں نے تیرے نام
 سے شہرت کے لئے اپنے اشعار منسوب کر دئے ہیں۔

حکیم سنائی کی وفات | حکیم سنائی کے سال وفات میں تذکرہ نویسوں کے درمیان اختلاف ہے۔ جامی نے
 نقات میں سنائی کا سال وفات ۵۲۵ھ تحریر کیا ہے دولت شاہ سمرقندی نے اپنے تذکرہ اور شمس الدین
 نے قاموس الاعلام میں ۵۲۶ھ لکھا ہے۔ صاحب مجمع الفصحا ۵۲۹ھ بتاتے ہیں۔ مولف سفینۃ الاولیاء
 دارا خکوہ و مولف خزینۃ الاصفیاء ۵۲۵ھ قراہ دیتے ہیں مولف ریاض العارفین کے نزدیک سنائی
 کا سال وفات ۵۲۶ھ ہے حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں ۵۲۹ھ لکھا ہے امین احمد رازی کی تحقیق
 ہے کہ سنائی نے بقول اصح ۵۲۵ھ میں جہان فانی سے رحلت کی۔ حمد اللہ مستوفی رقم طراز ہے کہ
 حکیم سنائی زمان سلطنت بہرام شاہ (۵۱۱ھ۔ ۵۲۵ھ) تک بقید حیات تھے۔ مولف تاریخ
 فرشتہ لکھتا ہے کہ سنائی بہرام شاہ کے معاصر تھے اور کتاب حدیقۃ النفوس نے ۵۲۹ھ میں تمام کی
 نفی الدین کاشی نے سنائی کا سال وفات ۵۲۵ھ ٹھہرایا ہے۔

ہمارے زمانہ کے مورخین نے تحقیق کے بعد اس پر اتفاق کیا ہے کہ حکیم سنائی نے ۵۲۵ھ
 میں وفات پائی۔ حکیم سنائی کی لوح مزار پر سال وفات ۵۲۵ھ کندہ ہے حقیقت یہ ہے کہ سنائی

نے ۱۹۵۲ء سے پہلے رحلت نہیں کی تھی۔ انھوں نے اپنی کتاب طریق التفتیح ۱۹۵۲ء میں مکمل کی ہے چنانچہ اس کتاب کے آخر میں لکھتے ہیں

پانصد و بست و ہشت آخر سال بود کیں نظم آخر یافت کمال
۱۹۵۳ء تک سنائی کا بقید حیات ہونا اس سے بھی ثابت ہے کہ انھوں نے امیر معزی کا مرنیہ لکھا اور تمام تاریخ نویس اس امر پر متفق ہیں کہ امیر معزی نے ۱۹۵۵ء میں وفات پائی۔ اس سے ثابت ہو گیا کہ حکیم سنائی ۱۹۵۲ء تک زندہ تھے دولت شاہ سمرقندی حکیم کی وفات ۱۹۵۶ء میں بتاتا ہے لیکن اسے غلط فہمی ہوئی ہے اس لئے کہ سنائی ۱۹۵۶ء تک بقید حیات تھے تو غزنی کے قتل عام سے محفوظ نہ رہتے اگر بہ فرغ کر لیا جاتے کہ علاء الدین جہاں سوزان کا احترام کرنا تھا تو کم از کم ان کے کلام میں عزیز وطن کی اس بربادی اور اپنے محبوب مولد کی تباہی کے متعلق ضرور کوئی ذکر موجود ہوتا اور جب یہ معلوم ہو گیا کہ سنائی ۱۹۵۶ء میں بقید حیات نہ تھے تو مولف مجمع الفصحا کا یہ قول صحت سے بہت بعید ہے کہ سنائی نے ۱۹۵۶ء میں وفات پائی۔

اب رہا لوح مزار کا مسئلہ اس کی حقیقت یہ ہے کہ جب داراشکوہ غزنی آیا تو اسی لوح مزار کو دیکھ کر سنائی کا سال وفات معلوم کیا اور صاحب خزینۃ الاولیاء نے اس کو صحیح سمجھ کر اپنے تذکرہ میں درج کر دیا لیکن افسوس یہ سنگ مزار سنائی کے سال وفات کا عقدہ حل نہیں کرتا۔ اس وجہ سے یہ پتھر حکیم صاحب کی وفات کے ایک مدت بعد نصب کیا گیا ہے۔

میں کئی بار اس مزار کی زیارت سے مشرف ہوا ہوں اور سنگ مزار کو بنورد بچھا ہے یہ پتھر دو ٹکڑوں سے مرکب ہے۔ چھوٹا ٹکڑا عمودی صورت میں قبر پر نصب ہے اس کے نقش و نگار اور رسم الخط ان الواح سے ملتے جلتے ہیں جو سنائی کے زمانہ میں لکھی گئیں لیکن اس ٹکڑے پر سنائی کا سال وفات کندہ نہیں صرف یہ لکھا ہوا ہے

”ہذا قبر فقیر الی رحمۃ اللہ محمد و آسنائی غفر اللہ لہ“

دوسرے پتھر پر جو قبر پر بچھا ہوا ہے سنائی کا سال وفات کندہ ہے اس کی وضع قطع سے

معلوم ہوتا ہے کہ سنائی کی وفات کے مدتوں بعد نصب کیا گیا ہے۔ اس کا اعتبار نہیں کیا جاسکتا
 اول اس وجہ سے اس کا رسم الخط اس عہد کی الواح مزارات سے بالکل مختلف ہے دوسرے
 اس وجہ سے کہ اس کا رسم الخط ہمارے زمانہ کے رسم الخط سے ملتا جلتا ہے تیسرے یہ کہ اس پتھر
 پر گلستانِ سعدی کا مشہور شعر بلخ اعلیٰ بکمالہ کندہ ہندی اور سنائی کے عہد کے درمیان ۱۲۶
سال کا فرق ہے یعنی سعدی نے سنائی سے ۱۲۶ سال بعد وفات پائی۔ ہمارے زمانہ کے مورخین
متفق ہیں کہ سنائی نے ۵۴۵ھ میں وفات پائی ممکن ہے یہ قیاس صحیح ہو لیکن ایک بات شبہ
پیدا کرتی ہے اور وہ یہ کہ سنائی ۵۴۵ھ تک بقید حیات ہوئے تو کرمان میں بہرام شاہ کی شکست
غزنی میں سیف الدولہ غوری کی تخت نشینی (۵۴۳ھ) بہرام شاہ کا حملہ اور سیف الدولہ کا قتل ان
واقعات کا ضرور کچھ ذکر کرتے۔ بہرام شاہ سنائی کا مدد و ح تھا اور اس حد تک حکیم صاحب کا
احترام کرتا تھا کہ حکیم صاحب نے اپنے شاہکار حدیقۃ الحقیقت کو اس کے نام سے نام لیت کیا۔
سنائی کا مزار حکیم سنائی کا مزار غزنی کے گوشہ شمال مغربی میں اس شہر کے قریب واقع ہے جو غزنی
سے کابل جاتی ہے، لوگ نزدیک و دور سے اس کی زیارت کے لئے آنے رہتے ہیں زائرین
کی کثرت کی وجہ سے کافی پہل پہل رہتی ہے ملت افغان کے نزدیک غزنی وہ سرزمین ہے
جس کے خاک کے ذروں میں اسلاف کی شوکت و عظمت خوابیدہ ہے۔ اس کی نگاہ میں
سلطان کا روضہ شجاعت اور طاقت کی یادگار اور سنائی کا مزار انوارِ روحانی و عرفانی کا ہیضہ ہے
تئے مزار کی تعمیر مزار سنائی پر جو عمارت پیشتر بنی ہوئی تھی معلوم نہیں کس نے اور کب بنائی تھی بہر
بلحاظ طرز تعمیر حیدرآباد قدیم نہ تھی۔ اعلیٰ حضرت امیر حبیب اللہ خاں شہید کے عہد میں اس کی ترمیم
کی گئی لیکن مرمت سے بس قدیم عمارت کی بانداری میں کچھ اضافہ ہوا، حقیقت یہ ہے وہ عمارت
حکیم سنائی کی جلالتِ قدر کے شایاں نہ تھی اس عصرِ فرخند میں جب مملکت اوزستان
کے اندر سہفت ادبی کا دور شروع ہوا تو اعلیٰ حضرت شہر یار جوان المتوکل علی اللہ محمد ظاہر شاہ دہلوی
اللہ شاکتہ نے مزار سنائی پر نئی عمارت بنانے کا حکم صادر کیا تاکہ یہ تاریخی مقام اس عہدِ درخشاں

میں از سر نو عظمت حاصل کرے۔

کلام سنائی | حکیم سنائی کا منظوم کلام دو حصوں میں منقسم ہے حصہ اول مثنویات پر مشتمل ہے حصہ دوم قصائد غزلیات اور رباعیات پر مثنویات میں مندرجہ کتابیں شامل ہیں۔

(۱) حدیقۃ المحقیق (۲) سیر العباد (۳) طریق التحقیق (۴) عقل نامہ (۵) عشق نامہ (۶) کارنامہ بلخ (۷) بہرام دہروز

حدیقۃ المحقیق جس کو فخری اور الہی نامہ بھی کہتے ہیں حکیم سنائی کا الہی شاہکار ہے اس میں حکم و معارف کے خزانے بھر دیئے ہیں ان الفاظ میں حدیقہ کا تعارف کرتے ہیں۔

ہر یکے بیت از د جہانِ علم ہر یکے سطر آسمانِ علم
اس کی ہر ایک بیت علم کا جہان ہے اور ہر ایک سطر علم کا آسمان
سنائی نے اس کی تصنیف پر اپنی تمام قدرت کلام صرف کر دی۔ اور فصاحت و بلاغت معنی میں حدیقہ کو اس مقام پر پہنچا دیا کہ فضلا کو یہ اعتراف کرنا پڑا کہ اس سے بہتر کتاب موجود نہیں
فضلا متفق شدند بر این کہ کتابے گزیدہ نیست جز این
فضلا اس بات پر متفق ہو گئے کہ اس سے بہتر کتاب موجود نہیں
علماء حدیقہ سنائی کو علم الہی اور حکم و معارف میں ترجمہ قرآن کہتے ہیں سنائی حدیقہ کا تعارف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

اس کتاب کے اندر اسرارِ زندگانی اور سعادت معاش و معاد انسانی جمع کر دیئے گئے ہیں اور یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ تصوف اور عرفان میں اس سے پر مغز اور بہتر کتاب نہ پیشتر شدہ نظم میں آئی نہ اس کے بعد آئے گی۔

شیخ علی بخش بیمار

از

(جناب عابد رضا خاں صاحب بیدار)

(ادارہ ادبیات اردو رام پور کے یوم بیمار میں بیمار کی صد سالہ برسی کے موقع پر پڑھا گیا)

بیمار کا اصل وطن آنولہ ضلع بریلی تھا ۱۲۰۴ھ میں پیدا ہوئے نساخ نے غلطی سے بیمار کا نام الہی بخش لکھا ہے۔ صحیح نام علی بخش ہے والد کا نام شیخ غلام علی مسموم ہوتا ہے شروع ہی سے ایک جگہ قیام نہیں رہا صاحب بزم سخن نے اسی وجہ سے انھیں "از مشاہیر سخنوران سنہیل" کہہ کر یاد کیا ہے۔ بعض تذکرہ نویسوں نے بیمار کو مصحفی کا شاگرد بتایا ہے سب سے پہلے یہ بات امیر مینائی نے ۱۲۹۰ھ میں کہی۔ مصحفی نے اپنا آخری تذکرہ "یاض الفضا" ۱۲۳۶ھ میں ختم کیا۔ اس میں کہیں بیمار کا ذکر نہیں آیا مصحفی کا انتقال ۱۲۴۲ھ میں ہوا اس وقت بیمار کی عمر ۳۶ برس کی تھی اور تذکرہ لکھتے وقت ۳۲ برس۔ تعجب ہے کہ اتنی عمر کا ایک شاگرد اور مصحفی جیسا استاد اسے اپنے تذکرہ میں جگہ نہ بیمار نے خود بھی کہیں اس کا اقرار نہیں کیا۔ مولانا حسرت موہانی نے بھی سلسلہ مصحفی میں بیمار کا نام نہیں لیا۔ نساخ نے "سخن شعرا" امیر مینائی کے تذکرے انتخاب یادگار (۱۲۹۰ھ) سے پہلے لکھا۔ اس میں صرف احمد خاں غفلت رام پوری کی شاگردی کا حوالہ ہے۔ امیر مینائی پر ہمارا شبہ کرنا بے جا ہوگا لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مصحفی امیر مینائی کے استاد تھے، کے استاد تھے۔ اور اس سے زیادہ کھلی ہوئی حقیقت یہ ہے کہ امیر مینائی اور اتسیر نے ہی جب نواب کلب علی خاں صاحب کے حکم سے مصحفی کے دو ادین کی اشاعت کا انتظام کیا تو مصحفی کے کلام میں ہر ممکن اصلاح دی گئی جس سے اس کے شعرا مرتبہ بڑھ جائے محض نقلی ترمیم نہیں پورے پورے مصرعوں میں حیرت انگیز تبدیلی کردی گئی۔ ادبی دنیا مولانا عبدالسلام خاں کی ممنون ہے کہ انھوں نے اس جہل سازی کا پتہ لگا لیا۔

رام پور آنے سے پہلے ہمیں بیمار کا کچھ حال معلوم نہیں۔ رام پور میں یہ نواب محمد سعید خاں کے زمانے میں آئے اور احمد خاں غفلت کی شاگردی اختیار کی۔ یہ تذکرہ نویسوں کا بیان ہے۔ غفلت نے رام پور سے باہر مشاعروں میں شرکت کی۔ مصحفی نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ وہ محمد سے لکھنؤ میں ملاقات کے لئے آئے اور یہاں کے مشاعروں میں بھی شریک ہوئے۔ ممکن ہے بیمار اور غفلت میں استاد شاگردی کا رشتہ رام پور آنے سے پہلے ہی استوار ہو گیا ہو۔ غفلت کا انتقال رام پور ہی میں ۱۲۵۹ھ میں ہوا اور نواب محمد سعید خاں ۱۲۵۶ھ میں تخت نشین ہوئے۔ رام پور میں ان کا ورود ۱۲۵۶ھ اور ۱۲۵۹ھ کے درمیان ہوا۔ ۱۲۵۱ھ میں ربیع الاول کی ۲۴ تاریخ بیمار کا انتقال ہو گیا اس طرح ان کی زندگی کے آخری ۱۴، ۱۵ سال رام پور میں گزرے۔

احمد خاں غفلت، قدرت اللہ شوق کے شاگرد تھے۔ شاعر تو وہ بہت کم تھے لیکن شاعر سے کہیں زیادہ استاد تھے رام پور میں ان کا وہی درجہ تھا جو لکھنؤ میں اس زمانے میں ناسخ کا تھا۔ یہ دونوں استاد ہم عصر اور ہم عمر تھے۔ غفلت قصیدہ اور مثنوی تو خوب کہتے تھے اس کی مصحفی نے بھی تعریف کی ہے۔ لیکن غزل گوئی ان کے بس کی نہ تھی۔ غفلت کا رنگ ناسخ کا کچھ ترقی یافتہ رنگ کہا جاسکتا ہے بعض بعض جگہ آتش کا رنگ بھی آ جاتا ہے۔ ان کا نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

جوں شمع اُٹھ گئی سے تری میں جدھر چلا	شعلہ بفرق، داغ بدل چشم تر چلا
لوہو کے چند قطرے پھر آنکھوں میں آگئے	سمجھا تھا میں کہ زخم مرے دل کا بھر چلا
جو خون تھا سوا شک بہائے گیا عبث	جراح تو نہ رگ پہ مری تیشتر چلا
مجنوں میں جلد جلنے کی طاقت نہیں رہی	اے سارباں تو نفاقہ کو آہستہ تر چلا
غفلت نے شکل بجز نہ رکھی ہزار شکر	اُٹھ کر تو اپنے گھر کو چلا یاں یہ مر چلا
حاصل کنارہ کر چکے سیر جہاں سے ہم	جوں میل رو سیہ پھرے اس خاکدان سے ہم
گویا وہاں زمانے کا غفلت ہے سر دلیں	سننے نہیں ہیں داد کسی کی زباں سے ہم
بیمار لکھا: نہ اصلاح جناب غفلت اے بیاگر ہوتی	تو معنی بھی نہ رکھتا شعر کوئی تجھ سے ناوا کا

جانتا ہے معجزہ بیمار غفلت کا سخن کون ہے دنیا میں ایسا معتقد اوستا کا
 لیکن بیمار کے یہاں غفلت کا رنگ سخن نہیں ملتا۔ جہاں کہیں وہ اس رنگ میں کہتا ہے
 ناسخ اور شاہ نصیر کا رنگ جھلکنے لگتا ہے مجموعی طور پر بیمار غفلت سے اچھا غزل گو ہے۔

نواب محمد سعید خاں کے زمانے کا رام پور شعر اور علماء کی مجمع گاہ تھا۔ باہر کے شعرا میں حسین
 نسکین دہلوی اور شیخ علی بخش بیمار وغیرہ ملازم سرکار تھے رام پور کے شاعروں میں غفلت سے بہت
 اصغر علی خاں اصغر شاگرد موتی موتی ۱۲۴۳ھ، نجف علی شفقت شاگرد شاہ نصیر موتی ۱۲۴۱ھ، عطاء
 شاگرد موتی ۱۲۶۸ھ، احمد خاں فاخر موتی ۱۲۹۸ھ اور مولوی الہ داد طالب ۱۲۴۵ھ پیش پیش تھے
 بیمار یقیناً ان سب سے متاثر ہوئے ہوں گے یہاں خاص خاص شاعروں کا نمونہ کلام پیش کرنا مناسب تھا۔

موت سے کم مری حیات نہیں
 یوں تو ناہر باں نہیں ہو تم
 پر وہ پہلا سا التفات نہیں
 بے وفا تیرے عہد کی مانند
 اب مرے صبر میں ثبات نہیں
 میں ہی ملتا ہوں بے حیائی سے
 پوچھتا وہ تو میری بات نہیں
 جان کھونے کے سوا کیا سہرا آتا ہے مجھے
 دل میں اک قطرہ خوں ہے نہ جگر میں ہے
 ہی آتا ہے مجھے کچھ اگر آتا ہے مجھے
 پاس بے رونقی چشم تر آتا ہے مجھے
 اب مرے صبر میں ثبات نہیں
 میں تو دیتا ہوں دم اس قد قیامت پر
 پس بے رونقی چشم تر آتا ہے مجھے
 پس بے رونقی چشم تر آتا ہے مجھے

تجھ سا اگر تجھے کوئی بیدا گر ملے
 عدو کی جائے ہو کیوں کر کہو مرے دل میں
 خیال بھی تو تمہارے سوا نہیں آتا
 تجھ پہ گزری سو گزری پر قاصد
 لے جاں یہ جانے کہ گئے اپنی جاں ہم
 میرے خط کا جواب کیا لایا
 لے ہم صفیر و بلبل بے تاب کی طرح
 نے خواہش بہار نہ شاکی خزل سے ہم

۱۲۴۱ھ اصغر اور عنایت کی مستقل سکونت دہلی میں تھی۔ عنایت آخر میں رام پور آگئے تھے۔ اصغر کبھی کبھی آنے تھے۔ کلام بالود
 اثر ضرور ڈالتا ہوگا۔

بہترین چیزیں

وہ جلوہ اپنا دکھانے کو ظالم کم نکلتا ہے یہاں پر انتظاری میں ہمارا دم نکلتا ہے۔

کوچہ یار میں غم نے تسکین پاؤں رکھا تھا کہ سر یاد آیا

ہر روز وہ ڈھونڈے ہے کوئی تازہ خرید صورت مری ہر روز بدل جاتے تو اچھا

اے چشم سرگمیں تری گردش نے کیا کیا راحت پذیر تھے ستم آسمان سے ہم

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے کہے دینی ہے شوخی نقش پا کی

ہزار طرح سے کرنی پڑی تسلی دل کسی کے جانے سے گو خود نہیں قرار مجھے

قاصد آیا ہے وہاں سے تو ذرا تھم تو سہی بات تو کرنے دے اس سے دل بے تاب مجھے

خدا جانے عدد پر کیا بنے گی پڑا ہے کام ان سے بدگماں سے

گماں ہے دل کو سب یہ نامہ برد کا کہوں کس کس سے آتے ہو کہاں سے

انصاف کر خراب نہ پھر تا میں درد بد ملتی جو تیرے گوشہ خاطر میں جا مجھے

بے وجہ ہر اک بات پر رنجش ہے ہمیں سے دشمن یہ کبھی آپ کو عفتہ نہیں آتا

اس بزم میں آتا نہیں تو بے کاذرا پاس ناصح تجھے ساتی نے دیا جام نہ ہوگا

دل لگایا تھا دل لگی کے لئے لگ گیا روگ جیتے جی کے لئے

نفس عیسوی نہ کر ممنون ہم کو دو دن کی زندگی کے لئے

مر کے ہم نے تو سب کو دیکھ لیا کوئی مڑتا نہیں کسی کے لئے

ہم نے دشمن کیا جہاں اپنا بے وفائیری دوستی کے لئے

بیمار کے رنگ کا تجزیہ کیا جائے تو اس میں نین چیزیں نمایاں طور پر نظر آئیں گی۔ ایک

تو لکھنویت جس کے تحت ان کے یہاں رعایت لفظی، کنگھی چوٹی کے اشعار، دور از کار تشبیہیں

اور رکاکت اور ابتذال ملتا ہے۔ اسے اشعار کی تعداد کلام کا پانچواں حصہ ہے داغ سے پہلے

بیمار کے یہاں کہیں مصحفی کے لہجہ میں کہیں بالکل داغ کے لہجہ میں وہی خیالات و مضامین وہی ہستی

اور ڈپٹ ملتی ہے اس قسم کے اکثر اشعار داغ کے رنگ میں داغ سے بہتر کہے گئے ہیں، یہ بیمار

کا دوسرا رنگ ہے، تیسرا اور سب سے زیادہ قابلِ قدر رنگ وہ ہے جسے موتن اور غالب کا رنگ کہنا چاہئے، الفاظ کا رکھ رکھاؤ، خیالات کی لمبندی، شعر میں بہت سے امکانات چھپا دینا، عالمگیر انسانی نفسیات کی ترجمانی، اسرار و رموزِ محبت کا تجرباتی بیان ہی سب چیزیں ہیں جو ہمارے سب سے اچھے اشعار میں ملتی ہیں۔

موتن ۱۲۱۵ھ میں پیدا ہوئے، غالب ۱۲۱۱ھ میں۔ موتن نے ۱۲۶۶ھ میں انتقال کیا غالب نے ۱۲۸۵ھ میں۔ بیمار کا سال پیدائش ۱۲۰۸ھ ہے اور سال وفات ۱۲۶۴ھ موتن کے شاگرد رشید میر حسین تسکین نے رام پوری میں ۱۲۱۸ھ میں انتقال کیا ان کا سال پیدائش ۱۲۱۸ھ ہے۔ بیمار عمر کے اعتبار سے ان میں سب سے بڑے تھے تسکین اور موتن بالکل ایک طرز میں کہنے والے تھے۔ بیمار کے سب سے اچھے اشعار غالب سے بہت کموتن بلکہ کہنا چاہئے تسکین کے رنگ کے ہیں رام پوری میں یہ سچا مذاق غالب رام پوری میں ملتا ہے بہت ممکن ہے بیمار نے تسکین کا رنگ پسند کیا ہو اور اسے جذب کر لیا ہو یہ حال یہ تو ناممکن ہے کہ دلی کے شاعروں نے رام پوری میں رہنے والے ایک گننام شاعر سے استفادہ کیا ہو۔ یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ بیمار نے موتن یا تسکین کی تقلید کی ممکن ہے بیمار کی یہ اپنی اپنی ہو ممکن ہے وہ بھی موتن اور غالب کی طرح نئی راہ بنانے کا عادی ہو۔ تو یہ ہے بیمار کے رنگ کا تجربہ، مختصر سے انتخاب سے اس کی قدر و قیمت واضح ہو جائے گی۔

بیمار کے شاگردیوں تو ایک درجن سے کچھ زیادہ ہی ہیں۔ لیکن احمد علی رتسا رام پوری اور نظام رام پوری ایسے دو شاگرد ہیں جنہوں نے استاد کی لاج ہی نہیں رکھی بلکہ استاد کے ہر طرز پر اضافہ کیا۔ احمد علی رتسا کا کلام نہیں ملتا۔ نظام کا کلام شائع ہو چکا ہے اور مولانا نیاز اور پیر پرنسپل عبدالشکور ان پر خوب خوب لکھ چکے ہیں۔

بیمار کی تصنیفات سے دو فلمی چیزیں بھی مل سکی ہیں اور وہ دونوں رضا لاہوری رام پور
 نے میر حسین تسکین اور ان کا کلام از عابد رضا بیدار معارف جنوری ۱۳۵۲ھ لکھا گیا تھا یا تقادبات

میں موجود ہیں ایک ان کا دیوان جس میں ۶۰۰ اشعار غزل اور ایک معمولی قصیدہ دلی عہد بہار اور
(غائبانہ) یوسف علی خاں ناظم کی تعریف میں ہے دوسرے طلسم بیضا نام کی ایک داستان
ہے جسے بقول بیمار فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا گیا ہے اور جو بدستان خیال کا خلاصہ ہے اس میں
بھی کوئی خاص بات نہیں یہ داستان شرارد میں ہے تذکرہ نویسوں نے غلطی سے اسے منظوم
داستان کہا ہے یہ غلطی صاحب گلستان سخن اور صاحب خزانہ جاوید سے ہوئی ہے۔

کلام بیمار کا مختصر سا انتخاب پیش کیا جاتا ہے۔

نہ بناتا جو دن جدائی کا	کیا بگڑتا تری جدائی کا
کل تھے رندی کے مجتہد بیمار	آج دعویٰ ہے پارسائی کا
وحشتِ دل نے پھر نکالے پاؤں	پھر تجل کا اختیار اٹھا
پھر جنوں فصل گل میں لایا رنگ	پھر میں ہونے کو شرمسار اٹھا
کون پر ساں ہے حال سہل کا	خلق منہ دیکھتی ہے قاتل کا
کبک اس منہ سے اس کو کیا نسبت	داغ تو دیکھ ماہ کامل کا
لب جو کون سیر کو آیا	موج منہ چومتی ہے ساحل کا
سانس آہستہ لیجیو ہمیں	ٹوٹ جائے نہ آبلہ دل کا
تقریب جس گھڑی لب مطلب آگئی	بہکا یہ قصہ خواں کہ فسانہ بدل گیا
پتھر پڑیں سپہر ترے انقلاب پر	گو رنگ بزم خانہ سجانہ بدل گیا
غمہ فقس میں نالہ بلبل نہ ہو سکا	نوجہ سے لاکھ بار ترانہ بدل گیا
مسجد میں پی شراب پڑھی دیریں ناز	بیمار کو شور کسی بات کا نہیں
مٹا نہ داغ خزاں عنذلیب کے دل سے	ہزار باغ میں موسم بہار کا پہنچا
کہاں تک اہل وفا ضبط آہ کا یارا	کہ انتہا کو ستم اب تو بار کا پہنچا

زد میں ترے ستم سے بھلا کس کے سامنے
 محتسب پوچھ رہے پرستوں سے
 بزم میں وہ نہیں اٹھاتے آنکھ
 جب باعثِ کلامِ ترش ہو جھٹا ہو لیں
 سنگِ درِ حرمِ درے سجڑے سمٹ گیا
 بیمار اور اس کے سوا کچھ نہیں خبر
 جنت میں حیاتِ ابدی خاک ملے گی
 فریبِ یار کا شکوہ زباں پہ آجاتا
 عذابِ آتشِ فرقت سے کانپتا تھا دل
 سن کر مٹاٹے ترے اہلِ نیاز سے
 دیتا ہے طمعِ حورِ صنمِ ترے سامنے
 رو بدگماں کہاں ہیں کہاں محفلِ نشاط
 کہہ کہتا ہوں اضطرابِ بدنِ دشمن سے حالِ دل
 فتنے جو کچھ اٹھتے ترے اغماض سے اٹھتے

ہ پورا مصرعہ تسکین کے یہاں نظر آتا ہے

مزے یہ دیکھتے ہیں آغازِ عشق میں تسکین

کہ سو جھٹتا نہیں اپنا مالِ کار مجھے

حالاتِ حاضرہ

ایک سیاسی جائزہ

صدر آئرن ہاور کی پیشکش

از
(اسرار احمد صاحب آزاد)

گذشتہ ماہ میں امریکن سوسائٹی آف نیوز پیپر ڈیپارٹمنٹ کے سالانہ اجلاس کو مخاطب کرتے ہوئے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے صدر آئرن ہاور نے بقار امن عالم، اقوام عالم کے مابین تعاون اور اشتراک عمل، نیز بین الاقوامی خوشحالی اور ترقی کے لئے ایک اہم منصوبہ پیش کیا ہے۔ اس منصوبہ کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر سوویٹ یونین کو ریاست ہائے متحدہ اور مصالحت اور ریاست ہائے متحدہ کو عام انتخابات کرانے ہندوستانی اور ملائیشیائی کیونسٹوں کی سرگرمیوں کو ختم کرانے، آسٹریلیا کی آزادی کو تسلیم کرنے اور وہاں سے غیر ملکی افواج کے ہٹائے جانے، جرمنی کو متحد کر کے پوشیدہ طریقہ رائے دہندگی کے ماتحت عام انتخابات کرانے تمام اقوام کے لئے جن میں مشرقی یورپ کی قومیں بھی شامل ہیں ان کی مرضی کے مطابق حکومتیں قائم کرنے کے حق کو تسلیم کرنے اور ادارہ اقوام متحدہ کی نگرانی میں تحدید اسلحہ و افواج پر رضامند ہو جائے تو ریاست ہائے متحدہ امریکہ اس کے ساتھ تعاون کرنے کے لئے تیار ہے اور اس طرح مصارف میں تخفیف کی بدولت جو بحث ہوگی اسے ایک بین الاقوامی سرمایہ کی شکل میں اقوام عالم کی اقتصادی، تعلیمی، معاشرتی اور تجارتی فلاح و بہبود کے لئے خرچ کیا جائے گا

صدر آئرن ہاور نے مذکورہ بالا منصوبہ ایک تقریر میں پیش کیا ہے اس لئے فی الحال اسے سرکاری حیثیت نہیں بلکہ نیم سرکاری حیثیت حاصل ہے اور اسی لئے اس پر سوویٹ یونین کی حکومت نے نہیں بلکہ سوویٹ یونین کی کمیونسٹ پارٹی کے ترجمان اخبار ”پراودا“ اور حکومت کے ترجمان

اخبار ”ازدستیا“ نے اظہار خیال بھی کیا ہے اور ان دونوں اخباروں کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ — سوویٹ یونین موجودہ بین الاقوامی تنازعات کو حل اور عالم گیر امن قائم کرنے کے سلسلہ میں اپنے مقدور بھر کوشش کرنے کے لئے تیار ہے اس کے رہنماؤں پر اس معاملہ میں شک و شبہ وارد کرنے کی کوئی گنجائش نہیں — اس کے ساتھ ہی ان اخباروں نے صدر آئزن ہاور کی پیش کردہ ان مطالبات کو بے محل قرار دیا ہے جو انہوں نے موجودہ حالات میں سوویٹ یونین سے کئے ہیں اور اس بات پر نکتہ چینی کی ہے کہ صدر آئزن ہاور نے اپنی تقریر اور تجویز میں چین کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں کہا۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے حکمران طبقوں اور تمام دنیا میں ان کے ہمنواؤں پر ”برادوا“ اور ”ازدستیا“ کے خیالات کا رد عمل کیا ہو گا یہاں اس پر اظہار خیال کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی، لیکن بھلا امن اور بین الاقوامی تعلقات کو مستحکم اور خوش گوار بنانے کا معاملہ امریکہ اور روس ہی کا معاملہ نہیں بلکہ دنیا کے ہر ملک کا معاملہ ہے اس لئے ہمیں ایک آزاد اور امن پسند ملک کے شہری کی حیثیت سے اس بات پر غور کرنا چاہئے کہ کیا صدر آئزن ہاور کی تجویز اپنی جگہ مکمل ہے اور اگر اس کی موجودہ شکل میں اس کی حمایت کی جائے تو کیا اس کی بدولت عالم گیر امن قائم ہو سکتا ہے؟

اس سلسلہ میں ہمیں صرف مشرق بعید ہی کے مسائل پر غور کر لینا چاہئے۔ اس خطہ ارض میں اس وقت انڈو چائنا، ملایا اور کوریا کے باشندے اپنے اپنے وطن کی آزادی کے لئے سرفروشانہ جدوجہد کر رہے ہیں لیکن صدر آئزن ہاور نے سوویٹ یونین سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ ان ممالک میں کمیونسٹوں کی سرگرمیوں کو بند کرادے۔ اس مطالبہ کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ سوویٹ یونین اس بات کی ذمہ داری قبول کرے کہ ان ممالک کے باشندے قومی آزادی کی جدوجہد سے دست کش ہو جائیں گے اور برطانیہ، فرانس اور امریکہ کی اجازت دارانہ بالادستی پر مطمئن رہیں گے، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا سوویٹ یونین کے مغربی سرمایہ داروں سے مصالحت کرنے کے لئے کسی قوم کو فروخت کر دینے کا حق حاصل ہے؟ اور اگر وہ میونخ کی ملعون مثال کی تجدید پر آمادہ بھی ہو جائے تو کیا ملایا، ہندو چین اور کوریا کے باشندے نیز دنیا کے کروڑوں حریت پسند باشندے اس کی اس حرکت کو گوارہ کر سکیں گے؟ صدر آئزن ہاور کا یہ مطالبہ بے معنی مطالبہ ہے اس لئے

برعکس انہیں مغربی نوآبادیات خواہ جمہوریت پسندوں سے مطالبہ کرنا چاہئے کہ وہ بقاء امن عالم اور عالم گیر خوشحالی اور ترقی کی تمام مناسب تحریکات اور تجاویز کے سلسلہ میں اپنی جمہوریت پسندی اور امن خواہی کے عملی ثبوت کے طور پر ایشیاء اور افریقہ کے تمام محکوم اور مظلوم ممالک کی آزادی اور خود مختاری کو تسلیم کر لیں اور اسی طرح محض مشرقی یورپ ہی کے چند ملکوں کو نہیں بلکہ ایشیاء اور افریقہ کے تمام محکوم ملکوں کو بھی اس بات کا موقع دیا جائے کہ وہ اپنے لئے جس قسم کی حکومت چاہیں قائم کریں۔

یہاں اس بحث کی گنجائش نہیں کہ ملائیا، ہندوچینی اور کوریا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ ہرٹ کمیونسٹوں کی ہنگامہ خیزی ہے یا قومی آزادی کی جدوجہد۔ یہ ایک جداگانہ موضوع بحث ہے لیکن گذشتہ ماہ کے آخری عشرہ میں امریکہ سے واپس آتے ہوئے کمبوڈیا کے نوجوان بادشاہ نے ایک بیان میں کہا تھا کہ — اگر میرے ملک کے باشندوں کو سیاسی آزادی نہ دی گئی تو وہ کمیونسٹوں کے ساتھ مل جائیں گے — اور اس بیان کا صاف مطلب یہ ہے کہ ان ممالک باشندوں کی جدوجہد شورش پسندی کے جذبہ کے ماتحت بلکہ قومی آزادی کی ضرورت کے احساس پر مبنی ہے۔ پھر دنیا کا ہر ہوش مند انسان اس بات سے واقف ہے کہ چین کی شمولیت کے بغیر مشرق بعید کا کوئی مسئلہ بھی حل نہیں ہو سکتا اور فارموسا کو ارض چین سمجھ لینا ایک مضحکہ خیز تصور سے زیادہ نہیں اور صدر آئزن ہاور کی تجویز میں چین کے مذکورہ کی عدم موجودگی نے پوری تجویز کو بے اثر بنا دیا ہے۔

مختصر یہ کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد سے جو بین الاقوامی مسائل الجھتے جا رہے ہیں مغربی جمہوریت پسندوں کی طرف سے پہلی بار سلجھانے پر آمادگی کا اظہار کیا گیا ہے اور صدر آئزن ہاور نے اس سلسلہ میں جو تجویز پیش کی ہے، اگرچہ اسے مکمل نہیں کہا جاسکتا، لیکن دنیا کے امن پسند عوام کو اس کی اصلاح پر ضرور زور دینا چاہئے اور یہ توقع رکھنی چاہئے کہ اگر ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے موجودہ حکمران حقیقی معنی میں بقاء امن اور بین الاقوامی ترقی کے خواہاں ہیں تو وہ اس تجویز کی خامیوں کو دور کرنے سے گریز نہ کریں گے۔



ویت نام کا مستقبل

ویت نام جسے ہند چینی بھی کہتے ہیں مشرق بعید کا ایک چھوٹا سا ملک ہے اس ملک پر فرانس نے اٹھارویں صدی عیسوی کے اواخر میں قبضہ کیا تھا اور کم و بیش سو اسو سال تک اس ملک کے باشندے فرانسیسی ملوکیت پسندی کا شکار بنے رہے لیکن دوسری عالمگیر جنگ کے زمانہ میں ۱۹۴۴ء میں ویت نام پر جاپان کا تسلط قائم ہو گیا مگر ویت نام کے قوم پروروں نے ۱۹۴۵ء میں جاپانیوں کو شکست دے کر جمہوریہ ویت نام قائم کر لی۔

یہاں یہ بتادینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اٹلانٹک چارٹر میں دنیا کی تمام قوموں کے لئے ان کی مرضی کے مطابق حکومت کے قیام کے حق کو تسلیم کر لیا گیا تھا۔ اس کے باوجود فرانس نے ویت نام پر از سر نو اپنا تسلط قائم کرنے کی کوششیں شروع کر دیں اور مغربی طاقتوں کی امداد اور حمایت نیز اپنے مقامی حامیوں کی بدولت اس ملک پر اپنی حکومت بحال کرنے میں کامیاب ہو گیا لیکن قوم پرور رہنما ڈاکٹر ہو چی منہ اور ان کے رفقا برابر قومی آزادی کے حصول کی جدوجہد میں مصروف رہے اور اس چھوٹے سے ملک میں گزشتہ سال سے قوم پروروں اور فرانس اور حامیوں کے درمیان خونریز جنگ کا سلسلہ جاری ہے۔

ویت نام کے قوم پرور آہستہ آہستہ فرانس کو پسپا کر رہے ہیں اور گزشتہ ماہ میں انہوں نے ریاست لاؤس پر جو حملہ کیا تھا اس کی کامیابی نے مغربی نوآبادیات خواہوں کو شدید کشمکش میں مبتلا کر دیا ہے۔ چنانچہ روزنامہ انگریزی ”ہندوستان ٹائمز“ کے خصوصی وقائع نگار نے ۲۷ اپریل کو لندن سے طویل اطلاع بھیجی ہے اس میں مذکور ہے کہ — امریکہ برطانیہ اور فرانس کی حکومتیں ہند چینی کے معاملہ کو مجلس تحفظ کے روبرو پیش کرنے کے مسئلہ پر غور کر رہی ہیں اور کوریائی طرح ہند چینی میں بھی مسلح فوج بھیجنے کا معاملہ بھی زیر غور ہے۔ جنگ کے سلسلہ میں ایک بات ہمیشہ مد نظر رکھنا چاہئے اور وہ بات یہ ہے کہ عہد حاضر کے علم و طاقت میں کسی ملک کے عام باشندوں کو ایک مخصوص حیثیت حاصل ہے اور اگر کسی ملک کے باشندے غلامی قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوں تو حملہ آور انہیں اپنی قوت و طاقت کے بھروسہ پر مجبور تو کر سکتا ہے لیکن

انہیں غلامی پر رضامند نہیں کر سکتا اور آج کو ریا اور ویت نام میں مغربی مستعمرین کو جو ناکامیاں اور قوم پروروں کو جو کامیابیاں حاصل ہو رہی ہیں وہ حصول حریت کے مقصد پر عوام کے اتحاد اور غلامی پر نفرت ہی کے جذبہ پر نہیں ہیں، اس لئے اگر ہندوستانی کے معاملہ کو مجلس تحفظ میں پیش کیا گیا اور ادارہ اقوام متحدہ کے نام پر ہندوستانی میں فراتسیسی ملکیت پسندوں کی امداد کے لئے افواج بھیج دی گئی تو اس کا صاف مطلب یہ ہوگا کہ مغربی طاقتیں مشرق کی کسی قوم کو بھی آزاد دیکھنا نہیں چاہتیں اور انہوں نے ادارہ اقوام متحدہ کو اپنے مذموم مقاصد کے حصول کا ایک ذریعہ بنا لیا ہے۔

اسی سلسلہ میں اس امر کو بھی مد نظر رکھنا چاہئے کہ برما میں فارموسائی فوجوں کی موجودگی ثابت ہو چکی ہے اور اس بات کا ثبوت بھی مل چکا ہے کہ گزشتہ چند سال میں اس فوج کے سپاہیوں کی تعداد تین ہزار سے بارہ ہزار تک پہنچ گئی ہے اور انہیں نہایت باقاعدگی کے ساتھ جدید ترین اسلحہ کے علاوہ رسد اور کمک بھی بھیجی جاتی رہی ہے لیکن اس معاملہ میں ادارہ اقوام متحدہ نے نہ تو فارموسائی حکومت کو مجاز یا حملہ آور قرار دیا ہے اور نہ برما کو اس فوج سے پاک کرنے کے لئے وہاں اپنی فوج بھیجنے ہی کے مسئلہ پر غور کیا ہے۔ اور اس مثال سے ایک بار پھر یہ حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے کہ اس ادارہ کو مشرقی قوموں کی آزادی کی تحریکات کو کچلنے ہی کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے غالبوں کو تہدید و تنبیہ کرنے کے لئے نہیں۔

پاکستان کے تغیرات

گزشتہ چند ماہ سے پاکستان میں کچھ ایسے واقعات پیش آتے رہے ہیں جو ہمارے اس ہمسایہ ملک کے متعدد بڑے چیدہ مسائل کی غمازی کر رہے ہیں۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہند اور پاکستان دو جدا، آزاد اور خود مختار ملک ہیں، اس کے باوجود ان دونوں ملکوں میں سے کسی ایک ملک میں اچھے یا برے حالات دوسرے ملک کے حالات پر ضرور اثر انداز ہوتے ہیں اور گزشتہ دو تین ماہ سے پاکستان میں جو کچھ ہوتا رہا ہے ہمیں اسے سمجھنے کی ہر ممکن کوشش کرنا چاہئے۔

پاکستان میں رونما ہونے والے تغیرات کا آغاز ”مخالف قادیانیت“ تحریک سے ہوا تھا اور بظاہر خاتمہ مسٹر ناظم الدین کی کابینہ کی برطرفی پر ہوا لیکن آغاز و انجام کے مابین پیش آنے والے واقعات کا مطالعہ اس حقیقت کو بے نقاب کرتا ہے کہ اس مختصر سی مدت میں پاکستان حریفانِ اقتدار پسندی کا میدان بن رہا ہے اور اقتدار پسندی کی اس کشمکش نے پاکستان کی اقتصادیات اور معاشیات کو بڑی حد تک خراب کر دیا ہے۔

ہند اور پاکستان کے تعلقات کی نزاکت اور مستقبل میں ان کے مستحکم اور خوشگوار ہو جانے کی توقع مجھے ان تعلقات کے اسباب و علل اور اس منظر کو بیان کرنے کی اجازت نہیں دیتی لیکن اتنا ضرور سمجھ لینا چاہئے کہ آج کسی ملک کے داخلی تغیرات خارجی اثرات سے پاک نہیں رہ سکتے اور آج پورے مشرق وسطیٰ میں دوسرا یہ دار گرد ہوں کے مابین جو کشمکش جاری ہے پاکستان کے مذکورہ بالا حالات اور تغیرات بھی اس کشمکش کے اثر سے خالی نہیں اور معاملات کا یہی وہ پہلو ہے جسے ہم ہندوستانیوں کو خصوصیت کے ساتھ مد نظر رکھنا چاہئے۔

بہر حال یہ امر سرت اور اطمینان کا باعث ہے کہ پاکستان کے نئے وزیر اعظم پنڈت ہرو سے ملاقات کرنے کے خواہش مند ہیں اور انہیں اس بات کا یقین ہے کہ یہ ملاقات دونوں ملکوں کے مابین پیدا شدہ بیشتر اختلافات کو دور کرنے کی موجب ثابت ہو سکے گی۔

ہند اور پاکستان کے مابین جو امور فیصلہ طلب ہیں انہیں دو اقسام میں منقسم کیا جاسکتا ہے مثلاً کشمیر کا تنازعہ اور مشترکہ دفاع کا معاملہ وغیرہ ایسے مسائل ہیں جن سے براہ راست عوام کا تعلق نہیں لیکن بین مملکتی تجارت اور سفر و قیام ایسے مسئلے عوامی مسئلے ہیں اور جب تک دونوں ملکوں کے عوام ایسے معاملات میں اپنی اپنی جگہ اور ایک دوسرے سے مطمئن نہ ہوں گے دونوں ملکوں کی حکومتوں کا ایک سرے کے متعلق قوی ترین جذبہ خیر سگالی بھی کچھ زیادہ خوشگوار نتائج پیدا نہیں کر سکتا۔ موجودہ صورت حال یہ ہے کہ دونوں ملکوں کے مابین غیر سرکاری تجارت تقریباً معطل ہے اور اگرچہ پاسپورٹ سسٹم کے نفاذ نے ہند اور پاکستان کے مابین سفر کی بعض دشواریوں کو کمزور

کر دیا ہے لیکن امت سر اور فیروز پور کی راہوں کی بندش نے دونوں ملکوں کے غریب باشندوں کے لئے آمد و رفت کو عملاً سبوتا کر رکھا ہے اور اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جب تک اس قسم کے عوامی مسائل کو حل نہیں کیا جائے گا دونوں ملکوں کے تعلقات حقیقی معنوں میں خوش گوار نہیں بن سکتے۔

قرآن اور تعمیر سیرت

انڈیا کے میرولی الدین صاحب ایم، اے پی ایچ ڈی، صدر شعبہ فلسفہ جامعہ عثمانیہ۔
قرآنی تعمیرات کا انسانی سیرت کی تعمیر میں کیا دخل ہے اور ان تعلیمات کے ذریعہ سے اس کو دارو سیرت کا کس طرح ظہور ہوتا ہے؟ یہ گراں قدر تالیف خاص اس موضوع پر تیار کی گئی ہے۔
ایک ایسے وقت میں جب کہ مسلمان عام طور پر احساس کمتری اور بے یقینی کی اندھیروں میں پھنسے ہوئے ہیں یہ گراں مایہ تالیف ان کے روحانی رشتہ کو استوار کرنے میں چراغ راہ کا کام دے گی۔
سچ تو یہ ہے کہ گرامی قدر مولف نے اس کتاب میں تعلیمات قرآنی کا عطر کشید کر کے رکھ دیا ہے اور پھر اس میں فلسفہ تصوف اور ادب کو بڑی قابلیت سے سمویا ہے۔
”قرآن اور تعمیر سیرت“ اپنے انداز کی لسانی کتاب ہے جس کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ فہرست مضامین کا ایک حصہ ملاحظہ فرمائیے۔

۱) عبادت و استعانت (۲) توحید الوہیت (۳) صالحیت (۴) نیکی علم ہے (۵) تعلیم کا مقصد (۶) انسان کامل (۷) تصحیح فکر (۸) قرآن اور سیرت سازی (۹) قوت ایمانی اور ظہور غیب (۱۰) ماحول پر کس طرح قابو حاصل کیا جائے (۱۱) کامیاب زندگی کا قرآنی تصور (۱۲) قرآن اور علاج خوف (۱۳) قرآن اور علاج حزن (۱۴) قرآن اور علاج غضب (۱۵) زندگی میں غم کیوں ہے۔

کتابت و طباعت نہایت اعلیٰ، دیکھنے کے لائق، بڑی تقطیع صفحات ۳۳ قیمت غیر مجلد

پانچ روپے، مجلد چھ روپے۔

الکبیتا

غزل

از

(جناب آلم مظفرنگری)

محبت کی قسم فردوس بھی بیت الحزن بھی ہے
 ہنسی پھولوں کی سمجھ گریہ شبنم کو پہچانے
 یقین ہے قافلہ محفوظ تا منزل نہ پہنچے گا
 خبر بھی ہے تجھے اے باغباں بجلی کی نظروں میں
 تباہی دیکھ کر اہل یہاں کی میں یہ سمجھا ہوں
 قریب جلوہ گاہ عشق ہے یہ کون سی منزل
 نہیں حسن بتاں ہی شہرتِ تجانہ کا ضامن
 لحد میں خوفِ ظلمت کیا یہاں فیضِ محبت ہے
 فقط سمجھا ہے جس کو شمعِ محفلِ ذوقِ پروانہ
 شریکِ سازشِ بربادی تنظیمِ رنگ و بو
 ہے جلوہ اک لکین جلوہ گا میں مختلف سی میں
 کہاں کفر سے تخلیقِ ایماں ہوتی آئی ہے
 سرورِ درقصِ مستانہ کے جلوے دیکھنے والے
 فضلے قدس میں دیکھیں تو سبقت کو لے جائے
 آلم کی طرزِ فکرِ شعر کو دیکھا ہے ہم نے بھی

وہ محفلِ جس میں پروانہ بھی ہے شمعِ لگن بھی ہے
 چین والوں میں کوئی واقفِ رازِ چین بھی ہے
 جسے سمجھ ہوئے ہیں راہِ پروہ راہِ زن بھی ہے
 مری شلیخِ نشیمن ہی نہیں تیرا چین بھی ہے
 مری قسمتِ شریکِ گردشِ چرخِ کہن بھی ہے
 یہاں منصور بھی ہنگامہ دارورسن بھی ہے
 صدائے نغمہِ ناقوس بھی ہے برہمن بھی ہے
 فروغِ داغِ دل بھی ہے تجلیِ کفن بھی ہے
 وہ جانِ انجمن بھی سرفروشِ انجمن بھی ہے
 فقط لالہ نہیں سرورِ دسمن بھی نترن بھی ہے
 رگِ گل نام ہے جس کا وہ سورج کی کد بھی ہے
 مذاقِ آذری بت گر بھی ہے اور بتِ کن بھی ہے
 نگاہوں میں مآلِ انقلابِ انجمن بھی ہے
 برجیل بھی ہے اور پروازِ سخن بھی ہے
 مذاقِ تازہ بھی ہے اور اندازِ کہن بھی ہے

اردو عبیات

از

(جناب برج لال جلی رعنا)

یہ رباعیات انجمن ترقی اردو شاخ دہلی کے سالانہ اجلاس میں پڑھی گئی تھیں جو بہت پسند کی گئیں ”برہان“

(۴)

ہر رنگ کے جذبات کا آئینہ ہے
ہر صورتِ حالات کا آئینہ ہے
اللہ رے وسعتِ جہانِ اُردو
صدیوں کی روایات کا آئینہ ہے

(۵)

تہذیب وفاق کی کہانی ہے یہ
مخلوط تمدن کی نشانی ہے یہ
ہر رنگ میں تصویرِ رواداری ہے
آئینہ حسنِ جاودانی ہے یہ

(۶)

اخلاص کا اڑتا ہوا پرچم ہے یہ
آئینہ حسنِ ربطِ باہم ہے یہ
اک خوابِ محبت کی ہے زندہ تعبیر
گنگا زمزم کا پاک سنگم ہے یہ

(۱)

دانہ تھی کبھی اب تو شجر ہے اُردو
قطرہ تھی کبھی اب تو گہر ہے اُردو
آسان نہیں اس کا مٹنا رعنا
صدیوں کی ریاضت کا ثمر ہے اُردو

(۲)

اندازِ حسیں - طرزِ سہانی اس کی
الفاظ میں ہے گہرِ نشانی اس کی
مقبول و جہانگیر ہے اُردو اتنی
غیروں کے بھی لب پر ہے کہانی اس کی

(۳)

کوثر کی روانی ہے روانی اس کی
حوروں کی جوانی ہے جوانی اس کی
یہ حسنِ معانی یہ جمالِ الفاظ
جنت کی کہانی ہے کہانی اس کی

(۱۱)

بیکنہ کی کلیوں کی چٹک ہے اس میں
سوزِ دلِ عاشق کی بھڑک ہے اس میں
شبِ نیم کی دلاویز نراکت ہے نہیں
خورشید کی کرنوں کی چمک ہے اس میں

(۱۲)

کچھ صبحِ ازل کی بھی جھلک ہے اس میں
کچھ شامِ ابد کی بھی چمک ہے اس میں
دب سکتی ہے لیکن یہ نہیں مٹ سکتی
فطرت کی مستقل لچک ہے اس میں

(۱۳)

گلزارِ نسیمِ جاودانی ہے یہ
ترشّار کی اعجازِ بیانی ہے یہ
جورنگِ تعصب سے بری ہو یکسر
وہ نقشِ جلالِ زندگی لکھی ہے یہ

(۱۴)

کیفیتی کا پیام ہے ضمانت اس کی
محروم کا نام ہے ضمانت اس کی
زندہ ہے اور یہ رہے گی زندہ
رعنا کا کلام ہے ضمانت اس کی

(۷)

اپنی ہی زمیں کا یہ شجر ہے رعنا
اپنے ہی فلک کا یہ قمر ہے رعنا
کیوں غیہ سمجھتے ہیں اس کو کچھ لوگ
یہ اپنی ہی آنکھوں کی نظر ہے رعنا

(۸)

سوئے ہوئے انساں کو جگایا اس نے
احساسِ حیاتِ نو دلایا اس نے
بجھتے بجھتے چراغِ آزادی کو
پھر سوزِ ترنم سے جلایا اس نے

(۹)

حالات کا جائزہ لیا ہے اس نے
ماحول پہ تبصرہ کیا ہے اس نے
جب بھی کوئی تحریک چلی ہے رعنا
ساتھ اس کا بہرِ نوع دیا ہے اس نے

(۱۰)

مسجودِ مسیح و خضر ہے دم اس کا
ہے جوشِ حیاتِ جزوِ اعظم اس کا
ہے کشتیِ طوفانِ زدہ کے حق میں
آغوشِ اماں۔ ساحلِ محکم اس کا

شعز علیہ

آواز اور جراثیم | اونچے سر کی آوازیں جراثیم کو ہلاک کر سکتی ہیں۔ یہ امریکن کیمیکل سوسائٹی کا گویا عقیدہ ہے چنانچہ وہ اس پر تجربے کر رہی ہے کہ آواز یا شور سے جراثیم کے ہلاک کرنے کا کام لیا جائے تاکہ پانی اور دودھ کو جراثیم سے پاک کیا جاسکے۔

انسانی کان جن آوازوں کو سن سکتا ہے ان سے ۲۰ گنا بلند تر آوازوں کو گارنٹیر شدہ طور پر سن سکتا ہے۔ یہ مصنوعی ”کان“ ان آوازوں کی ”سماعت“ کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جو جراثیم کے لئے مہلک ہیں۔

آواز ایک حرکت ہے۔ ایک ارتعاش ہے۔ ایک سکنڈ میں اگر ۲۰ ہزار سے زائد ارتعاش ہوں تو انسانی کان ان کو سن نہیں سکتا۔ ایسی آوازیں ”بالا صوتی“ (ULTRASOUND) کہلاتی ہیں۔ ان آوازوں کی زد میں جو جراثیم آجاتے ہیں وہ پھر نیپ نہیں سکتے۔ اس لئے غذاؤں کی حفاظت کا کام ان سے لیا جاسکتا ہے۔

اگر ایک سکنڈ میں دس لاکھ یا اس سے زیادہ ارتعاش ہونے لگیں تو پھر آواز میں روشنی کی سی خاصیتیں نظر آنے لگتی ہیں۔

اگر ایسے ارتعاشوں یعنی ایسی اونچی آوازوں کے راستے میں انگلی رکھی جائے تو ارتعاشی حرکت یعنی جھنجھٹا ہٹ محسوس ہوتی ہے اور ساتھ ہی ہڈیوں میں سے آواز کے گزرنے میں بھی محسوس ہوتی ہے۔

موسیقی کی تانیں ایسے اونچے سروں میں بجائی جاسکتی ہیں جن سے جراثیم ہلاک ہو جائیں۔ تو پھر مشرق میں موسیقی کے متعلق جو دعوے کئے گئے ہیں ان میں کچھ صداقت نظر آنے لگتی ہے۔



اقبال کی کہانی پر تبصرے کے متاثر ہو کر

از

(جناب ڈاکٹر ظہیر الدین احمد صاحب جامعی)

محرمی زاد مجدکم و متعنا اللہ بافاد اتمکم - السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

مؤقر ماہنامہ ”برہان“ کی حالیہ اشاعت میں میری ایک نہایت ہی حقیر کوشش ”اقبال کی کہانی“ کے متعلق آپ کے گرامی تاثرات میری نظر سے گزرے۔ لہجہ کی سنجیدگی، متانت اور شائستگی نے مجھ کو بہت متاثر کیا ہے، تنقید برائے تحقیق کی یہ ایک جاندار مثال ہے، اسی سے علم چھپتا، علم کی راہیں کھلتیں اور حقیقت تک پہنچنے میں ہم کو بڑی مدد ملتی ہے۔ تنقید کی ایک دوسری قسم بھی ہے جس کی غرض تحقیق نہیں تو تعزیریں ہوا کرتی ہے اس تنقید برائے تعزیریں سے نفس مارہ کی تسکین، خرازاں نفس کی تشفی تو ہو سکتی ہے لیکن علم کی گتھیاں نہیں سلجھ سکتیں۔ اس سے تو رشتہ علم پر پہلے ہی سے پڑی ہوئی بہت سی گرہوں میں ایک گرہ کا اور اضافہ ہو جاتا ہے اور حاصل کچھ بھی نہیں ہوتا۔ آپ کی تنقید کے اسی برگزیدہ انداز تحقیق نے میرے اس ”عجائز ناقصہ“ کے متعلق جو چند اہم تنقیحات پیدا کی ہیں انہوں نے مجھ کو اپنے افکار و خیالات کا از سر نو جائزہ لینے پر مجبور کر دیا ہے اور محض تشاد اور تبادُل فکر کے لئے میں آپ کی خدمت میں کچھ نہیں پیش کر رہا ہوں کہ اگر ان سے آپ کا اطمینان ہو سکا تو پھر مجھ کو اپنے پیش کردہ افکار میں کسی ترمیم کی ضرورت نہ ہوگی ورنہ آپ کا نیا ض علم مجھ کو اپنے خیالات کی اصلاح پر اس طرح مطمئن کر دے گا کہ دوسری اشاعت کے موقع پر مناسب ترمیم کے ساتھ اپنے خیالات کو پیش کروں۔

مولویت اور صوفیت اگر نام ہے مذہب کی روح سے اُس سرشاری کا جو آدمی کو اعلائے کلمۃ الحق کے لئے ہمیشہ سر بکھٹ۔ احمائے باطل کے لئے متحرک اور بے چین اور ”می نگنجد در جہان دیگران“ کا جاندار مصدق بنادتی اور عالم قرآن کو وجود میں لانے کے لئے اس فرسودہ عالم کو سیٹ

کر رکھ دینے کی کم از کم آرزو اور تڑپ سے قلب و دماغ کے ہر گوشے کو گھیر لیتی ہے تو پھر میں آپ کے اس خیال سے پوری طرح متفق ہوں کہ اقبال ایک کٹر مولوی اور ایک کٹر صوفی تھا بلکہ میں تو یہاں تک کہہ سکتا ہوں کہ قدرت نے گزشتہ سات سو سال میں ایسے چند ہی مولوی اور صوفی پیدا کئے ہیں۔ اس مولویت اور صوفیت کے بلند مقام پر فائز تو سب سے پہلے ذات قدسی صفا حضرت رحمۃ اللعالمین (صلعم) تھی۔ اسی مولویت اور صوفیت نے ابو بکر کو صدیق، عمر کو فاروق، عثمان کو غنی، اور حیدر کو کرار بنایا تھا۔ اور اسی منصب پر فائز ہونے کی تمنا میں اقطاب و اولیاء انقیاء و صالحین نے عمریں گزاریں۔ اسی سے بد و جنین میں گرمی پیدا ہوئی تھی۔ اور اسی نے حسینؑ کو وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل بلند کرنے پر آمادہ کیا تھا۔ حاشا و کلا اس مولویت اور صوفیت کے خلاف بے احتیاسی کا کوئی جذبہ نہ میں نے پیدا کیا ہے اور نہ کبھی اس کا وہم و گمان بھی ردی اور اقبال کے ایک دنیٰ حلقہ بگوش کی حیثیت سے مجھ کو ہو سکتا ہے۔ اس کے بالکل برعکس میں تو اس کا کوئی معمولی سے معمولی شائبہ بھی اپنے اندر پیدا ہو جانے کی دلسوز دعائیں کرتا رہتا ہوں اور آپ سے بھی درخواست کرتا ہوں کہ میرے لئے دعا فرمائیں۔

اس کے علاوہ مولویت اور صوفیت کی جو بھی شکلیں ہیں اور ایک حد تک ان کی جانب آپ نے بھی اشارہ کیا ہے وہ قرآن کی نظر میں جو اقبال کا نقطہ نظر ہے، مردود، مذموم اور بہر حال میٹ دینے کے قابل ہے۔ منتِ نئی قباؤں میں یہ خود کو ظاہر کرتی رہتی ہیں۔ اپنے ہی ساختہ پرداختِ اصنام سے ان کے قلب معمور ہوتے ہیں۔ فرمانرواؤں کی قوت ان کی معبود ہوتی ہے اور انہی کی مصلحت اور مفاد کے لئے یہ سوچتے ہیں اور انہی کے مستأمراد کے مطابق اپنی دل نشین تقریروں سے تجدید اور احیائے دین کے فرائض انجام دیتے دکھائی دیتے ہیں۔ غیر کی تعمیر کے لئے ملت کی تخریب میں ان کو لطف ملتا ہے۔ گفتہ ہائے بے عمل کی ان چلتی پھرتی تصویروں کو اگر موقع ملے تو کعبۃ اللہ کے ملبے سے کسی دہری کی تعمیر تک میں ان کو نائلِ کھیل مندی۔ عبادت، تن پروری اور مفت خوری کے یہ مجسمے مرگِ ناتمام کی جھلک میں اپنی روح کو دیئے ہوئے۔ خاکِ مزار کو کسبِ معاش کا ذریعہ بنائے ہوئے ہیں۔

خانقاہوں کے یہ مجاور اور گورگن، بزرگانِ دین کے مقبروں کی اس تجارت اور اپنی خود ساختہ اوضاع و اشکال کو تبدل نہ اور الٰہی اہمیت دے کر سادہ لوح عوام کو گمراہ کر رہے ہیں۔ اپنی پیدا کی ہوئی بدعتوں کو شعائرِ دینیہ کا درجہ دیتے ہیں اور اس طرح مذہب اور دین سے عام بیزاری اور تنفر پیدا کر دیتے ہیں۔ اس قسم کی مولویت اور صوفیت کے خلاف اقبال نے جو جہاد کیا ہے اس کا خود آپ کو اعتراف ہے، عالمِ قرآن کا مستحق ہونا اقبال کی نظر میں موقوف ہے ان بتوں کے ڈھادینے پر اقبال کے خیال میں ان کم نگاہ، کور و ذوق، ہرزہ گرد ہستیوں کے قال و اقوال نے ہی ملت کے پر خچے اڑا دیے ہیں ان کو وہ قرآنِ فردش کہتا ہے جن کی تحریف و تاویل نے روحِ الامین تک کو مضطرب اور پریشان کر رکھا ہے اس کی نگاہ میں یہ دینِ فردش سوداگر میں جو رحمتہ للعالمین کے دین کی حکمت سے قطعاً بے نصیب ہیں۔ ان کے نزدیک ام الکتاب کی ایک افسانہ سے بڑھ کر کچھ قیمت نہیں۔ اسرارِ کتاب تک ان کی جامد فکر کی رسائی اتنی ہی ناممکن ہے جتنا کسی مادرِ زرا اندھے کا آفتاب کو دیکھنا۔ اس دین کو جس کا یہ مظاہر کرتے ہیں اقبال ع ”دینِ ملائی سبیل اللہ“ کہتا اور اس دین سے اپنی برأت ظاہر کرتا ہے جو انسان میں بیداری اور مسائلِ حیات کو پوری توانائی کے ساتھ حل کرنے کی بجائے آدمی پر غنودگی طاری کر دے اور زندگی کے تقاضوں اور مشکلات سے کتر ارجح نکلنے کی رغبت دے۔ اس کی نگاہ میں دین کے یہ مظاہرے سحر و افسوں تو ہو سکتے ہیں لیکن دین ہرگز نہیں۔ اُن کے افسوں کی گولیاں ہونے میں تو کلام نہیں لیکن مذہب ہرگز نہیں۔

آج سے تقریباً چودہ سو سال پہلے ایک قوم وجود میں آئی جس کی اصل ایک باختہ رنگ شرار سے زیادہ نہ تھی۔ لیکن ایک اُمّی کے فیضِ نظر اور اس کی برگزیدہ حکمت کے اثر نے اس کو خورشیدِ جہانگیر اور آشتائے بہاؤ تقدیر بنا دیا۔ اپنے ہر قدم سے وہ سنیکڑوں ہنگاموں کی صورت گری اور اپنے فلک شکن نعروں سے دستِ افلاک میں غلطے پیدا کر رہی تھی۔ اس کا ٹکا بڑے سے بڑے باطل کی گردن توڑ کر رکھ دیتا اور اس کے تیوروں کو دنیا کی قوتیں اہتمام کی نظر سے دیکھا کرتیں۔ دیرانوں کو گلزار بناتی، بے آبرو انسانیت کے مرتبہ اور وقار کو بڑھاتی اور مظلوم انسانیت کی ہر گونہ بیہودی اور صلاح

کے سامان ہبیا کرتی ہوئی وہ آگے ہی بڑھنا جانتی تھی۔ اس آسمان کیود کے لئے یہ ستارے آنکھوں کا کام تھے
تھے اور وہ ان آنکھوں سے اس کی خوش خرامیوں کو دیکھ کر مست ہو جاتا کرتے تھے آج آپ دیکھ رہے
ہیں کہ یہ باتیں خواب و خیال اور ایک پارینہ افسانہ ہو کر رہ گئی ہیں ذوقِ جعفر سے محروم اور کاوشِ رازی
سے لڑنا، ترساں اور گریزاں یہ مولوی دھونی عروجِ رخت سے اس کو گرا رہے اسلام کی عظمت و شوکت
کے پرچم کو سرنگوں کر رہے، دین حق کی کافرئی سے زیادہ رسوائی کر رہے اور اپنی کافرگری کے جوہر دکھا رہے
ہیں۔ قطعِ دبرید کے ذریعہ اپنی شکل و صورت میں ایک ذرا سا تغیر اور اپنے طور و طریق، وضع و قطع میں اک
ذرا سی تبدیلی ان کے لئے اسرارِ دین اور رموزِ مذہب کی ٹھیکہ داری اور فکر کی سرمایہ داری کی ضمانت دینے
لگتی ہے اور ان کو انسانیت کے لئے شاہراہِ دین کو تنگ سے تنگ کرنے کے بڑے ہی عجب اور ناپاک موافقے
ملنے جاتے ہیں۔ یہ مذہب جس کا یہ مظاہرہ کرتے ہیں، غیر مسلموں کے لئے کوئی ترغیب تو کیا بن سکتا اس سے
تو خود ان لوگوں کا دم گھٹ رہا ہے جو اس کو قبول کئے ہوئے ہیں۔ یہ داستان گو اور افسانہ بند ہستیاں نامہ
میزان کے خود ساختہ قصے بیان کرنے میں تو اپنی چرب زبانی کے جوہر دکھاتی ہیں لیکن ”قیامت ہو جو“
سے غافل اس مسکین ملت کو نت نئی قیامتوں کا شکار بنا رہی ہیں۔ اپنے سحر و افسوں سے تسلیم و رضا تو کل
، قناعت کی جو قطعاً غیر شرعی، غلط اور غیر فطری تعلیم انھوں نے اس غم زدہ اور بد نصیب قوم کو دی ہے
اسی کا نتیجہ ہے کہ آج وہ اپنے ہاتھ پیر توڑے ہوئے دنیا کے تاریک کونوں میں اپنی قسمت کو ٹپتی رہ رہی،
اپنے کاسہ گدائی ہی پر ناز کر رہی اور اپنی تقصیر اور کوتاہی کے متناسب دنیا میں ذلیل و خوار ہو رہی ہے
صوفی و ملاکی شراب نے یہ انجام کیا ہے اس قوم کا جس کے لئے کہکشاں جائے نماز کا کام دیا کرتا تھا۔

میرے بھائی! ملت کا یہ حشر کیا دل خون کرنے کے لئے کافی نہیں ہے؟ اس میں شک نہیں کہ
ملت کی تباہی کے اسباب کی ایک طویل فہرست تیار کی جاسکتی ہے لیکن رومی اور اس کے برگزیدہ حلقہ
گوشِ قبائل نے سرفہرست اسی نام نہاد مولویت اور صوفیت کو رکھا ہے، انھی اکابرِ عرفاء کے ایک
حقیر شارح ہونے کی سعادت مجھ کو حاصل ہو رہی ہے۔ میں نے بھی ادبارِ ملت کے اسباب میں انھی
کو مقدم کیا ہے علاوہ اس ملت کی گذشتہ سات سو سالہ تاریخ کے مطالعہ کے گذشتہ نصف صدی میں

اکثر بلادِ اسلامیہ کے متعلق خود میرے اپنے ذاتی تجربے، مشاہدے اور شخصی معلومات اور ربط و اتصال نے اس خیال کو زیادہ سے زیادہ تقویت دی اور اقبال اور رومی کے ہم نوا بنادیا ہے۔ مملکت عثمانیہ کو انقلاب قبل بھی میں نے دیکھا ہے اور متضاد افکار و خیال کے ترکوں سے میں نے شخصی ربط پیدا کیا تھا۔ قاہرہ میں جب پہلی مرتبہ میں نے مصطفیٰ اکمال کے انقلاب کی خبر پڑھی تو میں آپ کو کس طرح یقین دلاؤں کہ یہ چیز اوروں کے لئے تو یقیناً حیرت کا موجب بن سکتی تھی لیکن میرے لئے ہرگز نہیں۔ میں تو بعض دفعہ بیٹھا ہوا یہ سوچتا کرتا تھا کہ یہ انقلاب اب تک کیوں نہ آیا۔

مصطفیٰ اکمال کے انقلاب کے دوسرے رُخ یعنی مذہب و مملکت کی علیحدگی کی تحریک سے آج کے روزِ من پر شاید ہی مجھ سے بڑھ کر کوئی درد مند ہو۔ یقیناً یہ ملت کش روح قرآن کے معارف اور خود زندگی کی بلند حقیقتوں کی معاند ایک تحریک تھی جس کو افغانی اور سعید علیم کی فکر روشن میں کی رہنمائی اور اقبال کے مشورہ سے بیا میزند چوں نورِ دو قندیل منیدیش افتراق ملکِ ردیں را

کے مطابق ایک طبعی قدرتی اور فطری شکل دی جاتی تو نہ معلوم آج ملتِ اسلامیہ خود داری، خود آگاہی، عظمت و اقتدار کے کن بلند مقام پر پہنچ چکی ہوتی یہی ملت سیاست کے ان پیچیدہ اور گنجلک عقودوں کو جن کے حل سے آج انسانیت قاصر دکھائی دے رہی ہے، اپنے ناخنِ تدبیر سے حل کر دیتی۔ احیائے ملتِ اسلامیہ کے فرائض انجام دیتی اور اقوامِ عالم کی سیادت اور عامت کے منصب تک خود کو پہنچا سکتی تھی۔ یہ نہ ہوا اور اس لئے نہ ہوا کہ قسطنطنیہ کے مولوی اور صوفی نے یہ نہ ہونے دیا۔ مصطفیٰ اکمال نے غلطی کی اور اس لئے غلطی کی کہ مولوی اور صوفی نے اس کو اس غلطی پر مجبور کر دیا لیکن اس کے ساتھ مجھ کو تو اس اعلان اور تصریح میں بھی تامل نہیں کہ خدا کے نام پر شیطنت کی جھلک مضبوط کرنے اور ابلیس کی گرم بازاری سے یہ کہیں بہتر ہے کہ ایک دفعہ خدا ہی کا انکار کر دیا جائے تو اس سے آدمی کم از کم لا کے درجہ میں آجاتا اور خود اس کی فطرت تھوڑی سی ٹھوکر میں کھانے کے بعد اس کو آلا کی طرف دھکیل دیتی،

۵۔ در مقامِ لا نیا ساید حیات سوئے اہلامی خرامد کائنات

جامنہ ازہر کے مولویوں اور جمال الدین افغانی اور محمد عبیدہ کی پیداوار، سعد زاعلوی کی تحریک آزادی کے علمبرداروں سے ایک طویل عرصہ تک مجھ کو بہت ہی قریبی ربط اور تعلق رہا ہے، گو میں مصری نہ تھا لیکن فواد اول، شاہِ مصر کے

از کاران مولویوں کے آنے دن اور ہر قدم پر تحریک آزادی کی راہ میں رکاوٹیں در دشواریاں پیدا کرتے رہنے سے میر دم گھٹا کرنا تھا اور آج میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اپنی زندگی میں سعد زغلول کی اپنی مساعی کے ثمرات و جزائی زیادہ تر نتیجہ تھی ان ہی مولویوں کی دسیسہ سازوں کے۔ مغول شاہ فاروق کے مٹان کی ساز باز اور پرستان پیرس میں قہر ہے۔
 کے اس متوالے کو سادات بنی ہاشم کا ایک نجیب الطرفین سید اذہ ثابت کرنے میں ان کی آپس میں مسابقت اب کوئی راز کی بات نہیں ہے۔ میں قاہرہ ہی میں تھا۔ انھی مغول شاہ فاروق کی لادت کا جشن منایا جا رہا تھا۔ شاہ قواد کی سرکاری قیام گاہ "قصر عابدین" بقیعہ نور بنی ہوئی تھی۔ مبارک سلامت کے شادیانے بچ رہے تھے۔ تہنیت و تبریک میں جامعہ ازہر کے یہی مولوی اور صوفی پیش پیش تھے لارڈ ایلیمی برطانیہ کے ریزیڈنٹ مقیم قاہرہ کے دوش بدش، شاہی عشا ئیہ کی ان گنت نعمتوں سے بلا خوف و ہراس اپنے معول کو بھر رہے تھے اسی وقت اور اسی لمحہ مصر کی شاہراہیں اور گلی کوچے ایک دوسرا بہت ہی بھیانک منظر پیش کر رہے تھے، فتح فلسطین، ایلیمی کی فوجیں فوجانہ طور پر اور بوڑھے فدایان وطن کو اپنی گولیوں کا نشانہ بنا رہی، کبوتروں کی طرح ان کو گرا رہی تھیں۔ ٹھیک اسی وقت سعد زغلول کو گرفتار کر کے مالٹا میں نظر بند کرنے کے لئے جہاز پر سوار کر لیا جا رہا تھا۔ جنرل نجیب کے انقلاب نے کسی اور کو حیران و پریشان کیا ہو تو کیا ہو، میں تو اس لئے حیران ہوں کہ یہ انقلاب اتنی دیر سے کیوں آیا؟ آج ایران میں ڈاکٹر مصدق کے خلاف جو شورش برپا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور شاہ پرستی کے جس ناپاک جذبہ کو اشتعال دیا گیا ہے، اس کا سراغ آپ کو آیت اللہ کاشانی کی چار دیواری میں ملے گا۔

اس دوسری قسم کی مولویت اور صوفیت پر میں نے اپنی حقیر کوشش میں ضرور تنقید کی ہے۔ اس کا بھی مجھ کو اعتراف ہے کہ میری تنقید کا لہجہ کسی قدر تلخ ہو گیا ہے لیکن اس لہجہ سے بہر حال نرم اور ملائم ہو جو خود قرآن اور روئی اور اقبال ذی استعمال کیا ہو۔ قرآن ان "قاسیة القلوب ذکرتہم اللہ" کی "کاستی قرآن دیتا ہے اور "ضلال مبین" میں گرفتار کرتا ہے۔ یہ مجھ سے کیسے خواہش کی جاسکتی ہے کہ اس ضلال مبین سے احتراز پیدا کرنے کی بجائے کسی کے قلب میں اس کا کوئی شائبہ ترغیب پیدا کر سکوں اپنے فکر کی ان چند الجھنوں کو آپ سے تشاور فی الامور و تبادلہ فکر کے لئے پیش کر رہا ہوں اور متوقع ہوں کہ یہ "برہان" کے قیمتی صفحات پر جن سے ہمیشہ "الحقیقۃ تثبت البحت" کا علمی ثبوت ملتا رہا ہے اگر ان نہ گذریں گے۔ آپ کی گرامی تنقید کے متعلق کسی مذاقہ میں الجھ کر صحافت کی آزادی میں دخل انداز ہونا ہرگز مقصود نہیں ہے، مقصد صرف اس التباس فکری کو رفع کرنا ہے جو بحیث تالیف میں کسی ناتمام بحث کی وجہ سے پیدا ہو گیا ہو۔ اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہو گا کہ برہان کے قارئین کی کسی تعداد کو میری ان توضیحات کی روشنی میں آپ کے گرامی تبصرو کو پڑھتے، کوئی رائے قائم کرنے اور اگر ممکن ہو تو مجھ کو مشورہ دینے کا موقع مل سکے گا

ندوة المصنفین کی تاریخی کتابیں

غلامان اسلام

انہی سے زیادہ غلامان اسلام کے کمالات و فضائل اور کارناموں کا ایمان افروز بیان

عرب اور اسلام

ڈاکٹر حق کی مشہور و معروف کتاب کا آسان اور نفیس ترجمہ

قیمت چھ مہلے

قیمت چھ مہلے

تاریخ اسلام پر ایک نظر

تاریخ اسلام آٹھ جلدوں میں

تھوڑے وقت میں تاریخ اسلام پڑھنے والوں کے لئے یہ کتاب بہت مفید ہے۔ تاریخ ملت کے یہ تمام حصے مستند و معتبر بھی ہیں اور جامع و مکمل بھی طرز بیان نہایت شگفتہ درواں تربیت دل نشین

نجم اسلام کے تمام حصے ضروری حالات

قرون وسطیٰ

مسیلمانوں کی علمی خدمات

قرون وسطیٰ کے مملکتوں

اسلام سائنس دانوں

اور فلاسفوں کے ہیشال

علمی کارناموں کا بیان

قیمت جلد اول چار مہلے دوم چھ مہلے

نبی عربی صلعم خلافت راشدہ خلافت بنی امیہ

قیمت چھ مہلے چھ مہلے چھ مہلے

خلافت عباسیہ جلد اول خلافت عباسیہ جلد دوم

قیمت چھ مہلے چھ مہلے چھ مہلے

تاریخ مصر و مغرب اقصیٰ خلافت عثمانیہ

قیمت چھ مہلے چھ مہلے چھ مہلے

غیر جلد مکمل سیٹ کی قیمت

قیمت چھ مہلے

قیمت چھ مہلے

قیمت چھ مہلے

قیمت چھ مہلے

قیمت چھ مہلے

قیمت چھ مہلے

قیمت چھ مہلے

مسلمانوں کا نظم مملکت

مسلمانوں کا عروج و زوال

مسلمانوں کے نظم حکمرانی کی بصیرت افروز تاریخ جس میں مسلمانوں کے آئین جہان بینی کے تمام شعبوں کو متعلق نہایت صاف اور روشن معلومات دی گئی ہیں یہ وقت کی ایک لائق مطالعہ کتاب ہے اصل کتاب کے مصنف مصر کے مشہور فاضل اور جدید و قدیم علوم کے باخ نظر عالم ڈاکٹر حسن ابوالہیتم حسن ایم اے پی ایچ ڈی ہیں اور ترجمہ ندوة المصنفین کی نگراں میں کیا گیا ہے۔

جدید ایڈیشن (اپنے موضوع پر ایک اچھوتی کتاب) جس میں خلافت راشدہ کے دور سے لے کر منہدستان کے عہد حکمرانی تک مسلمانوں کے عروج و زوال کے اسباب کا مبصرانہ اور متفقانہ تجزیہ کیا گیا ہے۔ قیمت للہر مہلے

تاریخ مشائخ حشت

سلسلہ حشت کے صوفیہ کرام کا متفقانہ تذکرہ اور ان کے متبعین حیات نظام اصلاح و تربیت پر مدلل بحث قیمت للہر مہلے

قیمت للہر مہلے

فہرست کتب مفت طلب فرمائیے

مینجر ندوة المصنفین اردو بازار خاج مسجد علی

مختصر قواعد ندوة المصنفین دہلی

۱۔ **محسن خاص** جو مخصوص حضرات کم سے کم پانچ سو روپیہ یکمشت مرحمت فرمائیں وہ ندوة المصنفین کے دائرہ محسنین خاص کو اپنی شمولیت سے عزت بخشیں گے ایسے علم نواز اصحاب کی خدمت میں ادائے اور مکتبہ برہان کی تمام مطبوعات نذر کی جاتی رہیں گی اور کارکنان ادارہ ان کے قیمتی مشوروں سے مستفید ہوتے رہیں گے۔

۲۔ **محسنین** جو حضرات پچیس روپے مرحمت فرمائیں گے وہ ندوة المصنفین کے دائرہ محسنین میں شامل ہوں گے۔ ان کی جانب سے یہ خدمت معادضہ کے نقطہ نظر سے نہیں ہوگی بلکہ عطیہ خاص ہوگا۔ ادارے کی طرف سے ان حضرات کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات حق کی تعداد تین سے چار تک ہوتی ہے۔ نیز مکتبہ برہان کی بعض مطبوعات اور ادارہ کا رسالہ "برہان" بلا کسی معادضہ کے پیش کیا جائیگا۔ جو حضرات اٹھارہ روپے پیشگی مرحمت فرمائیں گے ان کا شمار ندوة المصنفین کے حلقہ ۳۔ **معاونین** :- معاونین میں ہوگا ان کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات ادارہ اور رسالہ برہان (جس کا سالانہ چندہ چھ روپے ہے) بلا قیمت پیش کیا جائے گا۔

۴۔ **اجتہاد** :- نذر روپے ادا کرنے والے اصحاب کا شمار ندوة المصنفین کے اجتہاد میں ہوگا۔ ان کو رسالہ بلا قیمت دیا جائے گا اور طلب کرنے پر سال کی تمام مطبوعات نصف قیمت پر دی جائیں گی یہ حلقہ خاص طور پر علماء اور طلبہ کے لئے ہے۔

قواعد رسالہ برہان (۱) برہان ہر انگریزی مہینے کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔ (۲) مذہبی، علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین اگر وہ زبان و ادب کے معیار پر پورے اتریں برہان میں شائع کئے جاتے ہیں۔ (۳) باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاک خانوں میں ضائع ہو جاتے ہیں جن صاحب کے پاس لٹا نہ پہنچے وہ زیادہ سے زیادہ ۲۵ تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیں۔ ان کی خدمت میں پرچہ دوبارہ بلا قیمت بھیج دیا جائے گا۔ اس کے بعد شکایت قابل اعتنا نہیں سمجھی جائے گی۔

(۴) جواب طلب امور کے لئے ۲۰ آنے کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا چاہئے۔ خریداری نمبر کا حوالہ ضروری ہو۔ (۵) قیمت سالانہ چھ روپے۔ دوسرے ملکوں سے ساڑھے سات روپے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ (۶) منی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھئے۔

مولوی محمد ادریس پرنٹر پبلشر نے جنید برقی پریس میں طبع کرا کر دفتر برہان جامع مسجد دہلی سے شائع کیا

ندوة ائین دینی کا علمی و دینی ماہنامہ

برپا

مرتب
سعید احمد کسرا بادی

ندوة المصنفین کی دینی اور اجتماعی کتابیں

اسلام کا نظام مساجد

نظام مساجد کے تمام گوشوں پر دل پذیر بحث اور اس کی
منفعتوں اور برکتوں کی تفصیل -

قیمت ۳۰۰ مجلد للعر

اسلام کا اقتصادی نظام

وقت کی ایک اہم انقلاب انگیز کتاب جس میں اسلام
کے معاشی نظام کا جامع نقشہ پیش کیا گیا ہے، چوتھا

ایڈیشن۔ قیمت ۳۰۰ مجلد ۳۰۰

اسلام میں غلامی کی حقیقت

مسئلہ غلامی کی تحقیق پر ندوة المصنفین کی معرکتہ الآراء کتاب جس میں انفرادی اور اجتماعی غلامی کے ایک ایک
پہلو پر اسلام کا نقطہ نظر پیش کیا گیا ہے، قیمت ۳۰۰ مجلد للعر

قرآن اور تعمیر سیرت

ایک عظیم نشان اصلاحی کتاب

قرآن مجید کی تعلیم و تربیت کا انسانی سیرت کی تعمیر میں کیا دخل ہے اور اس تعلیم کے ذریعہ سیرت و کردار کا کس طرح غلط
ہوتا ہے یہ تبرک کتاب خاص ہی موضوع پر لکھی گئی ہے۔ ایک ایسے وقت میں جب کہ مسلمان عام طور پر احساس کمتری کے
اندھیریوں میں پھنسے ہوئے ہیں یہ گراں اہم تالیف ان کے روحانی رشتے کو مضبوط کرنے میں چراغِ ناز کا کام دے گی۔

قیمت ۳۰۰ مجلد ۳۰۰

ارشادات نبوی کا لائٹانی ذخیرہ

اردو زبان میں

ترجمان السنہ :- ہماری زبان میں حدیثوں کی ایسی جامع اور مستند کتاب آج تک وجود میں نہیں آئی تھی اس میں
حلی متن معارف اب بھی ہے اور صاف و سلیس ترجمہ بھی ساتھ ہی معتقہ تشریحی نوٹ بھی ہیں۔ ترتیب میں کتاب التوحید کو پہلے رکھا گیا
ہر حصہ پر ہی مناسبت سے پوری کتاب کی ترتیب قائم کی گئی ہے پہلی جلد کے شروع میں کئی سو صفحات کا ایک مقدمہ ہے

جلد دوم قیمت ۳۰۰ مجلد للعر

وحی الہی
مسئلہ وحی کے تمام گوشوں پر دل پذیر
بحث، وحی کی حقیقت اور اس کی
صدقت سمجھنے کے لئے لاجواب کتاب -

قیمت ۳۰۰ مجلد للعر

جلد اول قیمت ۳۰۰ مجلد ۳۰۰

ہم قرآن
قرآن مجید کے آسان ہونے کے کیا معنی ہیں
کلام ربانی کا قطعی نشان معلوم کرنے کے لئے
آنحضرت کے ارشادات و اقوال کا معلوم کرنا کیوں ضروری ہے اس
کتاب کا اصل موضوع یہی ہے۔ ایک بہترین تبلیغی اور اصلاحی کتاب ہو گی

منہج ندوة المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی

بُرْهَان

شمارہ نمبر ۶

جلد نمبر ۳۰

جون ۱۹۵۳ء مطابق رمضان المبارک و شوال المکرم ۱۳۷۲ھ

فہرست مضامین

۳۲۲	سعید احمد	نظرات
۳۲۵	جناب ڈاکٹر غور شید احمد صاحب فارق ایم۔ اے۔ ۱۔	قامتی شریح
	پی۔ ایچ۔ ڈی پروفسیر دہلی کالج	
۳۴۴	جناب انعام اللہ خاں صاحب ناٹھرا ڈیپٹی رورنامہ المجمعہ دہلی	حکیم سنائی
۳۵۹	جناب خواجہ محمد علی شاہ صاحب	قرآن مجید اور ترجمہ و تفسیر
		التقریظ والانتقاد
۳۶۷	سعید احمد	مختصر سیرت قرآنہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم
		حالات ماضیہ
۳۷۲	جناب اسرار احمد صاحب آزاد	اہم عالمی واقعات پر ایک نظر
		ادبیات
۳۷۵	جناب آنور صابری جناب شارق میرٹھی	غزل غزل
۳۷۷	م۔ ا۔ ع۔	شعور علیہ
۳۸۰	سعید احمد	تعبیرے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نَظَرَات

کم و بیش دو سال سے اُتر پردیش میں اُردو کو علاقائی زبان تسلیم کرانے کے لئے دستخطوں کی جو مہم جاری تھی خوشی کی بات ہے کہ وہ آخر منزلِ مقصود پر پہنچ کر کامیابی کے ساتھ ختم ہو گئی یعنی بیس لاکھ دستخط حاصل کر لئے گئے اور اس سلسلہ میں جو ایک عارضی کمیٹی بنی تھی ۳۱ مئی کو اسے بھی ختم کر دیا گیا اس میں شک نہیں کہ موجودہ حالات میں اُردو کے لئے بیس لاکھ دستخط فراہم کر لینا کوئی معمولی بات نہیں ہے جن مخلص کارکنوں اور زبان کے شہداء نے اس تحریک کو کامیاب بنانے میں عملاً حصہ لیا ہے وہ سب قدردانانِ اُردو کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں۔ کہ اس کار از تو آید و مرداں چنیں کنند۔

اگست ۱۹۴۹ء میں کانگریس ورکنگ کمیٹی نے ہندوستان میں زبان کے مسئلہ کی نسبت اپنی پالیسی کا جو اعلان کیا تھا اس میں صاف صاف یہ کہہ دیا گیا تھا کہ اگرچہ ہندی کی جوابدہی زبان بن گئی ہے مگر حوصلہ افزائی ہونی چاہئے لیکن جو اور صوبائی یا علاقائی زبانیں ہیں ان کے علاقوں میں ان کی بھی اسی طرح حوصلہ افزائی ہونی چاہئے۔ پرائمیری تعلیم طلباء کو ان کی مادری زبان میں ہی دی جانی چاہئے اور اگر کسی جگہ کئی کئی زبانیں بولی جاتی ہیں تو وہاں کی حکومت کا فرض ہوگا کہ وہ ہر زبان کے ذریعہ تعلیم کا بندوبست کرے۔ بشرطیکہ اس زبان کے لڑکوں کی تعداد معقول ہو اسی اعلان میں مزید برآں یہ بھی کہا گیا تھا کہ ملک کے دستور میں ہندوستان کی بڑی زبانوں کی ایک فہرست ضمیمہ ہشتم میں دے دی گئی ہے ان زبانوں میں سے ایک اُردو بھی ہے اور کمیٹی کو اس بات کا پورا یقین ہے کہ اُردو کو اس کا مقام جس کی وہ مستحق ہے ضرور دیا جائے گا اس بیان میں آگے چل کر کہا گیا ہے کہ اس کو لازماً یاد رکھنا چاہئے کہ اُردو ہندوستان کی زبان ہے جو ہمیں سدا

ہوتی اور پٹی بڑھی اور جس کو ہندوستان میں لوگوں کی ایک بڑی تعداد بولتی اور لکھتی ہے۔

کانگریس ورکنگ کمیٹی نے زبان سے متعلق اپنی پالیسی کا یہ اعلان اپنے جلسہ ۵ اگست ۱۹۴۰ء میں کیا تھا۔ لیکن گذشتہ چار سال میں اس کو یہ معلوم ہوا کہ اردو کے ساتھ بعض صوبائی حکومتیں اور بعض ادارے انصاف کا معاملہ نہیں کر رہے ہیں اس بناء پر اس نے اپنا فرض سمجھا کہ گذشتہ ماہ مئی کی ۱۷ تاریخ کو ورکنگ کمیٹی کا جو اجلاس ہوا تھا اس میں پھر اپنے مسئلہ والے بیان اور زبان کی نسبت اپنی پالیسی کا اعادہ کرے۔ چنانچہ اس نے کیا اور صوبائی حکومتوں کو خاص طور پر متوجہ کیا کہ وہ زبان کی نسبت کانگریس کی سوچی سمجھی اور خوب اچھی طرح سے غور کی ہوئی پالیسی کا احترام کریں اور اس پر عمل کریں اس کی تائید وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے جو جناب موصوف نے ۱۷ مئی کی پاس شدہ چند تجاویز کی وضاحت کی غرض سے دیا تھا۔ مولانا نے اس میں صاف لفظوں میں فرمایا ہے کہ ۱۷ مئی کی ورکنگ کمیٹی کے جلسہ میں ۵ اگست ۱۹۴۰ء والے زبان سے متعلق رزلویشن کے اعادہ کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ بعض ریاستی حکومتیں اور بعض ادارے اس پر عمل نہیں کر رہے تھے۔ اس بناء پر کانگریس ورکنگ کمیٹی نے ضروری خیال کیا کہ وہ ان حکومتوں کو اپنا مسئلہ والا رزلویشن پھر یاد دلانے اور ان پر زور دیا جائے کہ وہ اس پر عمل بھی کریں۔

بہر حال ایک طرف اردو کے لئے بیس لاکھ دستخطوں کی مہم کا کامیابی کے ساتھ سرانجام پانا اور دوسری طرف انھیں دنوں اور اسی مہینہ میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کا زبان کی نسبت اپنی پالیسی کا پھر زور الفاظ میں اعادہ کرنا اور اس کے فوراً بعد ہی وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد کا اس کی وضاحت میں بیان دینا اور اس میں بعض صوبائی حکومتوں کی کوتاہیوں کا پردہ فاش کرنا۔ یہ سب چیزیں اردو کے حق میں فال نیک اور اچھی علامتیں ہیں اب دیکھنا یہ ہے کہ

اس مبتدئی خبر کیا نکلتی ہے !! شعر
دیکھئے پاتے ہیں عشاق تیرے کیا فیض اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال چھاپے

یہ محضر نامہ جناب صدر جمہوریہ کی خدمت میں پیش کیا جائے گا۔ اور اس کے نتیجے دو ہی ہو سکتے ہیں جناب صدر صاحب اس کو شرف قبول و پذیرائی عطا فرمائیں اور ایک آرڈیننس کے ذریعہ اتر پردیش میں علاقائی زبان ہونے کا اعلان کر دیں اور یا یہ محضر نامہ درخور قبول ہی قرار نہ پائے۔ ان دونوں صورتوں میں اردو کا کام محض دستخطوں کی فراہمی کے بعد ختم نہیں ہوتا بلکہ اور بڑھ جاتا ہے قدرتی طور پر اب دنیا یہ معلوم کرنا چاہے گی کہ جس زبان کے لئے صرف ایک صوبہ ہی کے اندر بیس لاکھ انسانوں نے دستخط کر دیئے ہوں انہوں نے اس زبان کی حفاظت و بقا کے لئے بھی کچھ کیا یا صرف دستخط کر دینا ہی ان کے کیسے جوش و عمل کی سب سے بڑی پوئجی تھا۔

ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں اور اب پھر لکھتے ہیں کہ اصل ضرورت یہ ہے کہ جگہ جگہ اردو کی تعلیم کے لئے مکاتب کھولے جائیں جن میں بنیادی تعلیم کے ماہر اساتذہ کام کریں تاکہ وہ پڑھنے والوں میں زبان کے ساتھ دلچسپی اور اس کا شوق بھی پیدا کر سکیں۔ علاوہ بریں اردو کی گشتی لائبریری اور گشتی دار المطالعہ کا قریب بہ قریب۔ محلہ بہ محلہ انتظام ہونا چاہئے اردو اخبارات و رسائل اور اردو مصنفین و مؤامنین کی ہمت افزائی کا بند و سبب ہونا چاہئے۔ اردو کلاس کی ادب کی جو کتابیں معدوم ہوتی جا رہی ہیں ان کی از سر نو دیدہ زیب طباعت و اشاعت ہونی چاہئے یونیورسٹیوں میں جوڑے کے یاڑکیاں اردو میں ایم۔ اے کریں۔ ان کے لئے وظائف اور جوامع امتیازی امتحان پاس کر لیں ان کے واسطے طلائی تمغہ وغیرہ کا بند و سبب ہونا چاہئے اردو کو خود اس کے مخالفوں کی طرف سے اتنا خطرہ نہیں ہے جتنا کہ خود اردو کے نام لبواؤں کی طرف سے ہے اور ہم نے جو کچھ لکھا ہے اس کا سر و سامان اور انتظام و اہتمام انجمن ترقی اردو کو کرنا چاہئے!

قاضی شریح

از

جناب ڈاکٹر خورشید احمد صاحب فارق

(ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی پروفیسر لی کالج)

(۲)

حضرت علیؑ کے عہد میں شریح سے متعلق دو واقعات ملتے ہیں جن سے شریح کی سیرت کی مضبوطی اور حضرت علیؑ کے تشدد پر نہایت صاف روشنی پڑتی ہے پہلا واقعہ جنگ صفین (۳۵ھ) سے پہلے اور جنگ جمل (۳۶ھ) کے بعد کے زمانہ سے تعلق رکھتا ہے۔ حضرت علیؑ کی زرہ بکتر کہیں گر گئی تھی ایک دن انھوں نے اس کو کسی یہودی کے پاس دیکھا اور پہچان کر بولے: ”یہ میری ہے فلاں فلاں دن کھو گئی تھی؟“ یہودی نے دینے سے انکار کیا اور کہا: ”یہ میری ملکیت ہے، آئیے اس قضیے کو مسلمانوں کے قاضی کے سامنے پیش کریں؟“ دونوں شریح کی مجلس میں پہنچے۔ شریح امیر المومنین کو دیکھ کر بطور احترام کھڑے ہوئے جب سب بیٹھ گئے تو حضرت علیؑ نے کہا: ”یہ زرہ بکتر جو اس یہودی کے پاس ہے میری ہے میں نے پہچان لی ہے؟“ شریح نے مدعی کا دعویٰ سن کر مدعی علیہ کا بیان مانگا۔ یہودی نے کہا زرہ بکتر میری ہے میں اس کا مالک ہوں؟“ شریح نے حضرت علیؑ کو مخاطب کر کے کہا: ”امیر المومنین آپ سچ فرماتے ہیں یہ زرہ بکتر آپ کی ہوگی لیکن ضروری ہے کہ آپ دو گواہ پیش کریں حضرت علیؑ نے اپنے غلام قنبر اور لڑکے حسنؑ کو پیش کیا جنہوں نے حضرت علیؑ کے حق میں شہادت دی شریح نے قنبر کی شہادت مان لی لیکن حسنؑ کی ماننے سے انکار کیا۔“

عہ ابن عساکر تاریخ دمشق (مصر) پر لکھتے ہیں کہ حضرت علیؑ نے لڑکے کی شہادت باپ کے حق میں نامقبول قرار دی تھی اور شریح کا فعل خود حضرت علیؑ کی رائے کے مطابق تھا۔

حضرت علیؓ بہت برہم ہوئے اور بولے: ”رسول اللہؐ نے فرمایا ہے کہ حسنؓ اور حسینؓ جنت کے جوانوں کے امام ہیں اور تم ان میں سے ایک کی شہادت ماننے سے انکار کرتے ہو یہاں سے نکل جاؤ اور بانقیاء جا کر چالیس دن وہاں کے لوگوں کے درمیان انصاف کرو“ تاہم شریح کا فیصلہ بحال رکھا گیا یہودی اس عمدہ فعل سے متاثر ہو کر بولا: امیر المؤمنین آپ میرے ساتھ اپنے قاضی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور جب انھوں نے آپ کے خلاف فیصلہ کیا تو آپ نے فیصلہ مان لیا: آپ نے سچ کہا یہ زرہ بکتر آپ کی ہے فلاں فلاں دن جب آپؐ خاکستری اونٹ پر سوار تھے یہ گر گئی تھی اور میں نے اٹھالی تھی، میں اسلام قبول کرنا ہوں: حضرت علیؓ نے زرہ بکتر کے علاوہ اس کو گھوڑا دیا اور ۹۰۰ درہم سالانہ وظیفہ مقرر کر کے فوج میں بھرتی کر لیا۔

شریح چالیس دن تک بانقیاء میں جلاوطن رہ کر لوٹ آئے۔ رہا یہ کہ انھوں نے وہاں حضرت علیؓ کے حکم کے بموجب یہودیوں کے درمیان قاضی کے فرائض انجام دیے یا نہیں تو قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا نہیں کیا۔ اس کی تائید ابن سعد کی اس روایت سے ہوتی ہے کہ ”جب شریح جزیرہ کے علاقہ میں جاتے تو فیصلے نہیں کرتے تھے“ بانقیاء کو فہ کے قریب ایک گاؤں تھا جہاں کی اکثر آبادی یہودی تھی جس سے جزیرہ لیا جانا تھا۔ دوسرا واقعہ پنج البلاغہ کے شارح ابن ابی الحدید نے نقل کیا ہے: شریح نے انسؓ دینار میں ایک مکان خریدا۔ اس کی خبر حضرت علیؓ کو ہوئی تو وہ ناراض ہوئے اور شریح کو بلا کر کہا: مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم نے انسؓ دینار (آجکل ایک دینار تیرہ روپے سے کچھ زیادہ ہوتا ہے) اس وقت غالباً پانچ روپے کے بقدر تھا) میں مکان خریدا ہے، اور اس کی خریداری کا سرخط لکھا ہے جس پر گواہوں کی شہادت ہے: ”شریح نے کہا جی ہاں ایسا ہوا ہے“ حضرت علیؓ شکمی نظروں سے دیکھ کر بولے: شریح کیا تمہارے پاس وہ شخص

فارسیں کو شاید معلوم ہو گا کہ رصنی (متوفی ۱۰۴۰ھ) کی ہنج البلاغۃ کا شمار عربی کی موضوع کتابوں میں ہوتا ہے اگر سب نہیں تو اس کے بہت سے خطوط یقیناً موضوع محرف اور بدلے ہوئے ہیں۔ ضروری نہیں کہ یہ واقعہ کبھی موضوع ہو لیکن اس کا احتمال ہے بہر حال اس قصے سے حضرت علیؑ کا غیر معتدل تشدد ظاہر ہوتا ہے اگر کوئی شخص حد اعتدال میں رہ کر رہائش کے لئے مکان بنوائے یا خریدے تو اس کو فریب خوردہ دنیا یا آخرت سے بے پروا نہیں کہا جاسکتا نہ اس کا زہد مطعون ہو سکتا ہے کیونکہ زہد ترک دنیا نہیں بلکہ دنیا کو برتنے ہوئے اس سے ذہنی بے رغبتی اور اس سے لگاؤ کو خدا کی رضا جوئی کے تابع رکھنے

في شرح نهج البلاغة ١٤

کا نام ہے۔ زہد کی اس تعریف ہی سے وَ سَخَّرَ لَكُمْ مَافِي الْأَرْضِ جَمِيعًا اور لَنْبَلُوكُمْ أَتِيكُمْ
 أَحْسَنُ عَمَلًا کا مطلب واضح ہوتا ہے۔ اگر گھر کی ملکیت زہد کے معانی ہو تو نہ رسول اللہ
 مکان کے مالک ہوتے نہ صحابہ حالانکہ متعدد صحابہ تو غیر معتدل حد تک املاک اور نقد و فیس
 کے مالک تھے، ان میں حضرت عثمان، طلحہ، زبیر، سعد بن ابی وقاصؓ اور حضرت علیؓ
 کے خاندان کے نام بطور مثال پیش کئے جاسکتے ہیں۔ حضرت علیؓ کا یہ قول کہ شریح غور کرد
 کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ مکان تم نے اپنے روپے سے خریدا ہو جو تمہارا نہیں یا تم نے روپیہ
 ناجائز طریقہ سے حاصل کیا ہو“ شریح کی دیانت کو کسی قدر مشتبه کرتا ہے۔ ابن سعد نے
 ابولہب کی سند سے لکھا ہے کہ شریح کی تنخواہ حضرت علیؓ کے زمانہ میں ۵۰۰ درہم تھی جو اس عہد
 کے شرح تبادلہ سے تقریباً ۵۰۰۰۰ دینار کے مساوی ہوتی ہے، اتنی تنخواہ پانے والے کے لئے
 اتنی دینار کا مکان خریدنا کوئی مشکل بات نہ تھی اس کے علاوہ شریح کی سیرت میں رچی ہوئی
 خدا ترسی کا جو ریکارڈ ہمارے سامنے ہے اس سے جیسا کہ ہم آگے دیکھیں گے ایسے شہوں
 کا شانہ تک نہیں پیدا ہوتا۔

حضرت علیؓ کے بعد جب معاویہ کے عہد خلافت (۶۶۱ء تا ۶۸۰ء) میں زیاد بصرہ
 اور کوفہ کا گورنر تھا (۶۵۷ء تا ۶۸۰ء) شریح کی چند جھلکیاں پھر نظر آتی ہیں، یہ وہ زیاد ہے جس
 کو ایک عرصہ تک غلام ماں باپ کا لڑکا سمجھا جاتا تھا، اس کی ماں تو بالاتفاق غلام تھی لیکن باپ
 کے بارے میں دو رائیں تھیں ایک یہ کہ وہ عبید نامی غلام تھا دوسرے یہ کہ وہ معاویہ کا والد ابو سفيان
 تھا، زیاد چودہ سال کی عمر سے بصرہ میں کلرک، سکرٹری اور منتظم مالیات کے فرائض انجام
 دے کر مسئلہ میں حضرت علیؓ کی طرف سے باغی صوبہ فارس کا گورنر مقرر ہوا تھا مسئلہ میں
 معاویہ نے متعدد ثقہ شہادتوں کے پیش نظر ایک پبلک جلسہ میں اس کو اپنا بھائی تسلیم کیا اور
 اس کی غیر معمولی لیاقت انتظام و تدبیر سیاست سے متاثر ہو کر مسئلہ میں بصرہ کا گورنر مقرر کیا

نہم نہیں کو فہ کے گور ز منیرہ بن شعبہ کی وفات پر اس کو کو فہ کی حکومت بھی سونپ دی۔
حضرت عمرؓ نے اپنے عہد خلافت میں کئی بار زیاد کا امتحان لیا تھا اور اس کی قرآنی و فقہی فہمیت
سے اتنے متاثر ہوئے تھے کہ بصرہ کے اعیان کو اس کے مشوروں اور فیصلوں پر عمل کرنے کی
ہدایت کی تھی۔

نہم میں جب اس کو بصرہ کے ساتھ کو فہ کی گور زی دی گئی تو وہ چھ ماہ بصرہ میں
قیام کرتا اور چھ ماہ کو فہ میں۔ گور ز ہو کر جب وہ کو فہ آیا تو شریح کی جی کا ہر طرف شہرہ تھا ایسا
قابل اور راست باز حج پا کر وہ بہت خوش ہوا۔ بصرہ میں جہاں وہ حکم سے گور ز تھا اس
کو کامیاب حج نہیں ملے تھے اور اس وقت تک کئی حج بدلے جا چکے تھے۔ بصرہ کی آبادی
کو فہ سے زیادہ تھی اور وہاں کے انصافی مسائل کے لئے ہمیشہ لائق حج کی ضرورت رہتی تھی لیکن
کو فہ کو بھی شریح کے بغیر نہیں چھوڑا جاسکتا تھا، تاہم وہ اہل بصرہ کو ان کی سیرت اور راست باز
عقل کے جوہر دکھانا ضروری سمجھتا تھا چنانچہ وہ ان کو ساتھ لے کر بصرہ آیا اور ان کی جگہ ابن مسعود
کے حلقہ کے ایک فاضل کو جن کا نام مسروق بن اجدع تھا ان کا جانشین مقرر کیا۔

مصنف عقد الفرید ۳ (مصر ایڈیشن) لکھتا ہے کہ بصرہ آکر زیاد شریح کے ساتھ
مجلس قضا میں بیٹھتا اور کہتا: اگر میں ایسا فیصلہ کروں جو آپ کی رائے میں قرین انصاف نہ ہو
تو مجھے مطلع کیجئے گا۔ لیکن شریح کو اس سے اختلاف کرنے کی ضرورت پیش نہ آئی ایک
دن جماعت انصار کا ایک شخص آیا اور کہا: میں بصرہ اس وقت آیا تھا جب مکانات بنانے
کے لئے حکومت کی طرف سے دی ہوئی زمینیں موجود تھیں چنانچہ ایک قطعہ زمین پر میں
نے مکان بنانا چاہا، میرے چچا زاد بھائی پہلے سے مکان بنا کر آباد ہو چکے تھے، انھوں نے
کہا تم کہاں الگ رہو گے، ہمارے پاس ہی مکان بنالو، انھوں نے مجھے زمین دے دی اور
میں نے مکان بنالیا اور شادی کر لی۔ پھر شیطان نے ہمارے درمیان بھوٹ ڈالی اور انھوں
نے مجھ سے کہا کہ نکل جاؤ: یہ سن کر زیاد نے مدعی علیہم کو مخاطب کرتے ہوئے فیصلہ دیا۔ تم

کو نکالنے کا حق نہیں ہے جب خالی زمینیں موجود تھیں تم نے اس کو الگ مکان بنانے سے باز رکھا، تمہارے پاس ضرورت سے زیادہ زمین تھی وہ تم نے دے دی، اب جب کہ زمینیں ختم ہو چکیں تم اس کو نکالنے ہو اور نقصان پہنچانا چاہتے ہو، وہ گھر نہیں چھوڑے گا؛ شریح نے اس فیصلہ سے اختلاف کرتے ہوئے کہا یا مستعیر القدر اُس دُھار ہانڈی مستعار لینے والے ہانڈی لوٹا دے، یعنی زمین کا معاملہ اس ہانڈی کا سا ہے جو مستعار لی گئی ہو اور جس کا لوٹانا واجب ہو، زیادہ نے شریح کے اس قیاس کو غالباً قیاس مع الفارق سمجھ کر منظور نہیں کیا اور اپنا فیصلہ بحال رکھا۔ ان فیصلوں پر ابن سیرین (متوفی ۳۸۰ھ) جو شریح کے ہم عصر اور بصرہ کے ممتاز مفتی تھے تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: ”فیصلہ وہی ہے جو شریح نے کیا لیکن زیادہ کا قول مستحسن ہے۔“

شریح زیادہ عرصہ اپنے مستقر سے الگ نہ رہ سکے، ایک سال بعد ہی ان کو لوٹنا پڑا ابن زیاد سجال مصنف طبقات ۶/۱۰۰ کہتے ہیں: ”زیادہ شریح کو لے کر بصرہ سے آیا اور انھوں نے ایک سال تک ہمارے درمیان ایسا انصاف کیا جیسا ان سے پہلے یا بعد کسی نے نہیں کیا، اصابہ میں ایک دوسری سند پر بالکل یہی روایت پیش کی گئی ہے اصابہ کی ایک دوسری روایت کے مطابق شریح سات سال تک بصرہ کے قاضی رہے، لیکن اس کی صحت پایہ تحقیق کو نہیں پہنچ سکی ہے۔“

زیادہ کا ۳۸۰ھ میں انتقال ہو واجب وہ اپنے گرمی کے مستقر کوفہ میں تھا۔ اس کی انگلی میں ایک زہریلی کھنسی نکل آئی تھی جس کو کاٹنے کا طبیعوں نے مشورہ دیا تھا۔ زیادہ نے استصواب رائے کے لئے اپنے معزز اور مخلص قاضی شریح کو بلایا، انھوں نے جس دل میں تھکے دے انداز سے مشورہ دیا وہ سننے کے لائق ہے: ”مجھے اندیشہ ہے کہ آپریشن انگلی میں ہو اور اس کا اثر دل تک پہنچے اور آپ کی موت کا وقت آگیا ہو اور آپ انگلی کے کٹے خدا کے حضور میں حاضر ہو اور انگلی آپ نے خدا کی ملاقات سے بچنے کی خاطر کٹوائی ہو یا بصورت دیگر آپ کی موت کا

وقت نہ آیا ہوا اور انگلی کٹوا چکے ہوں اور بقیہ عمر بغیر انگلی کے زندہ رہیں اور آپ کے بچوں کو اس کا طعنہ دیا جائے؟ اس صاف مشورہ سے زیادہ کے دل کا تردد دور ہوا اور انگلی کٹوانے کا ارادہ اس نے ترک کر دیا۔ جب شریح محل سے باہر نکلے تو زیادہ کے بعض بدخواہوں نے ان کا مشورہ معلوم کر کے ملامت کی اور کہا: ”آپ نے انگلی کٹوائے کا مشورہ کیوں نہیں دیا۔“ یا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر زیادہ آپریشن کرالینا تو بچ جاتا اور طبعی موت مرنے اور بھنسی سے مرنے کی صورت میں اس کو شہادت کا درجہ حاصل ہوتا جو انھیں گوارا نہ تھا۔ شریح کی خدا ترسی بدخواہی کی تحمل کیسے ہوتی ان کا مختصر مگر جامع جواب تھا: ”المستشاس مؤثمت“، یعنی جس شخص پر بھروسہ کر کے مشورہ کیا جائے اس کو سزاوار نہیں کہ غلط مشورہ دے۔

۶۷ میں شریح کی ایک ہلکی سی جھلک بھر نظر آتی ہے۔ ۶۸ میں معاویہ کی موت اور یزید کی خلافت پر کوفہ میں بڑی شدت سے حضرت حسین کی خلافت کی تحریک اٹھی۔ شیعوں کے دفنان کے پاس مدینہ جلسے لگے اور وفاداری و جاں نثاری کے عہد و پیمان سے مملو آنے خط شیعہ لیڈروں کے ان کے پاس آئے کہ دو پھیلے بھر گئے، حضرت حسین اہل کوفہ کی اس بد عہدی کو نہیں بھولے تھے جس سے وہ ان کے والد اور بھائی کے ساتھ پیش آئے تھے اس لئے انھوں نے شیعوں کی وفاداری پر کھنا ضروری سمجھا اور اس مقصد کے لئے اپنے چچا زاد بھائی مسلم بن عقیل کو کوفہ بھیجا۔ مسلم مختار بن ابی عبید (متوفی ۶۸) کے گھر ٹھہرے اور حضرت حسین کے لئے بیعت لینا شروع کی جلد ہی بارہ ہزار شیعوں نے بیعت کر لی۔ یزید کو اس انقلابی تحریک کا جب علم ہوا تو اس نے کوفہ کے موجودہ گورنر نعمان بن بشیر انصاری کو جو اٹھتے ہوئے طوفان کا مقابلہ نہ کر سکے تھے ہٹا کر نصرہ کے گورنر عبید اللہ بن زیاد کو کوفہ کی امارت بھی سونپ دی، عبید اللہ مستعد حاکم تھا، وہ ڈاک کے گھوڑوں سے کوفہ آیا اور بغاوت کو دبانے میں لگ گیا۔

عبد اللہ شعی عرب سردار ہانی بن عروہ اور ایک دوسرے مقتدر لیڈر شریک بن عور کی بڑی عزت کرتا تھا، شریک بصرہ سے اس کے ساتھ آیا تھا وہ بظاہر عبد اللہ کا ہی خواہ لیکن دل میں اس کا دشمن اور اہل بیت کا دوست تھا، کوفہ آکر وہ ہانی کے گھر فرود کش ہوا جہاں مختار کا غیر محفوظ گھر چھوڑ کر مسلم پہلے ہی پناہ لے چکے تھے، یہاں وہ بیمار پڑا اور عبد اللہ نے اس کی عیادت کرنا چاہی۔ شریک نے یہ موقع غنیمت جانا اور مسلم کو عبد اللہ کے دوران عیادت میں قتل کرنے پر ہموار کر لیا۔ عبد اللہ آیا اور شریک کی مزاج پر سی کرتا رہا لیکن مسلم نے حملہ نہیں کیا۔ تب شریک نے ایسے زمریہ الفاظ نکالے جن سے عبد اللہ کے اردلی کو شبہ ہوا اور اس نے عبد اللہ کو اٹھنے کا اشارہ کیا اور وہ بخیریت محل لوٹ آیا اس کا ایک جاسوس شیعوں کے مجلس میں چھوٹا ہوا تھا، اس نے مسلم کی نیا مگاہ ادران کی جنگی تیاریوں کا مکمل پتہ چلا لیا، شریک تیسرے دن مر گیا عبد اللہ کو ہانی کی عذاری پر بہت غصہ آیا۔ اس نے ہانی کو بلایا اور گوہانی نے بہانے بنائے اور بالآخر ان کو آنا ہی پڑا، عبد اللہ کی مجلس میں اس وقت شریح موجود تھے، ہانی کو مخاطب کر کے عبد اللہ نے کہا: تمہیں معلوم ہے میرے والد نے کوفہ آکر تمہارے اور حجر بن عدی کے سوا سارے سرغنہ شیعوں کو قتل کر دیا تھا، پھر حجر کا جو حشر ہوا وہ بھی تم کو معلوم ہے، اس کے قتل کے بعد وہ ہمیشہ تمہارے ساتھ واداری اور حسن سلوک سے پیش آتے رہے۔ اس کا تم نے مجھے یہ صلہ دیا کہ اپنے گھر میں ایک شخص کو مجھے قتل کرنے کے لئے چھپا لیا ہے۔“ ہانی نے اس کی تردید کی۔ عبد اللہ نے اس جاسوس کو بلایا جو شیعوں کے مجلس میں ہانی کے گھر میں ہونے والی جنگی تیاریوں اور مسلم کے قیام سے واقف تھا۔ اس کو دیکھ کر ہانی کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ تاہم اس نے معذرت کی اور عبد اللہ کو یقین دلایا کہ اس نے جو کیا مجبوری کے تحت کیا پھر ان کی گفتگو نے درشتی کا پہلو اختیار کیا جس کی تفصیل طبری میں دیکھئے، اور ہانی نے سرکشی کی باتیں کیں جن سے عبد اللہ اتنا برہم ہوا کہ اس نے ہانی کے منہ پر خوب چھڑیاں ماریں جن سے وہ ہولناک ہو گیا۔ پھر اس

کو محل کے ایک کمرہ میں مقید کر دیا گیا۔ منٹوں میں ہانی کے قبیۃ مسند حج میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ ہانی قتل کر دیئے گئے اور وہاں کے جوان بھرے ہوئے محل کی دیوار تلے جمع ہو کر شور و غوغا مچانے لگے۔ اس موقع پر شریح سے زیادہ موزوں آدمی اس شورش کو فرو کرنے کے لئے نہیں تھا کیونکہ ان پر سب بھروسہ کرتے تھے، پولیس کے چند سپاہیوں کو ان کے ہمراہ کر کے عبید اللہؓ نے کہا آپ ہانی کو دیکھئے اور پھر لوگوں کو اطمینان دلاد دیجئے کہ وہ زندہ ہے۔ شریح کو دیکھ کر ہانی نے کہا: ”آپ میرے قبیلے کے لوگوں سے کہہ دیجئے کہ ساتھ لے جائیں ورنہ عبید اللہؓ مجھے قتل کر دے گا“ شریح لوٹ کر عبید اللہؓ کے پاس گئے اور کہا وہ زندہ تو ہے لیکن اس کے زخم بہت کاری ہیں۔ عبید اللہؓ نے پتہ بدل کر کہا: کیا آپ کو یہ بات ناپسند ہے کہ حاکم اپنی رعیت کو سزا دے، جائیے لوگوں کو مطلع کیجئے“ شریح اس نازک مشن سے اس طرح عہدہ برآ ہوئے کہ ایک لفظ جھوٹا ان کی زبان سے نہ نکلا۔ انھوں نے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا۔ یہ یہودہ خوف و ہراس کیسا، ہانی زندہ ہیں، حاکم نے ان کو مار کی سزا دی ہے جس سے وہ مرے نہیں ہیں لہذا آپ لوگ لوٹ جائیے اور اپنی شوریدہ ساری سے خود کو اور اپنے سردار کو خطرہ میں نہ ڈالیں۔ لوگ شریح کا یہ اعلان سن کر لوٹ گئے۔

۳۳۴ء میں یزید بن معاویہ کا جب انتقال ہوا تو عبید اللہ بن زیاد کو ذہ اور بصرہ کا گورنر تھا اس وقت اس کا قیام بصرہ میں تھا وہاں کے لوگوں نے نئے خلیفہ کے گورنر کے تقرر تک اس کو حاکم تسلیم کر کے اس کی بیعت کر لی تھی جس کو انھوں نے بہت جلد نوڑا اور عبید اللہؓ کی اتنی مخالفت بڑھی کہ اس کو بصرہ سے بھاگنا پڑا۔ اہل بصرہ کی بیعت کے بعد اس نے ایک وفد کو ذہ بھیجا اور وہاں کے لوگوں کو بھی نئے خلیفہ کے نامزدے تک اپنی بیعت کی طرف مائل کیا لیکن وہ نہ صرف یہ کہ تیار نہیں ہوئے بلکہ اس کے جانشین گورنر کو بھی نکال دیا۔

شام میں یزید کا لڑکا معاویہ خلیفہ ہوا، مگر میں پہلے ہی ابن زبیرؓ اپنی خلافت کا اعلان کر چکے تھے۔

لیکن بھرہ اور کوفہ کے لئے ان دونوں میں سے کسی کے گورنر مقرر نہیں ہوئے تھے اس لئے یہاں کا امن و امان سخت خطرہ میں تھا۔ مرکز خلافت کے نمائندہ کے تقرر تک کوفہ کے ارباب راتے نے عارضی طور پر عامر بن مسعود کو نماز جماعت کا امام تسلیم کر لیا تھا۔ اس حالت میں جب کہ شہر سے باقاعدہ حکومت اٹھ چکی تھی اور سیاسی مطلع ابراہیم کو تھا شریح منصب قضا سے دست بردار ہو گئے اور تقریباً دو سال تک رہے یعنی ۶۴ھ سے ۶۵ھ تک۔

۶۶ھ میں وہ پھر قضا کے کوفہ کے افق پر زور دیر کے لئے ابھرتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مختار بن ابی عبید اللہ بیت کے نمائندہ اور مظلوموں کے مددگار کی حیثیت سے ابن زبیر کے گورنر کو نکال کر کوفہ پر قابض ہوا اور خاص دعام کو خوش کر کے ایک مرکزی حکومت قائم کی اول اول وہ صبح شام خود مجلس قضا میں بیٹھ کر فیصلے کرتا لیکن حکومت کی بڑھتی ہوئی مصروفیتوں نے جلد ہی اس کو اس کام کے چھوڑنے پر مجبور کیا اور منصب قضا شریح کے سپرد کر دیا گیا، شریح نے شاید باور دل ناخواستہ اس کو قبول کیا کیونکہ ماحول حزبیت کے رنگ میں رنگا ہوا تھا، شیعیت پہلی بار فتح پا کر آپے سے باہر تھی کچھ ہی دن گزرے تھے کہ ان پر اعتراض ہونے لگا کہ وہ (۱) عثمانی ہیں۔

(۲) انہوں نے مختار بن عدی کے خلاف شہادت دی تھی (۳) ۵۳ھ میں جب مختار نے کوفہ میں بغاوت کر کے حکومت الٹا چاہی تھی۔

(۳) انہوں نے ہانی بن عروہ کا پیغام نہیں پہنچایا تھا،

(۴) ان کو حضرت علیؑ نے معزول کر دیا تھا یہ اشارہ ہے ان کی چالیس دن تک بانقیا میں بلاد طنی کی طرف شریح نے اپنی روح اور جسم کی سلامتی کنارہ کشی میں دیکھی اور مگر مجبور ہے مختار نے ان کی جگہ ابن مسعود کے پوتے عبداللہ کو قاضی مقرر کیا۔

اس کنارہ کشی کا خاتمہ حسب تفریح طبری ۵۴ھ میں ہوا غالباً دو سال بعد ان دو

سالوں میں اٹھارہ ماہ مختار کے دو اقبال اور شاید چھ ماہ کے لگ بھگ مصعب بن زبیری کی ولایت عراق (بصرہ و کوفہ) کے شامل ہیں۔ مصعب نے اپنے بھائی ابن زبیری کی طرف سے مختار کو شکست دے کر رمضان ۶۷ھ میں کوفہ پر قبضہ کیا تھا۔ ۶۸ھ سے ۶۹ھ تک جب انھوں نے استعفیٰ دیا ایسا معلوم ہوتا ہے وہ مسلسل قاضی رہے۔ طبری نے شرح کی کنارہ کئی جن سالوں میں پیش کی ہے (یہاں یہ واضح رہے کہ طبری بس اتنا ہی بتانے میں کہ کس سال کون کوفہ کا قاضی تھا) یعنی ۶۷ھ سے ۶۸ھ تک پہلی بار اور کچھ عرصہ قاضی رہنے کے بعد (مختار کے زمانہ میں) ۶۹ھ سے ۷۰ھ کے چند ماہ تک دوسری بار، ان کا موٹا حساب لگانے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ چار سال کے قریب معطل رہے۔ پیش نظر کتابوں میں ان کے تعطل کے بارے میں دو روایتیں ہیں: ایک یہ کہ وہ تین سال تک معطل رہے، یہ روایت طبری کی تاریخوں سے جو موٹا حساب بنتا ہے اس کے قریب تر ہے۔ کتاب المعارف، وفيات الاعیان، شرح پنج البلاغۃ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ وہ نو برس تک معطل رہے، یہ روایت طبقات ابن سعد ۶ کے ایک راوی نے پیش کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں: ”دورانِ فتنہ میں شرح ۹ سال تک بیکار رہے، نہ کسی کو خبر سناتے نہ کسی سے سنتے“ فتنہ سے مراد ابن زبیر اور اموی سرداروں کی خلافت کے لئے باہمی پیکار کا زمانہ ہے (۶۷ھ سے ۶۹ھ تک) اس رائے کو تقویت متعدد تاریخی اشاروں سے ملتی ہے لیکن جب تک قطعی شہادت فراہم نہ ہو اس پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔

زمانہ تعطل سے زیادہ مختلف فیہ مسئلہ ان کی مدتِ نقیض، بقا اور سنِ وفات کا ہے مصنف استیعاب اور شرح پنج البلاغۃ کی رائے میں وہ ساٹھ سال تک قاضی رہے مصنف معارف اور وفيات کی رائے میں پچھتر سال تک۔ طبری کی تاریخوں سے مدد لے کر جو نتیجہ نکلتا ہے وہ پہلی رائے کے حق میں ہے،

ان کی عمر کے بارے میں یہ رائے دی گئی ہیں: ۱۸۰، ۱۲۰، ۱۱۰ سال بسند رواۃ افغانی ۳۱

۱۶۸ سال بسند شرح ہیج البلاغہ، ۱۰۸ سال بسند راوی ابن سعدؓ، ۱۲۱ سال بسند راوی صاحب
 ۱۴۹، ۱۰۰ سال بسند استیعاب ماشیہ اصحابہؓ، ۱۲۰ سال بسند کتاب المعارف و تاریخ ابن اثیرؒ
 ان کے سن وفات کا مسئلہ عمر سے بھی زیادہ الجھا ہوا ہے۔ ذیل کے سن پیش کئے
 گئے ہیں سن ۸۵۹ یا ۸۵۸ بقول شعبی مطابق روایت افغانی ۱۴، یہی شعبی ابن سعد کی روایت
 کے بموجب سن ۸۵۸ یا ۸۵۷ سن وفات بتاتے ہیں، سن ۸۵۸ بسند اصحابہؓ، سن ۸۵۷ افغانی
 و طبقات بسند روایت آخر سن ۸۵۸ اصحابہ بسند راوی خلیفہؓ، سن ۸۵۲ اصحابہ بروایت ابن
 مدینی، سن ۸۵۹ یا ۸۵۸ تاریخ ابن الاثیرؒ۔

ان تفصیلات کے بعد اب ان کے وہ حالات و واقعات پیش کئے جائیں گے
 جو کسی گورنر یا خلیفہ کے عہد میں مقید نہیں بلکہ سارے دورِ قصار پر پھیلے ہوئے ہیں اور جن سے
 ان کی سیرت بحیثیت قاضی ان کے انصاف کے طریقوں اور انفرادی سیرت پر مزید روشنی
 پڑتی ہے۔

سیرت بحیثیت قاضی اور وہ بارش کے دن مجلس قضا کی بجائے گھر پر مقدمے سنتے تھے، اگرچہ
 انصاف کے طریقے لگتی یا غصہ آتا تو مجلس چھوڑ دیتے تھے۔

جب گھر سے عدالت کو جاتے تو یہ الفاظ کہتے جاتے: "جس نے حق مارا ہے اس
 کو حق لوٹانا ہوگا، ظالم سزا کا اور مظلوم کامیابی کا منتظر ہے۔"

وہ گواہوں کی شہادت پر ہی اکتفا نہ کرتے بلکہ مدعی سے حلف بھی لیتے تھے۔
 اس کا سبب غالباً یہ تھا کہ شہادتیں آسانی سے فراہم ہو جاتیں اور "إِذَا قُلْتُمْ فَاعْدُوا
 وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ" پر کم عمل ہوتا تھا۔ ظن و شک کی شہادت دینے والے سے کہتے تھے
 "خدا کے بندے مشکوک و منطون باتوں کو چھوڑ کر یقینی باتوں کا اتباع کرو خدا کی قسم اللہ کی
 رہنمائی کی خاطر مشکوک و منطون باتیں چھوڑ دینے سے تم کو نقصان نہیں پہنچے گا؟"

ان لوگوں کی شہادت قبول نہ کرتے: دشمن یا حریف مدعی، شریک مدعی، مشتبه شخص

قرض دار مدعی، غلام یا ملازم مدعی،

ایک شخص نے کسی معاملہ میں ان سے فتوے دینے کو کہا پوچھے: ”میں فتویٰ نہیں دیتا، انصاف کرتا ہوں“ اسی طرح وہ گواہی بھی نہ دیتے تھے، شبی نے بولشیر بن مروان کی ولایت کو فہ میں عدالت مظالم کے انچارج تھے ان کا یہ قول نقل کیا ہے: ”میں قاضی کے ساتھ شاید بتنا مناسب نہیں سمجھتا۔“

وہ ان لوگوں کو مجلس فقہاء سے نکلوا دیتے جو مدعی و مدعی علیہ کے ساتھ تماشادیکھنے آتے اور شور و شغب سے عدالت کے کام میں رخنہ ڈالتے؟

جب گواہوں کی عدالت پران کو شبہ ہوتا تو کہتے: ”میں نے تم کو نہیں بلایا اور اگر تم چلے جاؤ گے تو میں تم کو نہیں رد کروں گا، اس شخص (مدعی علیہ) کے خلاف فیصلہ مستلزم گناہ ہے، میں نہیں چاہتا کہ خدا کا عذاب تم پر نازل ہو سو اس کے عذاب سے بچتے رہو“ اگر اب بھی وہ گواہی دینے پر مصر رہتے تو اس شخص سے جس کے حق میں فیصلہ کرتے کہتے: گو کہ میں تمہارے حق میں فیصلہ کرتا ہوں مجھے معلوم ہے کہ تم ظالم ہو، میں اپنے حیل کے بموجب فیصلہ نہیں کر سکتا کیونکہ مجھے گواہوں کی گواہی کو پیش نظر رکھنا پڑتا ہے مگر اتنا واضح رہے کہ میرا فیصلہ تمہارے لئے اس چیز کو جائز نہیں کر سکتا (یعنی حق تلفی و ظلم) جو خدا نے تمہارے لئے حرام کر دی ہے، چاؤ میری یہ بات گرہ میں باندھ رکھنا“

وہ پہلے قاضی تھے جنہوں نے گواہوں سے خفیہ طور پر ان کی صداقت کی تحقیق کے لئے سوالات کئے کسی نے بطور اعتراض کہا: ابو اُمیہ (ان کی کینہ) یہ نئی بات کیوں؟ جواب دیا: لوگ نئی باتیں کرنے لگے (یعنی راستباز نہیں رہے) اس لئے میں بھی یہ نئی بات کرتا ہوں۔“

ایک شخص نے ان کے رشتہ دار کے خلاف عدالت میں چارہ جونی کی: انہوں نے اس کے (رشتہ دار) خلاف فیصلہ کیا اور حکم دیا کہ مجلس کے ستون سے باندھ دیا جائے

جب وہ مجلس سے اٹھ کر گھر جانے لگے تو وہ رشتہ دار رہائی کے لئے ان سے منت سماجت کرنے لگا۔ وہ بالکل متاثر نہ ہوئے اور یہ کہہ کر چلے گئے، میں نے تم کو سزا نہیں دی انصاف نے ہی ہے،

ان کے لڑکے ایک دن کہنے لگے: "میرا کچھ لوگوں سے مالی جھگڑا ہو گیا ہے، قصبہ یہ ہے اس پر غور کیجئے، اگر فیصلہ میرے حق میں ہو تو میں مقدمہ دائر کروں ورنہ نہیں" ^{قصبہ} شرح سن کر بولے "مقدمہ دائر کر دو" جب مقدمہ دائر ہوا تو انھوں نے اپنے لڑکے کے خلاف فیصلہ کیا، وہ بہت حیران ہوا اور گھر آ کر کہنے لگا: "خدا کی قسم اگر میں پیدے سے آپ کو مطلع نہ کر چکا ہوتا تو ہرگز آپ کو ملامت نہ کرتا یعنی یہ جانتے ہوئے کہ فیصلہ میرے خلاف ہے آپ نے مقدمہ دائر کرنے کا مشورہ کیوں دیا؟ آپ نے مجھے رسوا کر دیا" شرح نے ٹھنڈے دل سے کہا پیارے بیٹے تم مجھے سارے جہان سے زیادہ عزیز ہو لیکن خدا کی رضا جوئی مجھے ہر چیز سے زیادہ عزیز ہے۔ جب قصبہ تم نے پیش کیا تو مجھے اندیشہ ہوا کہ اگر میں نے بتا دیا کہ فیصلہ تمہارے خلاف ہے تو شاید تم مرنے کی مانی سے ان کا کچھ حق دہا کر مصالحت کر لو۔

ان کے ایک صاحبزادے کسی مجرم کے کفیل ہوئے اور اپنی ضمانت پر اس کو قید سے چھڑا لیا جھوٹ کر وہ الیا بھاگا کہ پھر ہاتھ نہ آیا، شرح نے صاحبزادے کو قید کر دیا اور صبح شام اس کے لئے گھر سے کھانا بھیجتے،

ان کی عدالت کے ایک اردلی نے کسی کے کوڑے مارے، ان کو جب اس زیادتی کا علم ہوا تو انھوں نے پٹنے والے سے اتنے ہی کوڑے اردلی کے لگوائے جتنے اس نے مارے تھے یہ

طرافت کے نمونے ایک شخص ان کی عدالت میں آ کر کہنے لگا: "میرا مقدمہ سینے" بولے: "کہو میں سنتا ہوں" نو وارد: "میں شام کا باشندہ ہوں" شرح: "بہت دور افتادہ ملک ہے

لے مذکورہ بالا تمام تفصیلات طبقات ابن سبک سے ماخوذ ہیں لے عیون لا جبار (۳) کے مصنف نے تصریح کی ہے کہ شخص عدلی بن ارطاة تھا۔

نودارد: میں نے آپ کے شہر میں شادی کر لی ہے۔“ شریح: خدا کرے تم اتفاق سے رہو اور بیٹے ہوں۔“ نودارد: میں بیوی کو شام لے جانا چاہتا ہوں۔“ شریح: مرد کو اس کا حق ہے۔ نودارد: شادی اس شرط پر ہوئی تھی کہ وہ اپنے وطن سے باہر نہ جائے گی۔ شریح: شرط پورا کرنا لازم ہے۔“ نودارد: آپ ہمارے درمیان فیصلہ کیجئے۔“ شریح: میں کر چکا۔“ نودارد: کس کے خلاف؟“ شریح: تمہاری ماں کے بیٹے کے خلاف۔“ نودارد: کس کی شہادت پر؟“ شریح: تمہاری خالہ کی بہن کے لڑکے کی شہادت پر۔

ایک عورت آئی اور رو رو کر اپنے مظالم کی فریاد کرنے لگی۔ اس کی آہ وزاری سے شریح بالکل متاثر نہیں ہوئے ایک شخص نے ان کی اس بے اعتنائی پر حیرت سے کہا:“ قاضی صاحب آپ کو اس عورت کی آہ وزاری کا کچھ خیال نہیں ہوتا؟“ بولے: جاءَ إِخْوَةُ يُوسُفَ إِلَى أَبِيهِمْ عِشَاءَ نَبُكُوتَ، (یوسف کے بھائی شام کو باپ کے پاس روتے آئے تھے)۔

ایک شخص نے درخواست کی کہ عبید اللہ بن زیاد (گورنر کوفہ و بصرہ) سے کسی معاملہ میں سفارش کر دیں۔ کہنے لگے عبید اللہ کے سامنے کس کی چلتی ہے؟ اتنے میں ایک چڑیاڑھی اس کو دیکھ کر بولے:“ عبید اللہ کے سامنے اس چڑیا کی مجھ سے زیادہ چل سکتی ہے۔ ان کا عدالتی لباس کڑھے ہوئے پالمین (رخت) کا گاؤن (مطر) تھا، کبھی کبھی غالباً سردی کے موسم میں بڑس (چادر) بھی استعمال کرتے تھے، طبقات کی متعدد روایتیں شہد ہیں کہ ان کا عدالتی لباس مطر تھا۔

ان کی ہر کے بارے میں اختلاف ہے ایک رائے یہ ہے کہ اس پر دو شیر کھدے تھے جن کے وسط میں ایک درخت تھا۔ دوسری رائے یہ ہے کہ اس پر لکھا تھا: انگور کی گمان سے بہتر ہے۔ تیسری رائے یہ ہے کہ اس پر شریح بن عارت یعنی ان کا نام کندہ تھا۔

لہ روایات الامانہ ۱/۲۲۲ لہ شرح نہج البلاغۃ ۲/۱۹۶ لہ طبقات ۲/۶ لہ عین الاخبار ۳/۱۱۲ لہ افغانی ۱۶

سیرت | مذکورہ بالا تفصیلات سے ان کی زندگی کے عام رجحان کی پوری وضاحت ہوتی ہے یہاں وہ حقائق بیان ہوں گے جو ان کی پرائیویٹ زندگی کے بارے میں دریافت ہوئے ہیں اور جن کو نظر میں لا کر ان کی سیرت کا تصور اور زیادہ نکھر جاتا ہے؟

سب سے پہلے ان کی ایک شادی کا ذکر سننے کے لائق ہے خود ان کی زبان سے اس کی تفصیلات پڑھ کر ان کی سیرت کے علاوہ اس زمانہ کی بعض رسموں کی بھی نقاب کشائی ہوتی ہے، شعبی (متوفی ۱۲۸۷ھ) کہتے ہیں مجھ سے شریح نے کہا کہ اگر تم کو شادی کرنا ہو تو قبیلہ تمیم کی عورتوں سے کرنا۔ میں نے اس کا سبب پوچھا تو کہنے لگے: ایک دن دوپہر کے وقت جنازہ دفن کر کے لوٹ رہا تھا کہ میرا گزر قبیلہ تمیم کے محلہ سے ہوا۔ ایک گھر کی ڈیوڑھی میں میں نے ایک عورت کو گدے پر بیٹھا دیکھا اور اس کے سامنے دوسرے گدے پر ایک بالغ لڑکی بیٹھی تھی جس کی پیٹھ پر بال لشکر رہے تھے میں وہاں گیا اور بچے کو کچھ مانگا عورت نے پوچھا: تم کیا چیز پسند کرو گے بنید، دودھ یا پانی؟ میں نے کہا جو تم آسانی سے دے سکو عورت نے آواز دی ان کو دودھ پلاؤ مجھے یہ پر دسی معلوم ہوتے ہیں؟ جب میں دودھ پی چکا تو میں نے لڑکی کی طرف دیکھا وہ مجھے پسند آئی میں نے عورت سے دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ وہ اس کی لڑکی ہے اور قبیلہ تمیم سے اس کا تعلق ہے دریافت کرنے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ کنواری ہے، میں نے کہا کیا اس کی شادی مجھ سے کر دو گی؟ بولی: ہاں اگر تم کفو ہوئے، اس کا ایک چچا ہے اس سے ملو، میں گھر آیا اور شہر (کوفہ) کے معزز قراء و دستوں کو بلا بھیجا۔ مسروق بن اجدع (متوفی ۱۲۸۷ھ) سلیمان بن صرد (متوفی ۱۲۸۷ھ) خالد بن عرفطہ (متوفی ۱۲۸۷ھ) عروہ بن مغیرہ (متوفی ۱۲۸۷ھ) ابو بردہ اشجری (متوفی ۱۲۸۷ھ) ان سب کو لے کر نماز عصر پڑھنے گیا۔ لڑکی کا چچا مسجد میں بیٹھا تھا اس نے پوچھا ابوامیہ آپ کیا چاہتے ہیں؟ میں نے کہا مجھے معلوم ہوا ہے آپ کی بھینچی کنواری ہے بولا حاضر ہے آپ کو چھوڑ کر اور کسی کو تھوڑی دی جاسکتی ہے، آپ اس کے لئے بے بہا

موقع میں اس نے مسجد میں میری شادی زینب (راکی کا نام) سے کر دی۔ میرے ساتھیوں نے دعاء برکت مانگی اور ہم لوگ چلے آئے، مگر پہنچتے پہنچتے مجھے مذامت نے گھیرا میرے دل میں برابر یہ خیال آ رہا تھا کہ میں نے ایسی قوم میں شادی کی ہے جو عربوں میں سب سے زیادہ اکٹھا اور بدتمیز لوگ ہیں جی چاہا کہ طلاق دے دوں پھر میں نے سوچا کہ اس کو آنے دوں، اگر ٹھیک ہوئی تو خیر ورنہ طلاق دے دوں گا۔

کچھ دن بعد دہن کے گھر کی عورتیں اس کو رخصت کرنے آئیں، جب گھر میں بٹھانی گئی تو میں نے اس کی پیشانی پر بکڑ کر برکت کی دعا مانگی پھر جب سب لوگ چلے گئے تو میں نے کہا: ”سنو! طریقہ یہ ہے کہ نکاح کے بعد پہلی بار جب بیوی خاوند سے ملے تو دونوں دو دو رکعت نماز پڑھیں اور خدا سے رات کے لئے خیر کی دعا مانگیں: ”یہ کہہ کر میں اٹھا اور نماز پڑھنے لگا: ”میں نے دیکھا کہ وہ بھی میرے پیچھے نماز میں مشغول ہے، جب میں نماز سے فارغ ہوا تو وہ لیٹ چکی تھی میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھائے تو وہ بولی ”ٹھہریئے“ میں ایک عرب عورت ہوں اور آپ میرے لئے اعلیٰ میں ہیں آپ کے مزاج اور اخلاق سے ناواقف ہوں، اس لئے آپ بتائیے کون سی باتیں آپ کو پسند ہیں اور کون سی ناپسند تاکہ میں ان سے باز رہوں“ میں نے کہا: ”تم بہت اچھی جگہ آئی ہو تم ایسے گھر آئی ہو جہاں تمہارا خاوند مردوں کا سردار ہے اور تم عورتوں کی، مجھے یہ یہ باتیں پسند ہیں اور یہ یہ ناپسند: بولی: ”آپ کو سسرال والوں کا یہاں آنا جانا پسند ہو گا یا نہیں؟“ میں نے کہا: ”میں قاضی ہوں اور اس عہدہ کی ذمہ داریوں کے پیش نظر ان کا زیادہ آنا جانا پسند نہیں کروں گا“ اس گفتگو کے بعد میں نے نہایت اچھی رات گزاری اور تین دن کے بعد مجلس نضا گیا ہماری ازدواجی زندگی کا ہر نیا دن گندے ہونے سے بہتر ہوتا۔

سال ختم ہونے پر جب ایک دن میں گھر آیا تو ایک بڑھیا کو گھر میں نصیحت کرتے دیکھا۔ زینب سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ اس کی ماں ہے میں نے سلام کیا اس نے مزاج بری

کی اور زینب کی بابت پوچھا۔ میں نے اس کی تعریف کی تو وہ بولی: ”عورت کا اخلاق دو حالوں میں بہت زیادہ بگڑ جاتا ہے: ایک جب وہ اپنے خاوند کی چہیتی ہو اور دوسرے جب اس کے لڑکا پیدا ہو اس لئے اگر آپ کو اس کی طرف سے شبہ پیدا ہو تو کوڑے سے خبر لیجئے گا، کیونکہ مرد کے گھر میں پھوڑ اور گستاخ عورت سے بڑی مصیبت کچھ نہیں ہو سکتی۔ میں نے کہا میں آپ کو اطمینان دلاتا ہوں کہ آپ کی لڑکی کی خوبیوں نے مجھے مار کی مشقت سے بچا لیا ہے وہ نہایت باتیز اور باادب عورت ہے۔“ لڑکی کی ماں ہر سال ہمارے گھر آتی اور ان باتوں کا اعادہ کر کے چلی جاتی۔

زینب پر مجھے صرف ایک بار غصہ آیا اور اس میں زیادتی میری ہی تھی میں اپنے کنبہ والوں کا امام تھا۔ میں نے اقامت نماز (خبر) کی آواز سنی، سنیتیں ختم کی ہی تھیں کہ ایک بچھو دیکھا اتنا دقت نہ تھا کہ اس کو مارتا (کیونکہ نماز تیار تھی) میں نے ایک برتن سے اس کو ڈھک دیا، دروازہ پر پہنچ کر میں نے زینب کو تالکید کی کہ میری واپسی تک برتن کو چھوئے چھڑے نہیں لیکن اس کو بچھو مارنے کی عہدی تھی اس نے برتن کو چھڑا اور بچھو نے اس کے ڈھک مار دیا میں نے اُکڑ دیکھا تو وہ بری طرح ٹپ رہی تھی، پھر کچھ نہ پوچھو شعی مجھے کتنا غصہ آیا اسی عالم میں اس کی انگلی پر نمک کا پانی گھستا، متوڑتین اور سورہ فاسخ پڑھ پڑھ کر دم کرتا۔ میرا ایک پڑوسی تھا جو ہمیشہ اپنی بیوی کو مارتا تھا، میں نہیں بتا سکتا مجھے یہ دیکھ کر کتنا دکھ ہوتا، اس مناسبت سے میں نے یہ شعر کہے ہیں: ترجمہ

میں دیکھتا ہوں کہ بعض مرد اپنی بیویوں کو مارتے ہیں۔ میرا سیدھا ہاتھ نسل ہو جائے جب میں زینب کو ماروں۔

کیا میں اس کو بے قصور ماروں۔ بے گناہ کو مارنا میرے لئے انصاف نہیں ہو سکتا وہ زیادہ تر با وضو رہتے تھے، اس کی تصدیق ابن سیرین کے اس قول سے ہوتی

مرنے سے پہلے انھوں نے وصیت کی تھی کہ ان کی موت کی کسی کو خبر نہ کی جائے، کوئی نوہ خواں عورت روٹی مٹی ان کے جنازہ کے ساتھ نہ چلے، نہ ان کی قبر پر چادر چڑھائی جائے، نیز یہ کہ ان کا جنازہ جلد قبرستان لے جا کر قبر میں دبا دیا جائے یہ

ابن سلمہ کہتے ہیں کہ ایک بار شرح نے درہم ڈرایا یا تو اٹھایا نہیں اور چلے گئے یہ وہ ہر موقع پر سلام میں خود سبقت کرتے تھے ان کے ایک ہم عصر نے کہا: مجھے شرح کو ان سے پہلے سلام کرنے کا کبھی موقع نہیں ملا، شرک پر ان کے سامنے آتا ہوتا تو دل میں کہتا اب میں سلام میں سبقت کروں گا، وہ مجھے دیکھ کر ذرا غافل ہو جاتے اور جب میرے قریب آتے تو سر اٹھا کر کہتے: السلام علیکم۔

شعبی کہتے ہیں کہ مشریح جب کبھی کسی سے ملنے تو پہلے خود سلام کرتے ہیں۔
ان کے گھر کے سب پر نالے ان کے گھر میں گرتے تھے، ان کی خداترسی کا اقتضا تھا
کہ ان کے پڑوسی کو ان کی ذات سے نہ کوئی تکلیف ہو نہ شکایت، پالتو بلی اگر مرجاتی تو اس کو
بھی گھر میں دفن کرتے تھے۔

فقہ و محدث سب اس بات پر متفق ہیں کہ وہ ثقہ تھے یعنی جو بات کہتے صداقت کے ساتھ کہتے جو کہ تے راستبازی کے ساتھ کرتے جب کہ پہلی صدی ہجری کے بہت سے مفتی و دینی لیڈر مثلاً شعبی، زہری اور سعید بن جبیر یا خود ان کے بعض قراء دوست مثلاً سلیمان بن صرد اور عروہ بن منیرہ نقادوں کے طعنوں سے نہ بچ سکے ان کا صاف نکل جانا ان کی سلامت نبوی کی بڑی شہادت ہے۔

ان کی سیرت کے ان تمام پہلوؤں کو جن پر پیش نظر تاریخ و ادب سے روشنی پڑتی ہے
جب ان کی ہم عصر آشفہ حال سیاسی، اجتماعی اور مذہبی پس منظر سے رحس کا مختصر خاکہ پیش ہو چکا ہے
ہے، ماکر دیکھا جاتا ہے تو ان کی سلامت روی، ان کی پُرعامیت طویلانی عمر ان کی ساڈسالاہی کا
ہر گھنٹہ اور ان کے مقبول خاص عام ہونے کا دار و مدار صرف دو باتوں پر نظر آتا ہے: خدائے ابرہی اور خدائے ابراہیم

طَبَقَاتُ

حکیم سنائی

مترجم

جناب انعام اللہ خاں صاحب نامہ

(ایڈیٹر روزنامہ المجتبیٰ دہلی)

یہ کتاب انسان کو بیانِ حکیمانہ اور بطریقِ صداقتانہ سے منزلِ تحقیق کی طرف بلاتی ہے۔
اس میں دس ابواب اور تقریباً دس ہزار اشعار ہیں
پہلا باب تقدیس و تجید و تعظیم باری تعالیٰ۔

(۲) لغت میں

(۳) صفتِ عقل کے بیان میں

(۴) نفسیتِ علم میں

(۵) عقل کے بیان میں

(۶) افلاک و بروج کے بیان میں

(۷) حکمت و افعال

(۸) عشق و محبت کے بیان میں

(۹) اپنے حال اور رتبہ کتاب کے بیان میں

(۱۰) بہرام شاہ اور قصبات اور مشاہیر غزنی کی مدح میں

حدیقہ کی تاریخِ تالیف کے متعلق اختلاف ہے کتب خانہ وزارت معارف (افغانستان)

میں عبداللطیف عباسی مرتب حدیقہ کا جو قلمی نسخہ موجود ہے اس میں تاریخ اس طرح

درج ہے۔

پنج و سی و چار رفتہ ز عام پنج صد و سی و پنج گشتہ تمام
محمد علی بن رقام شاگرد حکیم سنائی کے جمع کردہ قلمی حدیقہ میں جو مذکورہ بالا نسخہ سے
پہلے لکھا گیا ہے یہ بیت اس طرح لکھی ہوئی ہے

پنج صد و سبست و چار رفتہ ز عام پنج صد و سبست و پنج گشتہ تمام
بہر حال سنائی نے حدیقہ کو جب مکمل کر لیا تو غزنی کے بعض علماء شور مچانے اور
اس کتاب پر اعتراض کرنے لگے۔ حکیم ان باتوں سے سخت متاثر ہوا اور حدیقہ کا ایک نسخہ
دارالسلام بغداد میں بھیج دیا جو اس وقت خلافت عباسی کا مرکز اور علوم اور فنون کا مستقر
تھا ابراہان الدین ابوالحسن علی بن ناصر غزنوی کو ایک مکتوب منظوم تحریر کیا جس میں حقوق
محبت و رفاقت و یرینہ یاد دلا کر ظاہر مہنوں کے مظالم کی شکایت کی گئی تھی۔ برہان الدین
نے حدیقہ کو انجمن علمائے بغداد میں پیش کر دیا علمائے بغداد نے حدیقہ کو بنور مطالعہ کرنے کے
بعد حکیم سنائی کے عقیدہ کی صحت اور حدیقہ کی فضیلت کی تصدیق کر دی اس طرح حکیم سنائی
کو ظاہر مہنوں کے ستم سے نجات ملی۔

کتاب حدیقہ قدیم سے مشرق کے سخنوروں اور ادیبوں کی منظور نظر ہے خصوصاً حضرت مولوی
جلال الدین بلخی نے اپنی مثنوی میں چند مقامات پر اس کا ذکر کیا ہے اور اس کے اشعار کی
تشریح و تفسیر کی ہے نظامی گنجوی نے اپنی مخزن اسرار کو حدیقہ کا سمبر فرض کر کے اس پر فخر
کیا ہے۔

حدیقہ کی تدوین کتاب حدیقہ کو اول خود حکیم سنائی کے عہد میں محمد بن علی رقام نے جو حکیم صاحب
کا شاگرد تھا مرتب کیا اس پر دیباچہ لکھا اور کتاب کے آخر میں حکیم صاحب کا وہ خط بھی
نقل کر دیا جو انھوں نے غزنی کے ظاہر میں علماء کی شکایت میں بہرام شاہ کو لکھا تھا۔
حاجی خلیفہ نے کشف الطنون میں اس امر کی تائید کی ہے کہ محمد بن علی رقام نے حدیقہ

کو مدون کیا حدیقہ کو دوسری بار عبد اللطیف ابن عبد اللہ عباسی نے سال ۱۰۳۸ھ میں بمقام کابل مدون کیا اور چند نسخوں سے تصحیح کرنے کے بعد اس کا نام امام حدائق رکھا۔ تصحیح کے لئے جو نسخے عبد اللطیف نے جمع کئے تھے ان میں ایک ایسا نسخہ بھی تھا جو حدیقہ کی تصنیف سے اسی سال بعد لکھا گیا تھا۔ عبد اللطیف نے تصحیح کے بعد حدیقہ پر دیباچہ تحریر کیا اور عربی کے ان جملوں کی شرح جو حدیقہ میں مندرج تھے علیحدہ لکھ کر بصورت رسالہ مختصر کتاب کے آخر میں ملحق کر دی۔ دیباچہ منثور کو جو حکیم سنائی سے منسوب ہے کتاب کے اول میں رکھا لیکن تعجب ہے کہ عبد اللطیف نے حدیقہ کی اس ترتیب کا کوئی ذکر نہیں کیا جو محمد بن علی رقام نے کی ہے۔

۱۹۱۰ء میں ایک مستشرق نے حدیقہ کا ترجمہ فارسی سے انگریزی میں کیا اور اس کا دیباچہ بھی لکھا محمد بن علی رقام کے مدونہ حدیقہ اور مطبوعہ حدائق میں جزوی اختلاف ہے۔ اسی مقدمہ میں محمد بن علی رقام اپنے استاذ حکیم سنائی کا ذکر خیر اس ادب و احترام سے کرتے ہیں۔

”... ادو خواجه روزگار بود حکیم العصر۔ ملک الکلام محقق الانام۔ سلطان البیان۔ حجتہ الایمان شمس العارفین بدر المحققین۔ عالم الحقیقت۔ قوام الطریقت۔ سدید النطق۔ رفیع الہم۔ عزیز الوجود۔ عدیم المثل۔ محقر الدنیا۔ مقبل الدین۔ نظام النظم۔ مؤثر النشر۔ مآرج سید الانبیاء (رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) ذواللسانین۔ ابوالمجد مجدد بن ابی الحسن آدم السنائی الغزنوی رحمۃ اللہ علی علیہ و نور قبرہ کہ عالمیاں در حیات یاراحت اور روزگار خوش دلی می گذاشتند و در ہیئت نقد می بودند“۔

حدیقہ کے ظاہر میں مخالفین کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

”... از روزگار آدم تا روزگار او د سنائی ا کسے کتابے بدی سنق ساختہ بود مایہ جہانے است و پیرایہ عالمی آزادہ حقیقت و الشریعت و الطریقت نام کرد جاعے مخقر بے بصیرت ہر پیشہ۔ غول بیشہ کہ سرمایہ عقل و پیرایہ صبر نہ داشتند و از دایہ علم سیر نبودند میوہ از طبیدن گرفتند و آن موسسہ کہ در سہ صد و شصت و رگ

رگ ایشاں سید و شہست رہ دارند (ان الشیطان یجری فی عروق احد کمریحی الدم) تخم
دوسر در میان دل ایشاں بہاد و آں عزیز می گفت ولا تقر باھذہ الشجرۃ

انتخاب حدیقہ

آں شنیدی کہ گفت دمسازے باقرینے ازاں خود رازے
گفت کیں راز را نہ گوئی باز گفت خود کے شنیدہ ام نہ تو راز
شررے بود کز ہوا پڑ مرد از تو زاد آں زماں و در من مرد
باطن تو حقیقت دل نشت ہر چہ جز باطن تو باطل نشت
دیں ز دل خیزد و خرد نہ دماغ دل ز روز آمد و خرد جو چراغ
دیں نہ دارد کسے کہ اندر دل مرد را نیست مغر دل حاصل

آفتابے بہ باید انجسم سوز

بہ چراغ تو شب نہ گردد روز

کارنامہ بلخ | حکیم سنائی کی دوسری تصنیف کارنامہ بلخ ہے یہ مثنوی میں حدیقہ کے وزن پر ہے۔
چونکہ یہ تصنیف قیام بلخ کے دوران کی گئی تھی اس لئے اس کا نام کارنامہ بلخ رکھا گیا اس میں
حکیم صاحب نے بزرگان غزنی کے نام پیام بھیجا ہے۔ اس کا آغاز تمجید کے بغیر ایک خطاب
سے ہوا ہے جو ہوا کے نام کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں حکیم صاحب نے مسعود کی تعریف
کی ہے اس لئے یقیناً حدیقہ سے پہلے کی تصنیف ہے حدیقہ میں بہرام شاہ کی تعریف کی
گئی ہے مسعود بہرام شاہ سے پہلے وفات پا چکا تھا سنائی نے کارنامہ بلخ میں اپنے والد کا
ذکر بھی کیا ہے جو اس وقت بقید حیات تھے اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ کارنامہ بلخ دوسری
مثنویات سے قدیم ہے کارنامہ بلخ ۳ ہزار ۶۰ اشعار پر مشتمل ہے اس میں صرف ایک یادو
مقامات پر تصوف اور معرفت کا ذکر ہے کتاب کے عنوانات یہ ہیں۔

خطاب بہ باد۔ صفت فاندان محمود۔ صفت شاہزادگان۔ صفت ارباب قلم صفت

نقد الملک - صفت قلم - صفت پدر سائی - صفت شکریاں - صفت امیر صاحب - صفت
 امیر جواب - صفت امام یوسف حداد و سپراو - مثالب علمائے سور - صفت رباب طریقت
 - صفت شعرا - صفت سید شرف الدین - صفت امیر حسینی - صفت محمد
 افوی - صفت اسمعیل خجستہ - طبیعت بالغوی - صفت ابو حنیفہ اسکافی - صفت صابونی
 مثالب مدعیان - مدح امیر سید حسین بن علی - مناقب مختاری - صفت خواجہ موبد - صفت
 قاضی لطیف - صفت زرخ را - صفت عبدالحمید بلخی -

طریق تحقیق | حکیم سائی کی تیسری مثنوی طریق تحقیق ہے اس کتاب کے نام کے متعلق فرماتے ہیں
 داد ایزد شمار تو فیقش نام کردم طریق تحقیقش
 یہ مثنوی ۱۹۵۲ء میں حدیقہ کی تکمیل کے تین سال بعد تصنیف کی گئی ہے لیکن نہ
 حدیقہ میں طریق تحقیق کا ذکر ہے نہ طریق تحقیق میں حدیقہ کا - حدیقہ اور طریق تحقیق میں حکیم سائی
 نے ماحول اور زندگی کے متعلق جو تصور و خیالات ظاہر کئے ہیں ان میں بین فرق نظر آتا ہے
 اول یہ کہ حدیقہ بہرام شاہ کے نام پر لکھا گیا تھا - اور حکیم سائی نے اس میں اپنے معاصر علماء
 اور فضلاء کی مدح کی تھی اور اس بلند پایہ کتاب کو بہرام شاہ کے نام کے شایاں سمجھا تھا لیکن
 طریق تحقیق میں اپنے مجدد حنین باقی میں سے کسی شخص یا امیر کو اس لائق نہیں سمجھتے کہ کتاب
 اس کے نام سے منسوب کی جائے طریق تحقیق میں فرماتے ہیں میں نے یہ کتاب لکھنے
 کے بعد عقل سے پوچھا کہ اس عروس زیباکو کس کی مدح کے زیور سے آراستہ کروں اس نے
 جواب دیا کہ اس ملک میں کوئی صاحب دل نہیں جو اس کتاب کے اہد اکا سزاوار بنے -

خرد از گوشہ بر آمد چیست گفت این نقد را کہ رشتہ تست

سخن سرسری نمی بینم زان نگیں مشتری نمی بینم

فرید فرماتے ہیں

خود گرفتہ کہ آن سخن رانم کز عبارت نظر حاتم

دور چینیں روزگار با نفرت با چینیں منعمانِ دوں ہمت
چوں کم دیں ہمہ پریشانی در ثنار مدیح حسانی
بس ازیں وصف زلف و طرہ خال بس ازیں ہرزہ گفتگوئے محال
دوسرے یہ کطرق تحقیق کی تصنیف کے وقت حکیم صاحب پر تجرید و عزلت کی
کیفیت حدیقہ کے زمانہ کی نسبت زیادہ شدت سے وارد ہو گئی ہے زمانہ کی شکایت زیادہ
تلخی اور ملنڈ آہنگی سے کرتے ہیں اور ان کا دل مادیات سے سیر ہو گیا ہے نالائقوں کی صحبت
سے دل گرفتہ ہیں اور کسی کو اپنی مصاحبت اور ہمہی کے لائق نہیں سمجھتے۔ فرماتے ہیں

مہ کم با کہ اس سخن گویم گلہ از سجت یا ز چرخ کم
ہلرم خون گرفت نیست کسے کہ شود غمگسار من نفسے
من مسکین مستمند ضعیف با غم و مختتم ندیم و حریف
گلہ دارم ز روزگار بے کہ گویم کہ نیست ہم نفسے
جہد روئے زمیں بہ گردیدم ہمدے کافر م اگر دیدم
دوستے نیست کو شود محرم محرم نیست کو شود ہمدم
دل از جور چرخ جفت فناست کاندہیں روزگار قحط وفاست
طریق تحقیق بحالت پیری و زمیں گیری تصنیف کی گئی ہے فرماتے ہیں
نالام زان شدہ است اثر آہنگ کہ عنا قائم خمیدہ چو چنگ
روز عمرم بہ شب رسید و نبود جز تعب حاصلم ز چرخ کبود
دود دل جیب دامنم سوخت سقف چرخ آہ آتشیم سوخت
حکیم صاحب طریق تحقیق کی تصنیف پر مباحث کرتے ہیں اور اپنی اس کتاب کو تحفہ
ربانی اور اسرار روحانی کہتے ہیں۔

اس سخن تحفہ الیت ربانی رمز و اسرار ہائے روحانی

سننے ز آسماں بلند تراست تا نہ گوئی کہ نظم مختصر است
نظم لغزش ز نکتہ و امثال سحر مطلق دے مباح و حلال
اہل دل کیں سخن فرو خواند آستیں از جہاں بر افشانند
طریق تحقیق ۸ سو ۶۰ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں حکیم صاحب نے مراتب
سلوک و طریق عرفان اور مسائل اخلاق کی شرح کی ہے کتاب کی ابتدا حمد باری تعالیٰ
سے کی گئی ہے اور انتہا ظالموں کی مذمت پر درمیان میں کبھی کبھی اپنی پریشانی اور تنگدستی کا
ذکر بھی کیا ہے۔ اس کتاب میں آفتاب سے جو خطاب کیا گیا ہے خاقانی نے اس خطاب
کی تصنیف کی ہے طریق تحقیق بلحاظ سلاست و فصاحت ادبی اور عرفانی منشویات میں
شمار کی جاتی ہے۔

سیر العباد | سیر العباد حکیم سنائی کی مشہور منشوی ہے اس کی ابتدا میں ہوا سے خطاب کیا گیا ہے
یہ خطاب بلحاظ استعارہ و تشبیہ اور فصاحت ان کے بہترین قطعات میں شمار ہوتا ہے۔
اس منشوی میں مراتب سلوک و طریقت اور تہذیب اخلاق کی تشریح کی گئی ہے
ہوا سے خطاب کے بعد روح نامی اور روح حیوانی کی صفت بیان کی گئی ہے۔ سیر العباد |
محمد بن منصور کی مدح پر ختم ہو چکا ہے اس کتاب کے اشعار کی تعداد کے متعلق اختلاف ہے
قاضی عبداللطیف عباسی کے تدوین کردہ قلمی نسخہ سے بھی جو کتب خانہ وزارت معارف
افغانستان میں موجود ہے سیر العباد کے اشعار کی تعداد ۴۰۷ معلوم ہوتی ہے منصور بن محمد
کی مدح میں ۹ اشعار ہیں لیکن روایت نے مجمع الفصحا میں بیان کیا ہے کہ حکیم سنائی
نے سیر العباد مدح محمد بن منصور میں ۲۰۹ اشعار کہے ہیں۔

انتخاب سیر العباد | مرحبا سے برید سلطان و لش تخت از آب و تاجت از آتش

لے ابو الفاضل محمد بن منصور اس زمانے کے ایک بزرگوں میں سے تھے اور ان کا لقب مفتی مشرق تھا وطن ان کا خراس
نہا اور حکیم سنائی نے مدقہ میں ان کی ترقیف کی ہے۔

ذ از آب آب را نقاش نہ از خاک خاک را فراش
 اے بہنگام خوبی و زشتی سانی ابر و قاند کشتی
 باغ را ہم تو پشت دہم روی شاخ را ہم تو زوج ہم شوی
 آتش از تو جو بدیں خرمین آب با تو زمردیں خرمین
 کنی از جنبشے کہ خواہی تو روئے دریا تو پشت ماہی تو
عقل نامہ حکیم سنائی نے یہ مثنوی خدا سے شروع کی ہے اور اس میں توحید اور علم کلام کے
 مسائل مثلاً استواء اور نزول اور آداب پیری و مریدی اور اصطلاحات عوالم کا بیان ہے
 اس کے اشعار کی تعداد ۶۰۶ ہے طریق تحقیق کی مانند حکیم سنائی نے عقل نامہ میں بھی کسی
 امیر یا عالم کی مدح نہیں کی قناعت اور تجرید کو ہر ایک چیز پر ترجیح دی ہے۔ فرماتے ہیں
 ستابندہ را کہ بد باشد مدح مخلوق ذم خود باشد
 در ہمہ کارے یاری از خود خواہ دست ازیں ناکساں بکن کوتاہ
 مکن اسے دوست با خود این بیدار زان طلب کن از انکہ جانت داد
عقل نامہ میں انداز بیان حدیقہ۔ طریق تحقیق۔ اور سیر العباد سے بالکل مختلف ہے
 ان کتابوں میں ایک طرح آمریت اور حاکمیت پائی جاتی تھی لیکن اس مثنوی میں حکیم صاحب
 نرمی اور ملائمت سے باتیں کرتے ہیں اور اس کتاب کو علوم دنیا و آخرت کا مجمع اور غزالی
 کی کیمیائے سعادت اور احیاء العلوم کا مہر جانتے ہیں۔ کتاب کے آخر میں فرماتے ہیں
 کاندہیں نسخہ ہر کرا سمعست علم دنیا و آخرت جمع است
 ہر چہ در کیمیا و در احیا است با مزید دگر دریں ہای است
 کردہ صاحب نظر دریں حدقہ مشہدے چوں حدیقہ حدقہ
عشق نامہ حکیم سنائی نے اس مثنوی میں عشق حقیقی کی تعریف اور اس کے مراتب و عشاق کی
 صفت اور ان کے خصائل بیان کئے ہیں اور عشق و محبت کے حدوث و عدم پر بحث کی ہے

اور تو صیح مطالب کے لئے حکایات بھی بیان کی ہیں یہ مثنوی بھی وفاتر عشق و عرفان کے اہبات میں شمار کی جاتی ہے اس مثنوی کا اسلوب لطیف اور پیرایہ بیان حدیقہ کے بعد سبائی کے تبحر علمی اور قادر الکلامی کی ایک روشن دلیل ہے اس کا آغاز عشق کی تعریف سے ہوتا ہے اور اسی پر کتاب ختم ہوتی ہے قلمی نسخہ میں کل اشعار کی تعداد ۵۸۵ ہے

بہرام دہروز اس افسانہ کا موضوع دو بھائیوں کے عشق کے واقعات ہیں ان میں ایک کا نام بہرام اور دوسرے کا بہروز تھا یہ دونوں اپنی چچا زاد بہن کلچہر پر عاشق تھے۔

بہرام رند اور بد اخلاق تھا اور بہروز پارہ سادہ اور صالح حکیم صاحب نے اس افسانہ میں اچھے اور برے اخلاق کا نتیجہ دکھایا ہے۔ بیان کا اسلوب نہایت سادہ اور رواں ہے غرضی میں کلیدہ و منہ رودی کے بعد اخلاقی انسانوں کی نگارش کا سلسلہ بہرام و بہروز سے شروع ہوتا ہے اس کتاب میں بہرام کو جب بہروز یا کوئی اور شخص نصیحت کرتا ہے اپنے مطلب کی تائید کے لئے ایک حکایت بھی بیان کرتا ہے مثلاً نیکی اور حسن سلوک کی پاداش کے سلسلہ میں ایک چور کا واقعہ بیان کیا ہے کہ وہ ایک مکان میں داخل ہو گیا اور سہو آ ایک لقمہ کھا لیا لیکن صاحب خانہ کے اموال سے کوئی تعرض نہ کیا جب باہر آیا تو اس کے ساتھی نے سبب پوچھا اس نے جواب دیا میں نے حق نمک ادا کرنے کے لئے اس گھر سے کوئی چیز نہیں لی۔

ایک ظالم کی حکایت ظالم کی بد اسخامی واضح کرنے کے لئے یہ حکایت بیان کی ہے کہ ایک شہر میں ایک فقیر رہتا تھا وہ بھیک مانگنے کے لئے نکلتا تو دوسرے فقروں کے برخلاف ہمیشہ صید دیتا کہ جو اپنے لئے پسند نہیں کرتے وہ دوسروں کے لئے بھی پسند نہ کر دے اسی شہر میں ایک ظالم بھی رہتا تھا ایک دن فقیر نے اس کے دروازہ پر بھی یہی صدا دی۔ ظالم کو فقیر کی یہ بات سخت ناگوار ہوئی اس روز تو مال دیا دوسرے دن اپنے آدمی سے کہا کہ اس فقیر کو زہر ملا کر روٹی دے دو فقیر یہ زہر آمیختہ روٹی لے کر شہر سے باہر چلا گیا اور ایک دیوانہ میں سو رہا۔ اتفاقاً اسی ظالم

کے بیٹے اسی روز بھوکے پیاسے شکار سے تھکے ہوئے اس مقام پر آنکے جہاں فقیر سورا
تھا۔ فقیر کو بیدار کر کے اس سے روٹی لے لی اور کھاتے ہی مر گئے۔

پیرام دیہروز کے اشعار... ہم کے قریب ہیں۔

قصائد اکثر تذکرہ نگار کہتے ہیں کہ مثنویات کے علاوہ حکیم سنائی نے ۳۰ ہزار اشعار لکھے تھے
لیکن ان کے موجودہ دیوان میں صرف سب سے پہلے ہزار اشعار مندرج ہیں۔ مطبوعہ دیوان میں توحید اخلاق،
مدائح اور مرثی کے عنوانات سے جو قصائد موجود ہیں ان کی تعداد ۷۴۴ ہے تمام قصائد میں
بہتر وہ ہیں جو حکیم صاحب نے توحید اور مبارک کے موضوع پر لکھے ہیں ان کا ہر ایک
عرفانی قصیدہ توحید کا ایک دفتر اور معرفت اور فلسفہ کا گنجینہ ہے اکثر اسانذہ علم و ادب نے
ان قصائد کے بقیع میں خاصہ فرسائی اور طبع آزمائی کی ہے۔

یہ دعویٰ بلا خوف تردید کیا جاسکتا ہے کہ جو تاثیر حکیم سنائی کے عرفانی قصائد میں ہے
وہ شعرا میں سے شاذ ہی کسی کے کلام کو نصیب ہوئی ہے حکیم صاحب کو اس باب میں
دوسرے شعرا سے خاص امتیاز حاصل ہے اور ان کے شعرائے مابعد میں کسی کا کلام یہ خوش
عرفانی اور تجلی معرفت نہیں رکھتا۔ صوفیا میں اچھے اشعار اسی کے ہیں جس کا کلام شور انگیز
سوزندہ اور دردناک تر ہے۔ ایسا ہی کلام دل میں عشق اور سینہ میں طیش پیدا کرتا ہے سینے
والوں کو رلاتا ہے اور احساس میں شور برپا کرتا ہے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان ایک الہامی
شعر میں دنیا اور مافیہا سے مستغنی ہو کر عالم قدس میں پہنچ جائے۔ کبھی ایک نازیبا نہ عبرت
سے انسان اپنی ہستی ضعیف کو خوار ترین ذرات وجود کے مقابلہ میں ہیچ دیکھتا ہے اور
اپنے کو حقیر اور ناچیز سمجھتا ہے ہشاعر کبھی بوئے گل سے اسے مست کرتا ہے اور کبھی نالہ لبیل
سے محو فریاد بناتا ہے۔

اخلاقی شعرا میں اس کا شعرا چھاپے جس کا کلام زیادہ دل نشین حکمت آمیز اور مدلل ہو،
مسائل اخلاقی کو ایسے منطقی انداز سے بیان کرے کہ ایک اچھا شعر سننے والے کے دل کو شگ

بنا سکے اور تازیانہ اور ڈنڈے کے بغیر اس کے اخلاق کو آراستہ کر دے۔
 جس قدر اس کا طرز استدلال منطقی اور بیان بلیغ ہوگا اسی قدر تاثیر زیادہ ہوگی ایسا
 شاعر و زمرہ رونما ہونے اور مشاہدہ میں آنے والے واقعات سے عوام کی سمجھ کے مطابق
 اخلاقی دلائل اور موثر نصائح پیدا کر سکتا ہے

سنائی کے کلام میں یہ دونوں امتیاز پائے جاتے ہیں ان کے تمام عرفانی قصائد۔
 شورا نگیز اور اثر آفریں ہیں تمام اخلاقی قصائد حکیمانہ اور فیلسوفانہ ہیں سنائی کا ایک قصیدہ جس
 کا مطلع ذیل میں درج کیا جاتا ہے اہمیت قصائد عرفانی میں شمار ہوتا ہے اور اکثر اساتذہ نے
 اس کا استقبال کیا ہے۔

مکن در حسیم و جاں منزل کہ این دون است و آن والا
 قدم زیں ہر دو بیرون نہ اینجا باش و نہ آنجا
 ترک و تجرید کے بیان میں اسی قصیدہ کا یہ شعر خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔
 بہر چہ از راہ دور افتی چہ کفر آں حرف و چہ ایماں

بہر چہ از دوست و امانی چہ زشت آں نقش و چہ زیبا
 بے ثباتی دنیا بے ثباتی دنیا کے موضوع پر اکثر شعرا نے طبع آزمائی کی ہے لیکن حکیم سنائی اس باب
 میں دوسرے شعرا سے پیش پیش ہیں اور اس مسئلہ کو ایسے منطقی اور حکیمانہ استدلال سے
 بیان کرتے ہیں کہ سننے والا زندگی مستعار اور ہستی ناپائیدار سے دلگیر ہو جاتا ہے۔
 اسی موضوع پر فرماتے ہیں۔

گویی ز بعد ما چہ کنند و کجا روند فرزندگان و دخترگان یتیم ما
 خود یاد نادری کہ چہ کردند و چون شدند آں مادران و آں پدران قدیم ما
 یہ بات کہ ظاہر سنوں کی پیروی سے پرہیز کرنا اور تحقیق حق کے لئے جدوجہد جاری رکھنا
 چاہئے اس انداز حکیمانہ سے کہتے ہیں۔

مروبراہ ہر کورے اگر مردے برائیں ہاموں کہ گراہے بروں آئی بسے گمرہ تراز ہاماں
 نہ ہر آہو کہ پیش آید بود در ناف او ناف نہ ہر زندہ کہ می بینی بود در قالب جانان
 بسے آہو ست در عالم کہ شکش نیست دابن بسے شخص است در گیتی کہ جانش نیست در ابد
 اسی موضوع کو ایک جگہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

اندربں رہ صد ہزار ابلیس آدم رو تہمت تاجر آدم روے رازاں ہا بہ آدم نشمری
 شراب کی مذمت میں فرماتے ہیں۔

ترا ایزد ہی گوید کہ در دنیا مخور بادہ ترا ترسا ہی گوید کہ در صفر مخور حلوا
 نہ ہر دیں تو نہ گذاری حرام از حرمت یزداں ولیک از بہر تن مانی حلال از گفتہ یزداں
 دنیا پرستوں کی باہم آویزی کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتے ہیں۔

این جہاں ہر مثال مردار سیت کرگساں گرد او ہزار ہزار
 این مراں را ہی زند مخلص آں مراں را ہی زند منتقار
 آخر الامر بر بند ہمہ وز ہمہ باز ماند این مردار

موجودہ بین المللی تعلقات پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ مردار دنیا کے طلبکاروں
 کی آج بھی وہی حالت ہے جو سنائی کے عہد میں تھی۔

مدائح [قصائد مدحیہ] ارکان ہمہ شعرو شاعری میں شمار کئے جاتے ہیں بکلام پر شاعر کی قدرت اور
 طبیعت کی قوت مدائح سے معلوم ہو جاتی ہے اگرچہ مداحی شاعر کو اس کی معنوی اور اخلاقی
 عظمت کے بلند تاریخی مقام سے گرا دیتی ہے۔ حکیم سنائی کے قصائد بدیع مدحیہ بلحاظ مضامین
 خاص مقام رکھتے ہیں۔ حکیم صاحب فرخی اور عنصری کی پیروی کرتے ہوئے قصائد کو زیبا
 تشبیہوں اور دلکش استعاروں سے آراستہ کرتے ہیں۔

خواجہ اسد کی مدح میں لکھتے ہیں

کرد نو روز چو بتخانہ چمن از جمال بت و بالائے شمن

شد جو روئے صملاں لالہ لعل شد چو پشت شمنان شاخ سمن
 باغ شد چوں رخ شاہاں زکمال شاخ چوں زلف عروساں و فکمن
 ابر چوں خامہ خورجہ بہ سخا چوں دل خواہ بہار است چمن
 خواہ اسعد کی مدح میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں۔

گرچہ زہر درخت خوشی دید ہر دماغ در چند زائیں بہار بہا یافت ہر دیار
 لیک از بہار خرمی طبع نیست چوں خلق و طبع خواہ اگر نیستے بہار
اشعار حماسی | مخاطب کو بوسیلہ اشعار آتشیں جنگ کی ترغیب دینے اور آمادہ قتال کرنے سے
 شاعر کی قدرت کلام اور قوت طبع ظاہر ہوتی ہے اس باب میں شعرائے عرب شعرائے
 مشرق سے بازی لے گئے ہیں فارسی میں اشعار حماسی کا رواج دربار غزنی سے ہوا اعلیٰ حضرت
 مبین الدولہ محمود کی بارگاہ میں فردوسی نے پہلی بار اس مفاخرت کا علم بلند کیا۔
 حکیم سنائی نے بھی گاہ گاہ اشعار حماسی لکھے اور ان سے کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ
 ہوئے ایک قصیدہ میں بہرام شاہ کو حفاظتِ وطن اور حراستِ ناموسِ مملکت کی ترغیب
 دیتے ہیں اور ممدوح کو پوچھ مبالغوں سے مبتلائے غفلت کرنے کی بجائے سربازی اور
 فداکاری کے لئے آمادہ کرتے ہیں۔

چوں بہ زرد بے دلاں بہر شود از نام جنگ
 از قوی دست اجل گرد دامل را پائست
 بے مزاج گرمی و خشکی شود چوں باد و خاک
 ناگہاں شاہابوں نازی چو بر چرخ آفتاب
 چوں بہ زرد بے دلاں بہر شود از نام جنگ
 وز سبک دست قضا گرد دامل را تیر جنگ
 جان بے شخص از شتاب و شخص بے جان درنگ
 برفراز کوہ رنگے - ہم چو اندر کوہ رنگ
 حقیقہ میں ایک مقام پر ممدوح کو وطن کی عزت اور اقتدار خاندان محمودی کی حفاظت
 کی ترغیب دیتے ہوئے ان الفاظ میں شجاعت کا درس دیتے ہیں۔

ملک چوں بوستان نغمہ خوش تانہ گرید سناں چوں آتش

مکن از خون دشمن آلودہ تنہائے نیام فرسودہ
 من نہ گویم کہ تیغ بردوں زن گردن گردناں گردوں زن
 دشمنان را بریر پائے درآر گردن گردناں بدار بہ دار
 خصم خود را بہ تیغ بردر پوست کہ دو سر در یکے کلمہ نہ نکوست
 ننگ باشد یکے جہان دوشاہ ننگ باشد یکے سپہر دو ماہ
 خوشہ ملک پختہ شد ٹخو کن جامہ بخت کنہ شد نو کن

مراثی | مرثیہ گوئی بھی اجزائے اہم شاعری سے ہے۔ حکیم سنائی نے ہزرگان وطن اور دستوں کی وفات پر متعدد مرثیے لکھے ہیں ان میں امیر مغربی کا مرثیہ خصوصیت سے قابل ذکر ہے حکیم صاحب کے تمام مرثیے استادانہ اور سچتہ ہیں اور ان کی ترجیحات کو اس عہد کے بہترین مرثیوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

وصف مناظر طبعی | مناظر طبعی کا وصف شاعر کے شاہکاروں میں سے ہے قدرت کی زیبائی کو ضبط تحریر میں لانا۔ جمال و رعنائی کا سنات کا حفظ اٹھانا اور اپنے احساسات کو موزوں اور موثر الفاظ میں بیان کرنا شاعر کی طبیعت کے جوش اور اس کی قادر الکلامی کا ثبوت ہے۔ حکیم سنائی نے مناظر طبعی کے وصف میں نہایت لطیف اشعار لکھے ہیں۔

ایک اندھیری رات میں گھوڑے پر سوار ہو کر کوئے معشوق کی طرف روانہ ہوتے ہیں منزل مقصود پر پہنچنے تک جو کچھ پیش آیا اس کا حال سنئے۔
 یارب چہ بود آں تیرگی۔ داں راہ دور و نیم شب

از جان من یکبارگی۔ بردہ غم جاناں تعب
 گردوں چور و نئے عاشقاں در لوگوں گمنوں نہاں
 گیتی چور و نئے دلبراں پوشیدہ از غیر سلب
 حکم عنان در جنگ من سوئے نگار آہنگ من
 می بردہ شبنگ من گا ہے سرخ و کہ خیب
 باد بہاری خوشاں و۔ ناورد جولاں کیشاں
 صحر اوریا پیش اد چوں مہرہ پیش بوالعجب

آہو سر میں صرغام بر۔ کیوں منش۔ خورشید فر
خارا دل دسنداں جگر دین سم و آہن عصب
دلہاہ چوں شہرنگ جم۔ باشیر لودہ دراجسم
آموختہ جولاں در تخم۔ خوردہ ربیع اندر عرب
کوئے معشوق میں پہنچ کر حکیم صاحب کا گھوڑا سنبھاتا ہے اور کوئی استقبال کے لئے بتیابا
باہر نکل آتا ہے۔

آواز اسب من شنید آں ماہ پیش من دوید
وصل آمد و بھراں پرید آمد نشاط و شد کرب
گلزار سنائی میں گائے بھی ہیں | شاعر کا دل ایک صاف اور شفاف آئینہ ہے جو معمولی ناخوشگوار حادثہ سے
مکدر ہو جاتا ہے اور شاعر اس صدمہ کو عملاً دفع کرنے کی بجائے شعر کے چربے سے کام لیتا ہے
جو شاعر بر خند بگوید ہجا باند ہجا تا قیامت ہجا
حکیم سنائی کے کلام میں بھی ہجو بات پائی جاتی ہیں، شبلی نے اس پر اسنوس کیا ہے
کہ گلزار سنائی میں یہ کائنات کیوں اُگے؟ لیکن کسی مبالغہ کے بغیر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ کسی
شاعر کا کلام ہجو بات سے خالی نہیں رہو گی سے لے کر ہمارے زمانہ کے شرانگ سب کے
کلام میں ایسے اشعار موجود ہیں حکیم صاحب نے بھی جہاں لوگوں کے اخلاق کو مفاد عمومی کے
خلاف دیکھا ان کی مذمت کی۔

وحی الہی (جدید ایڈیشن)

تالیف

مولانا سعید احمد صاحب ایم۔ اے

مسند وحی پر ایک متفقانہ کتاب جس میں اس مسند کے تمام گوشوں پر ایسے دلپذیر
و دلکش انداز میں بحث کی گئی ہے کہ وحی اور اس کی صداقت کا ایمان افزو نقشہ آنکھوں
کو روشن کرتا ہوا دل میں سما جاتا ہے جدید تعلیم یافتہ حضرات کے مطالعہ کے لائق کتاب
کاغذ نہایت اعلیٰ کتابت نفیس طباعت عمدہ۔ صفحات ۲۰۰۔

قیمت سترہ روپے، مجلد للہ

قرآن مجید اور ترجمہ و تفسیر

از

(جناب خواجہ محمد علی شاہ صاحب)

جَمَعَ الْعِلْمُ فِي الْقُرْآنِ لَكِنْ تَقَاصَرَتْ عَنْهُ أَفْهَامُ الرِّجَالِ

یہ ایک مشہور شعر ہے اور اس شعر میں شاعر نے ایک نفس لامری حقیقت اور اپنے ایک واقعی تاثر اور صحیح جذبہ و خیال کو الفاظ کا جامہ پہنا کر حدیث نبوی رایت میں الشَّعْرُ الْحَكِيمُ کی صداقت کا ایک لطیف و نفیس اعلیٰ نمونہ پیش کیا ہے، محاکات اور شعر کے فطری اور نچرل ہونے کی دنیا کے شاعری میں اس سے بڑھ کر اور کیا مثال مل سکتی ہے، شعر اگرچہ شعری ہوتا ہے مگر شعر کا مضمون حقیقت پر مبنی اور حقانیت سے مملو ہونے کی بنا پر وہ شعر حقیقت کا شعور بن جاتا ہے صرف تخیل ہی نہیں رہتا، شعریت اور حقیقت کا حسین امتزاج ہو جاتا ہے۔

بے شک تمام علوم و معارف، ادراکات کلیہ و جزئیہ۔ اس ام الکتاب یعنی قرآن میں ہیں اجمالی اصول کی صورت میں موجود ہیں اور اولین و آخرین کے جمیع علوم کا خلاصہ صراحتہً یا اشارۃً اس امام حسین میں مذکور ہے اور یہ کتاب عزیز و مقدس تمام علوم دینی و دنیاوی، بدہی و نظری اور ادراکات ظاہری و باطنی اصولی و فروعی کی بنیاد و اساس ہے۔

اور یہ بھی درست ہے کہ اس کے علوم و حقائق حکم و بصائر لا محدود و لا محدود ہیں اور اس کی تعلیمات محض روحانی دائرہ تک ہی محدود نہیں بلکہ معاشرتی، تمدنی اور سیاسی جہات کو شامل و حاوی ہیں۔

دین و دنیا، معاش و معاد، زندگی اور موت کے ہر امر کے متعلق، تہذیب و اخلاق، تدبیر منزل، سیاست مدنی اور حکمت نظری و عملی کے ہر شعبہ کے بارے میں خدا کی مرضی اور

اس کا منشا معلوم کرنے اور خدا کا فضل، سعادت اور نجات حاصل کرنے کے لئے یہ کتاب مسبین انسانوں کو عطا کی گئی ہے۔

اس کی تلاوت، اس کا فہم اور اس پر عمل :- یہ تین چیزیں اس کتاب حق کے انزال و تنزیل کا اولین مقصد ہے۔

قرآن مجید :- تلاوت و قراءت، فکر و تدبر، ادرسی و عمل کی کتاب ہے، بنی نوع انسان کو علمی و عملی دستور العمل کے طور پر ملی ہے اور یہی تین چیزیں بحیثیت مجموعی اس کتاب غریزہ کا منشا و مقصد ہے۔

تلاوت الفاظ کی ہوتی ہے۔ فہم معانی کے ساتھ ہو یا بغیر فہم، برکت و فضل خداوندی کا سبب، اور معانی و مفاسیم کے ظہور و اظہار کا وسیلہ ہے۔

فکر و تدبر معانی میں ہوتا ہے، جو سعی و عمل کا مبداء اور اعمال و افعال کا معبود و محرک اور محدود و محدود ہے۔

ادب و عمل و فضل خداوندی کے ساتھ انسان کی فلاح و سعادت اور نجات کا ذریعہ ہے قرآن مکرم کے علوم و ادراکات، اعمال و اخلاق اور اس کے نور حکمت کو مشکوٰۃ نبوت سے اخذ کرنے میں حضرات صحابہ کرام دہل بیت عظام - تابعین - تبع تابعین - سلف صالحین - ائمہ خیر و ہدایت اور جمہور متبعین اسلام نے حسب مدارج و مراتب اپنے علم و عمل اور ہدایت و استقامت کے اعتبار سے نزول قرآن کے وقت سے اب تک جو حصہ لیا اور بے مثل و مثال نمونہ فہم و عمل پیش کیا ہے۔ وہ ”ذٰلِكَ الْكِتَابُ“ کی صداقت و ہدایت اور اس کے اعجاز و تاثیر کی لاریب و شک و اضمح و قوی دلیل ہے۔

اس کتاب سعادت کے نورانی لطائف و حکم، حقانی مضامین و مطالب، اور روحانی بصائر و مفاسیم کی جلوہ آرائیاں شریعت و دین کے عقلی و نقلی اصول کے مطابق ہر فرد بشر کے لئے جدا جدا ہیں۔ اور آیات کلام اللہ کی نورانی حقیقتیں اور نئے نئے مطالب ہر صاحب فہم

وَنظَرِ النَّاسِ كَمَا مَنَعْنِي نَعْمَةً مِّنْهُ أَنْ يَرَوْا بَطْنَ رَأْسِي وَلِيَحْكُمُوا بَيْنَ يَدَيْهِ إِنَّهُ لَعَلَّ الْفُجَّارَ لَغَافِلُونَ
 لَا يَقْنُتُ الْعَبْدُ حَتَّى يَرَى الْقُرْآنَ وَجُوهًا كَثِيرَةً (عین العلم محمد بن عثمان بن عمر البغوی)

مخدرات سرا پردہائے قرآنی چہ دلبرند کہ دل می برند نہانی
 کتاب نور در و عکس روئے اندازد جمالیات و ہمہ نطفہائے سبحانی
 کثرت تلاوت و قراءت اور تکرار ذکر و مداومت سے اس کتاب الہی میں پرمردگی، انشہائی
 اور ملالت پیدا نہیں ہوتی لَا تَخْلُتْ بِكَثْرَةِ التَّرَدُّادِ، وَلَا تَلْتَبِسُ بِهِ إِلَّا سِنَّةٌ،
 اور نہ اس کے حقانی علوم اور صحیح ادراکات کے احاطہ سے اہل علم کو کبھی کامل سیری
 اور سیرانی ہوئی ہے لَا يَشْبَعُ مِنْهُ الْعُلَمَاءُ وَلَا يُنْقِصُنِي عَجَائِبُهُ۔

قرآن مجید کی تعلیمات، عقائد و اعمال، اخلاق و آداب، عبادات و معاملات۔ بشری
 نفوس اور ارواح انسانی کی اصلاح و تربیت اور اس کے ظاہر و باطن کی تطہیر و تعمیر اور تزکیہ و
 تصفیہ کے لئے الہی و ربانی فیض کا ایسا سرچشمہ ہے جس کی سوتیں ہمیشہ اور ہر ایک کے لئے
 جاری رہتی ہیں۔

اس پر ایمان لانا، اس کی تصدیق کرنا، خلوص و اخلاص کے ساتھ اس کو قبول کرنا،
 محبت سے دل میں جگہ دینا اس کا پڑھنا سیکھنا اور تلاوت کرنا، اس میں تدبر اور غور و فکر کرنا
 اور اس پر عمل کرنا یہ سب باتیں جملہ انسانی افراد و اقوام کو شر سے خیر، ظلمت سے نور، جہالت
 سے علم اور منکالت و شقاوت سے ہدایت و سعادت کی طرف لانے والی اور علمی و عملی تدبیر
 تربیت کے طریقہ انسان کی انسانیت کو کمال سعادت اور نجات سے بہرہ ور کرنے والی
 ہیں۔ اِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِلْعَالَمِينَ لِمَنْ شَاءَ مِنْكُمْ اِنْ يَسْتَقِمْ،

عالم انسانی کے سب سے بڑے خیر خواہ، ہادی کائنات سید الموجودات صلی اللہ علیہ
 وسلم نے فرمایا

خَلِّكُمْ هَذَا الْقُرْآنَ، فَإِنَّهُ مَادَّةٌ ہوگو! قرآن کریم کو تلاوت اور فہم و عمل کے لئے،

اللہ فَمِنْ اَسْتَطَاعَ مِنْكُمْ اَنْ
يَاْخُذَ مَا دَبَّةَ اللّٰهِ فَيَفْعَلَ فَاَمَّا
الْعِلْمُ يَا تَعْلَمُ (جمع الفوائد ج ۱ ص ۱۷)

لازم پکڑ لو، یہ قرآن اللہ پاک کی ایک دعوت ہے
تم میں سے جو کوئی بھی خدا کی دعوت کو قبول کرنا چاہے
وہ قرآن کو لے لے۔ کیونکہ علم تو سیکھنے ہی سے

حاصل ہو سکتا ہے۔

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے مقدمہ موضح القرآن میں فرمایا ہے کہ: (حق تعالیٰ کے
غیر متناہی خزانے میں جس کو جس میں سے چاہتے ہیں حصہ معین فرمادیتے ہیں، اِنْ
مِنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَ نَاخِرَةِ اٰيٰتِهٖ وَمَا نُنَزِّلُهٗ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّا مَعْلُوْمٌ

بندہ نوازیاں تو یہ دیکھو کہ آدمی جزو ضعیف محرم اسرار کل ہوا
قرآن مجید کے فہم و تفہیم اور کتاب اللہ کے نظم و معانی پر نقد و بحث اور تدبر و تفکر
اور تفسیر کے قدیم و جدید ذخیرہ کتب سے دینی و علمی اور تاریخی و تحقیقی معلومات ہم پہنچانے
کا ایک بہت بابرکت موقع راقم الحروف کو حاصل ہوا تھا۔ وز ہوسٹل اور نیٹل کالج لاہور
میں ۱۹۴۶ء و ۱۹۴۷ء میں قیام رہا۔ اور کالج کے عربی پروفیسر، پنجاب یونیورسٹی کے عربی
ڈیپارٹمنٹ کے صدر ڈاکٹر برکت علی صاحب قریشی کی توجہات اور علمی فیضان شامل
حسب ذیل مضمون اسی وقت کالکھا ہوا ہے جس میں منطقی و علمی ترتیب اور جامعیت
و اختصار ملحوظ رہا ہے، یہ ایک ریسرچ ہے جس میں

درپس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند
انچہ استاد ازل گفت ہماں می گویم

کے مصداق، بادۂ قدیم زر ساغر نو کا نمونہ بصیرت افروز قلب و نظر کرنے کی سہی کی گئی ہے
علم کے عظیم تغیرات و حوادث کے سبب اب تک اصل مسودہ سے مبہضہ
کرنے کی نوبت نہ آئی تھی، گویا بقول خواجہ آتش،

بزمگ شمع ہم دل سوختوں سے بزم عالم میں
زباں کھولی، نہ لیکن بات کرنے کا محل یلایا

اسی وجہ سے یہ چند سطریں جو یادداشت کے طور پر لکھی گئی تھیں اب تک شائع

نہ ہو سکیں۔ اب ایک مناسب تہدید کے ساتھ مجلیہ دینیہ و علمیہ برہان

کے ذریعہ یہ معذرت کرتے ہوئے پیش کرتا ہوں کہ

زبان دہن میں تو غنجہ کے پی ہے کیا لازم کہ جس کے منہ میں زبان ہو سخنوری جانے
بعید کیا ہے کہیں اہل علم اس کو قبول خدا کے فضل سے مجھ کو یقین کامل ہے
یہ اس کلام کی تفسیری یادداشت ہے جو جلائے امینہ جاں ہے صیقل دل ہے

تمہید :- علم و معرفت انسان پر قدرت کا ایک وسیع اور عام نورانی فیضان و انعام ہے
اور اس کو جہالت و غفلت پر بہر حالت و نوع فضیلت و شرف حاصل ہے قرآن مجید
میں انسانی شرافت کو علم و فضل ہی سے وابستہ کیا گیا ہے اس شرافت و فضل کے
دور اندر سے تمام انسانوں کے لئے کھلے ہوئے ہیں، علم و عرفان کسی کی جدی میراث اور آبائی
ترکہ نہیں بلکہ ہر شخص بلا امتیاز نسل و قوم و رنگ و وطن اس شرافت و فضل کا حقدار ہے
الْحَمْدُ لِلَّهِ الْقَرَّانِ، خَلَقَ الْإِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ

اور یہ تو بالکل ہی ظاہر اور عیاں ہے کہ کوئی کام اور کوئی فعل و عمل بغیر علم و معلومات
کے نہ تو کیا جاسکتا ہے اور نہ انجام کو پہنچایا جاسکتا ہے اور علم بغیر فہم و عمل کے ایسا ہے
جیسے جسم بلا روح۔ علم کے لئے فہم ضروری ہے، اور چونکہ علم سے فہم و عقل اور سعی و عمل
کی توفیق ملتی ہے اس لئے تمام علوم خواہ وہ دنیا کے ہوں یا دین کے موجب سعادت
و صلاح اور باعث برکت و خیر ہیں۔

لیکن ان تمام علوم میں جو دنیا میں جاری اور رائج ہیں، علم الہی اور کلام ربانی بہر صورت
و حیثیت انسانی علوم اور بشری کلام سے ظاہر و باطن، نتیجہ و مقصد، اور فوائد و تاثیر ہر ایک
اعتبار سے احسن و اشرف اور اپنے منطوق و مفہوم، صورت و معنی، عبارت و اشارت
اقتصاد و دلالت ہر لحاظ سے افضل و اعلیٰ اور کَلَامُ الْمَلُوكِ مِلْكُ الْكَلَامِ کا حقیقی مصداق
ہے وَفَضْلُ كَلَامِ اللَّهِ عَلَى سَائِرِ الْكَلَامِ كَفَضْلِ اللَّهِ عَلَى خَلْقِهِ (اشہد بچہ ۱۳) وَحَسَنَ

الْحَدِيثُ كَلَامُ اللَّهِ :-

کلام الہی یعنی حضرات انبیاء و رسل علیہم السلام کے صحیفے اور کتابیں خواہ وہ سب ہم تک پہنچی ہوں یا نہ پہنچی ہوں اور چاہے ان میں کال بعض حصہ اپنی اصلی حالت پر باقی ہو یا کل کامل متغیر اور محرف و مبدل ہو چکا ہو۔ بہر کیف قرآن مجید ان سب سابقہ کتب و صحائف کے لئے ناسخ و مکمل اور ان سب کے علوم و نصائح، معارف و حکم اور تعلیمات و احکام پر مادی و مشتمل ہے اور ہر فرد بشر کی روحانی و جسمانی، دینی و دنیاوی، معاشی و معادی جملہ ضروریات و اقتضات کے لئے حامل و کافی اور بلا استثناء تمام عالم کے لئے سرچشمہ رشد و ہدایت اور فدیہ فلاح و نجات دنیا و آخرت ہے۔

اس کتاب عزیز کے بعد کوئی آسمانی یا الہامی کتاب عالم انسانی کے افراد و اقوام کی دنیاوی سعادت اور اخروی نجات کے لئے قطعی و یقینی حجت و براہان نہیں قرار دی جاسکتی۔ ذَلِکَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ، اِنَّ هُوَ الْاِذْ کُرِّ لِلْعَالَمِیْنَ۔

ہادی عالم صلی اللہ علیہ وسلم اسی قرآن مکرم کی سرمدی و لامہوتی آواز میں فرماتے ہیں وَأَوْحِیْ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاَنْذِرَکُمْ بِہٖ وَ مَنۢ بَلَغَ۔ اور میری طرف (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف) یہ قرآن اس لئے رحمی کیا گیا ہے کہ اس کے ذریعہ میں تمہیں اور ہر اس شخص کو ڈراؤں جس کو بھی یہ قرآن پہنچے (یعنی قیامت تک آنے والی نسل انسانی کو اس قرآن عزیز کے ذریعہ خدا کا خوف دلاؤں)۔

علم و تعلیمات الہی کا یہ خزانہ۔ خدا کی مخلوق کو ظلمت جہل سے نکالنے اور اس کے بجائے نور علم و قوت و توفیق عمل ان میں بھرنے کے لئے عطا ہوا ہے۔

قرآن پاک کی سب سے پہلی وحی، سورۃ اقراء کی ابتدائی پلچ آیتیں ہیں جن میں انسان کی پیدائش کا مقصد اور انسان کے اپنی زندگی اور موت میں عزت و اکرام پانے کو خدا پاک نے قرأت و علم یعنی پڑھنے، سیکھنے تعلیم حاصل کرنے اور جہالت کی تاریکی دور کرنے پر

موقوف قرار دیا ہے۔

جس سے یقینی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ علم و تعلیم قرآن پاک کے نزول کا سنگ بنیاد اور اساسی مقصد ہے۔

علم اپنی ذات کے اعتبار سے ایک متعدی امر ہے اور حق و حقیقت کی معرفت کے لحاظ سے ایک دائمی شے ہے۔ علم الہی حق تعالیٰ شانہ کی تجلی و تمثیل اور صفت نورانیت کا ظہور ہے اور مخلوق خدا کی جسمانی و روحانی جمیع سعادات کا ضامن و کفیل اِنَّ هٰذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ اَقْوَمُ

قرآن مکرم خدا کا ایک کلام ہونے کی حیثیت سے تمام فطری و الہی خوبیوں کا معدن ہے اور تمام قدرتی حکمتوں کا مخزن۔ اور چونکہ یہ مقدس کلام خدا پاک کا دائمی، انہی ابدی سرمدی اور ذاتی و نفسی کلام ہے اس لئے اس کے الفاظ و عبارت بھی خدا ہی کے ہیں اور معنی و مفہوم بھی اسی کی طرف سے ہیں۔ وَ لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا۔

اگر قرآن پاک کے لفظ و معنی دونوں خدا کی طرف سے نہ ہوتے تو تم اس میں کجہ نقلی و معنوی اختلاف پاتے اور نہ یہ کلام نقلی و معنوی تحریف و تبدل و تغیر سے محفوظ رہتا۔ مخلوق کا خواہ وہ فرشتہ ہو یا پیغمبر خدا کے اس پاک کلام اور اس کے مفہوم میں کوئی دخل نہیں، اس کی آیات کو (الفاظ و معانی کو) روح القدس اور روح الامین یعنی جبریل علیہ السلام نے ”لوح محفوظ“ کتاب مکنون“ اور ”امام مبین“ سے بعینہ و بحسبہ جوں کا توں نقل کر کے پیغمبر اسلام ہادی عالم فزدارین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا اور پھر ان سے سنا اور حضور نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تمام لوگوں کو جو صحابہ کے لائق عزت اور ممتاز نام سے پکارے جاتے ہیں تمام و کمال بسم اللہ سے من الجنتہ والناس، تک جو یہو اسی طرح پہنچا دیا جس طرح کہ انھیں پہنچا اور ملا۔ الفاظ و معانی دونوں کا مترل من اللہ ہونا

قرآن مجید کا وہ لفظی و معنوی اعجاز و کرامت ہے جس کی وجہ سے یہ کلام دائمی طور پر پورے جزم و یقین کے ساتھ عملی و عقلی اور روحانی معجزہ قرار پایا ہے۔
حق الامر یہ ہے کہ قرآن مجید کی روحانی عظمت، اور اس کی نوزانی حکمتوں کی کرامت و فضیلت کا اندازہ قلب بشری سے ناممکن ہے۔ لیکن آئے مشکوٰۃ نبوت کی روشنی سے سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے جو انوار و فیوض اس کتاب کریم کے بارے میں حاصل کئے ہیں۔ ان کو ہم ترمذی شریف سے نقل کرتے ہیں ذرا ان پر صدق دل اور خلوص نیت سے غور کریں اور اس روشنی میں اس حکم اور با حکمت کتاب کے اصل مرتبہ اور حقیقی درجہ تک پہنچنے کی امکانی سعی کریں۔

دل وہی دل ہے کہ جس دل میں اس کی لگن سر وہی سر ہے کہ جس سر میں ہو سودا اس کا سید الاولیاء حضرت علیؑ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضور بنی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ (عنقریب فتنے ظاہر اور برہان ہونے والے ہیں) حضرت علیؑ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ان سے بچنے اور محفوظ رہنے کی کیا سبیل ہے۔ ہادی عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کتاب اللہ یعنی قرآن مجید کو مضبوطی سے پکڑ لیا ان تمام فتنوں سے حفاظت کا سبب اور بچاؤ کا ذریعہ ہے۔ اس کے بعد حضرت علیؑ بھی کہتے ہیں کہ ہادی عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ ”

سیرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم

جس میں آسان اور دل نشین انداز میں سیرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اہم واقعات کو بیان کیا گیا ہے دورِ حاضر کی مختلف سیرت نبوی کی کتابوں میں جامعیت کے اعتبار سے امتیازی حیثیت رکھتی ہے

بلا جلد ص ۴

قیمت مجلد ۳۰/-

التقریظ والانتقاد

مختصر سیرت قرآنیہ سید محمد صلی اللہ علیہ وسلم

از

(سید احمد)

حضرت عائشہؓ سے پوچھا گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کیا تھے؟ فرمایا آپ کا خلق قرآن تھا ام المؤمنین کے ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ قرآن مجید تو وہ ہے جو ماہین الفتن مکتوب و محفوظ ہے لیکن اگر کسی کو قرآن کا عملی پیکر اور اس کی ایک زندہ و متحرک تصویر دیکھنی ہو تو آنحضرت کو دیکھے اسی بنا پر بعض علماء نے کوشش کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ کا خاکہ قرآن مجید کے موئے قلم سے تیار کریں۔ زیر تبصرہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کوشش ہے لیکن اس کے مرتب پروفیسر محمد احملاً صاحب نے اس میں سب سے ہی الگ ایک نئی راہ نکالی ہے یعنی ایک تو یہ کہ آپ نے قرآن مجید کا مطالعہ اس کے ترتیب نزولی کی روشنی میں کیا ہے اور دوسرے یہ کہ اگرچہ عنوان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ہے لیکن درحقیقت آپ کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ سیرت کی آڑ کے اسلام کی اصل حقیقت کو اپنی فہم و فکر کے مطابق بیان کر جائیں۔ کتاب ایک مقدمہ اور دس فصلوں پر مشتمل ہے مقدمہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ واقعات زندگی تاریخی ترتیب سے بیان کئے گئے ہیں جن کا تعلق زمانہ قبل بعثت سے ہے اس کے بعد دس فصلوں میں بعثت سے وفات تک کے واقعات کا اسی تاریخی ترتیب سے بیان ہے لائق مولا کا جذبہ محنت اور ذوق تحقیق لائق داد ہے جس کے باعث وہ ایک عمدہ از جناب محمد احملاً صاحب ایم۔ اے تقطیع متوسط کتابت و طباعت بہتر ضخامت ۲۷۱ صفحات قیمت شش ماہی ۱۰ روپے

عہد سے قرآن مجید کا مطالعہ ایک مخصوص زاویہ نگاہ کے ساتھ بڑے اہمیت سے کر رہے ہیں لیکن انہوں نے یہ کہ وہ اس مطالعہ کے بعد جن نتائج تک پہنچے ہیں ان میں سے اکثر ہمارے نزدیک غلط اور سخت گمراہ کن ہیں اس سلسلہ میں پہلی بات جو بنیادی طور پر یاد رکھنی چاہئے وہ یہ ہے کہ جس طرح ہر علم و فن کے چند اصول موضوعہ ہوتے ہیں جن پر اس علم و فن کے تمام کلیات و جزئیات اور اصول و فروع کی بنیاد قائم ہوتی ہے ٹھیک اسی طرح ہر مذہب کے بھی چند اصول موضوعہ ہوتے ہیں جنہیں اس کے تمام احکام و مسائل کے لئے اساس کا کام دیتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ اصول موضوعہ اپنی صحت کے لئے کسی عقلی استدلال و منطقی ثبوت کے محتاج نہیں ہوتے مثلاً عربی نحو میں یہ مسلم ہے کہ ہر فاعل مرفوع ہوگا اور ہر مفعول منصوب ہو اب اس کے ثبوت کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے بس یہی حال اسلام کے اصول موضوعہ کا ہے جن کا مانتا ہر شخص کے لئے خواہ موافق ہو یا مخالف ہر حال ضروری ہے ایک شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اصول موضوعہ میں سے کسی اصل کی مقبولیت کو بھی تسلیم نہ کرے یہ ایک الگ بات ہے۔ لیکن جہاں تک اسلام کا تعلق ہے وہ بغیر اس اصل کو مانے نہیں سمجھا جاسکتا اسلام کے اصول موضوعہ کیا ہیں؟ چند عقائد اور چند مخصوص عبادات جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم خاں صاحب کی سب سے بڑی فرد گزاشت یہ ہے کہ انہوں نے اس کتاب میں اسلامی عبادات کی کوئی اہمیت ہی نہیں دکھائی ہے۔ نماز کی حقیقت ان کے نزدیک تقریباً وہی ہے جو عیسائیوں کے ہاں پروردگار صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے یعنی ایک جگہ جمع ہو جانا اور کچھ دعا مانگ لینا۔ چنانچہ لکھتے ہیں قرآن نے بتایا ہے کہ اسلامی نماز یا دعا یا اللہ سے مدد مانگنے کا طریقہ یہ ہے کہ (الف) سولے اللہ کے کسی کو قادر نہ سمجھو۔ اس لئے اسی سے مدد مانگو۔ الخ (ص ۱۶۷)

اسی طرح فرضیت صیام کا بھی تذکرہ کیا لیکن اس طرح کہ گویا روزے ہنگامی حکام کے پیش نظر فرض کئے گئے تھے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اب وہ ہنگامی حالات نہیں

ہیں تو روزہ رکھنا ضروری بھی نہیں ہوگا۔ لکھتے ہیں

”روزہ کا مقصد ہی جہاد تھا یعنی جس طرح سرایا بھیج کر مشق کرائی جاتی تھی اسی طرح بھوکے رہ کر مشقت اور انفاق کی عادت ڈالی جاتی تھی مثلاً تھا کہ لوگ کم کھاتے اور جن سے ہو سکے وہ اپنے غریب ساتھی کو کھلاتے۔ مسلمانوں پر بعد ہجرت بہت ہی سخت زمانہ تھا۔ اور اس کے سوا چارہ نہ تھا۔“
پوری کتاب پڑھنے کے بعد یہ صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ جس طرح ہندو مذہب اور عیسائیت میں نیکی اور بدی کے متعلق چند مبہم اور گول گول سی باتیں ہیں یعنی یہ کہ خدا پرستی کرو۔ اور کسی کا دل نہ دکھاؤ۔ خاں صاحب اسلام کو بھی کھینچ تان کر اسی سطح پر لے آئے ہیں۔ حالانکہ اسلام ایک مکمل نظام زندگی اور بہرہ بہت کامل ایک دستور حیات ہے چنانچہ اسی جذبہ کے ماتحت انھوں نے سورۃ الفاتحہ میں نعید کے معنی میں بھی ایسا تصرف کیا ہے جو عربی کے قواعد کے لحاظ سے بالکل نادرست ہے موصوفی کے نزدیک نعید کا ترجمہ حسب ذیل ہے

”ہم سب مانتے ہیں کہ سوائے تیرے ہمارا کوئی آقا نہیں اس لئے ہم تیری بندگی کا اعلان کرتے ہیں اور ہم سب صرف تجھی سے مدد مانگتے ہیں (کسی دوسرے دیوتا وغیرہ سے مدد نہیں مانگتے اس لئے کہ وہ خود مخلوق ولا چار ہیں)“

سوال یہ ہے کہ عبادت کے معنی بندگی کا اعلان کرنا کون سی لعنت میں لکھے ہوئے ہیں۔ شاہراہ عام سے ہٹ کر اگر کوئی بات کہی جائے تو ضروری ہے کہ اس کے لئے دلائل و ثبوت فراہم کئے جائیں مگر افسوس ہے کہ خاں صاحب نے ترجمہ میں جگہ جگہ عجیب حدیثیں کی ہیں مگر حوالہ کہیں پر بھی نہیں دیا۔ مثلاً اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ کا ترجمہ یوں کرتے ہیں۔

”اے اپنے اس آقا کے نام سے وعظ و نصیحت دیا (حمد) شروع کر جس نے خلق کیا ہے اس لئے درجہ

کائنات) انسان کو انس (عقل) و محبت کا پتلا بنایا ہے۔ اے محمد تو یہ اعلان کر دے کہ تیرا آقا ہاں ہی کریم ہے... اس آقا کا کتنا بڑا کرم ہے کہ اس نے انسان کو علم حاصل کرنے کا آلہ (یعنی عقل) عطا فرمایا اور اس کے ذریعہ سے علم دیا۔ اب غور کیجئے قرآن کی صرف دو سطروں کا ترجمہ ہے لیکن کس قدر غور طلب ہے!

(الف) لائق مولف نے اِشْرَء کے معنی ایک جگہ وعظ و نصیحت شروع کرنا بیان کئے ہیں اور دوسری جگہ اس کے معنی اعلان کرنا بتاتے ہیں۔ جالانکہ قراءت عربی زبان کا کوئی غریب لفظ نہیں ہے جس میں زیادہ کنج و کاؤ کی ضرورت ہو ہر شخص جانتا ہے اس کے معنی پڑھنا ہیں اِشْرَء امر کا صیغہ ہے تو اس کے معنی ”پڑھ“ ہوتے جناب خاں صاحب کو اس کا بھی دھیان نہیں رہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اِشْرَء کے جواب میں ”لست بقارئ“ فرمایا تھا۔ اب اگر خالص صاحب کے بیان کردہ معنی ہی مراد لئے جائیں۔ تو ایک جگہ اس کا ترجمہ ہوگا ”میں وعظ و نصیحت یا حمد شروع کرنے والا نہیں ہوں۔ اور دوسری جگہ اس کا ترجمہ ہوگا میں اعلان کرنے والا نہیں ہوں“ خالص صاحب بتائیں کہ آنحضرت کا اپنے متعلق مذکورہ بالا دونوں باتوں میں سے کسی ایک بات کو فرمانا بھی صحیح ہے؟ ہرگز نہیں کیونکہ آپ وعظ و نصیحت اور حمد کرنے والے بھی تھے اور احکام خداوندی کا اعلان کرنے والے بھی (ب) خالص صاحب ”رب“ کے معنی آقا کرتے ہیں اور آقا بھی وہ جو ہر زمانہ میں خود غرض اور ظالم ہوتے رہے ہیں (ص ۳۷۳) لیکن یہ بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ اگرچہ لغوی اعتبار سے رب کے معنی آقا یا مالک کے آتے ہیں جیسا کہ خود قرآن میں ہے ”ہو رب کل شیء“ یا حدیث اشراط الساعۃ میں ہے ”وان تکلد الامۃ سربھا“ لیکن علمائے لغت کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ جب کبھی رب کا لفظ مطلق ہوگا تو اس سے خدا ہی مراد ہوگا۔ اور اس وقت اُس سے مراد ”پروردگار“ کے معنی ہوں گے۔ اگرچہ جو پروردگار ہوگا وہ مالک یا آفاض ہوگا۔ اور اگر رب کا اطلاق غیر اللہ پر ہو تو وہ لازمی طور پر مضاف ہو کر مستقل ہوگا اور اس وقت مضاف الیہ کے قرینہ سے اس کے معنی مالک یا آقا کے ہو سکتے ہیں مثلاً

اذا كان رب البيت بالطيل ضارباً فلا تلم الا اولاداً فیه علی الرقص
 یا مثلاً سرب الداسر - رب السجین - سربات الاحجال - سربات الخدوسر وغیرہ
 چونکہ سرب کا لفظ جب خدا کے لئے بولا جاتا ہے اس وقت اس کے معنی پروردگار
 کے بھی ہوتے ہیں اسی بنا پر ایک حدیث میں جو حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے آنحضرت
 صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کی ممانعت کی ہے کہ کوئی غلام اپنے آقا کو رب کہہ کر پکارے
 ظاہر ہے کہ اگر خدا پر رب کا اطلاق معنی مالک یا آقا ہی ہوتا تو ممانعت کی کوئی ضرورت نہیں
 تھی کیونکہ مالک یا آقا کا لفظ تو خدا اور وہ شخص دونوں پر بولا جاسکتا ہے۔

(ج) سب سے زیادہ غضب و سربك الاکرم الاية کے ترجمہ میں کیا گیا ہے
 خاں صاحب نے اِخْرَء کے معنی ”اعلان کرنا لئے اور و سربك الاکرم کو اس کا مفہول
 واقع کیا۔ حالانکہ و سربك میں واد حالہ ہے اور یہ پورا جملہ اِخْرَء میں جو ضمیر خطاب مستتر
 ہے اس سے حال ہے۔

(د) اسی طرح علق کے معنی النس و محبت کے مراد لئے ہیں حالانکہ خلق اس بات
 کا صاف قرینہ ہے کہ یہاں علق سے مراد دم جامد ہے علاوہ بریں قرآن مجید میں کئی ایک
 مواقع پر آیا ہے ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً ”تو کیا یہاں بھی علقہ کے معنی النس و محبت
 ہی کے لئے جاتیں گے پھر لائق مؤلف کو یہ بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ علق کے معنی اگرچہ
 محبت کے آتے ہیں لیکن وہ محبت جس کی بنیاد صنفی میلان پر ہو اور جس کو عربی میں ہوی
 کہتے ہیں۔ لسان العرب میں لحياتی کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ العلق الھوی یکون
 للرجل فی المرأة۔ چنانچہ کنیر غرہ کا شعر ہے

ولقد اسر دت الصبر عند فغانی علقٌ قلبی من هواک قدیم

(باقی آئندہ)

حالاتِ حاضرہ

اہم عالمی واقعات پر ایک منظر

از

(جناب سرار احمد صاحب آزاد)

کوریائی جنگ | تازہ ترین اطلاعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ کوریائی جنگ امروز فردا میں 'متارکہ' پر ختم ہو جائے گی۔ یہ جنگ ۱۹۵۰ء میں ۲۵ جون کو شروع ہوئی تھی اور اگر نڈکورد بالا اندازہ صحیح ثابت ہوا تو کوریائی کے باشندوں کو پورے تین سال کے بعد امن کی نصیب سانس لینے کا موقع نصیب ہو سکے گا۔ اور اس طرح دوسرے بین الاقوامی اختلافات اور تنازعات کو طے کرنے کے لئے زیادہ ہہمت اور فرصت مل سکے گی، لیکن اس اطمینان بخش اطلاع کے ساتھ یہ تشویش انگیز خبر بھی موصول ہوتی ہے کہ جنوبی کوریا کے صدر سنگمان ری اور ان کی حکومت نے اعلان کیا ہے کہ وہ خود کو متارکہ کا پابند نہیں بنائیں گے اور اگر شمالی کوریا اور ادارہ اقوام متحدہ کے مابین مفاہمت اور مصالحت ہو گئی تو وہ جنگ جاری رکھیں گے اور جنوبی کوریا کی فوجیں شمالی کوریا پر بلغا شروع کر دیں گی۔ پھر اسی قدر نہیں بلکہ جنوبی کوریا میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا ہے اور جنوبی کوریا کے جو امریکہ سے باہر گئے ہوئے ہیں انھیں واپس بلانے کے لئے احکام جاری کر دیئے گئے ہیں ان باتوں سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ صدر سنگمان ری نے اپنے اعلان کو عمل کی شکل دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

سنگمان ری کا مطالبہ یہ ہے کہ متارکہ سے قبل امریکہ اور جنوبی کوریا کے درمیان ایک میثاق دفاع ہو جانا چاہئے جس کی رو سے ————— امریکہ، جنوبی کوریا کو

کثیر تعداد میں اسلحہ اور سامان مہیا کرتا رہے۔ اگر کوریا پر حملہ کیا جائے تو امریکہ فوراً جنوبی کوریا کے
دوش بدوش کھڑے ہو کر حملہ آور کا مقابلہ کرے اور امریکی سہریہ اور فضائیہ اس وقت تک جنوبی
کوریا میں موجود رہے جب تک جنوبی کوریا میں اپنی مدافعت کی اہلیت اور قوت پیدا نہ ہو جائے
اس میں شک نہیں کہ کوریا میں جنگ شروع ہونے کی اطلاع کے ساتھ ہی اس
جنگ میں امریکی فوج کے حصہ لینے کی اطلاع بھی موصول ہوئی تھی لیکن ادارہ اقوام متحدہ
نے اس معاملہ کو اس درجہ سرعت کے ساتھ اپنا لیا تھا کہ ایک ہی ہفتہ میں یہ جنگ ادارہ اقوام
متحدہ اور شمالی کوریا کی جنگ منسوخ ہونے لگی تھی اور اب تک یہ جنگ شمالی کوریا اور اطوار
اقوام متحدہ ہی کی جنگ سمجھی جاتی ہے اس لئے اس سلسلہ میں متعدد سوالات پیدا ہوتے
ہیں مثلاً یہ کہ کیا جنوبی کوریا کو ادارہ اقوام متحدہ اور شمالی کوریا کے درمیان طے
ہو جانے والی شرائط متارکہ کی خلاف ورزی کا کوئی حق حاصل ہے اور اگر اسے اس قسم کا کوئی
حق حاصل نہیں تو خلاف ورزی کی صورت میں ادارہ اقوام متحدہ جنوبی کوریا کی حکومت
کے خلاف کیا کارروائی عمل میں لائے گا؟ اور کیا امریکہ کی طرف سے کسی ایسے ملک کی امداد
مناسب فعل ہوگا جو ادارہ اقوام متحدہ کے فیصلہ سے انحراف پر آمادہ ہو اور اگر امریکہ نے
سنگمان ری کو مدد دی تو کیا اس کا مطلب ادارہ اقوام متحدہ کے فیصلہ کی خلاف ورزی نہ
ہوگا اور اس صورت میں امریکہ کے متعلق ادارہ اقوام متحدہ کا رویہ کیا ہوگا؟

مذکورہ بالا سوالات کا صحیح جواب مستقبل ہی دے سکے گا لیکن یہاں اتنی بات
ضرور سمجھ لینی چاہئے کہ جس طرح کوریا کا میدان جنگ تین سال تک دو متضاد نظریوں اور
قوتوں کی کشمکش کا میدان بنا رہا ہے اسی طرح اس جنگ کا خاتمہ بھی دنیا کے امن خواہوں
جنگ بازوں کے ارادوں اور ادارہ اقوام متحدہ کے تدبیر کے لئے آزمائش کا ایک نازک
ترین دور ثابت ہوگا اور اس دور کے واقعات سے اس بات کا اندازہ کیا جاسکے گا کہ
امن پسند کون ہے اور جنگ باز کون نیز ادارہ اقوام متحدہ کس حد تک امن عالم کو برقرار

رکھ سکتا ہے۔

برمودا کا فحش عالمی تنازعات کو طے کرنے اور دنیا کو تیسری جنگ کے اندیشہ سے نجات دلانے
کے لئے دنیا کی بڑی طاقتوں کے مابین ایک کانفرنس کا انعقاد بنیادی حیثیت رکھتا ہے لیکن جنگ
کے اندیشہ سے نجات دلانے کے لئے دنیا کی بڑی طاقتوں کے درمیان مذاکرات بے حد ضروری
ہیں۔ لیکن مغربی جمہوریت پسندوں کے رہنما، کوریائی جنگ جاری رہتے ہوئے اس قسم کے مذاکرات
کو بے سود سمجھتے رہے ہیں اور اگرچہ برطانیہ کے وزیر اعظم سر ڈسٹن چرچل نے کم و بیش ایک ماہ قبل
اس بات کا اعلان کیا تھا کہ مشرق و مغرب کے مابین پیدا شدہ اختلافات کو دور کرنے کا وقت
آگیا ہے اور اب ہمیں سوویٹ یونین کے رہنماؤں کے ساتھ گفتگو کرنے کے لئے جلد از جلد
بڑی طاقتوں کی ایک کانفرنس منعقد کرنا چاہئے لیکن صدر آرن ہاور نے اس تجویز کو پسندیدگی
کی نظر سے نہیں دیکھا اور اس بات کو مناسب سمجھا کہ سوویٹ یونین کے رہنماؤں کے ساتھ
گفت و شنید سے قبل، برطانیہ، فرانس اور امریکہ کے درمیان تبادلہ خیالات کر لیا جائے۔ چنانچہ
ماہِ رواں کے اواخر یا آئندہ ماہ کے آغاز میں برمودا میں جو کانفرنس منعقد ہونے والی ہے اس
میں صدر آرن ہاور، سر چرچل اور فرانس کے وزیر اعظم شرکت کریں گے۔

آج سے چند روز قبل جب برمودا کا فرانس کے انعقاد کا اعلان کیا گیا تھا کوریائی جنگ
جاری تھی اور اس لئے یہ خیال کیا جاتا تھا کہ صدر آرن ہاور اس جنگ کے پیش نظر سوویٹ یونین
کے ساتھ گفت و شنید پر آمادہ نہ ہوں گے اور اس طرح سر چرچل نے جو تجویز پیش کی ہے وہ
یا تو بالکل ہی مسترد ہو جائے گی یا اسے ایسی شرائط کے ساتھ مشروط کر دیا جائے گا جو دنیا کی بڑی طاقتوں
کی کانفرنس کے انعقاد کو تقریباً ناممکن بنا دیں گی لیکن آج ایک طرف تو جنگ کوریائی کے ختم ہونے
کے قریب امکانات پیدا ہو گئے ہیں اور دوسری طرف وزیرائے اعظم دولت مشترکہ کی کانفرنس نے
سر ڈسٹن چرچل کی مذکورہ بالا تجویز کی تائید و حمایت کی ہے اس لئے اس امر کا امکان پیدا ہو گیا ہے کہ
کانفرنس میں سر ڈسٹن چرچل کی تجویز کو منظور کر لیا جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ دوسری عالم گیر جنگ کے بعد دنیا میں پہلی بار امن کی فضا پیدا ہوئی ہے اور اگر اس فضا کو قائم رکھا جائے

احبابِ کاشغری

غزل

از

(جناب انور صابری)

ہزار بار نشیمن بنے اُجڑ جائے
خزاں کے تلخ نتائج بھی ناگوار نہیں
خدا کرے کہ شریک مزاج گلشن میں
تمہارے در کے سوا جس کا سر اسی نہیں
قدم قدم پہ قیامت نفس نفس مشکل
اسی کو خاص ہوئی نسبتِ کرمِ حال
میں ایسی موت پہ کر دوں نثارِ عمرِ ابد
جنونِ شوق کی راہِ طلب بدل نہ سکی
میں سازِ عشق میں پہاں کچھ ایسے نغمے بھی
یہ دورِ ڈھال رہا ہے وہ پیکرِ انساں
بلاِ خلوص محبت سکوں ہے ناممکن
یہ بات آج کی دنیا کو کون سمجھائے

حیات اس کی ہے ننگِ حیاتِ انور
وہ آدمی جو غمِ زندگی سے گھبرائے

غزل

از

(جناب شائق میرٹھی ایم۔ اے)

اہل دل کیا کریں گے تدبیریں کھیلتی ہیں نظر سے تقدیریں
 اپنی ہستی پہ اک نگاہ تو ڈالیں ظلمتوں میں نہاں ہیں تنوریں
 خاموشی پر نہ جا مری ظالم میں نے چپ رہ کے کی ہیں تقریریں
 اور کیا ہے جہاں کے پردہ پر میری نظریں مہربانی تصوریں
 اب تو لگ جائے آگ ہی دل میں دیکھ لیں ضبطِ غم کی تاثیریں
 میں تو لک آہ کر کے ہوں خاموش اب کرے کون غم کی تفسیریں
 کہیں نہیں بلکہ ہو گئیں شائق
 میں کچھ ایسی بھی اپنی تفسیریں

شؤونِ علمیہ

پرواز کی تیزی | برٹش اور سیز ابرو زیر کارپوریشن کے صدر سرائلس ٹامس نے مشگونی کی ہے کہ لندن سے نیویارک تک کی مسافت جٹ طیارے، گھنٹے سے کم کی مدت کی پرواز میں طے کر لیں گے۔ اور خود کارپوریشن کے جٹ طیارے ۱۹۵۴ء میں ایسی پروازیں شروع کر دیں گے۔

پہلی بار شمالی بحر اطلانتک کو جٹ طیارے پار کریں گے اور خود کو نیو یارک کی لمبڈی پر پرواز کریں گے۔ اس لئے موسمی حالات کا مطالعہ زمینی حالات کے مطالعہ سے مختلف ہوگا۔ رازدار پر کافی توجہ کرنا پڑے گی۔

۱۹۵۵ء میں ایسا ہو جائے گا کہ ”دنیا کے گرد“ پرواز کرنے کے لئے ۲ سروسیں قائم ہو جائیں گی۔ سرائلس نے یہ بھی فرمایا کہ ایک کامٹ طیارے نے لندن سے ٹوکیو تک کی مسافت ۷ گھنٹہ ۵۴ منٹ میں طے کی اس سے صاف ظاہر ہے کہ برطانوی جٹ طیاروں سے دنیا کی کمر میں مٹی باندھنے کا منصوبہ کوئی خواب نہیں ہے۔

سائنس دانوں کی کمی | یہ ذکر ہندوستان کا نہیں ہے جہاں سائنس دانوں کی تعداد درود افروز سہی لیکن ضرورتوں کے لحاظ سے بہت ہی کم ہے۔ یہ ذکر فوٹنگلستان کا ہے جس کی نسبت یہ بھی گمان بھی نہ ہو سکتا تھا کہ وہاں سائنس دانوں کی کمی ہوگی لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہاں سائنس دانوں کی اتنی کمی ہو گئی ہے کہ حکومت کو کچھ نہ کچھ اس سلسلے میں کرنا پڑے گا۔ صنعتوں میں ملازمتوں میں اور جامتوں میں تربیت یافتہ سائنس دانوں کی مانگ ہے اور وہاں اتنے موجود نہیں۔

برطانوی وزارت رسد کے ایک افسر نے کہا کہ ”فنی آدمیوں کی کمی بہت سنگین ہو گئی ہے اور حالت ابتر ہوتی جا رہی ہے۔“

مسئلے نے پیچیدہ صورت اس لئے اختیار کر لی ہے کہ مدارس اور جامعات میں فنی مضامین کی تعلیم کے لئے استاد نہیں ملتے۔ ایسے استادوں کی کمی کو صرف برطانیہ ہی محسوس نہیں کر رہا ہے بلکہ تقریباً ساری دنیا میں سائنس دانوں کی طلب بڑھ رہی ہے۔

دولت مشترکہ کے جو ملک ہیں وہ برطانوی سائنس دانوں کو اپنے مشاہیر دیتے ہیں حتیٰ کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ نے برطانوی سائنس دانوں کو بڑے بڑے لالچ دئے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ امریکی شہریت بہت جلد ان لوگوں کو عطا کر دی جائے گی۔ اسی وقت کو رفع کرنے کے لئے لندن کے امپیریل کالج آف سائنس کو ایسا مرکز بنایا جا رہا ہے جہاں فنی آدمیوں کی تربیت کا انتظام ہوگا۔

اٹرن طشتریاں | سوئٹزرلینڈ کے ماہر ریاضی و موسمیات پروفیسر لوی نکولٹ نے ایک ملاقات میں یہ خیال ظاہر کیا کہ تیسری عالمگیر جنگ میں جوہری بموں سے زیادہ اٹرن طشتریاں حصّہ لیں گی۔ ان سے طوفان اور آندھیاں پیدا کی جائیں گی۔ تاکہ دشمن کو شکست دی جاسکے۔

کوئی ۲ برس اوھر سے اٹرن طشتریوں کا بہت چرچا رہا ہے۔ پروفیسر موصوف کا خیال ہے کہ یہ زمین ہی سے اٹھتی تھیں۔ ان کا مقصد موسمی حالات میں خلل پیدا کر دینا ہے۔

موصوف کا دعویٰ ہے کہ ان کو جو شہادت بہم پہنچی ہے اس سے انھوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ان طشتریوں کی ابتدا سوویٹ یونین سے ہوئی ہے۔ ان سے موسموں میں جو خلل پیدا ہوا ہے اس کی نظیر نہیں ملتی۔ چنانچہ برطانیہ، بلجیم اور ہالینڈ میں جو طغیانیات آئیں وہ موصوف کے نزدیک ان ہی طشتریوں کی کار فرمائی ہے۔ مزید شہادت یہ ہے کہ حال حال میں متعدد علاقوں میں غیر معمولی موسمی حالات پیدا ہوئے۔

اور سوویٹ یونین سے ان کے نزدیک طشتریوں کی ابتدا کی شہادت یہ ہے کہ ان علاقوں سے کسی طوفان خیزی یا طغیانی کی اطلاع نہیں آئی ہے۔

کوئی جنگ اگر چھڑ گئی تو موصوت نے پیش گوئی کی کہ اڑن طشتریوں سے یہ کام لیا جائے گا کہ وہ جوہری بم بردار ہوائی جہازوں کو طیران گاہوں سے نکلنے نہ دیں۔ اس کی صورت یہ ہوگی کہ اڑن طشتریاں اتنی تعداد میں روانہ کی جائیں گی کہ وہ زبردست طوفان پیدا کر دیں تاکہ طیارے زمین سے اوپر نہ اٹھ سکیں۔

جب ان سے سوال کیا گیا کہ پچھلے چند مہینوں میں کسی نے اڑن طشتری نہیں دیکھی ہے تو انھوں نے جواب دیا کہ ان کو اب اتنا مکمل کر لیا گیا ہے کہ وہ کوئی ۶۰ ہزار فٹ بلندی پر اس لئے ان کو زمین سے دیکھا نہیں جاسکتا۔

انگلستان کے ایک استاد ریاضی مسٹر کننگھم اسل نے پیش گوئی کی **پچاس برس بعد** ہے کہ سن ۲۰۰۳ء میں مدرسوں میں لڑکے پہاڑوں کی بجائے مشینوں کی مدد سے حالی سوالات کریں گے اور اقلیدس پڑھنے کی بجائے آئنسٹائن کا نظریہ ان کے مطالعہ میں رہے گا۔ ابتدائی درجوں میں کوئی مضامین مقررہ نہ ہوں گے۔ عددی کھیل زیادہ ہوں گے۔ پہاڑوں وغیرہ کا یاد کرنا غیر ضروری ہو جائے گا۔ اور ریاضی کی تقسیم حساب، الجبرا، ہندسہ اور مثلث میں نہ کی جائے گی۔ کسروں کی بجائے اعشاریہ کا دور دورہ ہوگا۔ شاید نصف یا ثلث کی کسریں رہ جائیں گی۔

ریاضی کے ہر کمرہ میں ایک شمارندہ مشین ہوگی اور لڑکے کا کام یہ ہوگا کہ جس حساب کی ضرورت ہو مشین کی مدد سے انجام دے۔

تیز رفتاروں اور خمی مسافتوں سے اس قدر تعلق خاطر ہو جائے گا کہ آئنسٹائن کا نظریہ پڑھنا ضروری ہو جائے گا۔ اور یہ بھی توقع ہے کہ شماریات اور جوہری انشقاق مدرسوں میں زبردست رہیں گے۔

تبصرے

ترجمان اسرار | از آنریبل مسٹر حبیب اللہ شیخ عبدالرحمن - تقطیع کلاں - ضخامت پونے دو سو صفحات - ٹائپ علی اور روشن - گٹ اپ خوبصورت اور جاذب نظر پتہ :- مکتبہ کارواں - ایک روڈ - انارکلی - لاہور - (پاکستان)

یہ کتاب ڈاکٹر سراقبال کی مشہور مثنوی اسرار خودی، کا اردو ترجمہ ہے۔ لائق مترجم کا شگفتہ و بختہ ذوق شعر و ادب اور قدرت کلام سزاوار تحسین و آفریں ہے کہ پنجاب کی عدالت عالیہ کے جج اور پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہونے کی دو گونہ مصروفیتوں کے باوجود ایسا عمدہ اور شگفتہ ترجمہ کیا ہے کہ اکثر جگہ ترجمہ نہیں معلوم ہوتا اور جگہ جگہ بے ساختہ ایسے اشعار قلم سے نکل گئے ہیں کہ بالکل اصل کا لطف آتا ہے مگر ان اشعار میں بھی اصل کلام اقبال کی اسپرٹ کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے۔ تاہم جیسا کہ شیخ صاحب نے خود سر آغاز میں کہا ہے کہ انھیں اطمینان سے ترجمہ پر نظر ثانی کرنے کا موقع نہیں ملا بعض بعض اشعار نظر ثانی کے محتاج ہیں مثلاً صفحہ ۲ پر ع کہیں روشن ہے جامِ جم سے میری خاک کی مٹھی " سے اصل مفہوم ادا نہیں ہوتا، یہاں بجائے روشن کے روشن تر " ہونا چاہیے " جیسا کہ اصل میں ہے پھر "مشت خاک" کا صحیح اردو ترجمہ "مٹھی بھر خاک" ہے نہ کہ خاک کی مٹھی، اسی طرح اصل مصرعہ "یوسف من بہر اس بازار نیست" کا ترجمہ "یہ وہ بازار ہے جو میرے یوسف کے نہیں شایاں" بھی غور طلب ہے اس میں اصل مصرعہ کا مفہوم متقلب ہو گیا ہے۔ صفحہ ۱۲ پر "قلم میرے نے راز نہ فلک سب کر دئے افشا"

ایک دہوی نثر ادا دیب کے قلم سے اچھا نہیں معلوم ہوتا " یہاں بجائے "قلم میرے

نے کے ”میرے خامہ نے“ بہت آسانی سے کہا جاسکتا تھا۔ یہ چند اشارات صرف اس لئے کئے گئے ہیں کہ آئندہ اڈیشن کے لئے فاضل مترجم نے ترجمہ پر نظر ثانی اطمینان اور یکسوئی سے کی تو امید ہے کہ یہ پھولوں کا دستہ اس طرح کے چند کانٹوں سے بالکل پاک و صاف ہو جائے گا۔ ترجمہ کے شروع میں اقبالیات اور فلسفہ کے مشہور فاضل ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب کا ایک طویل مقدمہ جس میں موصوف نے کلام اقبال کے مختلف پہلوؤں اور خصوصاً فلسفہ خودی کی اصل حقیقت و عظمت پر بڑی فاضلانہ اور سبزانہ گفتگو کی ہے اس حیثیت سے یہ مقدمہ خود ایک مستقل افادیت کا حامل ہے۔ امید ہے کہ ارباب ذوق اس کے مطالعہ سے محفوظ و شاد کام ہوں گے اور فاضل مترجم و مقدمہ نگار اور ناشر جنہوں نے بڑے استہمام سے اس کو شائع کیا ہے ان کی محنت و سعی کی داد دیں گے۔

رسالہ نور المعرفت تصنیف دلی شاعر ہندی مرتبہ ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی ایم۔ اے پی۔ ایچ۔ ڈی تقطیع متوسط کتابت و طباعت بہتر ضخامت ۳۲ صفحات قیمت عم پتہ:- انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹیٹیوٹ ممبئی

ہندوستان کی اسلامی تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ سلاطین گجرات نے اپنے پورے دو سو سال کے دور فرمانروائی میں اسلامی علوم و فنون کی جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں وہ دلی سلطنت اپنے چھ سو سال کے دور میں بھی نہیں کر سکی اسی کا نتیجہ تھا کہ صرف ایک احمد آباد میں عربی کے مدارس اور خانقاہیں اس کثرت سے تھیں کہ ایک شاعر کہتا ہے

مدارس درو بے حد و خانقاہ برائے مسافر کہ آید ز راہ
انھیں مدارس میں ایک مدرسہ مدد سہ ہدایت بخش کے نام سے تھا جس میں گجرات کے مشہور فاضل اور بزرگ مولانا شیخ نور الدین اور آپ کے بعد آپ کے بڑے صاحبزادے شیخ محمد عرف پیر بابا درس دیتے تھے اردو کے دور اول کے مشہور شاعر دلی کو جو پہلے دکنی کہلاتے تھے مگر اب گجراتی لکھے جانے لگے ہیں (چونکہ مولانا شیخ نور الدین سے بڑی عقیدت تھی اس لئے

انھوں نے حضرت شیخ کے نام کی مناسبت سے ایک رسالہ مدرسہ ہدایت بخش کی تعریف و توصیف میں لکھا تھا جس میں مولانا شیخ نور الدین کی مدح و منقبت کے ساتھ مدرسہ کی عمارت اس کی مسجد اور اس کے حوض وغیرہ کا تذکرہ ایک خاص شاعرانہ انداز میں کیا گیا تھا رسالہ اگرچہ مختصر ہے تاہم دلی کی فارسی انشاء پر دازی اور اس کے علم و فضل کا ایک بہترین شاہ کار ہے۔ لائق مرتب نے اسی رسالہ کو ایڈٹ کر کے اپنے ایک فاضلانہ مقدمہ کے ساتھ شائع کیا ہے۔ دلی کی ایک علمی یادگار ہونے کی بنا پر امید ہے ارباب ذوق اس کی قدر کریں گے

نشانی مفتی اعظم | مرتبہ مولانا ابو الخیر محمد ادریس نسیم دہلوی - تقطیع جیبی - کتابت و طباعت بہترین ضخامت ۳۲ صفحات - قیمت درج نہیں شاید ۴ روپے - بذریعہ

امروہوی - دارالکتابت گلی راجان فرشتخانہ دہلی - مولانا ابو الخیر محمد ادریس فن تاریخ گوئی کے مسلم اللہ استاد اور ماہر ہیں۔ موصوف نے حضرت مفتی محمد کفایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے حادثہ وفات سے متاثر ہو کر کم و بیش ایک سو مادے تاریخ وفات کے نکالے تھے جو عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں ہونے کے علاوہ عجیب و غریب قسم کی مختلف صنعتوں میں بصورت قطعات یا عبارت ہائے منظوم و منثور پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ کتابچہ انھیں کا دل پسند مجموعہ ہے، جو حضرات اس فن کا ذوق رکھتے ہوں انھیں کم از کم ایک مرتبہ فن کے اس حیرت انگیز نمونوں کو دیکھ کر لائق موعظ کی لیاقت و محنت اور کمال و ہنرمندی کی داد ضرور دینی چاہئے۔

شرق اوسط میں کیا دیکھا؟ | از سید ابوالحسن علی صاحب ندوی - تقطیع خورد ضخامت ۹۴ صفحات - کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد عم، سہتر:-

مکتبہ تعلیمات اسلام نمبر ۳۸۷ امین آباد پارک لکھنؤ۔

یہ ان چند عربی تقریروں کا اردو ترجمہ ہے جو سید ابوالحسن علی صاحب ندوی نے شرق اوسط کے سفر سے واپس آکر دہلی ریڈیو اسٹیشن سے عربی پروگرام کے سلسلہ میں نشر کی تھیں یہ سفر نامہ نہیں بلکہ صرف ان طبعی تاثرات کا ایک بیان ہے جو مصر شام و فلسطین وغیرہ میں گھومنے

کے بعد لائق سیاح کے دل و دماغ پر طاری ہوئے علاوہ بریں ان ملکوں کے چند نامور علما اور ارباب اثر و رسوخ حضرات کا تذکرہ بھی ضمیمہ آگیا ہے؛ کتاب دلیخسپ لائق مطالعہ و تحقیق

(۱) فقہ نظامی تقطیع خور و ضخامت

از جناب مولانا ابوبکر خطیب دہلی

قیمت کسی ایک کی بھی درج نہیں

پتہ: مدرسہ حاجی احمد بن محمد لکھنؤ

مرحوم ڈیرن ٹال (جنوبی افریقہ)

۱۱۲ صفحات

(۲) عربی اردو نظامی قاعدہ

جدید حصہ اول و دوم مکمل ضخامت ۸۸ صفحات

(۳) سیرت محبوب رب العین

ضخامت ۸۰ صفحات

پہلے رسالہ میں نماز۔ روزہ۔ زکوٰۃ اور حج اور ان سے متعلقہ امور کے احکام و مسائل عام فہم اور سادہ زبان میں بصورت سوال و جواب بیان کئے گئے ہیں دوسرے رسالہ میں ایک نئے طریقہ پر سچوں اور بچیوں کے لئے قاعدہ اس طرح پر لکھا گیا ہے کہ اس کو پڑھ لینے کے بعد سچے کو عربی حروف کے ساتھ ساتھ اور حروف پڑھ لینا بھی آسان ہو جاتا ہے اس میں تین فصلیں اور ۳۹ اسباق ہیں جن میں حروف کی شکلیں اور قواعد بیان کئے گئے ہیں اور فصل سوم میں دینیات کے مسائل کا بیان ہے تیسرا رسالہ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے آسان اردو میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں بصورت سوال و جواب لکھا گیا ہے تینوں رسالے اس لائق ہیں کہ بچوں اور بچیوں کے مکاتب کے نصاب میں ان کو شامل کیا جائے۔ ان سے خاطر خواہ فائدہ ہوگا!

مرتبہ جناب افضل حسین صاحب ایم۔ اے

بی۔ ٹی تقطیع خور و کتابت و طباعت بہتر اور

دیدہ زیب حصہ اول و دوم کی قیمت ۳ روپے

حصہ چہارم کی ۵ روپے؛ مکتبہ جماعت اسلامی ہند لکھنؤ

اخلاقی کہانیاں حصہ اول و دوم ہر ایک

کی ضخامت ۳۲ صفحات

اخلاقی کہانیاں حصہ چہارم ضخامت

۸۴ صفحات

ہندوستان کی جماعت اسلامی نے رام پور کو اپنا مرکز بنا کر وہاں مسلمان بچوں کے لئے ایک درسگاہ قائم کی ہے جس کا مقصد تعلیم سے زیادہ بچوں کی تربیت ایک ایسے طریقہ پر کرنا ہے کہ وہ بڑے ہو کر بچے اور سچے مسلمان بھی ہوں دنیات اور عربی سے آشنا بھی ہوں اور ساتھ ہی دنیوی زندگی عزت اور خودداری کے ساتھ بسر کرنے کے بھی قابل ہوں اس مقصد کے پیش نظر درسگاہ کے ارباب کار نے خود اپنا ایک نصاب تیار کیا ہے اور اب اسی نصاب کو اس درسگاہ میں رائج کر کے اس کا عملی تجربہ کیا جا رہا ہے۔ زیر تبصرہ یہ چھوٹے چھوٹے چند رسالے اسی نصاب اور اس کے ماتحت تعلیمی و ذہنی اصلاح کے جذبہ سے لکھے گئے ہیں اس میں شک نہیں کہ زبان و بیان، مضامین و ترتیب اور کتابت و طباعت ہر اعتبار سے یہ رسالے اس لائق ہیں کہ ہر مسلمان سچے یا سچی کو پڑھانے جائیں ان کے پڑھنے سے اردو زبان بھی آنے کی نیکی کی عظمت اور اس کی طرف رغبت بھی پیدا ہوگی اور اخلاقی سر بلندی و سرفرازی حاصل کرنے کا دلولہ بھی پیدا ہوگا۔

مرتبہ جناب افضل حسین صاحب ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی قیمت ۳ روپے سالہ

آسان کہانیاں | جسے اسی سلسلہ کی کڑی ہے جس میں دس کہانیاں بچوں کے لئے دلچسپ و آسان زبان میں لکھی گئی ہیں ان کہانیوں میں اس بات کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ کہانیاں بچوں کی ذہنی استعداد کے مطابق ہوں۔

از مولوی حاجی ابوالسعود احمد الباقوی تقطیع متوسط ضخامت ۲۲ صفحات

باب القرآن | کتابت و طباعت عمدہ قیمت ۶ روپے :- دارالاشاعت میل و شمارام صوبہ سندھ

یہ رسالہ کیا بلکہ قاعدہ قرآن مجید کی تعلیم کو آسان کر دینے کی غرض سے لکھا گیا ہے اس کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصہ میں حروف تہجی اور حرکات و سکنات کی خوب مشق کرادی گئی ہے دوسرے حصہ میں حروف کی ترکیب اور مرکبات کو سہل و آسان طریقہ پر سمجھانے اور ان کی مشق کرانے کی کوشش کی گئی ہے امید ہے یہ قاعدہ تجربہ کے بعد اپنے مقصد میں کامیاب ثابت ہوگا۔

ندوة المصنفین کی تالیفی کتابیں

غلامان اسلام

مستحق سے زیادہ غلامان اسلام کے کمالات و فضائل
آتشکار ناموں کا ایسا ان افروز بیان

عرب اور اسلام

ڈاکٹر حقی کی مشہور و معروف کتاب کا آسان اور
نفیس ترجمہ -

قیمت چھ مہلے

قیمت چھ مہلے

تاریخ اسلام پر ایک نظر

تاریخ اسلام کے تمام
ادوار کے ضروری حالات

تاریخ اسلام آٹھ جلدوں میں

تھوڑے وقت میں تاریخ اسلام پڑھنے والوں کے لئے یہ کتاب بہت
مفید ہے۔ تاریخ ملت کے یہ تمام حصے مستند و معتبر بھی ہیں اور جامع و
مکمل بھی طرز بیان نہایت شگفتہ و رواں ترتیب دل نشین

واقعات کی تفصیل

تاریخ نویسی کے جدید

تعمیروں کو سامنے رکھ کر

اسلوب بیان نہایت ہی

دل نشین۔ قیمت سے مہلے

نبی عربی صلعم

قیمت پندرہ مہلے

خلافت عباسیہ

قیمت چھ مہلے

تاریخ مصر و مغرب اقصیٰ

قیمت پندرہ مہلے

غیر مکمل سیٹ کی قیمت

قیمت پندرہ مہلے

قیمت پندرہ مہلے

قیمت پندرہ مہلے

قیمت پندرہ مہلے

قیمت پندرہ مہلے

قیمت پندرہ مہلے

قیمت پندرہ مہلے

قیمت پندرہ مہلے

قیمت پندرہ مہلے

قیمت پندرہ مہلے

قیمت پندرہ مہلے

قیمت پندرہ مہلے

قیمت پندرہ مہلے

مسلمانوں کی علمی خدمات

تاریخ و سنی کے

تاریخ و سنی کے

تاریخ و سنی کے

تاریخ و سنی کے

تاریخ و سنی کے

تاریخ و سنی کے

تاریخ و سنی کے

تاریخ و سنی کے

تاریخ و سنی کے

تاریخ و سنی کے

تاریخ و سنی کے

تاریخ و سنی کے

تاریخ و سنی کے

تاریخ و سنی کے

تاریخ و سنی کے

تاریخ و سنی کے

تاریخ و سنی کے

تاریخ و سنی کے

تاریخ و سنی کے

تاریخ و سنی کے

مسلمانوں کا عروج و زوال

جدید ایڈیشن (اپنے موضوع پر ایک اچھوتی کتاب)
جس میں خلافت راشدہ کے دور سے لے کر منہدستان
کے عہد حکمرانی تک مسلمانوں کے عروج و زوال کے اسباب کا
مبصرانہ اور متفقانہ تجزیہ کیا گیا ہے۔ قیمت للہ مہلے

تاریخ مشائخ حشت

سلسلہ حشت کے صوفیہ کرام کا متفقانہ تذکرہ اور ان کے معتقد
حیات نظام اصلاح و تربیت پر مدلل بحث قیمت للہ مہلے

فہرست کتب مفت طلب فرمائیے

مسلمانوں کا نظم و ملکت

مسلمانوں کے نظم و ملکت کی بصیرت افروز تاریخ جس میں
مسلمانوں کے آئین جہان بینی کے تمام شعبوں کو شملت نہایت
صاف اور روشن معلومات دی گئی ہیں یہ وقت کی ایک
لائق مطالعہ کتاب ہے اصل کتاب کے مصنف مصر کے
مشہور فاضل اور جدید و قدیم علوم کے بانع نظر عالم ڈاکٹر
حسن ابراہیم حسن ایم اے پی ایچ ڈی ہیں اور ترجمہ
ندوة المصنفین کی نگراں میں کیا گیا ہے۔

قیمت للہ مہلے

مینجر ندوة المصنفین اردو بازار حجام معجود علی

مختصر قواعد ندوة المصنفین دہلی

۱۔ **محسن خاص** جو مخصوص حضرات کم سے کم پانچ سو روپیہ یکمشت مرحمت فرمائیں وہ ندوة المصنفین کے دائرہ محسنین خاص کو اپنی شمولیت سے عزت بخشیں گے ایسے علم نواز اصحاب کی خدمت میں ادارے اور مکتبہ برہان کی تمام مطبوعات نذر کی جاتی رہیں گی اور کارکنان ادارہ ان کے قیمتی مشوروں سے مستفید ہوتے رہیں گے۔

۲۔ **محسنین** جو حضرات پچیس روپے مرحمت فرمائیں گے وہ ندوة المصنفین کے دائرہ محسنین میں شامل ہوں گے۔ ان کی جانب سے یہ خدمت معادضہ کے نقطہ نظر سے نہیں ہوگی بلکہ عطیہ خاص ہوگا۔ ادارے کی طرف سے ان حضرات کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات حق کی تعداد تین سے جا تک ہوتی ہے۔ نیز مکتبہ برہان کی بعض مطبوعات اور ادارہ کار سالہ "برہان" بلا کسی معادضہ کے پیش کیا جائے گا۔ جو حضرات اٹھارہ روپے پیشگی مرحمت فرمائیں گے ان کا شمار ندوة المصنفین کے خلفاء میں ہوگا۔ معادین میں ہوگا ان کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات ادارہ اور سالہ برہان (جس کا سالانہ چندہ چھ روپے ہے) بلا قیمت پیش کیا جائے گا۔

۳۔ **اجتہاد** نورپے ادا کرنے والے اصحاب کا شمار ندوة المصنفین کے اجتہاد میں ہوگا۔ ان کو سالانہ بلا قیمت دیا جائے گا اور طلب کرنے پر سال کی تمام مطبوعات نصف قیمت پر دی جائیں گی۔ یہ حلقہ خاص طور پر علماء اور طلبہ کے لئے ہے۔

قواعد رسالہ برہان (۱) برہان ہر انگریزی مہینے کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔ (۲) مذہبی، علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین اگر وہ زبان و ادب کے معیار پر پورے اتریں برہان میں شائع کئے جاتے ہیں۔ (۳) باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاک خانوں میں ضائع ہو جاتے ہیں جن صاحب کے پاس نہ پہنچے وہ زیادہ سے زیادہ ۲۵ تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیں۔ ان کی خدمت میں پرچہ دوبارہ بلا قیمت بھیج دیا جائے گا۔ اس کے بعد شکایت قابل اعتنا نہیں سمجھی جائے گی۔

(۴) جواب طلب امور کے لئے ۲۴ گھنٹے یا جوابی کارڈ بھیجنا چاہئے۔ خیریداری نمبر کا حوالہ ضروری ہوگا۔ (۵) قیمت سالانہ چھ روپے۔ دوسرے ملکوں سے ساڑھے سات روپے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ۔ (۶) منی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھئے۔

مولوی محمد ادریس پرنٹر پبلشر نے جید برقی پریس میں طبع کرا کر دفتر برہان جامع مسجد ہلی سے شائع کیا

